بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

Shia Books PDF منظر ایلیاء

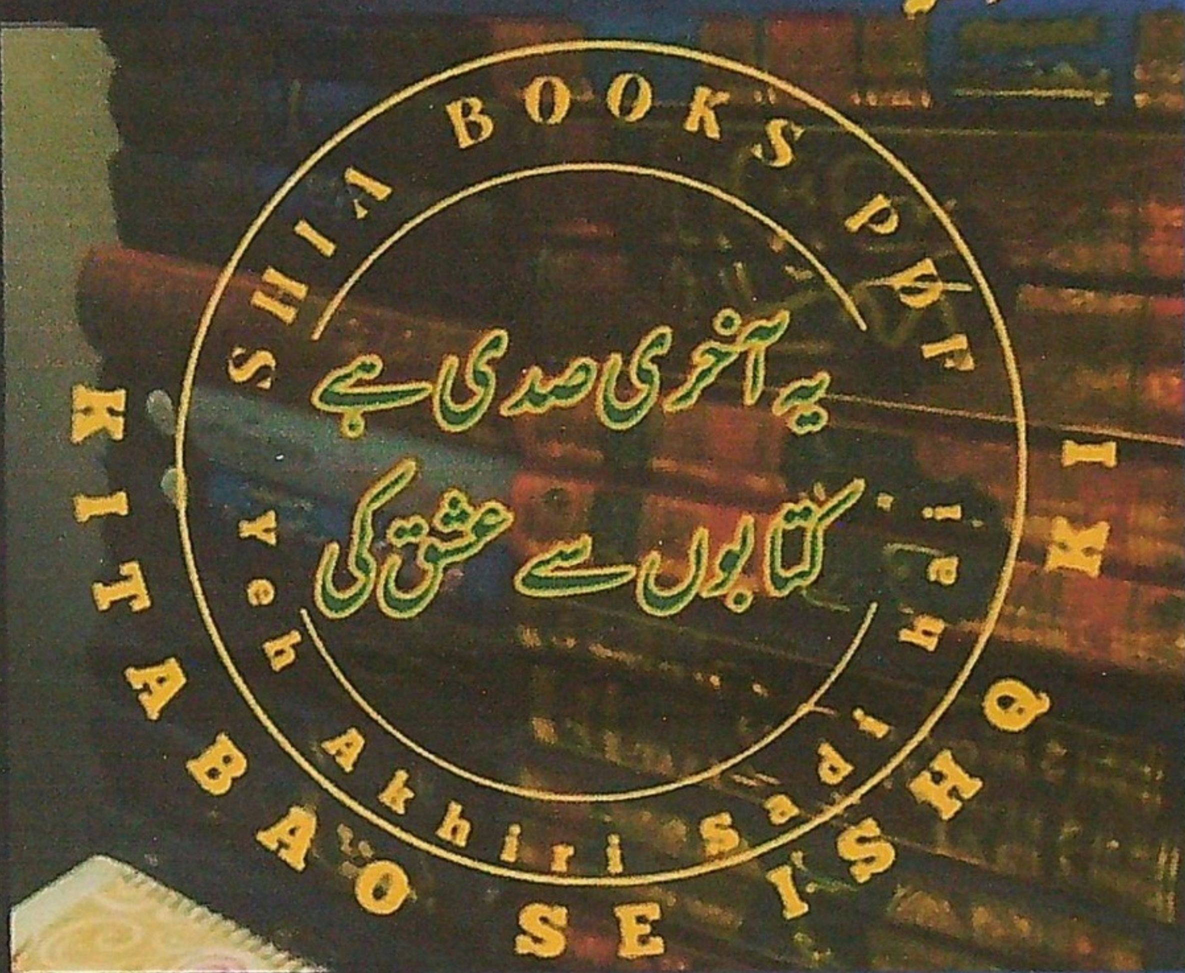

MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

قصص القرآن

حضرت آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی

مترجم

اقبال حیدر حیدری

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب: **قصص القرآن**

تصنیف: حضرت آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی

مترجم: اقبال حیدر حیدری

کمپوزنگ: قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس کراچی

پروف آر چوہدری

ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور۔ پاکستان

تعداد: ایک ہزار (۱۰۰۰)

طبع: اوّل۔ ۱۴۳۳ھ

قیمت:

ملنے کا پتہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کرتی رہے گی۔

موجودہ کتاب ''قصص القرآن'' تفسیر نمونہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات کو جمع کیا گیا ہے۔ جو لوگ مکمل تفسیر نمونہ کا مطالعہ نہیں کر سکتے یا چاہتے ہیں کہ کم وقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات کا مطالعہ کر سکیں یہ کتاب ان کے لئے ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

www.misbahulqurantrust.org

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
حرف اوّل	17
تقریظ حضرت آیت اللہ العظمی مکارم شیرازی	
مدظلہ العالی	18
پیش گفتار	19
چند ضروری نکات	19
انسانی زندگی پر داستان کا اثر	21
انبیاء علیہم السلام کے واقعات	23
حضرت آدم علیہ السلام	23
فرشتوں کا سوال	23
فرشتے امتحان کے سانچے میں	24
آدم علیہ السلام جنت میں	26
ابلیس نے مخالفت کیوں کی	26

عنوان	صفحہ نمبر
بہشت میں قیام	28
شیطان کا وسوسہ	28
حضرت آدم علیہ السلام کو آب حیات کی تمنا	29
شجرہ ممنوعہ کونسا درخت تھا؟	30
جنت سے اخراج	31
آدم علیہ السلام کونسی جنت میں تھے	32
آدم علیہ السلام کی بازگشت خدا کی طرف	33
خدا نے جو کلمات آدمؑ پر القا کئے وہ کیا تھے؟	33
آدمؑ کا ماجرا اور اس جہان پر ایک طائرانہ نظر	34
زمین پر سب سے پہلا قتل	34
ظلم کی پردہ پوشی	36
افسوس اپنے اوپر	36

عنوان	صفحہ نمبر
حضرت ادریس علیہ السلام	37
حضرت نوح علیہ السلام	38
950 سال تبلیغ 7 مومن	38
امامزادوں کو زائرین کی تعداد سے پہچانا جاتا ہے	39
حضرت نوح علیہ السلام کے جوابات	40
میں کسی صاحب ایمان کو نہیں دھتکارتا	41
خدائی خزانے میرے قبضہ میں نہیں ہیں	42
کہاں ہے عذاب؟	42
معاشرے کو پاک کرنے کا مرحلہ	43
کشتی نوح علیہ السلام	44
کشتی بنا رہے ہو دریا بھی بناؤ	44
آغاز طوفان	45
نوح علیہ السلام کا بیٹا بدکاروں کے ساتھ رہا	46
اللہ کا نام لے کر کشتی پر سوار ہو جاؤ	47
پسر نوح کا دردناک انجام	47
اے نوحؑ تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے	48
اس داستان کا اختتام	49
کوہ جودی کہاں ہے؟	50
حضرت نوح علیہ السلام باسلامت اتر آئے	50
کیا طوفان نوح علیہ السلام عالمگیر تھا؟	51
طوفان کے ذریعے سزا کیوں دی گئی؟	51
جناب نوح علیہ السلام کی بیوی	52
حضرت ہود علیہ السلام	53
شہرِ اِرم اور شداد کی بہشت	53

عنوان	صفحہ نمبر
حضرت ہود علیہ السلام برادر قوم عاد	53
حضرت ہود علیہ السلام کی بہترین دلیل	54
اے ہود تم ہمارے خداؤں کے غضب سے دیوانہ ہو گئے ہو	55
کیوں بت مجھے نابود نہیں کرتے	55
اس ظالم قوم پر ابدی لعنت	56
عذاب الٰہی ایک نحس دن میں	57
کیا ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو	58
حضرت صالح علیہ السلام	58
فاسد اور اسراف کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو	60
قوم صالح کی ہٹ دھرمی	60
کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے	61
اے صالح علیہ السلام ہم تم پر امید رکھتے تھے	62
تم کتنے نحس قدم ہو	62
ناقہ صالح علیہ السلام	63
اگر تم سچے ہو تو عذاب میں جلدی کرو	64
قوم ثمود کا انجام	65
"صیحۃ" سے کیا مراد ہے؟	65
حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ نجات پانے والے افراد	66
وادی القری میں نو (9) مفسد ٹولوں کی سازش	66
یہ خالی گھر ان کے ہیں؟	67
حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام	68

عنوان	صفحہ نمبر
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پر تلاطم زندگی	68
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش	68
دور نبوت	69
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ برجستہ صفات	69
ابراہیم علیہ السلام سب کے لئے نمونہ ہیں	71
شائستہ اولاد	71
آزر سے گفتگو	72
اے ابراہیم تم پر پتھر برساؤں گا	73
آسمانوں میں توحید کے دلائل	77
توحید کی دعوت	78
ہمارے بڑے بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے	79
ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا زبردست منظر	80
تم یہ بہترین اور شیرین غذا کیوں نہیں کھاتے	81
جناب ابراہیم علیہ السلام نمرودیوں کی عدالت میں	82
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دندان شکن دلیل	83
زود گذر بیداری	84
بت تو بولتے ہی نہیں	85
ابراہیم علیہ السلام کو جلا دیا جائے	86
فرشتوں کی فریاد	87
آگ گلزار ہوگئی	88
بہادر نوجوان	89
ابراہیم علیہ السلام اور نمرود	89
نمرود سے گفتگو	89
بت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیمؑ کی ہجرت	90

عنوان	صفحہ نمبر
کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا؟	92
چند اہم نکات	92
اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو منتقل کرنے کا حکم	93
اسماعیل علیہ السلام قربان گاہ میں	94
شیطانی وسوسہ	95
میری والدہ کو سلام کہنا	96
باپ بیٹے ایک دوسرے سے مل کر رونے لگے	97
جبرائیل علیہ السلام کی فریاد تکبیر	98
ذبح عظیم	98
ذبیح اللہ کون ہے؟	99
جناب اسحاق علیہ السلام کی بشارت	99
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر نو	101
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انعام میں امامت ملی	102
ابراہیمؑ کا کن چیزوں کے ذریعہ امتحان لیا گیا	102
امام کسے کہتے ہیں؟	103
حضرت لوط علیہ السلام	103
قوم لوط کا سب سے بڑا اخلاقی انحراف	104
جہاں پر عفت ایک عیب ہو	105
30 سال سعی و کوشش	106
یہ ہے گناہ گاروں کا انجام	106
صرف ایک خاندان مومن اور پاک	107
حضرت لوطؑ مہمانوں کو دیکھ کر پریشان ہوگئے	108
قوم لوط علیہ السلام آپ کے گھر میں داخل ہوگئی	109
اے کاش میں تم سے مقابلہ کرسکتا	110

عنوان	صفحہ نمبر
اے لوط! آپ پریشان نہ ہوں	111
کیا صبح قریب نہیں ہے؟	111
صبح کے وقت نزول عذاب کیوں؟	112
زیروزبر کیوں کیا گیا	113
قوم لوط علیہ السلام کا اخلاق	113
حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافروں کیلئے مثال	114
حضرت یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہما السلام	114
داستان عشق یا پاکیزگی کا بہترین سبق	114
قہرمان پاکیزگی	114
حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد	115
احسن القصص	116
امید کی کرن اور مشکلات کی ابتداء	116
بھائیوں کی سازش	117
یوسفؑ کو قتل کردیا جائے	118
منحوس سازش	119
کنعان کے بھیڑئے	119
روتے ہوئے جناب یوسف علیہ السلام کو وداع کیا	121
یوسف علیہ السلام کی ہنسی اور ان کا رونا	121
جناب یوسف علیہ السلام برہنہ کنویں میں	122
ذلیل کنندہ جھوٹ	122
مہربان بھیڑیا	123
ایک ترک اولیٰ کے بدلے	124
(1) حضرت یوسف علیہ السلام کی دلکش دعا	125
سرزمین مصر کی جانب	125
جناب یوسف علیہ السلام کو کم داموں میں بیچنا	126
عزیز مصر کے محل میں	126
جناب یوسفؑ کی پاکیزگی کا انعام	127
عزیز مصر کی بیوی کا عشق سوزاں	127
زلیخا نے ساتوں دروازے بند کردیئے	128
حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں ایک طوفان	129
زوجہ عزیز مصر کی رسوائی	130
شاہد گواہی دیتا ہے	131
شاہد کون تھا؟	132
زوجۂ عزیز مصر کی ایک اور سازش	132
جناب یوسف علیہ السلام کے پاس مصر کی عورتیں	133
مصر کی عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے	134
تو پھر یوسفؑ سے عشق میں مجھے کیوں ملامت کرتی ہو؟	134
اے یوسف علیہ السلام قبول کرلو	135
زندان کی تمنا	135
بے گناہی کی پاداش میں قید	136
زندان کے واقعات	137
قیدخانہ یا مرکز تربیت	137
قیدیوں کی تعبیر خواب	138
بادشاہ کے سامنے مجھے یاد کرنا	139
بادشاہ مصر کا خواب	140
بادشاہ کے ساقی نے جناب یوسفؑ کو یاد کیا	141

عنوان	صفحہ نمبر
مصر کا قیدی یا بہترین رہبر	142
یوسفؑ ہر الزام سے بری ہو گئے	142
زلیخا کا اعتراف	143
یوسفؑ، مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے	144
سات سال پُر برکت اور سات سال قحط	146
برادران یوسفؑ مصر پہونچے	146
جناب یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے ایک	
پیشکش کی	147
آخر کار باپ راضی ہو گیا	148
ایک دروازے سے داخل نہ ہونا	150
بھائی کو روکنے کی کوشش	151
اے اہل قافلہ تم چور ہو	152
اے بنیامین تم نے ہمیں ذلیل کر دیا	153
یوسفؑ نے بھی چوری کی تھی	154
برادران یوسفؑ کی فداکاری کیوں قبول نہ ہوئی	155
بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے	156
میں وہ الطاف الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے	157
برادران یوسفؑ شرمندہ اور حضرت یعقوبؑ	
نابینا ہو گئے	158
کوشش کرو اور مایوس نہ ہو، کیونکہ مایوسی کفر کی	
نشانی ہے	158
جناب یوسفؑ نے روتے ہوئے باپ کے خط کو چوما	159
کیا تو وہی یوسفؑ ہے؟	160
آج رحمت کا دن ہے	161
یوسفؑ کی قمیص کون لے کر گیا؟	162
یوسفؑ کی عظمت	162
آخر کار لطف الٰہی نے اپنا کام کر ڈالا	162
قافلہ کنعان پہنچتا ہے	163
1۔ یعقوب نے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو کیسے	
محسوس کی؟	165
2۔ انبیاء کے حالات میں فرق۔	165
3۔ بینائی کیسے لوٹ آئی؟	167
جناب یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر	167
باپ کو سرگزشت نہ سنانا	168
یوسفؑ، یعقوب اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام	169
حضرت شعیب علیہ السلام	169
حضرت شعیب علیہ السلام کی سرزمین ''مدین''	169
قوم شعیب کی اقتصادی برائیاں	170
ہٹ دھرموں کی بے بنیاد منطق	170
جناب شعیب علیہ السلام کا جواب	171
ایک دوسرے کو دھمکیاں	172
مدین کے تباہ کاروں کا انجام	174
حضرت موسیٰ علیہ السلام	175
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے پانچ ادوار	175
ولادت حضرت موسیٰ علیہ السلام	175
جناب موسیٰ علیہ السلام تنور میں	176
دریا کی موجیں گہوارے سے بہتر	177
دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت	178

عنوان	صفحہ نمبر
اللہ کی عجیب قدرت	179
موسیٰ علیہ السلام پھر آغوش مادر میں	180
صرف تیرا ہی دودھ کیوں پیا	181
موسیٰ علیہ السلام مظلوموں کے مددگار کے طور پر	183
موسیٰ علیہ السلام کی مخفیانہ مدین کی طرف روانگی	184
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سزائے موت	186
مدین کہاں تھا؟	187
ایک نیک عمل نے موسیٰ علیہ السلام پر بھلائیوں کے	
دروازے کھول دیئے	188
حضرت موسیٰ، جناب شعیب علیہما السلام کے گھر میں	190
جناب موسیٰ، حضرت شعیب علیہما السلام کے داماد بن گئے	190
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بہترین ایام	192
وحی کی تابش اول	193
اے موسیٰ جوتی اتار دو	193
موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا	194
انذار و بشارت	196
کامیابی کے اسباب کی درخواست	196
میرا بھائی میرا ناصر و مددگار	197
فرعون سے معرکہ آرا مقابلہ	199
دیوانگی کی تہمت	200
تمہارا ملک خطرے میں ہے	203
ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے	204
جادوگروں کا عجیب وغریب منظر	206
کیا عصا کا اژدھا بن جانا ممکن ہے؟	207

عنوان	صفحہ نمبر
کیا میری اجازت کے بغیر موسیٰ پر ایمان لے آئے؟	208
ہمیں اپنے محبوب کی طرف پلٹا دے	209
فرعون کی زوجہ ایمان لے آئی	210
جناب موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم	211
کہیں موسیٰ تمہارا مذہب نہ بدل دے	212
آیا کسی کو خدا کی طرف بلانے پر بھی قتل کرتے ہیں؟	213
میں تمہیں خبردار کرتا ہوں	214
آخری بات	215
موسیٰ کے خدا کی خبر لاتا ہوں	215
پچاس ہزار معمار برج بناتے ہیں	217
بیدار کرنے والی سزائیں	218
مختلف اور پیہم بلاؤں کا نزول	219
بار بار کی عہد شکنیاں	220
موسیٰ علیہ السلام کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں؟	221
جناب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے اونی لباس	222
چوتھا مرحلہ انقلاب کی تیاری	223
ہم نے انہیں باہر نکال دیا	224
فرعونیوں کا دردناک انجام	226
اپنے عصا کو دریا پر مار دو	227
اے فرعون تیرا بدن لوگوں کیلئے عبرتناک ہوگا	228
بنی اسرائیل کی گذرگاہ	229
حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت سازی کی فرمائش	229
ایک یہودی کو حضرت امیر المومنینؑ کا جواب	230
بنی اسرائیل سرزمین مقدس کی طرف	231

عنوان	صفحہ نمبر
جب کامیاب ہوجاؤ تو ہمیں بھی خبر کرنا	232
بنی اسرائیل بیابان میں سرگرداں	232
بنی اسرائیل کا ایک گروہ پشیمان ہوا	233
منّ وسلویٰ کیا ہے؟	234
بیابانوں میں چشمہ ابلنا	235
مختلف کھانوں کی تمنا	236
عظیم وعدہ گاہ	236
دیدار پرودگار کی خواہش	237
حضرت موسیٰ نے رویت کی خواہش کیوں کی؟	238
الواح توریت	239
یہودیوں میں گوسالہ پرستی کا آغاز	239
دو دن میں چھ لاکھ گوسالہ پرست بن گئے	240
گوسالہ پرستوں کے خلاف شدید ردعمل	241
بےنظیر غصہ	242
اے میری ماں کے بیٹے میں بے گناہ ہوں	242
طلائی گوسالہ سے کس طرح آواز پیدا ہوئی؟	244
سامری کی سزا	245
گناہ عظیم اور کم نظیر توبہ	246
اکٹھا قتل	246
خدا کی آیات کو مضبوطی سے پکڑلو	247
کوہ طور	248
توریت کیا ہے	248
حضرت خضر علیہ السلام	249
حضرت موسیٰ، جناب خضر علیہما السلام کی تلاش میں	250

عنوان	صفحہ نمبر
عرصہ دراز تک جناب خضر علیہ السلام کی تلاش	251
عظیم استاد کی زیارت	252
خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام؟	253
کیوں اس بچے کو قتل کر رہے ہو؟	254
اپنے کام کی مزدوری لے لو	255
فراق دوست، زندگی کے سخت ترین ایام	256
ان واقعات کا راز	256
خضر کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی؟	257
حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟	259
خودساختہ افسانے	260
وہ خزانہ کیا تھا؟	261
اور بنی اسرائیل کی نافرمانی اصحاب سبت، سنیچر کی چھٹی	261
بنی اسرائیل نے کس طرح گناہ کیا تھا؟	262
بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ	263
بنی اسرائیل کے اعتراضات	264
باپ سے نیکی کا صلہ	265
اور مالدار شخص قارون، بنی اسرائیل کا مغرور	266
چار نصیحتیں	266
قارون کا جواب	267
نمائش ثروت کا جنون	268
کاش ہم بھی قارون جیسے ہوتے	269
قارون کے سامنے زکوۃ کا مسئلہ	270
قارون کی شیطانی فکر	270

صفحہ نمبر	عنوان
271	عذاب الٰہی
271	کیا اچھا ہوا کہ ہم قارون کی جگہ نہ تھے
272	حضرت اشموئیل علیہ السلام
273	طالوت کون تھے؟
274	طالوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی
275	طالوت نے اپنی فوج کو چھانٹا
275	داؤد نے جالوت کو مار ڈالا
275	تابوت کیا ہے؟
276	فرشتے صندوق عہد کیسے لائے؟
277	یہ داؤد کون سے داؤد تھے
277	حضرت داؤد علیہ السلام
277	داؤد علیہ السلام کی زندگی سے درس حاصل کریں
277	جناب داؤد علیہ السلام پر الٰہی نعمتیں
279	حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش
281	داؤد علیہ السلام کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت
281	موجودہ توریت کی خرافاتی داستان
284	حضرت سلیمان علیہ السلام
285	سلیمان علیہ السلام کا سخت امتحان
286	سلیمان علیہ السلام کی وسیع حکومت
286	ہواؤں پر قبضہ
286	جنوں پر بھی حکومت
288	شیاطین زنجیروں میں
289	حضرت سلیمان علیہ السلام وادی نمل میں
290	جناب سلیمان علیہ السلام کا جانوروں کی بولی جاننا

صفحہ نمبر	عنوان
291	سلیمانؑ اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں
292	داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ
293	ہدہد اور ملکہ سبا کی داستان
294	ہدہد ایک اہم خبر کے ساتھ
296	حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا کے نام
297	بادشاہ تباہی لاتے ہیں
298	مجھے مال کے ذریعہ نہ ورغلاؤ
299	پلک جھپکتے ہی تخت موجود
300	آصف بن برخیا
302	ملکہ سبا کے دل میں نور ایمان
303	ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں
304	ملکہ سبا کا انجام
304	عبرت انگیز موت
305	سلیمان علیہ السلام کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟
306	حضرت ایوب علیہ السلام
306	حضرت ایوبؑ کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر
306	حضرت ایوبؑ کیوں مشکلات میں گرفتار ہوئے
307	سب سے بڑا غم دشمنوں کی دلآزاری باتیں
308	حضرت ایوب علیہ السلام کی قسم
309	حضرت ایوب علیہ السلام قرآن اور توریت میں
310	حضرت یونس علیہ السلام
310	یونس علیہ السلام امتحان کی بھٹی میں
311	یونس علیہ السلام فراری بندہ

عنوان	صفحہ نمبر
قرعہ تین بار جناب یونس علیہ السلام کے نام	312
جناب یونس علیہ السلام نے استغفار کیا	312
جناب یونس علیہ السلام کدو کی بیل کے سایہ میں	313
قوم یونس علیہ السلام کا انجام	314
یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟	314
حضرت الیاس علیہ السلام	315
پیغمبر خدا مشرکین کے مقابلے میں	316
قوم الیاس علیہ السلام کا ردعمل	317
حضرت الیسع علیہ السلام	317
حضرت ذالکفل علیہ السلام	318
حضرت عزیر علیہ السلام	318
حضرت عزیرؑ نے دین یہود کی بہت خدمت کی	319
حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام	320
ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	321
یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی نشانی	321
یحییٰ علیہ السلام، عشق الٰہی میں سرشار پیغمبر	322
یحییٰ علیہ السلام کی عمدہ صفات	323
بچپن میں نبوت	324
حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت	324
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا	325
پالنے والے یہ تو لڑکی ہے	326
مریم سلام اللہ علیہا کی پرورش کے لئے قرعہ کشی	326
جناب مریم کے سرپرست حضرت زکریا علیہ السلام	327
فرشتے جناب مریمؑ سے باتیں کرتے ہیں	328
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سرآغاز	328
''روح خدا'' سے کیا مراد ہے؟	330
مریم سلام اللہ علیہا سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں	330
اے کاش اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی!	332
حضرت مسیح علیہ السلام کی گہوارے میں باتیں	333
جناب عیسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا آغاز	335
معجزات عیسیٰ علیہ السلام	335
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عیسائیوں کی گفتگو	337
خیالی تثلیث	338
1۔ عیسیٰ علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں	338
2۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول ہیں	338
3۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں	338
4۔ عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں	339
یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں	339
حواری کون تھے؟	340
حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں	340
حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ	341
یہ آسمانی مائدہ کیا تھا	342
عہد جدید اور مائدہ	342
انجیل یا اناجیل؟	343
حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ	344
مسیح علیہ السلام قتل نہیں ہوئے، افسانہ صلیب	345
پیغمبر اسلامؐ کی بشارت، جناب عیسیٰؑ کی زبانی	347
عہدین کی بشارتیں اور ''فارقلیطا'' کی تعبیر	347

عنوان	صفحہ نمبر
ایک اور زندہ گواہ	348
حضرت لقمان	350
یہ تمام حکمت کہاں سے	350
اصحاب کہف	351
اصحاب کہف کی زندگی کا اجمالی جائزہ	351
داستان اصحاب کہف کی تفصیل	352
''غار'' ایک پناہ گاہ	353
اصحاب کہف کا اہم مقام	354
ایک طویل نیند کے بعد بیداری	356
پاکیزہ ترین غذا	357
سامان خریدنے والے پر کیا گزری	358
اصحاب کہف کے واقعہ کا اختتام	359
اصحاب کہف کی نیند	360
غار کہاں ہے؟	360
اصحاب کہف کا واقعہ دیگر تواریخ میں	361
ذوالقرنین کی عجیب کہانی	362
ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟	364
ذوالقرنین کون تھے؟	366
ذوالقرنین کو یہ نام کیوں دیا گیا؟	367
جناب ذوالقرنین کی ممتاز صفات	367
دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟	367
یاجوج ماجوج کون تھے؟	368
قوم تُبّع	368
قوم تُبّع کون تھی؟	368

عنوان	صفحہ نمبر
تُبّع مدینہ کے نزدیک	369
تُبّع شہر مکہ میں	369
انطاکیہ کے رسول	370
ہم آپ کو سنگسار کر دیں گے	371
ایک جاں بکف مجاہد	372
اس مرد مومن کے مقابلہ میں قوم کا ردّ عمل	374
تین پیغمبروں علیہ السلام کا انجام کار	375
اس ظالم اور سرکش قوم کا سرانجام	375
انطاکیہ کے رسولوں کی داستان مجمع البیان کی زبانی	376
اصحاب الرس	378
سرسبز باغات کے مالک	379
سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام	380
قوم سبا	382
ایک درخشاں تمدن جو کفران نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا	383
ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ ضرب المثل بن گئے	385
دو دوست یا دو برادر	385
مستضعفین کا جواب	386
اور یہ ان کا انجام	388
برصیصائے عابد	389
انسانوں کو جلا دینے والی بھٹیاں	390
بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا	391
میں نے اپنی بارہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے	392

عنوان	صفحہ نمبر
اصحاب فیل	393
ابرہہ حملہ کے لئے تیار	394
میں اونٹوں کا مالک ہوں	394
ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)	396
ایک مسلم تاریخی روئیداد	397
حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	398
نبوت سے پہلے آنحضرتؐ کس دین پر تھے؟	398
آغاز وحی	399
پہلا مسلمان	400
تحریف تاریخ	401
دعوت ذوالعشیرۃ	402
ایمان ابوطالب علیہ السلام	403
ایمان ابوطالب پر سات دلیل	404
اشعار ابوطالب علیہ السلام زندہ گواہ	405
ابوطالب علیہ السلام تین سال تک شعب میں	407
ابوطالب علیہ السلام کا سال وفات ''عام الحزن''	408
ابولہب کی دشمنی	408
ابولہب پیغمبر کا پیچھا کرتا رہا	408
ابولہب کے ہاتھ کٹ جائیں	409
ایندھن اٹھائے ہوئے	410
ابولہب کا عبرت ناک انجام	410
ابوسفیان وابوجہل چھپ کر قرآن سنتے ہیں	411
اسلام کے پہلے مہاجرین	412
مشرکین، مہاجرین کی تعقیب میں	412
جعفر بن ابی طالب مہاجرین کے بہترین خطیب	413
فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹنے کی	414
معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	415
معراج کی کیفیت قرآن وحدیث کی نظر سے	415
معراج کی تاریخ	415
معراج جسمانی تھی یا روحانی؟	417
معراج کا مقصد	417
معراج اور سائنس	418
ان سوالات کے پیش نظر چند چیزوں پر توجہ	419
شب معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کی باتیں	420
اہل بہشت کے صفات	421
بہترین اور جاویدانی زندگی	422
ہجرت پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	422
ابوجہل کی رائے	423
حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جان بیچ ڈالی	424
قبلہ کی تبدیلی	425
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خانہ کعبہ سے خاص لگاؤ	425
تبدیلی قبلہ کا راز	426
جنگ بدر	427
313 وفادار ساتھی	428
قریش کا ایک ہزار کا لشکر	429
مسلمانو! فرشتے تمہاری مدد کریں گے	429
ستر قتل ستر اسیر	430
مجاہدین کی تشویق	431

عنوان	صفحہ نمبر
جنگ کا خاتمہ اور اسیروں کا واقعہ	431
آنحضرتؐ کے چچا عباس کا اسلام قبول کرنا	432
جنگ احد کا پیش خیمہ	433
جناب عباس کی بروقت اطلاع	433
مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں	434
آغاز جنگ	435
کون پکارا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہو گئے؟	436
جنگ کا خطرناک مرحلہ	437
کھوکھلی باتیں	438
حضرت علی علیہ السلام کے زخم	438
ہم نے شکست کیوں کھائی؟	438
عمومی معافی کا حکم	439
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء سے مخاطب	439
حنظلہ غسیل الملائکہ	439
قبیلہ بنی نضیر کی سازش	440
جنگ احزاب	441
کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں	442
لشکر کی تعداد	442
خندق کی کھدائی	442
عمرو بن عبدود سے حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ	443
ضربت علی علیہ السلام ثقلین کی عبادت پر بھاری	444
نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ	445
حذیفہ کا واقعہ	447

عنوان	صفحہ نمبر
جنگ احزاب قرآن کی روشنی میں	447
منافقین اور ضعیف الایمان جنگ احزاب میں	449
میں نے ایران، روم اور مصر کے محلوں کو دیکھا ہے	449
منافقانہ عذر	450
روکنے والا ٹولہ	452
وہ ہرگز ایمان نہیں لائے	452
جنگ احزاب میں سچے مومنین کا کردار	454
مومنین کے صفات	454
جنگ بنی قریظہ	455
تین تجاویز	456
ابولبابہ کی خیانت	456
صلح حدیبیہ	457
بیعت رضوان	458
صلح نامہ کی تحریر	459
صلح حدیبیہ کے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی نتائج	460
صلح حدیبیہ یا عظیم الشان فتح	461
پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا خواب	461
مومنین کے دلوں پر نزول سکینہ	462
یہ سکینہ کیا تھا؟	462
پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی	463
اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی	464
عمرۃ القضاء	465
فتح خیبر	467
دعائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	468

عنوان	صفحہ نمبر
فاتح خیبر علی علیہ السلام	468
فتح مکہ	469
مکہ کی طرف روانگی	470
علی علیہ السلام کے قدم دوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر	471
آج کا دن روز رحمت ہے	472
عورتوں کی بیعت کے شرائط	473
ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی بیعت کا ماجرا	473
پیغمبرؐ کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام	474
مقوقس کے نام خط	475
قیصر روم کے نام خط	477
جنگ ذات السلاسل	479
جنگ حنین	479
دشمن کے لشکر کا مورچہ	480
بھاگنے والے کون تھے؟	481
جنگ تبوک	482
لشکری مشکلات	482
تشویق، سرزنش، اور دھمکی کی زبان	483
تنہا وہ جنگ جس میں حضرت علی علیہ السلام نے شرکت نہ کی	484
ایک عظیم درس	485
جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے تین لوگ	485
مسجد ضرار	486
مسجد قباء	488
سب سے پہلی نماز جمعہ	488
واقعہ غدیر	488
خطبہ غدیر	489
روز اکمال دین	491
فدک	492
’’نحن معاشر الانبیاء لانورث‘‘	493
مباہلہ	495
عظمت اہل بیت علیہم السلام کی ایک زندہ سند	496
زینب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی	498
ثعلبہ	502

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

حرف اوّل

قرآن مجید ایک تاریخی کتاب ہے، نہ گزشتہ لوگوں کی سوانح حیات کا مجموعہ، یہ نہ علوم طبیعی نصاب ہے اور نہ زمین وآسمان کے اسرار ورموز کو بیان کرنے کی کتاب ہے بلکہ وہ ''کتاب ہدایت'' ہے۔

ہاں قرآن کریم میں چونکہ گزشتہ لوگوں خصوصاً انبیائے کرام اور اقوام وملل کے عبرت ناک واقعات بیان ہوئے ہیں جن میں سے بہت سے لوگ زمین کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرتے تھے اور اب ان کا نام ونشان تک نہیں رہا، اور کائنات کے پُر اسرار مخلوقات میں ''توحید خدا'' اور ''معرفت اللہ'' کے بہترین درس چھپے ہوئے ہیں لہٰذا قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں بیان کیا ہے اور انسانی ہدایت کے لئے مؤثر اور کامیاب نمونے بیان کئے ہیں۔

عصر حاضر میں جوانوں اور نوجوانوں کو راہ ہدایت سے گمراہ کرنے کے لئے جس قدر پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اخبار اور جرائد ایک طرف، تو ریڈیو، ٹی وی دوسری طرف اور آج کل انٹرنیٹ جس نے پوری دنیا کی اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ ایک میز پر لاکر رکھ دی ہیں، ہر طرف سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں، اسلام کی ترقی دیکھ کر اسلام دشمن طاقتیں ایڑی چوٹی کے زور لگا رہی ہیں، خصوصاً جبکہ دشمن سمجھ چکا ہے کہ دین حقیقی کے ماننے والے یہی شیعہ اثناعشری ہیں، کہیں یورپ اور امریکہ سے اسلام کے خلاف اعتراضات بیان ہوتے ہیں تو کبھی فرقہ وہابیت کی طرف سے شیعت پر بے جا شبہات وارد کئے جاتے ہیں۔

لہٰذا ایسے ماحول میں اپنے جوانوں کو دینی راستے پر قائم رکھنا واقعاً ہم سب کی ذمہ داری ہے، علمائے کرام، دینی رہبروں اور قوم وملت کے صاحبان حیثیت افراد کا فریضہ ہے کہ اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کریں، ورنہ کل روز قیامت خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے اسی چیز کے پیش نظر الحاج جناب آقائے انصاریان صاحب کی فرمائش پر تفسیر نمونہ (تالیف استاد محترم آیت اللہ العظمی مکارم شیرازی دام ظلہ) سے منتخب شدہ قرآنی واقعات کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا، کیونکہ قرآنی واقعات ہماری زندگی کے لئے بہترین نمونۂ عمل بن سکتے ہیں۔

کتاب ''قصص قرآن''، تفسیر نمونہ (مترجم حجۃ الاسلام والمسلمین سید صفدر حسین اعلی اللہ مقامہ) سے تلاش کرنا، نشانات لگانا، کمپوز کرنا پھر تصحیح اور مطابقت کرنا واقعاً مشکل کام تھا، بسا اوقات ہم کو یہ فکر لاحق ہوتی تھی کہ شاید اس سے آسان تو ترجمہ ہی ہوجاتا، الحمد للہ توفیق الٰہی اور بعض برادران کے تعاون سے ایک سال کی مدت میں یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا ہے، ہم تہہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔

خداوند عالم ہماری توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

ربّنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اقبال حیدر حیدری

تقریظ حضرت آیت اللہ العظمی مکارم شیرازی مدظلہ العالی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن مجید ایک تاریخی کتاب ہے، نہ گزشتہ لوگوں کی سوانح حیات کا مجموعہ، یہ نہ علوم طبیعی نصاب ہے اور نہ زمین و آسمان کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کی کتاب ہے بلکہ وہ ''کتاب ہدایت'' ہے۔

ہاں! قرآن کریم میں چونکہ گزشتہ لوگوں خصوصاً انبیائے کرام اور اقوام وملل کے عبرت ناک واقعات بیان ہوئے ہیں جن میں سے بہت سے لوگ زمین کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرتے تھے، اور اب ان کا نام ونشان تک نہیں رہا، اور کائنات کے پُراسرار مخلوقات میں ''توحید خدا'' اور ''معرفت اللہ'' کے بہترین درس چھپے ہوئے ہیں لہٰذا قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں بیان کیا ہے اور انسانی ہدایت کے لئے مؤثر اور کامیاب نمونے بیان کئے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان نکات کو بیان کرتے ہوئے قرآنی آیات کا لب ولہجہ اس انداز کا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ ان واقعات کی تازگی ختم نہیں ہوتی بلکہ مرور زمان کے باوجود اس کے معنی ومفاہیم میں تروتازگی اور سبق آموزی پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح ہر پیر وجوان اور عوام الناس ودانشور اپنے لحاظ سے اس نور ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

یہ صرف ایک دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ آپ حضرات بھی قرآن سے نزدیک ہوسکتے ہیں، اور اس حقیقت کا تجربہ کرسکتے ہیں، اس کا ایک واضح نمونہ ''کتاب ہذا قصص قرآن'' ہے، جس میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات، گزشتہ اقوام ملل کی داستانیں جو حجۃ الاسلام عالی جناب سید حسین حسینی نے ''تفسیر نمونہ'' سے انتخاب کی ہیں، اور کافی زحمت کرکے اپنے بہترین سلیقہ کو بروئے کار لائے ہیں، جس سے ہر پڑھنے والے کو ہدایت وروشنی ملتی ہے اور اس کی زندگی کو ''سعادت وفلاح وبہبودی'' کا راستہ دکھاتی ہے۔

آخر میں ہم مولانا موصوف کی زحمتوں کی قدردانی کرتے ہوئے ان کے شکرگزار ہیں اور سبھی کو کتاب ہذا کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں خداوند عالم موصوف کی اس کاوش اور ہم سب کی جد وجہد کو قبول فرمائے۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم
ذی الحجہ 1421ھ

پیش گفتار

حالانکہ ہمیشہ سے شیعہ علمائے کرام نے قرآن مجید کی بہت سے تفاسیر لکھی ہیں، جن سے بہت سے علمائے کرام اور حوزات علمیہ فیض حاصل کرتے رہے ہیں، لیکن جن صفات کی حامل ''تفسیر نمونہ'' ہے وہ بھی فارسی زبان میں جس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، خصوصاً دورحاضر میں کہ جب قرآن فہمی کا جذبہ ہر طبقہ میں پیدا ہو گیا ہے۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی نے چند علماء کے ساتھ مل کر اس ضرورت کو پورا کیا اور اس تفسیر کے ذریعہ قرآن مجید کی شایان شان خدمت انجام دی۔

اس تفسیر کی خاص صفات جن کی وجہ سے یہ مقبول عام ہوئی ہے حسب ذیل ہیں:

1۔ اگر چہ یہ تفسیر فارسی زبان میں ہے لیکن اس کے علمی اور تحقیقاتی نکات میں کافی رعایت کی گئی ہے، تاکہ علمائے کرام اور طلاب بھی اس سے فیضاب ہو سکیں اور قرآن فہمی کا شوق رکھنے والے عوام الناس بھی۔

2۔ تفسیر آیات میں بعض غیر ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے ان مسائل سے خصوصی بحث کی گئی ہے جو انسان کے لئے واقعاً زندگی ساز ہیں جن کے ذریعہ انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی میں کافی مؤثر ہوتی ہے۔

3۔ آیات میں بیان شدہ عناوین کے تحت ایک مختصر و مفید عنوان سے الگ بحث کی گئی ہے جس کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام کو دوسری کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

4۔ تفسیر میں مشکل اور پیچیدہ اصطلاحات سے پرہیز کیا گیا ہے لیکن ضرورت کے وقت حاشیہ میں ضروری وضاحت بھی کی گئی ہے، تاکہ علمائے اور صاحبان نقد حضرات کے علاوہ عام قارئین کرام کے لئے بھی مفید واقع ہو سکے۔

5۔ اس تفسیر کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ اس میں قرآنی واقعات سلیس زبان اور پُر کشش انداز میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر طرح کے پیچیدہ مسائل سے اجتناب کیا گیا ہے۔

اسی لئے حقیر نے استاد معظم سے اجازت طلب کی تاکہ قرآنی واقعات کو جمع کر کے ایک الگ کتاب کی شکل دے دی جائے جو عام قارئین کرام کے لئے مفید واقع ہو سکے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ استاد بزرگوار نے اجازت مرحمت فرمادی، اور ہم نے تفسیر نمونہ کا ایک دقیق دورہ کیا اور اس سے قرآنی واقعات کو جمع کیا، جن کو آپ حضرات کتاب ہذا کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

چند ضروری نکات:

1۔ کہیں کہیں ایسا ہوا ہے کہ ایک واقعہ تفسیر کی مختلف جلدوں میں بیان ہوا ہے مثال کے طور پر جناب موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تیس

سے زیادہ سوروں میں 130 بار سے زیادہ بیان ہوا ہے، ہم نے ان کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کو مقدم و موخر کیا تا کہ واقعہ کی کیفیت ختم نہ ہونے پائے، اسی وجہ سے اگرچہ ظاہراً اس کتاب کا مواد جمع کرنا آسان کام ہے لیکن اس کے مختلف مراحل طے کرنے پڑے ہیں، منجملہ تفسیری دورہ، واقعات کی جمع آوری اور ان کو منظم و مرتب کرنا واقعاً ایک فرصت طلب کام تھا (جو الحمد للہ مکمل ہو گیا)

2۔ چونکہ واقعات قرآن سے ہم آہنگ ہیں حاشیہ میں سورہ اور آیت کا حوالہ لکھ دیا گیا ہے جس سے اگر کوئی تفسیر نمونہ پر رجوع کرنا چاہے تو اس کے لئے آسان ہو جائے، اسی وجہ سے ان واقعات کے حوالے نہیں لکھے گئے ہیں۔

3۔ قرآن کریم میں مختلف واقعات کے علاوہ 26 انبیاء علیہم السلام کا نام مبارک وضاحت کے ساتھ لیا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

حضرت آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، لوط، یوسف، یعقوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، ایوب، یونس، الیاس، الیَسع، ذاالکفل، عزیر، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ضمناً عرض ہے کہ حضرت اشموئیل علیہ السلام نبی جن کا نام صراحت کے ساتھ قرآن کریم میں نہیں ہے، ان کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا حصہ: قرآن میں بیان شدہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات۔

دوسرا حصہ: قرآن میں بیان شدہ دوسرے واقعات۔

تیسرا حصہ: قرآن میں بیان شدہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعات۔

امید ہے کہ یہ ناچیز کوشش حضرت بقیۃ اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی بارگاہ میں مقبول و منظور قرار پائے گی۔

سید حسین حسینی

قم المقدسہ

انسانی زندگی پر داستان کا اثر

قرآن کریم کا بہت سا حصہ گزشتہ قوموں کی سرگذشت اور گزرنے ہوئے لوگوں کے واقعات زندگی کی صورت میں ہے،اس پہلو پر نظر کرنے سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک تربیت کنندہ اور انسان ساز کتاب میں یہ سب تاریخ اور داستانیں کیوں ہیں۔

لیکن ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے:۔

1۔تاریخ انسانی زندگی کے مختلف مسائل کی تجربہ گاہ ہے اور جو چیزیں انسان عقلی دلائل سے اپنی ذہن میں منعکس کرتا ہے انہیں تاریخ کے صفحات میں عینی صورت میں کھلا ہوا پاتا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ معلومات میں سے زیادہ قابل اعتماد وہ ہیں جو حسی پہلو رکھتی ہیں،واقعات زندگی میں تاریخ کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے،انسان اپنی آنکھوں سے صفحات تاریخ میں اختلاف و انتشار کی وجہ سے کسی قوم کی مرگ بار شکست دیکھتا ہے اور اسی طرح اتحاد و ہم بستگی کے باعث کسی دوسری قوم کی درخشاں کامیابی کا مشاہدہ کرتا ہے۔

گزشتہ لوگوں کے حالات ان کے نہایت قیمتی تجربات کا مجموعہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ زندگی کا ماحصل تجربے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

تاریخ ایک آئینہ ہے جو اپنے اندر تمام انسانی معاشروں کا ڈھانچہ منعکس کرتا ہے،یہ آئینہ ان کی برائیاں اچھائیاں،کامیابیاں،ناکامیاں،فتوحات،شکستیں اور ان سب امور کے عوامل و اسباب دکھا دیتا ہے،اسی بنا پر ان کی پوری عمر کے تجربات سمیٹ لیتا ہے،اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام اپنے ابرومند فرزند کے نام اپنے تاریخی وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

''اے میرے بیٹے اگر گزشتہ لوگوں کی عمر یکجا مجھے حاصل نہیں تاہم میں نے ان کے اعمال دیکھے ہیں،ان کے واقعات میں غور و فکر کیا ہے اور ان کے آثار کی سیر و سیاحت کی ہے اس طرح سے گویا میں ان میں سے ایک ہو گیا ہوں،بلکہ اس بنا پر کہ میں نے ان کی تاریخ کے تجربات معلوم کئے ہیں تو گویا میں نے ان کے اولین و آخرین کے ساتھ زندگی گذاری ہے''۔[1]

البتہ!یہاں تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو خرافات،اتہامات،دروغ گوئیوں،چاپلوسیوں،ثناخوانیوں،تحریفوں اور مسخ شدہ واقعات سے خالی ہو لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسی تاریخیں بہت کم ہیں،اس سلسلے میں قرآن نے حقیقی تاریخ کے جو نمونے پیش کئے ہیں اس کے اثر کو نظر سے اوجھل نہیں رہنا چاہئے۔

ایسی تاریخ کی ضرورت ہے کہ جو آئینے کی طرح صاف ہو نہ کہ کثر نما ہو،ایسی تاریخ کہ جو صرف واقعات ذکر نہ کرے بلکہ اس کی بنیاد اور نتائج بھی تلاش کرے۔

ان حالات میں قرآن جو تربیت کی ایک اعلیٰ کتاب ہے تاریخ سے استفادہ کیوں نہ کرے اور گزشتہ لوگوں کے واقعات سے مثالیں اور شواہد کیوں پیش نہ کرے۔

---

[1] نہج البلاغہ،مکتوب 31،بنام امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

2۔علاوہ ازیں تاریخ ایک خاص قوت جاذبہ رکھتی ہے اور انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اپنی عمر کے تمام ادوار میں اس زبردست قوت جاذبہ کے زیر اثر رہتا ہے، اسی بنا پر دنیا کی ادبیات کا ایک اہم حصہ اور انشا پردازوں کے عظیم آثار تاریخ اور واقعات پر مشتمل ہیں۔

شعرا اور عظیم مصنفین کے بہترین آثار چاہے وہ فارسی میں ہوں یا دوسری زبانوں میں یہی داستانیں اور واقعات ہیں گلستان سعدی، شاہنامہ فردوسی، خمسہ نظامی اور معاصر مصنفین کے دلکش آثار، اسی طرح ہیجان آفرین فرانسیسی مصنف ویکٹر ہوگو، برطانیہ کے شکسپیئر، اور جرمنی کے گوئٹے، سب کی تصانیف داستان کی صورت میں ہیں۔

داستان اور واقعہ چاہے نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی، نمائش کے انداز میں ہو یا فلم کی شکل میں پڑھنے والے اور دیکھنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایسی تاثیر عقلی استدلالات کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان عقلی سے پہلے حسی ہے اور وہ جس قدر فکری مسائل میں غور وفکر کرتا ہے اس سے زیادہ حسی مسائل میں غوطہ زن ہوتا ہے، زندگی کے مختلف مسائل میں جس قدر میدان حس سے دور ہوتے ہیں اور خالص عقلی حوالے سے ہوتے ہیں اسی قدر ثقیل اور سنگین ہوتے ہیں اور اتنی ہی دیر سے ہمضم ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ عقلی استدلالات کے مضبوط بنانے کے لئے حسی مثالوں سے مدد لی جاتی ہے، بعض اوقات ایک مناسب اور برمحل مثال استدلال کا اثر کئی گنا زیادہ کر دیتی ہے، اسی لئے کامیاب علماء وہ ہیں جو بہترین مثالیں انتخاب کرنے پر زیادہ دسترس رکھتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ عقلی استدلال حسی، عینی اور تجرباتی مسائل کا ماحصل ہیں۔

3۔داستان اور تاریخ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہے جب کہ اس کے برعکس عقلی استدلالات کی رسائی میں سب لوگ برابر کے شریک نہیں ہیں۔

اسی لئے وہ کتاب کہ جو عمومیت رکھتی ہے اور سب کے لئے ہے، نیم وحشی، ان پڑھ عرب کے بیابانی بدّو سے لے کر عظیم مفکر اور فلسفی تک کے استفادہ کے لئے ہے اسے حتمی طور پر تاریخ، داستانوں اور مثالوں کا سہارا لینا چاہئے۔

ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تمام تاریخیں اور داستانیں بیان کر کے قرآن نے تعلیم وتربیت کے لحاظ سے بہترین راستہ اپنایا ہے۔

خصوصاً اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن نے کسی موقع پر بھی خالی تاریخی واقعات ہی بیان نہیں کر دیئے بلکہ ہر قدم پر اس سے نتائج اخذ کئے ہیں اور اس سے تربیتی حوالے سے استفادہ کیا ہے چنانچہ آپ اسی صورت میں اس کے کئی نمونے دیکھیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کے واقعات

حضرت آدم علیہ السلام

خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا موجود خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو، اس کی صفات، صفات خداوندی کا پرتو ہوں اور اس کا مرتبہ ومقام فرشتوں سے بالا تر ہو، خدا کی خواہش اور ارادہ یہ تھا کہ ساری زمین اور اس کی نعمتیں، تمام قوتیں، سب خزانے، تمام کانیں اور سارے وسائل بھی اس کے سپرد کر دیئے جائیں، ضروری ہے کہ ساری زمین اور اس کی نعمتیں عقل وشعور، ادراک کے وافر حصے اور خصوصی استعداد کا حامل ہو جس کی بناء پر موجودات ارضی کی رہبری اور پیشوائی کا منصب سنبھال سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: ''یاد کریں اس وقت کو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔[1]

بہر حال خدا چاہتا تھا کہ ایسے وجود کو پیدا کرے جو عالم وجود کا گلدستہ ہو اور خلافت الٰہی کے مقام کی اہلیت رکھتا ہو اور زمین پر اللہ کا نمائندہ ہو مربوط آیات کی تفسیر میں ایک حدیث جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فرشتے مقام آدم پہچاننے کے بعد سمجھ گئے کہ آدم اور ان کی اولاد زیادہ حقدار ہیں کہ وہ زمین میں خلفاء الٰہی ہوں اور مخلوق پر اس کی حجت ہوں۔

فرشتوں کا سوال

فرشتوں نے حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ اعتراض کی غرض سے عرض کیا: ''کیا زمین میں اسے جانشین قرار دے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ جب کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، تیری تسبیح وحمد کرتے ہیں اور جس چیز کی تیری ذات لائق نہیں اس سے تجھے پاک سمجھتے ہیں۔[2]

مگر یہاں پر خدا نے انہیں سربستہ ومجمل جواب دیا جس کی وضاحت بعد کے مراحل میں آشکار ہو فرمایا: ''میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔[3]

فرشتوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ انسان سربراہی نہیں بلکہ فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کس طرح سمجھے تھے۔

بعض کہتے ہیں خدا نے انسان کے آئندہ حالات بطور اجمال انہیں بتائے تھے جب کہ بعض کا احتمال ہے کہ ملائکہ خود اس

---

[1] سورہ بقرہ آیت 30

[2] سورہ بقرہ آیت 30

[3] سورہ بقرہ آیت 30

مطلب کو لفظ ''فی الارض'' (زمین میں) سے سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے انسان مٹی سے پیدا ہوگا اور مادہ اپنی محدودیت کی وجہ سے طبعاً مرکز نزاع وتزاحم ہے کیونکہ محدود مادی زمانہ انسانوں کی اس طبیعت کو سیر وسیراب نہیں کرسکتا جو زیادہ کی طلب رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر ساری دنیا بھی ایک فرد کو دے دی جائے تو ممکن ہے وہ پھر بھی سیر نہ ہو اگر کافی احساس ذمہ داری نہ ہو تو یہ کیفیت فساد اور خونریزی کا سبب بنتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین معتقد ہیں کہ فرشتوں کی پیشین گوئی اس وجہ سے تھی کہ آدم روئے زمین کی پہلی مخلوق نہیں تھے بلکہ اس سے قبل بھی دیگر مخلوقات تھیں؛ جنہوں نے نزاع، جھگڑا اور خونریزی کی تھی، ان سے پہلے مخلوقات کی بری فائل نسل آدم کے بارے میں فرشتوں کی بدگمانی کا باعث بنی۔

یہ تین تفاسیر ایک دوسرے سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتیں یعنی ممکن ہے یہ تمام امور فرشتوں کی اس توجہ کا سبب بنا ہو اور دراصل یہ ایک حقیقت بھی تھی جسے انہوں نے بیان کیا تھا یہی وجہ ہے کہ خدا نے جواب میں کہیں بھی اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ایسی مزید حقیقتیں انسان اور اس کے مقام کے بارے میں موجود ہیں جن سے فرشتے آگاہ نہیں تھے۔

فرشتے سمجھتے تھے اگر مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو ہم اس کے مصداق کامل ہیں، ہمیشہ عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں لہٰذا سب سے زیادہ ہم خلافت کے لائق ہیں لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے وجود میں شہوت وغضب اور قسم قسم کی خواہشات موجود نہیں جب کہ انسان کو میلانات وشہوات نے گھیر رکھا ہے اور شیطان ہر طرف سے اسے وسوسہ میں ڈالتا رہتا ہے لہٰذا ان کی عبادت انسان کی عبادت سے بہت زیادہ فرق رکھتی ہے کہاں اطاعت اور فرمانبرداری ایک طوفان زدہ کی اور کہاں عبادت ان ساحل نشینوں کی جو مطمئن، خالی ہاتھ اور سبک بار ہیں۔

انہیں کب معلوم تھا کہ اس آدم کی نسل سے محمدؐ، ابراہیم، نوح، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام جیسے معصوم اور ایسے صالح بندے اور جانباز شہید مرد اور عورتیں عرصہ وجود میں قدم رکھیں گے جو پروانہ وار اپنے آپ کو راہ خدا میں پیش کریں گے ایسے افراد جن کے غور وفکر کی ایک گھڑی فرشتوں کی سالہا سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فرشتوں نے اپنی صفات کے بارے میں تین چیزوں کا سہارا لیا تسبیح، حمد اور تقدیس، درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر ہدف اور غرض، اطاعت اور بندگی ہے تو ہم فرمانبردار ہیں اور اگر عبادت ہے تو ہم ہر وقت اس میں مشغول رہتے ہیں اور اگر اپنے آپ کو پاک رکھنا یا صفحہ ارضی کو پاک رکھنا ہے تو ہم ایسا کریں گے جب کہ یہ مادی انسان خود بھی فاسد ہے اور روئے زمین کو بھی فاسد کردے گا۔

حقائق کو تفصیل سے ان کے سامنے واضح کرنے کے لئے خداوند عالم نے ان کی آزمائش کے لئے اقدام کیا تا کہ وہ خود اعتراف کریں کہ:

''ان کے اور اولاد آدم کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے''

فرشتے امتحان کے سانچے میں

پروردگار کے لطف وکرم سے آدم حقائق عالم کے ادراک کی کافی استعداد رکھتے تھے خدا نے ان کی اس استعداد کو فعلیت

کے درجے تک پہنچایا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق آدم کو تمام اسماء (عالم وجود کے حقائق و اسرار) کی تعلیم دی گئی۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے اس آیت (**وعلم آدم الاسماء کلھا**) کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

الارضین والجبال والشعاب والاودیه ثمه نظر الی بساط تحته فقال وهزا ابساط مما علمه۔

اسماء سے مراد زمینیں، پہاڑ، دریا، اور وادیاں (غرض یہ کہ تمام موجودات) تھے، اس کے بعد امام علیہ السلام نے اس فرش کی طرف نگاہ کی جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور فرمایا یہاں تک کہ یہ فرش بھی ان امور میں سے ہے کہ خدا نے جن کی آدم کو تعلیم دی۔

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ علم لغت کے مشابہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق فلسفہ، اور اسرار اور کیفیات و خواص کے ساتھ تھا، خداوند عالم نے آدم کو اس علم کی تعلیم دی تا کہ وہ اپنی سیر تکامل میں اس جہان کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں اسی طرح مختلف چیزوں کے نام رکھنے کی استعداد بھی انہیں دی تا کہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکیں اور ضرورت کے وقت ان کا نام لے کر انہیں بلا سکیں یا منگوا سکیں اور یہ ضروری نہ ہو کہ اس کے لئے ویسی چیز دکھانی پڑے، یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے اس موضوع کی اہمیت ہم اس وقت سمجھتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ انسان کے پاس اس وقت جو کچھ ہے کتاب اور لکھنے کی وجہ سے ہے اور گزرے ہوئے لوگوں کے سب علمی ذخائر ان کی تحریروں میں جمع ہیں اور یہ سب کچھ چیزوں کے نام رکھنے اور ان کے خواص کی وجہ سے ہے ورنہ کبھی بھی ممکن نہ تھا کہ ہم گذشتہ لوگوں کے علوم آنے والوں تک منتقل کر سکتے۔

پھر خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: ''اگر سچ کہتے ہو تو ان اشیاء اور موجودات کے نام بتاؤ جنہیں دیکھ رہے ہو اور ان کے اسرار و کیفیات کو بیان کرو، لیکن فرشتے جو اتنا علم نہ رکھتے تھے اس امتحان میں پیچھے رہ گئے لہٰذا جواب میں کہنے لگے خداوندا: ''تو منزہ ہے، تو نے ہمیں جو تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے ہمیں نہیں معلوم تو خود ہی علیم و حکیم ہے۔[2]

اگر ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا ہے تو یہ ہماری ناآگاہی کی بناء پر تھا اور آدم کی اس عجیب استعداد اور قدرت سے بے خبر تھے جو ہمارے مقابلے میں اس کا بہت بڑا امتیاز ہے، بے شک وہ تیری خلافت و جانشینی کی اہلیت رکھتا ہے جہان ہستی کی سرزمین اس کے وجود کے بغیر ناقص تھی۔

اب آدم علیہ السلام کی باری آئی کہ وہ ملائکہ کے سامنے موجودات کا نام لیں اور ان کے اسرار بیان کریں خداوند عالم نے فرمایا: ''اے آدم: فرشتوں کو ان موجودات کے ناموں اور کاموں سے آگاہ کرو، جب آدم نے انہیں ان اسماء سے آگاہ کیا تو خداوند عالم نے فرمایا: کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب سے واقف ہوں اور تم جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو سب سے باخبر ہوں''[3]

---

[1] سورہ بقرہ آیت 31

مفسرین نے اگرچہ ''علم اسماء کی تفسیر میں قسم قسم کے بیانات دیئے ہیں لیکن مسلم ہے کہ آدم کو کلمات و اسماء کی تعلیم بغیر معنی کے نہیں دی تھی کیونکہ یہ کوئی قابل فخر بات نہیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان اسماء کے معانی و مفاہیم اور جن چیزوں کے وہ نام تھے ان سب کی تعلیم ہے البتہ جہان خلقت اور عالم ہستی کے مختلف موجودات کے اسماء خواص سے مربوط علوم سے باخبر و آگاہ کیا جانا حضرت آدم کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا''۔

[2] سورہ بقرہ آیت 31

[3] سورہ بقرہ آیت 33

اس مقام پر ملائکہ نے اس انسان کی وسیع معلومات اور فراواں حکمت و دانائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور ان پر واضح ہو گیا کہ صرف یہی زمین پر خلافت کی اہلیت رکھتا ہے۔

آدم علیہ السلام جنت میں

گذشتہ بحثیں جو انسان کے مقام و عظمت کے بارے میں تھیں ان کے ساتھ قرآن نے ایک اور فصل بیان کی ہے، پہلے کہتا ہے: ''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کے لئے سجدہ و خضوع کرو، ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، جس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور اسی تکبر و نافرمانی کی وجہ سے کافروں میں داخل ہو گیا''۔[۱]

بہر حال مربوط آیت انسانی شرافت اور اس کی عظمت و مقام کی زندہ اور واضح دلیل ہے کہ اس کی تکمیل خلقت کے بعد تمام ملائکہ کو حکم ملتا ہے کہ اس عظیم مخلوق کے سامنے سر تسلیم خم کر دو، واقعاً وہ شخص جو مقام خلافت الٰہی اور زمین پر خدا کی نمائندگی کا منصب حاصل کرے، تمام تر تکامل و کمال پر فائز ہو اور بلند مرتبہ فرزندوں کی پرورش کا ذمہ دار ہو جن میں انبیاء اور خصوصاً پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جانشین شامل ہوں، ایسا انسان ہر قسم کے احترام کے لائق ہے۔

ابلیس نے مخالفت کیوں کی

ہم جانتے ہیں کہ لفظ ''شیطان'' اسم جنس ہے جس میں پہلا شیطان اور دیگر تمام شیطان شامل ہیں لیکن ابلیس مخصوص نام ہے، اور یہ اسی شیطان کی طرف اشارہ ہے جس نے حضرت آدم کو ورغلایا تھا وہ صریح آیات قرآن کے مطابق ملائکہ کی نوع سے نہیں تھا صرف ان کی صفوں میں رہتا تھا وہ گروہ جن میں سے تھا جو ایک مادی مخلوق ہے۔[۲]

اس مخالفت کا سبب کبر و غرور اور خاص تعصب تھا جو اس کی فکر پر مسلط تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں لہٰذا آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا جانا چاہئے بلکہ آدم کو سجدہ کرنا چاہئے اور اسے مسجود ہونا چاہئے۔

خدا نے ''ابلیس'' کی سرکشی اور طغیانی کی وجہ اس کا مواخذہ کیا اور کہا: اس بات کا کیا سبب ہے کہ تو نے آدم کو سجدہ نہیں کیا اور میرے فرمان کو نظر انداز کر دیا ہے؟[۳]

اس نے جواب میں ایک نادرست بہانے کا سہارا لیا اور کہا: ''میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو آب و گل سے۔[۴]

گو یا اسے خیال تھا کہ آگ، خاک سے بہتر و افضل ہے، یہ ابلیس کی ایک بڑی غلط فہمی تھی، شاید اسے غلط فہمی بھی نہ تھی بلکہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا تھا۔

لیکن شیطان کی داستان اسی جگہ ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس نے جب یہ دیکھا کہ وہ درگاہ خداوندی سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی سرکشی اور ہٹ دھرمی میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بجائے شرمندگی اور توبہ کے اور بجائے اس کے کہ وہ خدا کی طرف پلٹے اور

---

[۱] سورہ بقرہ آیت 34

[۲] سورہ کہف آیت 50 میں ہے: ''سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو جنوں میں سے تھا''

[۳] سورہ اعراف آیت 12

[۴] سورہ اعراف آیت 12

اپنی غلطی کا اعتراف کرے،اس نے خدا سے صرف اس بات کی درخواست کی کہ:''خدایا مجھے رہتی دنیا تک کے لئے مہلت عطا فرمادے اور زندگی عطا کر۔[1]

اس کی یہ درخواست قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''تجھے مہلت دی جاتی ہے''[2]

اگر چہ قرآن میں اس بات کی صراحت نہیں کی گئی کہ ابلیس کی درخواست کس حد تک منظور ہوئی۔ارشاد ہوا:''تجھ کو اس روز معین تک کے لئے مہلت دی گئی''[3]

یعنی اس کی پوری درخواست منظور نہیں ہوئی بلکہ جس مقدار میں خدا نے چاہا اتنی مہلت عطا کی۔

لیکن اس نے جو یہ مہلت حاصل کی وہ اس لئے نہیں تھی کہ اپنی غلطی کا تدارک کرے بلکہ اس نے اس طولانی عمر کے حاصل کرنے کا مقصد اس طرح بیان کیا:

''اب جبکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے،تو میں بھی تیرے سیدھے راستے پر تاک لگا کر بیٹھوں گا(مورچہ بناؤں گا)اور ان(اولاد آدم)کو راستے سے ہٹادوں گا،تاکہ جس طرح میں گمراہ ہوا ہوں اسی طرح وہ بھی گمراہ ہوجائیں''[4]

اس کے بعد شیطان نے اپنی بات کی مزید تائید وتاکید کے لئے یوں کہا:''میں نہ صرف یہ کہ ان کے راستہ پر اپنا مورچہ قائم کروں گا بلکہ ان کے سامنے سے، پیچھے سے،داھنی جانب سے،بائیں جانب سے گویا

چاروں طرف سے ان کے پاس آؤں گا جس کے نتیجہ میں تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہ پائے گا''[5]

شروع میں اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا،اسی لئے اس کے خروج کا حکم صادر ہوا،اس کے بعد اس نے ایک اور بڑا گناہ یہ کیا کہ خدا کے سامنے بنی آدم کو بہکانے کا عہد کیا اور ایسی بات کہی گویا وہ خدا کو دھمکی دے رہا تھا،ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسا گناہ ہوسکتا ہے۔لہٰذا خدا نے اس سے فرمایا:اس مقام سے بدترین ننگ وعار کے ساتھ نکل جا اور ذلت وخواری کے ساتھ نیچے اتر جا۔

---

[1] سورہ اعراف آیت14

[2] سورہ اعراف آیت15

[3] سورہ حجر آیت38

[4] سورہ اعراف آیت16

[5] سوہ اعراف آیت16

مذکورہ بالا تعبیر سے مراد یہ ہوسکتی کہ شیطان ہر طرف سے انسان کا محاصرہ کرے گا اور اسے گمراہ کرنے کے لئے ہر وسیلہ اختیار کرے گا اور یہ تعبیر ہماری روزمرہ کی گفتگو میں بھی ملتی ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ''فلاں شخص چاروں طرف سے قرض میں یا مرض میں گھر گیا ہے۔''

اوپر اور نیچے کا ذکر نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زیادہ تر اور عموماً فعالیت ان چار طرف ہوتی ہے۔

لیکن ایک روایت جو امام محمد باقر علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے،اس میں ان''چاروں جہت''کی ایک گہری تفسیر ملتی ہے اس میں ایک جگہ پر حضرت علیہ السلام فرماتے ہیں:''شیطان جو آگے سے آتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت کو جو انسان کے آگے ہے اس کی نظر میں سبک کر دیتا ہے،اور پیچھے سے آنے کے معنی یہ ہیں کہ؛شیطان انسان کو مال جمع کرنے اور اولاد کی خاطر بخل کرنے کے لئے ورغلاتا ہے،اور''داہنی طرف''سے آنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ انسان کے دل میں شک وشبہ ڈال کر اس کے امور معنوی کو ضائع کر دیتا ہے اور بائیں طرف سے آنے سے مراد یہ ہے ک شیطان انسان کی نگاہ میں لذات مادی وشہوات دنیوی کو حسین بنا کر پیش کرتا ہے۔

اور فرمایا: ''میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کرے گا میں جہنم کو تجھ سے اور اس سے بھر دوں گا'' [۱]

بہشت میں قیام

بہرحال اس واقعہ اور فرشتوں کے امتحان کے بعد آدم اور حوا کو حکم دیا گیا کہ وہ بہشت میں سکونت اختیار کریں چنانچہ قرآن کہتا ہے: ''ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس کی فراواں نعمتوں میں سے جو چاہو کھاؤ لیکن اس مخصوص درخت کے نزدیک نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔'' [۲]

آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم زندگی گزارنے کے لئے اسی عام زمین پر پیدا ہوئے تھے لیکن ابتداء میں خداوند عالم نے انہیں بہشت میں سکونت دی جو اسی جہان کا ایک سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے مالا مال باغ تھا وہ ایسی جگہ تھی جہاں آدم نے کسی قسم کی تکلیف نہیں دیکھی شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آدم زمین پر زندگی گزارنے سے آشنائی نہ رکھتے تھے اور بغیر کسی تمہید کے زحمات و تکلیف اٹھانا ان کے لئے مشکل تھا اور زمین میں زندگی گزارنے کے لئے یہاں کے کردار و رفتار کی کیفیت سے آگاہیت ضروری تھی لہٰذا مختصر مدت کے لئے بہشت کے اندر ضروری تعلیمات حاصل کرلیں کیونکہ زمین کی زندگی پروگراموں، تکلیفوں اور ذمہ داریوں سے معمور ہے جس کا انجام صحیح سعادت، تکامل اور بقائے نعمت کا سبب ہے اور ان سے روگردانی کرنا رنج و مصیبت کا باعث ہے۔

اور یہ بھی جان لیں کہ اگر چہ انہیں چاہئے کہ زمین کی کچھ چیزوں سے چشم پوشی کریں نیز یہ جان لینا بھی ضروری تھا کہ اگر خطا و لغزش دامن گیر ہو تو ایسا نہیں کہ سعادت و خوش بختی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے بلکہ انہیں پلٹ کر دوبارہ عہد و پیمان کرنا چاہئے کہ وہ حکم خدا کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دیں گے تاکہ دوبارہ نعمات الٰہی سے مستفید ہو سکیں، یہ بھی تھا کہ وہ اس ماحول میں رہ کر کچھ پختہ ہو جائیں اور اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیں اور زمین میں زندگی گزارنے کی کیفیت سے آشنا ہو جائیں یقیناً یہ سلسلۂ تعلیمات ضروری تھا تاکہ وہ اسے یاد رکھیں اور اس تیاری کے ساتھ روئے زمین پر قدم رکھیں۔

یہ ایسے مطالب تھے کہ حضرت آدم اور ان کی اولاد آئندہ زندگی میں ان کی محتاج تھی لہٰذا اس کے باوجود کہ آدم کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا تھا ایک مدت تک بہشت میں قیام کرتے ہیں اور انہیں کئی ایک حکم دیئے جاتے ہیں جو شاید سب تمرین و تعلیم کے پہلو سے تھا۔

شیطان کا وسوسہ

اس مقام پر آدم نے اس فرمان الٰہی کو دیکھا جس میں آپ کو ایک درخت کے بارے میں منع کیا گیا تھا ادھر شیطان نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آدم اور اولاد آدم کو گمراہ کرنے سے باز نہ آئے گا وہ وسوسے پیدا کرنے میں مشغول ہو گیا جیسا کہ باقی آیات قرآنی

---

[۱] سورہ اعراف آیت 18

سجدہ خدا کے لئے تھا یا آدم کے لئے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''سجدہ'' جس کا معنی عبادت و پرستش ہے صرف خدا کے لئے ہے کیونکہ عالم میں خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور توحید عبادت کے معین یہی ہیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، لہٰذا اس میں شک و شبہ نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے لئے سجدہ عبادت نہیں کیا بلکہ یہ سجدہ خدا کے لئے تھا، لیکن اس عجیب و غریب مخلوق کی وجہ سے یا یہ کہ سجدہ آدم کے لئے تھا لیکن وہ خضوع و تعظیم کا سجدہ تھا نہ کہ عبادت و پرستش کا۔

کتاب عیون الاخبار میں امام علی بن موسی رضا علیہ السلام سے اسی طرح کی روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا: ''فرشتوں کا سجدہ ایک طرف سے خدا کی عبادت تھی اور دوسری طرف آدم کا اکرام و احترام کیونکہ ہم صلب آدم میں موجود تھے''۔

[۲] سورہ بقرہ آیت 35

سے ظاہر ہوتا ہے اس نے آدم کو اطمینان دلایا کہ اگر اس درخت سے کچھ لیں تو وہ اور ان کی بیوی فرشتے بن جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے یہاں تک کہ اس نے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔[1]

اس طرح اس نے فرمان خدا کو ان کی نظر میں ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا اور انہیں یہ تصور دلانے کی کوشش کی کہ اس ''شجرہ ممنوعہ'' سے کھالینا نہ صرف یہ کہ ضرر رساں نہیں بلکہ عمر جاوداں یا ملائکہ کا مقام و مرتبہ پالینے کا موجب ہے۔اس بات کی تائید اس جملے سے بھی ہوتی ہے شیطان کی زبانی وارد ہوا ہے: اے آدم: ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں زندگانی جاودانی اور ایسی سلطنت کی رہنمائی کروں جو کہنہ نہ ہوگی؟''[2]

ایک روایت جو ''تفسیر قمی'' میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور ''عیون اخبار الرضا'' میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے؛ میں وارد ہوا ہے:

''شیطان نے آدم سے کہا کہ اگر تم نے اس شجرہ ممنوعہ سے کھالیا تو تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے، اور پھر ہمیشہ کے لئے بہشت میں رہو گے، ورنہ تمہیں بہشت سے باہر نکال دیا جائے گا''

آدم نے جب یہ سنا تو فکر میں ڈوب گئے لیکن شیطان نے اپنا حربہ مزید کارگر کرنے کے لئے سخت قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔[3]

حضرت آدم علیہ السلام کو آب حیات کی تمنا

آدم، جنہیں زندگی کا ابھی کافی تجربہ نہ تھا، نہ ہی وہ ابھی تک شیطان کے دھوکے، جھوٹ اور نیرنگ میں گرفتار ہوئے تھے، انہیں یہ یقین نہیں ہوسکتا تھا کہ کوئی اتنی بڑی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے اور اس طرح کے جال، دوسرے کو گرفتار کرنے کے لئے پھیلا سکتا ہے، آخر کار وہ شیطان کے فریب میں آگئے اور آب حیات وسلطنت جاودانی حاصل کرنے کے شوق میں مکر ابلیسی کی بوسیدہ رسی کو پکڑ کے اس کے وسوسہ کے کنویں میں اتر گئے رسی ٹوٹ گئی اور انہیں نہ صرف آب حیات ہاتھ نہ آیا بلکہ خدا کی نافرمانی کے گرداب میں گرفتار ہو گئے ان تمام مطالب کو قرآن کریم نے اپنے ایک جملے میں خلاصہ کر دیا ہے ارشاد ہوتا ہے: ''اس طرح سے شیطان نے انہیں دھوکا دیا اور اس نے اپنی رسی سے انہیں کنویں میں اتار دیا''۔[4]

آدم کو چاہئے تھا کہ شیطان کے سابقہ دشمنی اور خدا کی وسیع حکمت ورحمت کے علم کی بنا پر اس کے جال کو پارہ پارہ کر دیتے اور اس کے کہنے میں نہ آتے لیکن جو کچھ نہ ہونا چاہئے تھا وہ ہوگیا۔

''بس جیسے ہی آدم و حوا نے اس ممنوعہ درخت سے چکھا، فوراً ہی ان کے کپڑے ان کے بدن سے نیچے گر گئے اور ان کے اندام ظاہر ہو گئے''۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ درخت ممنوع سے چکھنے کے ساتھ ہی فوراً اس کا برا اثر ظاہر ہو گیا اور وہ اپنے بہشتی لباس سے جو فی الحقیقت خدا کی کرامت واحترام کا لباس تھا، محروم ہو کر برہنہ ہو گئے۔

اس جملہ سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آدم و حوا یہ مخالفت کرنے سے پہلے برہنہ نہ تھے بلکہ کپڑے پہنے ہوئے تھے، اگر

---

[1] سورۂ اعراف آیت 20

[2] سورۂ طٰہٰ آیت 120

[3] سورہ اعراف آیت 21

[4] سورہ اعراف آیت 22

چہ قرآن میں ان کپڑوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی لیکن جو کچھ بھی تھا وہ آدم وحوا کے وقار کے مطابق اور ان کے احترام کے لئے تھا، جوان کی نافرمانی کے باعث ان سے واپس لے لیا گیا۔

لیکن خود ساختہ توریت میں اس طرح سے ہے:

آدم وحوا اس موقع پر بالکل برہنہ تھے لیکن اس برہنگی کی زشتی کو نہیں سمجھتے تھے، لیکن جس وقت انہوں نے اس درخت سے کھایا جو درحقیقت ''علم ودانش'' کا درخت تھا تو ان کی عقل کی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ اپنے کو برہنہ محسوس کرنے لگے اور اس حالت کی زشتی سے آگاہ ہو گئے۔

جس ''آدم'' کا حال اس خود ساختہ توریت میں بیان کیا گیا ہے، وہ فی الحقیقت آدم واقعی نہ تھا بلکہ وہ تو کوئی ایسا نادان شخص تھا جو علم ودانش سے اس قدر دور تھا کہ اسے اپنے ننگا ہونے کا بھی احساس نہ تھا لیکن جس ''آدم'' کا تعارف قرآن کراتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اپنی حالت سے باخبر تھا بلکہ اسرار آفرینش (علم اسما) سے بھی آگاہ تھا اور اس کا شمار معلم ملکوت میں ہوتا تھا، اگر شیطان اس پر اثر انداز بھی ہوا تو یہ اس کی نادانی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس نے ان کی پاکی اور صفائے نیت سے سوئے استفادہ کیا۔

اس بات کی تائید کلام الٰہی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

''اے اولاد آدم: کہیں شیطان تمہیں اس طرح فریب نہ دے جس طرح تمہارے والدین (آدم وحوا) کو دھوکا دے کر بہشت سے باہر نکال دیا اور ان کا لباس ان سے جدا کر دیا''۔[1]

اگر چہ بعض مفسرین اسلام نے یہ لکھا ہے کہ آغاز میں حضرت آدم علیہ السلام برہنہ تھے تو واقعاً یہ ایک واضح اشتباہ ہے جو توریت کی تحریر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

بہرحال اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ''جس وقت آدم وحوا نے یہ دیکھا تو فوراً بہشت کے درختوں کے پتوں سے اپنی شرم گاہ چھپانے لگے''۔

اس موقع پر خدا کی طرف سے یہ ندا آئی: ''کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، تم نے کس لئے میرے حکم کو بھلا دیا اور اس پست گرداب میں گھر گئے؟''[2]

شجرہ ممنوعہ کونسا درخت تھا؟

قرآن کریم میں بلا تفصیل اور بغیر نام کے چھ مقام پر ''شجرہ ممنوعہ'' کا ذکر ہوا ہے لیکن کتب اسلامی میں اس کی تفسیر دو قسم کی ملتی ہے ایک تو اس کی تفسیر مادی ہے جو حسب روایات ''گندم'' ہے۔

اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہئے کہ عرب لفظ ''شجرہ'' کا اطلاق صرف درخت پر نہیں کرتے بلکہ مختلف نباتات کو بھی ''شجرہ'' کہتے ہیں چاہے وہ جھاڑی کی شکل میں ہوں یا بیل کی صورت میں۔

دوسری تفسیر معنوی ہے جس کی تعبیر روایات اہل بیت علیہم السلام میں ''شجرہ حسد'' سے کی گئی ہے ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ آدم نے جب اپنا بلند ودرجہ دیکھا تو یہ تصور کیا کہ ان کا مقام بہت بلند ہے ان سے بلند کوئی مخلوق اللہ نے نہیں پیدا کی اس پر اللہ نے انہیں بتلایا کہ ان کی اولاد میں کچھ ایسے اولیاء الٰہی (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام) بھی ہیں جن کا درجہ ان سے بھی بلند وبالا

---

[1] سورہ اعراف آیت 27

[2] سورہ اعراف آیت 22

ہے اس وقت آدم میں ایک حالت حسد سے مشابہ پیدا ہوئی اور یہی وہ ''شجرہ ممنوعہ'' تھا جس کے نزدیک جانے سے آدم کو روکا گیا تھا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ آدم نے (ان روایات کی بناپر) دو درختوں سے تناول کیا ایک درخت تو وہ تھا جوان کے مقام سے نیچے تھا، اور انہیں مادی دنیا میں لے جاتا تھا اور وہ ''گندم'' کا پودا تھا دوسرا درخت معنوی تھا، جو مخصوص اولیائے الٰہی کا درجہ تھا اور یہ آدم کے مقام ومرتبہ سے بالاتر تھا آدم نے دونوں پہلوؤں سے اپنی حد سے تجاوز کیا اس لئے انجام میں گرفتار ہوئے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ یہ ''حسد'' حسد حرام کی قسم سے نہ تھا یہ صرف ایک نفسانی احساس تھا جبکہ انہوں نے اس طرف قطعاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیات قرآنی چونکہ متعدد معانی رکھتی ہیں لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ ''شجرہ'' سے دونوں معنی مراد لے لئے جائیں۔

اتفاقاً کلمہ ''شجرہ'' قرآن میں دونوں معنی میں آیا ہے، کبھی تو انہی عام درختوں [1] کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور کبھی شجرہ معنوی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [2]

لیکن یہاں پر ایک نکتہ ہے جس کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ خود ساختہ توریت میں، جو اس وقت کے تمام یہود ونصاری کی قبول شدہ ہے اس شجرہ ممنوعہ کی تفسیر ''شجرہ علم ودانش اور شجرہ حیات وزندگی'' کی گئی ہے توریت کہتی ہے:

''قبل اس کے آدم شجرہ علم ودانش سے تناول کریں، وہ علم ودانش سے بے بہرہ تھے حتیٰ کہ انہیں اپنی برہنگی کا بھی احساس نہ تھا جب انہوں نے اس درخت سے کھایا اس وقت وہ واقعی آدم بنے اور بہشت سے نکال دیئے گئے کہ مبادا درخت حیات وزندگی سے بھی کھالیں اور خداؤں کی طرح حیات جاویدانی حاصل کرلیں۔'' [3]

یہ عبارت اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ موجودہ توریت آسمانی کتاب نہیں ہے بلکہ کسی ایسے کم اطلاع انسان کی خود ساختہ ہے جو علم ودانش کو آدم کے لئے معیوب سمجھتا ہے، اور آدم کو علم ودانش حاصل کرنے کے جرم میں خدا کی بہشت سے نکالے جانے کا مستحق سمجھتا تھا، گویا بہشت فہمیدہ انسان کے لئے نہیں ہے۔ [4]

جنت سے اخراج

قرآن داستان حضرت آدم علیہ السلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے، بالآخر شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور جس بہشت

---

[1] جیسے (وَشَجَرَةً تَخرُجُ من طُورِ سَینَاءَ تَنبُتُ بالدُّهن) جس سے مراد زیتون کا درخت ہے۔

[2] جیسے: (وَالشَّجَرَةَ المَلعُونَةَ فی القُرآن) جس سے مراد مشرکین یا یہودی یا دوسری باغی قومیں (جیسے بنی امیہ) ہیں

[3] سفر تکوین فصل دوم نمبر 17

[4] قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ولیم میلر (جسے عہدین خصوصاً انجیل کا ایک مقتدر مفسر مانا گیا ہے) اپنی کتاب ''مسیحیت چیست'' (مسیحیت کیا ہے) میں رقمطراز ہے:

''شیطان ایک سانپ کی شکل میں باغ کے اندر داخل ہوا اور اس نے حوا کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اس درخت کے میوہ میں سے کھالیں چنانچہ حوّا نے خود بھی کھایا اور آدم کو کھانے کو دیا اور انہوں نے بھی کھایا، ہمارے اولین والدین کا یہ عمل ایک معمولی اشتباہ پر مبنی نہ تھا یا ایک بے سوچی سمجھی خطا بھی نہ تھی بلکہ اپنے خالق کے برخلاف ایک جانا بوجھا عصیان تھا دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ خود ''خدا'' بن جائیں وہ اس بات کے لئے آمادہ نہ تھے کہ خدا کے ارادہ کے مطیع بنیں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں نتیجہ کیا ہوا؟ خدا نے ان کی شدت سے سرزنش کی اور باغ (فردوس) سے باہر نکال دیا تاکہ درد ورنج سے بھری دنیا میں زندگی بسر کریں۔

توریت وانجیل کے اس مفسر نے درحقیقت یہ چاہا ہے کہ ''شجرہ ممنوعہ'' کی توجیہ کرے، لیکن اس کی بجائے عظیم ترین گناہ یعنی خدا سے جنگ کی نسبت آدم کی طرف دے دی کیا اچھا ہوتا کہ بجائے اس طرح کی کھوکھلی تفسیروں کے کم از کم اپنی ''کتب مقدسہ'' میں تحریف کے قائل ہوجاتے۔

میں وہ رہتے تھے اس سے باہر نکال دیا۔[1]

اس بہشت سے جو اطمینان و آسائش کا مرکز تھی، اور رنج و غم سے دور تھی شیطان کے دھوکے میں آ کر نکالے گئے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ زمین پر اُترو، جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے (آدم و حوا ایک طرف اور شیطان دوسری طرف)''

مزید فرمایا گیا: ''تمہارے لئے ایک مدت معین تک زمین میں قرار گاہ ہے، جہاں سے تم نفع اندوز ہو سکتے ہو''[2]

یہ وہ مقام تھا کہ آدم متوجہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور بہشت کے آرام دہ اور نعمتوں سے مالا مال ماحول سے شیطانی وسوسے کے سامنے سر جھکانے کے نتیجے میں باہر نکالے جا رہے ہیں اور اب زحمت و مشقت کے ماحول میں جا کر رہیں گے صحیح ہے، کہ آدم نبی تھے اور گناہ سے معصوم تھے لیکن جیسا کہ ہم آئندہ چل کر بیان کریں گے کہ کسی پیغمبر سے جب ترک اولیٰ سرزد ہو جاتا ہے تو خداوند عالم اس سے اس طرح سخت گیری کرتا ہے جیسے کسی عام انسان سے گناہ سرزد ہونے پر سختی کرتا ہے۔

آدم علیہ السلام کونسی جنت میں تھے

اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ اگر چہ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جو نیک اور پاک لوگوں کی وعدہ گاہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ وہ بہشت نہ تھی بلکہ زمین کے سرسبز علاقوں میں نعمات سے مالا مال ایک روح پرور مقام تھا کیونکہ:

اوّل تو وہ بہشت جس کا وعدہ قیامت کے ساتھ ہے وہ ہمیشگی اور جاودانی نعمت ہے جس کی نشاندہی بہت سی آیات میں کی گئی ہے اور اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔

دوّم یہ کہ غلیظ اور بے ایمان ابلیس کے لئے اس بہشت میں جانے کی کوئی راہ نہ تھی وہاں نہ وسوسہ شیطانی ہے اور نہ خدا کی نافرمانی سوم یہ کہ اہل بیت سے منقول روایات میں یہ موضوع صراحت سے نقل ہوا ہے۔

ایک راوی کہتا ہے: میں نے امام صادق علیہ السلام سے آدم کی بہشت کے متعلق سوال کیا امام نے جواب میں فرمایا:

''دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا جس پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی پڑتی تھی اگر آخرت کی جنتوں میں سے ہوتی تو کبھی بھی اس سے باہر نہ نکالے جاتے''۔

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدم کے ہبوط و نزول سے مراد نزول مقام ہے، نہ کہ نزول مکان یعنی اپنے اس بلند مقام اور سرسبز جنت سے نیچے آئے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جنت کسی آسمانی کرہ میں تھی اگر چہ وہ ابدی جنت نہ تھی، بعض اسلامی روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ یہ جنت آسمان میں تھی لیکن ممکن ہے لفظ "سماء"، (آسمان) ان روایات میں مقام بلند کی طرف اشارہ ہو۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 20،21

[2] سورہ بقرہ آیت 36

تاہم بے شمار شواہد نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جنت آخرت والی جنت نہ تھی کیونکہ وہ تو انسان کی سیر تکامل کی آخری منزل ہے اور یہ اس کے سفر کی ابتداء تھی اور اس کے اعمال اور پروگرام کی ابتداء تھی اور وہ جنت اس کے اعمال و پروگرام کا نتیجہ ہے۔ [1]

آدم علیہ السلام کی بازگشت خدا کی طرف

وسوسۂ ابلیس اور آدم کے جنت سے نکلنے کے حکم جیسے واقعات کے بعد آدم متوجہ ہوئے کہ واقعاً انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اس اطمینان بخش اور نعمتوں سے مالا مال جنت سے شیطانی فریب کی وجہ سے نکلنا پڑا اور اب زحمت مشقت سے بھری ہوئی زمین میں رہیں گے اس وقت آدم اپنی غلطی کی تلافی کی فکر میں پڑے اور مکمل جان ودل سے پروردگار کی طرف متوجہ ہوئے ایسی توجہ جو ندامت وحسرت کا ایک پہاڑ ساتھ لئے ہوئے تھی اس وقت خدا کا لطف وکرم بھی ان کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور جیسا کہ قرآن میں خداوند عالم کہتا ہے:

''آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے جو بہت مؤثر اور انقلاب خیز تھے، ان کے ساتھ توبہ کی خدا نے بھی ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ وہ تواب ورحیم ہے''۔ [2]

یہ صحیح ہے کہ حضرت آدم نے حقیقت میں کوئی فعل حرام انجام نہیں دیا تھا لیکن یہی ترک اولیٰ ان کے لئے نافرمانی شمار ہوتا ہے، حضرت آدم فوراً اپنی کیفیت وحالت کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹے۔

انہیں چاہئے کہ ان اعمال سے گریز کریں اور اہم کام بجالائیں ورنہ کہا جائے گا کہ انہوں نے ترک اولیٰ کیا ہے، ہم جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کچھ حصہ حضور قلب سے ہوتا ہے کچھ بغیر اس کے، یہ امر ہمارے مقام کے لئے تو مناسب ہے لیکن حضرت رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے شایان شان نہیں ان کی ساری نماز خدا کے حضور میں ہونی چاہئے اور اگر ایسا نہ ہو تو کسی فعل حرام کا ارتکاب تو نہیں تاہم ترک اولیٰ ہے۔

بہرحال جو کچھ نہیں ہونا چاہئے تھا یا ہونا چاہئے تھا وہ ہوا اور باوجود یکہ آدم کی توبہ قبول ہوگئی لیکن اس کا اثر وضعی یعنی زمین کی طرف اترنا یہ متغیر نہ ہوا۔

خدا نے جو کلمات آدم علیہ السلام پر القا کئے وہ کیا تھے؟

توبہ کے لئے جو کلمات خدا نے آدم علیہ السلام کو تعلیم فرمائے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

---

[1] آدم کا گناہ کیا تھا: واضح ہے کہ آدم اس مقام کے علاوہ جو خدا نے قرآن مجید میں ان کے لئے بیان کیا ہے معرفت وتقویٰ کے لحاظ سے بھی بلند مقام پر فائز تھے وہ زمین میں خدا کے نمائندے تھے وہ فرشتوں کے معلم تھے وہ عظیم ملائکہ الٰہی کے مسجود تھے اور یہ مسلم ہے کہ آدم امتیازات وخصوصیات کے ہوتے ہوئے گناہ نہیں کر سکتے تھے علاوہ ازیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ پیغمبر تھے اور ہر پیغمبر معصوم ہوتا ہے لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم سے جو کچھ سرزد ہوا وہ کیا تھا؟ اس سوال کے جواب میں تین تفاسیر موجود ہیں:

1۔ آدم سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترک اولیٰ تھا دوسرے لفظوں میں ان کی حیثیت اورنسبت سے وہ گناہ تھا لیکن گناہ مطلق نہ تھا، گناہ مطلق وہ گناہ ہوتا ہے جو کسی سے سرزد ہو اور اس کے لئے سزا معین ہو (مثلاً شرک، کفر، ظلم اور تجاوز وغیرہ) اورنسبت کے اعتبار سے گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات بعض مباح اعمال بلکہ مستحب بھی بڑے لوگوں کے مقام کے لحاظ سے مناسب نہیں

خدا کی نہی یہاں ''نہی ارشادی'' ہے جیسے ڈاکٹر کہتا ہے فلاں غذا نہ کھاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے خدا نے بھی آدم سے فرمایا کہ اگر درخت ممنوعہ سے کچھ کھا لیا تو بہشت سے باہر جانا پڑے گا اور رنج وتکلیف میں مبتلا ہونا پڑے گا، لہٰذا آدم علیہ السلام نے حکم خدا کی مخالفت نہیں کی بلکہ ''نہی ارشادی'' کی مخالفت کی ہے''۔

3۔ جنت بنیادی طور پر جائے تکلیف نہ تھی بلکہ وہ آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے لئے ایک آزمائش اور تیاری کا زمانہ تھا، اور یہ نہیں صرف آزمائش کا پہلو رکھتی تھی۔

[2] سورہ بقرہ آیت 37

مشہور ہے کہ وہ جملے یہ تھے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''ان دونوں نے کہا خدا یا ہم نے اپنے او پر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم زیاں کاروں اور خسارے میں رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''[۱]

کئی ایک روایات جو طرق اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، ان میں ہے کہ کلمات سے مراد خدا کی بہترین مخلوق کے ناموں کی تعلیم تھی یعنی محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام اور آدم نے ان کلمات کے وسیلے سے درگاہ الٰہی سے بخشش چاہی اور خدا نے انہیں بخش دیا۔[۲]

آدم علیہ السلام کا ماجرا اور اس جہان پر ایک طائرانہ نظر

اگر چہ بعض ایسے مفسرین نے جو افکار غرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں، اس بات کی کوشش کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کی داستان کو اول سے لے کر آخر تک تشبیہ، مجاز اور کنایہ کا رنگ دیں اور آج کی اصطلاح میں یوں کہیں کہ یہ ایک سمبولک (SIMBOLIC) تھا لہٰذا انھوں نے اس پوری بحث کو ظاہری مفہوم کے خلاف لیتے ہوئے معنوی کنایہ مراد لیا ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان آیات کا ظاہر ایک ایسے واقعی اور حقیقی ''قصہ'' پر مشتمل ہے جو ہمارے اولین ماں باپ کے لئے پیش آیا تھا چونکہ اس پوری داستان میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جو ظاہری عبارت سے میل نہ کھاتا ہو یا عقل کے خلاف ہو، اس لئے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے ظاہری مفہوم پر یقین نہ کیا جائے یا جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان سے پہلو تہی کیا جائے۔

لیکن درایں حال اس حسی وعینی واقعہ میں انسان کی آئندہ زندگی کے متعلق بھی اشارے ہو سکتے ہیں۔[۳]

زمین پر سب سے پہلا قتل

قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا نام نہیں لیا گیا ہے، نہ اس جگہ اور نہ کسی اور مقام پر، لیکن اسلامی روایات کے مطابق ایک کا نام ہابیل ہے اور دوسرے کا قابیل تھا، موجودہ توریت کے سفر تکوین کے چوتھے باب میں ایک کا نام ''قائن'' اور دوسرے کا نام ''ہابیل'' تھا جیسا کہ مفسر معروف ''ابوالفتوح رازی'' کہتے ہیں کہ ان دونوں ناموں کی مختلف لغت ہیں پہلے کا نام ''ہابیل'' یا ''ہابن'' تھا۔ دوسرے کا نام ''قابیل'' یا ''قابین'' یا ''قابل'' یا ''قابن'' یا ''قبن'' تھا۔

بہرحال اسلامی روایات کے متن اور توریت میں قابیل کے نام کے بارے میں اختلاف لغت کی طرف بازگشت ہے اور یہ

---

[۱] سورہ اعراف آیت 23

[۲] یہ تین قسم کی تفاسیر ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت آدم کو ان سب کلمات کی تعلیم دی گئی ہو کہ ان کلمات کی حقیقت اور باطنی گہرائی پر غور کرنے سے آدم میں مکمل طور پر انقلاب روحانی پیدا ہوا اور خدا انہیں اپنے لطف وہدایت سے نوازے۔

[۳] یعنی: انسان کی اس پر جنجال زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آ سکتے ہیں جو قصہ آدم علیہ السلام وحوا سلام اللہ علیہا سے مشابہت رکھتے ہیں، اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک طرف تو وہ انسان ہے جو قوت، عقل اور ہوا وہوس سے مرکب ہے، یہ دونوں طاقتیں اسے مختلف جہتوں میں کھینچ رہی ہیں، دوسری طرف کچھ ایسے جھوٹے رہبر ہیں جن کا ماضی شیطان کی طرح جانا پہچانا ہے اور وہ انسان کو اس بات پر اکسا رہے ہیں کہ عقل پر پردہ ڈال کر ہوا وہوس کو اختیار کر لو تا کہ یہ بے چارہ انسان پانی کی امید میں ''سراب'' کو آب سمجھ کر ریگستانوں میں بھٹک کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔

کوئی اہم بات نہیں ہے۔[1]

یہاں پر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کے بارے میں داستان بیان کی گئی ہے پہلے فرمایا: ''اے پیغمبر! انہیں آدم کے دو بیٹوں کا حقیقی قصہ سنا دیجئے''۔[2]

اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''جب ہر ایک نے تقرب پروردگار کے لئے ایک کام انجام دیا تو ایک کا عمل تو قبول کر لیا لیکن دوسرے کا قبول نہ ہوا''۔[3]

مگر جو کام ان دونوں بھائیوں نے انجام دیا اس تذکرہ کا قرآن میں وجود نہیں ہے بعض اسلامی روایات اور توریت کے سفر تکوین باب چہارم میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہابیل کے پاس چونکہ پالتو جانور تھے اس نے ان میں سے ایک بہترین پلا ہوا مینڈھا منتخب کیا، قابیل کسان تھا اس نے گندم کا گھٹیا حصہ یا گھٹیا آٹا اس کے لئے منتخب کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرزندان آدم کو کیسے پتہ چلا کہ ایک کا عمل بارگاہ ایزدی میں قبول ہو گیا ہے اور دوسرے کا عمل ردّ کر دیا گیا ہے قرآن میں اسکی بھی وضاحت نہیں ہے البتہ بعض اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں اپنی مہیا شدہ چیزیں پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے قبولیت کے اظہار کے طور پر بجلی نے ہابیل کی قربانی کو کھالیا اور اسے جلا دیا لیکن دوسری اپنی جگہ پر باقی رہی اور یہ نشانی پہلے سے رائج تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ایک عمل کی قبولیت اور دوسرے کی ردّ حضرت آدم علیہ السلام کو وحی کے ذریعے بتایا گیا اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہابیل ایک باصفا، باکردار اور راہ خدا میں سب کچھ کر گذرنے والا شخص تھا جبکہ قابیل تاریک دل، حاسد اور ہٹ دھرم تھا، قرآن نے دونوں بھائیوں کی جو گفتگو بیان کی ہے اس سے ان کی روحانی کیفیت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے اسی وجہ سے جس کا عمل قبول نہ ہوا تھا ''اس نے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور قسم کھا کر کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا''۔[4]

---

[1] تعجب کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم نے اس لفظ کو قرآن پر اعتراض کی بنیاد بنالیا ہے کہ قرآن نے ''قائن'' کو ''قابیل'' کیوں کہا ہے حالانکہ اول تو یہ اختلاف لغت ہے اور لغت میں ناموں کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے مثلاً توریت ''ابراہیم'' کو ''ابراہام'' لکھتی ہے قرآن میں اسے ''ابراہیم'' لکھا ہے ثانیاً بنیادی طور پر ''ہابیل'' کے نام قرآن میں مذکور ہی نہیں یہ اسماء تو اسلامی روایات میں آئے ہیں۔

ایسے شیطانوں کے بہکانے میں آجانے کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے جسم سے ''لباس تقویٰ'' گر جاتا ہے اور اس کے اندرونی عیوب ظاہر و آشکارا ہو جاتے ہیں، دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقام قرب الٰہی سے دور ہو جاتا ہے اور انسان اپنے بلند مقام سے گر جاتا ہے اور سکون و اطمینان کی بہشت سے نکل کر حیات مادی کی مشکلات و آفات کے جنگلوں میں گھر جاتا ہے اس موقع پر بھی عقل کی طاقت اس کی مدد کر سکتی ہے اور اسے اس نقصان کی تلافی کا موقع فراہم کر سکتی ہے اور اسے خدا کی بارگاہ میں دوبارہ بھیج سکتی ہے تاکہ جرأت و صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے، ایسا اعتراف جو اس کی زندگی کی تعمیر نو کا ضامن ہو اور اس کی زندگی کا ایک نیا موڑ بن جائے، یہی وہ موقع ہوتا ہے جب کہ دست رحمت الٰہی بار دیگر اس کی طرف دراز ہوتا ہے تاکہ اسے ہمیشہ کے انحطاط اور تنزل سے نجات دے، اگرچہ اپنے گذشتہ گناہ کا تلخ مزہ اس کے کام و دہن میں باقی رہ جاتا ہے جو اس کا ثر وضعی ہے، لیکن یہ ماجرا، اس کے لئے درس عبرت بن جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے شکست کے تجربہ سے اپنی حیات ثانیہ کی بنیاد مستحکم کر سکتا ہے اور اس کے نقصان و زیاں کے ذریعے سرور آئندہ فراہم کر سکتا ہے۔

[2] سورہ مائدہ آیت 27

[3] سورہ مائدہ آیت 27

[4] سورہ مائدہ آیت 27

لیکن دوسرے بھائی نے اسے نصیحت کی اور کہا کہ ''اگر یہ واقعہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ اعتراض تو تجھ پر ہونا چاہیے کیونکہ تیرے عمل میں تقویٰ شامل نہیں تھا اور خدا تو صرف پرہیز گاروں کا عمل قبول کرتا ہے''۔[1]

مزید کہا کہ ''حتیٰ اگر تم اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور میرے قتل کے لئے ہاتھ بڑھاؤ تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور تمہارے قتل کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور ایسے گناہ سے ہرگز اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کروں گا''[2]

قرآن میں حضرت آدم کے بیٹوں کا واقعہ، ایک بھائی کا دوسرے کے ہاتھوں قتل اور قتل کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں، پہلے فرمایا: ''سرکش نفس نے بھائی کے قتل کے لئے اسے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا''۔[3]

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہابیل کا عمل قبول ہو جانے کے بعد قابیل کے دل میں ایک طوفان پیدا ہو گیا ایک طرف دل میں ہر وقت حسد کی آگ بھڑکتی رہتی اور اسے انتقام پر ابھارتی اور دوسری طرف بھائی کا رشتہ، انسانی جذبہ گناہ، ظلم، بے انصافی اور قتل نفس سے ذاتی تنفر اسے اس جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا لیکن آخر کار سرکش نفس آہستہ آہستہ روکنے والے عوامل پر غالب آ گیا اور اس نے اس کے بیدار وجدان کو مطمئن کر دیا اور اسے جکڑ دیا اور بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کر دیا۔[4]

ظلم کی پردہ پوشی

قابیل نے جب اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اس کی لاش اس نے صحرا میں ڈال رکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے زیادہ دیر نہ گذری کہ درندے ہابیل کے جسم کی طرف آنے لگے قابیل ضمیر کے شدید دباؤ کا شکار تھا بھائی کے جسم کو بچانے کے لئے وہ لاش کو ایک مدت تک کندھے پر لئے پھرتا رہا کچھ پرندوں نے پھر بھی اسے گھیر رکھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اسے زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ لاش پر جھپٹ پڑیں۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ایک کوّا بھیجا، مقصد یہ تھا کہ وہ زمین کھودے اور اس میں دوسرے مردہ کوّے کا جسم چھپا دے یا اپنے کھانے کی چیزوں کو زمین میں چھپا دے جیسا کہ کوے کی عادت ہے تاکہ قابیل سمجھ سکے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح سپرد خاک کرے۔

البتہ اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ انسان کوئی چیز کسی پرندے سے سیکھے کیونکہ تاریخ اور تجربہ شاہد ہیں کہ بہت سے جانور طبعی طور پر بعض معلومات رکھتے ہیں اور انسان نے اپنی پوری تاریخ میں جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے یہاں تک کہ میڈیکل کی بعض کتب میں ہے کہ انسان اپنی بعض طبی معلومات میں حیوانات کا مرہون منت ہے،

افسوس اپنے اوپر

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ''اس وقت قابیل اپنی غفلت اور جہالت سے پریشان ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ وائے ہو مجھ

---

[1] سورہ مائدہ آیت 27

[2] سورہ مائدہ آیت 28

[3] سورہ مائدہ آیت 30

[4] سورہ مائدہ آیت 30

پر، کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ ناتواں اور عاجز ہوں، مجھ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ میں اس کی طرح اپنے بھائی کا جسم دفن کردوں، بہرحال وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہوا''۔[1]

کیا اس کی پشیمانی اس بنا پر تھی کہ اس کا گھٹیا اور برا عمل آخرکار اس کے ماں باپ پر اور احتمالی طور پر دوسرے بھائیوں پر آشکار ہو جائے گا اور وہ اسے بہت سرزنش کریں گے یا کیا یہ پشیمانی اس بنا پر تھی کہ کیوں میں ایک مدت تک بھائی کی لاش کندھے پر لئے پھرتا رہا اور اسے دفن نہ کیا اور یا پھر کیا یہ ندامت اس وجہ سے تھی کہ اصولی طور پر انسان ہر برا کام انجام دے لینے کے بعد اپنے دل میں ہر طرح کی پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس کی ندامت کی جو بھی وجہ ہو وہ اس کے گناہ سے توبہ کی دلیل نہیں ہے کیونکہ توبہ یہ ہے کہ ندامت خوف خدا کے باعث اور عمل کے برا ہونے کے احساس کی بنا پر ہو، اور یہ احساس اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا کام نہیں کرے گا، قرآن میں قابیل کی ایسی کسی توبہ کی نشاندہی نہیں کی گئی بلکہ شاید قرآن میں ایسی توبہ کے نہ ہونے کی طرف ہی اشارہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے، آپ نے فرمایا:

''جس کسی انسان کا بھی خون بہایا جاتا ہے اس کی جوابدہی کا ایک حصہ قابیل کے ذمہ ہوتا ہے جس نے انسان کشی کی اس بری سنت کی دنیا میں بنیاد رکھی تھی''۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا یہ واقعہ ایک حقیقی واقعہ ہے اس کے علاوہ کہ آیات قرآن اور اسلامی روایت کا ظاہری مفہوم اس کی واقعیت کو ثابت کرتا ہے اس کے ''بالحق'' کی تعبیر بھی جو قرآن میں آئی ہے اس بات پر شاہد ہے، لہٰذا جو لوگ قرآن میں بیان کئے گئے واقعہ کو تشبیہ، کنایہ یا علامتی (SIMBOLIC) داستان سمجھتے ہیں، بغیر دلیل کے ایسا کرتے ہیں۔[2]

آخرکار یہ برے لوگ اپنے شرمناک اور برے اعمال کے انجام سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے اور انہیں دفن کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اس موقع پر ان کی آرزوئیں ان کی مدد کو لپکتی ہیں، کوّا ان آرزوؤں کا مظہر ہے جو جلدی سے پہنچتا ہے اور انہیں ان کے جرائم پر پردہ پوشی کی دعوت دیتا ہے لیکن آخرکار انہیں خسارے، نقصان اور حسرت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

حضرت ادریس علیہ السلام

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق ادریس علیہ السلام، نوح علیہ السلام کے دادا تھے ان کا نام توریت میں ''اخنوخ'' اور عربی میں ادریس علیہ السلام ہے جسے بعض ''درس'' کے مادہ سے سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قلم کے ساتھ خط لکھا، مقام نبوت کے علاوہ وہ علم نجوم علم ہیئت میں بھی ماہر تھے وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انسان کو لباس سینے کا طریقہ سکھایا۔

اس عظیم پیغمبر کے بارے میں قرآن میں صرف دو مرتبہ، وہ بھی مختصر سے اشاروں کے ساتھ بیان آیا ہے، ایک تو یہی سورہ مریم آیت 56 میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیات 85 سے 86 میں، مختلف روایات میں ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلی طور پر بیان کیا

---

[1] سورہ مائدہ آیت 31

[2] اس کے باوجود اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ حقیقی واقعہ اس جنگ کے لئے نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا ہو جو ہمیشہ سے مردان پاکباز، صالح ومقبول بارگاہ خدا انسانوں اور آلودہ، منحرف، کینہ پرور، حاسد اور ناجائز ہٹ دھرمی کرنے والوں کے درمیان جاری رہی ہے وہ لوگ کتنے پاکیزہ اور عظیم ہیں جنھوں نے ایسے برے لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

گیا ہے کہ جسے ہم پورے کا پورا معتبر نہیں سمجھ سکتے۔ اسی وجہ سے ہم مذکورہ اشارے پر قناعت کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

قرآن مجید، بہت سی آیات میں نوح کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور مجموعی طور پر قرآن کی انتیس سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، ان کا نام 43 مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی زندگی کے مختلف حصوں کی باریک بینی کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے ایسے جو زیادہ تر تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت کے پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

مؤرخین و مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح کا نام ''عبدالغفار'' یا ''عبدالملک'' یا ''عبدالاعلیٰ'' تھا اور ''نوح'' کا لقب انہیں اس لئے دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سالہا سال اپنے اوپر یا اپنی قوم پر نوحہ گریہ کرتے رہے۔ آپ کے والد کا نام ''لمک'' یا ''لامک'' تھا اور آپ کی عمر کی مدت میں اختلاف ہے، بعض روایات میں 1490 اور بعض میں 2500 سال بیان کی گئی ہے، اور ان کی قوم کے بارے میں بھی طولانی عمریں تقریباً 300 سال تک لکھی گئی ہیں، جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت طولانی عمر پائی ہے، اور قرآن کی صراحت کے مطابق آپ 950 سال اپنی قوم کے درمیان رہے (اور تبلیغ میں مشغول رہے)۔

نوح کے تین بیٹے تھے ''حام'' ''سام'' ''یافث'' اور مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی اس وقت کی تمام نسل انسانی کی بازگشت انہیں تینوں فرزندوں کی طرف ہے ایک گروہ ''حامی'' نسل ہے جو افریقہ کے علاقہ میں رہتے ہیں دوسرا گروہ ''سامی'' نسل ہے جو شرق اوسط اور مشرق قریب کے علاقوں میں رہتے ہیں اور ''یافث'' کی نسل کو چین کے ساکنین سمجھتے ہیں۔

950 سال تبلیغ 7 مومن

اس بارے میں بھی، کہ نوح علیہ السلام طوفان کے بعد کتنے سال زندہ رہے، اختلاف ہے بعض نے پچاس سال لکھے ہیں اور بعض نے ساٹھ سال۔ [1] نوح علیہ السلام کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کا نام ''کنعان'' تھا جس نے باپ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ کشتی نجات میں ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوا اس نے برے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھی اور خاندان نبوت کے اقدار کو ضائع کر دیا اور قرآن کی صراحت کے مطابق آخر کار وہ بھی باقی کفار کے مانند طوفان میں غرق ہو گیا۔ اس بارے میں کہ اس طویل مدت میں کتنے افراد نوح علیہ السلام پر ایمان لائے، اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے، اس میں بھی اختلاف ہے بعض نے 80 اور بعض نے 7 افراد لکھے ہیں۔

نوح علیہ السلام کی داستان عربی اور فارسی ادبیات میں بہت زیادہ بیان ہوئی ہے، اور زیادہ تر طوفان اور آپ کی کشتی نجات پر تکیہ ہوا ہے۔ نوح علیہ السلام صبر و شکر اور استقامت کی ایک داستان تھے، اور محققین کا کہنا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انسانوں کی ہدایت کے لئے وحی کی منطق کے علاوہ عقل و استدلال کی منطق سے بھی مدد لی (جیسا کہ سورہ نوح کی آیات سے اچھی طرح ظاہر ہے) اور اسی بناء پر آپ اس جہان کے تمام خدا پرستوں پر ایک عظیم حق رکھتے تھے۔

---

[1] یہود کے منابع (موجودہ توریت میں بھی نوح کی زندگی کے بارے میں تفصیلی بحث آئی ہے، جو کئی لحاظ سے قرآن سے مختلف ہے اور توریت کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے، یہ مباحث توریت کے سفر ''تکوین'' میں فصل 6، 7، 8، 9 اور 10 میں بیان ہوئے ہیں

قوم نوح علیہ السلام کی ہلا دینے والی سرگزشت اس میں شک نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا قیام اوران کے اپنے زمانے کے متکبروں کے ساتھ شدید اور مسلسل جہاد اوران کے برے انجام کی داستان تاریخ بشر کے فراز میں ایک نہایت اہم اور بہت عبرت انگیز درس کی حامل ہے۔

قرآن مجید پہلے مرحلے میں اس عظیم دعوت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ''ہم نے نوح کوان کی قوم کی طرف بھیجا اوراس نے انہیں بتایا کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں''۔[1]

اس کے بعد اپنی رسالت کے مضمون کو صرف ایک جملہ میں بطور خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے میرا پیغام یہ ہے کہ ''اللہ'' کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش نہ کرو۔[2] پھر بلا فاصلہ اس کے پیچھے اسی مسئلہ انذار اور اعلام خطر کو تکرار کرتے ہوئے کہا: ''میں تم پر دردناک دن سے ڈرتا ہوں''۔[3]

اصل میں اللہ (خدائے یکتا و یگانہ) کی توحید اور عبادت ہی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ پہلا ردّعمل اس زمانے کے طاغوتوں، خودسروں اور صاحبان زر وزور کا اس عظیم دعوت اور واضح اعلام خطر کے مقابلے میں کیا تھا مسلماً سوائے کچھ بیہودہ اور جھوٹے عذر بہانوں اور بے بنیاد استدلالوں کے علاوہ کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا جیسا کہ ہر زمانے کے جابروں کا طریقہ ہے۔

انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے تین جواب دیئے: ''قوم نوح علیہ السلام کے سردار اور سرمایہ دار کافر تھے انہوں نے کہا: ہم تو تجھے صرف اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں''۔[4]

حالانکہ اللہ کی رسالت اور پیغام تو فرشتوں کو اپنے کندھوں پر لینا چاہئے نہ کہ ہم جیسے انسانوں کو، اس گمان کے ساتھ کہ انسان کا مقام فرشتوں سے نیچے ہے یا انسان کی ضرورت کو فرشتہ انسان سے بہتر جانتا ہے۔

امام زادوں کو زائرین کی تعداد سے پہچانا جاتا ہے

ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ: انہوں نے کہا: اے نوح علیہ السلام: ''ہم تیرے گردوپیش اوران کے درمیان کہ جنہوں نے تیری پیروی کی ہے سوائے چند پست، ناآگاہ اور بے خبر تھوڑے سن وسال کے نوجوانوں کے کہ جنہوں نے مسائل کی دیکھ بھال نہیں کی کسی کو نہیں دیکھتے''۔

کسی رہبر اور پیشوا کی حیثیت اوراس کی قدر و قیمت اس کے پیروکاروں سے پہچانی جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق صاحب مزار کو اس کے زائرین سے پہچانا جاتا ہے جب ہم تمہارے پیروکاروں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں چند ایک بے بضاعت، گمنام، فقیر اور غریب لوگ ہی نظر آتے ہیں جن کا سلسلہ روزگار بھی نہایت ہی معمولی ہے تو پھر ایسی صورت میں تم کس طرح امید کرسکتے ہو کہ مشہور و معروف دولت منداور نامی گرامی لوگ تمہارے سامنے سر تسلیم خم کرلیں گے۔؟

ہم اور یہ لوگ کبھی بھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے ہم نہ تو کبھی ایک دسترخوان پر بیٹھے ہیں اور نہ ہی ایک چھت کے نیچے اکھٹے

---

[1] سورہ ہود آیت 25

[2] سورہ ہود آیت 26

[3] سورہ ہود آیت 26

[4] سورہ ہود آیت 27

ہوئے ہیں تمہیں ہم سے کیسی غیر معقول توقع ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنی اس بات میں سچے تھے کہ کسی پیشوا کو اس کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے لیکن ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے شخصیت کے مفہوم اور معیار کو اچھی طرح نہیں پہچانا تھا۔ان کے نزدیک شخصیت کا معیار مال و دولت لباس و گھر اور خوبصورت وقیمتی سواری تھا لیکن طہارت، تقویٰ، حق جوئی جیسے اعلیٰ انسانی صفات سے غافل تھے جو غریبوں میں زیادہ اور امیروں میں کم پائی جاتی ہیں۔

طبقاتی اونچ نیچ بدترین صورت میں ان کی افکار پر حکم فرما تھی۔اسی لئے وہ غریب لوگوں کو ’’اراذل‘‘، ذلیل سمجھتے تھے۔

اور اگر وہ طبقاتی معاشرے کے قید خانے سے باہر نکل کر سوچتے اور باہر کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ایسے لوگوں کا ایمان اس پیغمبر کی حقانیت اور اس کی دعوت کی سچائی پر بذات خود ایک دلیل ہے۔

اور یہ جو انہیں ’’بادی الرای‘‘ (ظاہر بین بے مطالعہ اور وہ شخص جو پہلی نظر میں کسی چیز کا عاشق اور خواہاں ہوتا ہے)؛ کا نام دیا ہے حقیقت میں اس بناء پر ہے کہ وہ ہٹ دھرمی اور غیر مناسب تعصّبات جو دوسروں میں تھے وہ نہیں رکھتے تھے بلکہ زیادہ تر پاک دل نوجوان تھے جو حقیقت کی پہلی کرن کو جوان کے دل پر پڑتی تھی جلدی محسوس کر لیتے تھے وہ اس بیداری کے ساتھ جو کہ حق کی تلاش سے حاصل ہوتی ہے، صداقت کی نشانیاں، انبیاء کے اقوال وافعال کا ادراک کر لیتے تھے۔[1]

ان کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ قطع نظر اس سے کہ تو انسان ہے نہ کہ فرشتہ، علاوہ ازیں تجھ پر ایمان لانے والے نشاندہی کرتے ہیں کہ تیری دعوت کے مشتملات صحیح نہیں ہیں ’’اصولی طور پر تم ہم پر کسی قسم کی برتری نہیں رکھتے کہ جس کی بناء پر ہم تمہاری پیروی کریں‘‘۔[2]

’’لہٰذا ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو‘‘۔[3]

حضرت نوح علیہ السلام کے جوابات

قرآن میں ان بہانہ جو اور افسانہ ساز افراد کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے دیئے گئے جوابات ذکر کئے گئے ہیں پہلے ارشاد ہوتا ہے:

اے قوم: ’’میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل اور معجزہ کا حامل ہوں اور اس نے اس رسالت و پیغام کی انجام دہی کی وجہ سے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور یہ امر اگر عدم توجہ کی وجہ سے تم سے مخفی ہو تو کیا پھر بھی تم میری رسالت کا انکار کر سکتے ہو اور میری پیروی سے دستبردار ہو سکتے ہو‘‘۔[4]

یہ جواب قوم نوح علیہ السلام کے مستکبرین کے تین سوالوں میں سے کس کے ساتھ مربوط ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن غور وخوض سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جامع جواب تینوں اعتراضات کا جواب بن سکتا ہے کیونکہ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ تم انسان ہو آپ نے فرمایا یہ بجا ہے کہ میں تمہاری طرح کا ہی انسان ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت میرے شامل حال ہوئی ہے اور

---

[1] سورہ ہود آیت 27

[2] سورہ ہود آیت 27

[3] سورہ ہود آیت 27

[4] سورہ ہود آیت 28

اس نے مجھے کھلی اور واضح نشانیاں دی ہیں اس بناء پر میری انسانیت اس عظیم رسالت سے مانع نہیں ہوسکتی اور یہ ضروری نہیں کہ میں فرشتہ ہوتا۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تمہارے پیروکار بے فکر اور ظاہر بین افراد ہیں۔آپ نے فرمایا تم بے فکر اور بے سمجھ ہو جو اس واضح حقیقت کا انکار کرتے ہو حالانکہ میرے پاس ایسے دلائل موجود ہیں جو ہر حقیقت کے متلاشی انسان کے لئے کافی ہیں اور اسے قائل کر سکتے ہیں مگر تم جیسے افراد جو غرور، خودخواہی، تکبر اور جاہ طلبی کا پردہ اوڑھے ہوئے ہیں ان کی حقیقت بین آنکھ بیکار ہو چکی ہے۔

ان کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: ہم کوئی برتری اور فضیلت تمہارے لئے اپنی نسبت نہیں پاتے، آپ نے فرمایا:
اس سے بالاتر کون سی برتری ہوگی کہ خدا نے اپنی رحمت میرے شامل حال کی ہے اور واضح مدارک و دلائل میرے اختیار میں دیئے ہیں اس بناء پر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ تم مجھے جھوٹا خیال کرو کیونکہ میری گفتگو کی نشانیاں ظاہر ہیں۔

''کیا میں تمہیں اس ظاہر بظاہر بینہ کے قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں جبکہ تم خود اس پر آمادہ نہیں ہو اور اسے قبول کرنا بلکہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا بھی پسند نہیں کرتے ہو''۔

میں کسی صاحب ایمان کو نہیں دھتکارتا

''اے قوم: میں اس دعوت کے بدلے تم سے مال و ثروت اور اجر و جزا کا مطالبہ نہیں کرتا''۔[۱]

یہ امر اچھی طرح سے نشاندہی کرتا ہے کہ اس پروگرام سے میرا کوئی مادی ہدف نہیں، میں سوائے خدا کے معنوی و روحانی اجر کے سوا کچھ بھی نہیں سوچتا اور کوئی جھوٹا مدعی ایسا نہیں ہوسکتا جو اس قسم کے سر درد، ناراحتی اور بے آرامی کو یوں ہی اپنے لئے خرید لے اور یہ سچے رہبروں کی پہچان کے لئے ایک میزان ہے، ان جھوٹے موقع پرستوں کے مقابلے میں، کہ وہ جب بھی کوئی قدم اٹھاتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مادی ہدف اور مقصد ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں جنہیں اصرار تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام، اپنے اوپر ایمان لانے والے غریب حقیر اور کم عمر افراد کو خود سے دور کر دیں حضرت نوح علیہ السلام (حتمی طور پر فیصلہ سناتے ہوئے) کہتے ہیں:''کیونکہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے اور دوسرے جہان میں اس کے سامنے میرے ساتھ ہوں گے''۔[۲]

آخر میں انہیں بتایا گیا ہے:''میں سمجھتا ہوں کہ تم جاہل لوگ ہو''۔[۳]

''اے قوم اگر میں ان باایمان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے سامنے (اس عظیم عدالت میں بلکہ اس جہان میں) کون میری مدد کرے گا''۔[۴]

''کیا تم کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہو''۔[۵] جان لو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں عین حقیقت ہے۔

---

[۱] سورہ ہود میں 29

[۲] سورہ ہود آیت 29

[۳] سورہ ہود آیت 29

[۴] سورہ ہود آیت 30

[۵] سورہ ہود آیت 30

خدائی خزانے میرے قبضہ میں نہیں ہیں

اپنی قوم کے مہمل اعتراضات کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام آخری بات کہتے ہیں کہ اگر تم خیال کرتے ہو اور توقع رکھتے ہو کہ وحی اور اعجاز کے سوا میں تم پر کوئی امتیاز یا برتری رکھوں، تو یہ غلط ہے میں صراحت سے کہنا چاہتا ہوں ''میں نہ تم سے کہتا ہوں کہ خدا ئی خزانے میرے قبضے میں ہیں اور نہ ہر کام جب چاہوں انجام دے سکتا ہوں'' نہ میں غیب سے آگاہی کا دعویٰ کرتا ہوں'' اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں''۔[1]

ایسے بڑے اور جھوٹے دعوے جھوٹے مدعیوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ایک سچا پیغمبر کبھی ایسے دعوے نہیں کرے گا کیونکہ خدائی خزانے اور علم غیب صرف خدا کی پاک ذات کے اختیار میں ہیں اور فرشتہ ہونا بھی ان بشری احساسات سے مناسبت نہیں رکھتا لہٰذا جو شخص ان تین میں سے کوئی ایک دعویٰ کرے یا یہ سب دعوے کرے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔

آخر میں دوبارہ مستضعفین کا ذکر کرتے ہوئے تاکیداً کہا گیا ہے ''میں ہرگز ان افراد کے بارے میں جو تمہاری نگاہ میں حقیر ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ خدا انہیں کوئی جزائے خیر نہیں دے گا''[2] بلکہ اس کے برعکس اس جہان اور اس جہان کی خیر، انہی کے لئے ہے اگر چہ ان کا ہاتھ مال و دولت سے خالی ہے یہ تو تم ہو جنہوں نے خام خیالی کی وجہ سے خیر کو مال و مقام یا سن و سال میں منحصر سمجھ لیا ہے اور تم حقیقت سے بالکل بے خبر ہو۔

اور بالفرض اگر تمہاری بات سچی ہو اور وہ پست اور اوباش ہوں تو خدا ان کے باطن سے آگاہ ہے۔

میں تو ان میں ایمان اور صداقت کے سوا کچھ نہیں پاتا، لہٰذا میری ذمہ داری ہے کہ میں انہیں قبول کرلوں، میں تو ظاہر پر مامور ہوں اور بندہ شناس خدا ہے۔ ''اور اگر میں اس کے علاوہ کچھ کروں تو یقیناً ظالموں میں سے ہو جاؤں گا''۔[3]

کہاں ہے عذاب؟

قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی باقی گفتگو کی طرف اشارہ ہوا ہے قرآن میں پہلے قوم نوح علیہ السلام کی زبانی نقل ہے کہ انہوں نے کہا: ''اے نوح: تم نے یہ سب بحث و تکرار اور مجادلہ کیا ہے اب بس کرو، تم نے ہم سے بہت باتیں کی ہیں اب بحث مباحثے کی گنجائش نہیں رہی،'' اگر سچے ہو تو خدائی عذابوں کے بارے میں جو سخت وعدے تم نے ہم سے کئے ہیں انہیں پورا کر دکھاؤ اور وہ عذاب لے آؤ۔[4]

یہ بعینہ اس طرح سے ہے کہ ایک شخص یا کچھ اشخاص کسی مسئلے کے بارے میں ہم سے بات کریں اور ضمناً ہمیں دھمکیاں بھی دیں اور کہیں کہ اب زیادہ باتیں بند کرو اور جو کچھ تم کر سکتے ہو کر لو اور دیر نہ کرو، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہم نہ تو تمہارے دلائل کو کچھ سمجھتے ہیں نہ تمہاری دھمکیوں سے ڈرتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ ہم تمہاری بات سن سکتے ہیں۔ انبیاء الٰہی کے لطف و محبت اور ان کی وہ گفتگو جو صاف و شفاف اور خوشگوار پانی کی طرح ہوتی ہے اس طرز عمل کا انتخاب انتہائی ہٹ دھرمی تعصب اور جہالت کی ترجمانی

---

[1] سورہ ہود آیت 31

[2] سورہ ہود آیت 31

[3] سورہ ہود آیت 31

[4] سورہ ہود آیت 32

کرتا ہے۔

قوم نوح علیہ السلام کی اس گفتگو سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی ہدایت کے لئے بہت طویل مدت تک کوشش کی اور انہیں ارشاد و ہدایت کے لئے آپ نے ہر موقع سے استفادہ کیا، آپ نے اس قدر کوشش کی کہ اس گمراہ قوم نے آپ کی گفتار اور ارشادات پر اکتاہٹ کا اظہار کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں جو دیگر تفصیل آئی ہے اس سے بھی یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے، یہ مفہوم تفصیلی طور پر بیان ہوا ہے: ''پروردگارا: میں نے اپنی قوم کو دن رات تیری طرف بلایا لیکن میری اس دعوت پر ان میں فرار کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا میں نے جب انہیں پکارا تا کہ تو انہیں بخش دے، تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے لباس اپنے اوپر لپیٹ لئے انہوں نے مخالفت پر اصرار کیا اور غرور تکبر کا مظاہرہ کیا میں نے پھر بھی انہیں دعوت دی، میں نے پیہم اصرار کیا مگر انہوں نے کسی طرح بھی میری باتوں کی طرف کان نہ دھرے''۔[۱]

حضرت نوح علیہ السلام نے اس بے اعتنائی، ہٹ دھرمی اور بے ہودگی کا یہ مختصر جواب دیا: ''خدا ہی چاہے تو ان دھمکیوں اور عذاب کے وعدوں کو پورا کر سکتا ہے''۔[۲]

لیکن بہر حال یہ چیز میرے اختیار سے باہر ہے اور میرے قبضہ قدرت میں نہیں ہے میں تو اس کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے سامنے تسلیم ہوں، لہٰذا سزا اور عذاب کی خواہش مجھ سے نہ کرو، لیکن یہ جان لو کہ جب عذاب کا حکم آ پہنچے گا تو پھر تم اس کے احاطۂ قدرت سے نکل نہیں سکتے اور کسی پناہ گاہ کی طرف فرار نہیں کر سکتے۔[۳]

معاشرے کو پاک کرنے کا مرحلہ

قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی سرگذشت بیان ہوئی ہے اس کے در حقیقت مختلف مراحل ہیں ان میں سے ہر مرحلہ متکبرین کے خلاف حضرت نوح علیہ السلام کے قیام کے ایک دور سے مربوط ہے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی مسلسل اور پر عزم دعوت کے مرحلے کا تذکرہ تھا جس کے لئے انہوں نے تمام تر وسائل سے استفادہ کیا یہ مرحلہ ایک طویل مدت پر مشتمل تھا اس میں ایک چھوٹا سا گروہ آپ پر ایمان لایا، یہ گروہ ویسے تو مختصر سا تھا لیکن کیفیت اور استقامت کے لحاظ سے بہت عظیم تھا۔

قرآن میں اس قیام کے دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ مرحلہ دور تبلیغ کے اختتام کا تھا جس میں خدا کی طرف سے معاشرے کو برے لوگوں سے پاک کرنے کی تیاری کی جانا تھی پہلے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔''نوح علیہ السلام کو وحی ہوئی کہ جو افراد ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا''۔[۴]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صفیں بالکل جدا ہو چکی ہیں، اب ایمان اور اصلاح کی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں اور اب معاشرے کی پاکیزگی اور آخری انقلاب کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اس گفتگو کے آخر میں حضرت نوح علیہ السلام کی تسلی اور دلجوئی کے لئے فرمایا

---

[۱] نوح آیات 5 تا 13

[۲] سورہ ہود آیت 33

[۳] سورہ ہود آیت 33

[۴] سورہ ہود آیت 21

گیاہے: ''اب جب معاملہ یوں ہے تو جو کام تم انجام دے رہے ہو اس پر کوئی حزن وملال نہ کرو''۔[1]

مربوط آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اسرار غیب کا کچھ حصہ جہاں ضروری ہوتا ہے اپنے پیغمبر کے اختیار میں دے دیتا ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو خبر دی گئی ہے کہ آئندہ ان میں سے کوئی اور شخص ایمان نہیں لائے گا، بہر حال ان گناہگار اور ہٹ دھرم لوگوں کو سزا ملنی چاہئے، ایسی سزا جو عالم ہستی کو ان کے وجود کی گندگی سے پاک کر دے اور مومنین کو ہمیشہ کے لئے ان کے چنگل سے نجات دے دے، ان کے غرق ہونے کا حکم ہو چکا ہے لیکن ہر چیز کے لئے کچھ وسائل واسباب ہوتے ہیں لہٰذا نوح کو چاہئے کہ وہ سچے مومنین کے بچنے کے لئے ایک مناسب کشتی بنائیں تا کہ ایک تو مومنین کشتی بننے کی اس مدت میں اپنے طریق کار میں پختہ تر ہو جائیں اور دوسروں کے لئے بھی کافی اتمام حجت ہو جائے۔

کشتی نوح علیہ السلام

''ہم نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ ہمارے حضور میں اور ہمارے فرمان کے مطابق کشتی بنائیں''۔[2]

لفظ ''**وحینا**'' سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنانے کی کیفیت اور اس کی شکل وصورت کی تشکیل بھی حکم خدا سے سیکھ رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام آنے والے طوفان اور اس کی کیفیت ووسعت سے آگاہ نہ تھے کہ وہ کشتی اس مناسبت سے بناتے اور یہ وحی الٰہی ہی تھی جو بہترین کیفیتوں کے انتخاب میں ان کی مددگار تھی۔

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام کو خبردار کیا گیا ہے: ''آج کے بعد ظالم افراد کے لئے شفاعت اور معافی کا تقاضا نہ کرنا کیونکہ انہیں عذاب دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ حتماً غرق ہو جائیں گے''۔[3]

کشتی بنا رہے ہو دریا بھی بناؤ

اب چند جملے قوم نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی سن لیں: وہ بجائے اس کے کہ ایک لمحہ کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو غور سے سنتے، اسے سنجیدگی سے لیتے اور کم از کم انہیں یہ احتمال ہی ہوتا کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بار بار کے اصرار اور تکرار دعوت کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی ہو اور ہوسکتا ہے طوفان اور عذاب کا معاملہ حتمی اور یقینی ہی ہو، الٹا انہوں نے تمام مستکبر اور مغرور افراد کی عادت کا مظاہرہ کیا اور تمسخر واستہزاء کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی قوم کا کوئی گروہ جب کبھی ان کے نزدیک سے گزرتا اور حضرت نوح اور ان کے اصحاب کو لکڑیاں اور میخیں وغیرہ مہیا کرتے دیکھتا اور کشتی بنانے میں سرگرم عمل پاتا تو مذاق اڑاتا اور پھبتیاں کستے ہوئے گزر جاتا''۔[4]

کہتے ہیں کہ قوم نوح علیہ السلام کے اشراف کے مختلف گروہوں کے ہر دستے نے تمسخر اور تفریح وطبع کے لئے اپنا ہی ایک انداز اختیار کر رکھا تھا۔

ایک کہتا تھا: ''اے نوح علیہ السلام دعوائے پیغمبری کا کاروبار نہیں چل سکا تو بڑھئی بن گئے، دوسرا کہتا تھا: کشتی بنا رہے ہو؟ بڑا اچھا

---

[1] سورہ ہود آیت 3

[2] سورہ ہود آیت 37

[3] سورہ ہود آیت 37

[4] سورہ ہود آیت 38

ہے البتہ کشتی کے لئے دریا بھی بناؤ، کبھی کوئی عقلمند دیکھا ہے جو خشکی کے بیچ میں کشتی بنائے؟

ان میں سے کچھ کہتے تھے: اتنی بڑی کشتی کس لئے بنا رہے ہو اگر کشتی بنانا ہی ہے تو ذرا چھوٹی بنالو جسے ضرورت پڑے تو دریا کی طرف لے جانا تو ممکن ہو۔

ایسی باتیں کرتے تھے اور قہقہے لگا کر ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے یہ باتیں گھروں میں ہوتیں۔ کام کاج کے مراکز میں یہ گفتگو ہوتیں گویا اب بحثوں کا عنوان بن گئی وہ ایک دوسرے سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کی کوتاہ فکری کے بارے میں باتیں کرتے اور کہتے: اس بوڑھے کو دیکھو آخر عمر میں کس حالت کو جا پہنچا ہے اب ہم سمجھے کہ اگر ہم اس کی باتوں پر ایمان نہیں لائے تو ہم نے ٹھیک ہی کیا اس کی عقل تو بالکل ٹھکانے نہیں ہے۔

دوسری طرف حضرت نوح علیہ السلام بڑی استقامت اور پامردی سے اپنا کام بے پناہ عزم کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے اور یہ ان کے ایمان کا نتیجہ تھا وہ ان کور باطن دل کے اندھوں کی بے بنیاد باتوں سے بے نیاز اپنی پسند کے مطابق تیزی سے پیشرفت کررہے تھے اور دن بدن کشتی کا ڈھانچہ مکمل ہو رہا تھا کبھی کبھی سر اٹھا کر ان سے یہ پر معنی بات کہتے: ''اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ہم بھی جلدی ہی اسی طرح تمہارا مذاق اڑائیں گے''۔ [1]

وہ دن کہ جب تم طوفان کے درمیان سرگرداں ہو کر، سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگو گے اور تمہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی موجوں میں گھرے فریاد کرو گے کہ ہمیں بچالو جی ہاں اس روز مومنین تمہاری غفلت اور جہالت پر مذاق اڑائیں گے ''اس روز دیکھنا کہ کس کے لئے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کسے دائمی سزا دامن گیر ہوتی ہے''۔ [2]

اس میں شک نہیں کہ کشتی نوح کوئی عام کشتی نہ تھی کیونکہ اس میں سچے مومنین کے علاوہ ہر نسل کے جانور کو بھی جگہ ملی تھی اور ایک مدت کے لئے ان انسانوں اور جانوروں کو جو خوراک درکار تھی وہ بھی اس میں موجود تھی ایسی لمبی چوڑی کشتی یقیناً اس زمانے میں بے نظیر تھی یہ ایسی کشتی تھی جو ایسے دریا کی کوہ پیکر موجود میں صحیح وسالم رہ سکے اور نابود نہ ہو جس کی وسعت اس دنیا جتنی ہو، اسی لئے مفسرین کی بعض روایات میں ہے کہ اس کشتی کا طول ایک ہزار دو سو ذراع تھا اور عرض چھ سو ذراع تھا (ایک ذراع کی لمبائی تقریباً آدھے میٹر کے برابر ہے)۔

بعض اسلامی روایات میں ہے کہ ظہور طوفان سے چالیس سال پہلے قوم نوح علیہ السلام کی عورتوں میں ایک ایسی بیماری پیدا ہوگئی تھی کہ ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا یہ دراصل ان کے لئے سزا کی تمہید تھی۔

آغاز طوفان

گزشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح حضرت نوح علیہ السلام اور سچے مومنین نے کشتی نجات بنانا شروع کی اور انہیں کیسی کیسی مشکلات آئیں اور بے ایمان مغرور اکثریت نے کس طرح ان کا تمسخر اڑایا اس طرح تمسخر اڑانے والوں نے کس طرح اپنے آپ کو اس طوفان کے لئے تیار کیا جو سطح زمین کو بے ایمان مستکبرین کے منحوس وجود سے پاک کرنے والا تھا۔

یہاں پر اس سرگزشت کے تیسرے مرحلے کے بارے میں قرآن گویا اس ظالم قوم پر نزول عذاب کی بولتی ہوئی تصویر کو

---

[1] سورہ ہود آیت 38

[2] سورہ ہود آیت 39

لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''یہ صورت حال یونہی تھی یہاں تک کہ ہمارا حکم صادر ہوا اور عذاب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے پانی تنور کے اندر سے جوش مارنے لگا''۔[1]

اس بارے میں کہ طوفان کے نزدیک ہونے سے تنور سے پانی کا جوش مارنا کیا مناسبت رکھتا ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔[2]

موجودہ احتمالات میں سے یہ احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''تنور'' اپنے حقیقی اور مشہور معنی میں آیا ہے اور ہوسکتا ہے اس سے مراد کوئی خاص تنور بھی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ اس سے یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہو کہ تنور جو عام طور پر آگ کا مرکز ہے جب اس میں سے پانی جوش مارنے لگا تو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب متوجہ ہوئے کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور انقلاب قریب تر ہے یعنی کہاں آگ اور کہاں پانی بالفاظ دیگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیر زمین پانی کی سطح اس قدر اوپر آ گئی ہے کہ وہ تنور کے اندر سے جو عام طور پر خشک، محفوظ اور اونچی جگہ بنایا جاتا ہے، جوش مار رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ کوئی اہم امر درپیش ہے اور قدرت کی طرف سے کسی نئے حادثے کا ظہور ہے۔ اور یہی امر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب کے لئے خطرے کا الارم تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑے ہوں اور تیار رہیں۔

شاید غافل اور جاہل قوم نے بھی اپنے گھروں کے تنور میں پانی کو جوش مارتے دیکھا ہو بہر حال وہ ہمیشہ کی طرح خطرے کے ان پر معنی خدائی نشانات سے آنکھ کان بند کیے گزر گئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی غور و فکر کی زحمت نہ دی کہ شاید شرف تکوین میں کوئی حادثہ پوشیدہ ہو اور شاید حضرت نوح علیہ السلام جن واقعات کی خبر دیتے تھے ان میں سچائی ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں ''تنور'' مجازی اور کنائی معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ غضب الٰہی کے تنور میں جوش پیدا ہوا اور وہ شعلہ ور ہوا اور یہ تباہ کن خدائی عذاب کے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے ایسی تعبیر فارسی اور عربی زبان میں استعمال ہوتی ہیں کہ شدت غضب کو آگ کے جوش مارنے اور شعلہ ور ہونے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اس وقت نوح علیہ السلام کو ''ہم نے حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جفت (نر اور مادہ کا جوڑا) کشتی میں سوار کرلو''۔ تا کہ غرقاب ہو کر ان کی نسل منقطع نہ ہو جائے۔

''اور اسی طرح اپنے خاندان میں سے جن کی ہلاکت کا پہلے سے وعدہ کیا جا چکا ہے ان کے سوا باقی افراد کو سوار کرلو نیز مومنین کو کشتی میں سوار کرلو''۔[3]

نوح علیہ السلام کا بیٹا بدکاروں کے ساتھ رہا

یہ قرآن ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام کی بے ایمان بیوی اور ان کے بیٹے کنعان کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کی داستان آئندہ صفحات میں آئے گی جنہوں نے راہ ایمان سے انحراف کیا اور گنہگاروں کا ساتھ دینے کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام سے اپنا رشتہ

---

[1] سورہ ہود آیت 30

[2] بعض نے کہا ہے کہ تنور سے پانی کا جوش مارنا خدا کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کے لئے ایک نشانی تھی تا کہ وہ اصل واقعہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس موقع پر وہ اور ان کے اصحاب ضروری اسباب و وسائل لے کر کشتی میں سوار ہو جائیں۔

[3] سورہ ہود آیت 40

توڑ لیا وہ اس کشتی نجات میں سوار ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی پہلی شرط ایمان تھی۔

دوسری طرف یہ قرآن اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جو اپنے دین وآئین کی تبلیغ کے لئے سالہا سال بہت طویل اور مسلسل کوشش کی اس کا نتیجہ بہت تھوڑے سے افراد مومنین کے سوا کچھ نہ تھا بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد صرف اسی (80) افراد تھی یہاں تک کہ بعض نے تو اس سے بھی کم تعداد لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے کس حد تک استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان میں سے ایک ایک فرد کے لئے اوسطاً کم از کم دس سال زحمت اٹھائی اتنی زحمت تو عام لوگ اپنی اولاد تک کی ہدایت اور نجات کے لئے نہیں اٹھاتے۔

اللہ کا نام لے کر کشتی پر سوار ہو جاؤ

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے جلدی سے اپنے سے وابستہ صاحب ایمان افراد اور اصحاب کو جمع کیا اور چونکہ طوفان اور تباہ کن خدائی عذابوں کا مرحلہ نزدیک آ رہا تھا، ''انہیں حکم دیا کہ خدا کے نام سے کشتی پر سوار ہو جاؤ اور کشتی کے چلتے اور ٹھہرتے وقت خدا کا نام زبان پر جاری کرو اور اس کی یاد میں رہو''۔ [۱]

بالآخر آخری مرحلہ آ پہنچا اور اس سرکش قوم کے لئے عذاب اور سزا کا فرمان صادر ہوا تیرہ وتار بادل جو سیاہ رات کے ٹکڑوں کی طرح تھے سارے آسمان پر چھا گئے اور اس طرح ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ہوئے کہ جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی پے در پے سخت بادل گرجتے خیرہ کن بجلیاں پورے آسمان پر کوندتیں آسمانی فضا گویا ایک بہت بڑے وحشت ناک حادثے کی خبر دے رہی تھی۔

بارش شروع ہو گئی اور پھر تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی بارش کے قطرے موٹے سے موٹے ہوتے چلے گئے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''گویا آسمان کے تمام دروازے کھل گئے اور پانی کا ایک سمندر ان کے اندر سے نیچے گرنے لگا''۔ [۲]

دوسری طرف زیر زمین پانی کی سطح اس قدر بلند ہو گئی کہ ہر طرف سے پر جوش چشمے ابل پڑے، یوں زمین وآسمان کا پانی آپس میں مل گیا اور زمین، پہاڑ، دشت، بیابان اور درہ غرض ہر جگہ پانی جاری ہو گیا بہت جلد زمین کی سطح ایک سمندر کی صورت اختیار کر گئی تیز ہوائیں چلنے لگیں جن کی وجہ سے پانی کی کوہ پیکر موجیں امنڈنے لگیں اس عالم میں ''کشتی نوح کوہ پیکر موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی''۔ [۳]

پسر نوح کا دردناک انجام

پسر نوح علیہ السلام ایک طرف اپنے باپ سے الگ کھڑا تھا نوح علیہ السلام نے پکارا: ''میرے بیٹے، ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ ہو ورنہ فنا ہو جاؤ گے''۔ [۴]

---

[۱] سورہ ہود آیت 41

[۲] سورہ قمر آیت 11

[۳] سورہ ہود آیت 42

[۴] سورہ ہود آیت 43

پیغمبر بزرگوار حضرت نوح علیہ السلام نے نہ صرف باپ کی حیثیت سے بلکہ ایک انتھک پر امید مربی کے طور پر آخری لمحے تک اپنی ذمہ داری سے دست برداری نہ کی، اس امید پر کہ شاید ان کی بات سنگدل بیٹے پر اثر کر جائے لیکن افسوس کہ برے ساتھی کی بات اس کے لئے زیادہ پر تاثیر تھی لہٰذا دلسوز باپ کی گفتگو اپنا مطلوبہ اثر نہ کرسکی، وہ ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر تھا اسے گمان تھا کہ غضب خدا کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا تھا اس لئے اس نے پکار کر کہا: ''ابا میرے لئے جوش میں نہ آؤ میں عنقریب پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جس تک یہ سیلاب نہیں پہنچ سکتا''۔ [1]

نوح علیہ السلام پھر بھی مایوس نہ ہوئے دوبارہ نصیحت کرنے لگے کہ شاید کوتاہ فکر بیٹا غرور اور خودسری کے مرکب سے اتر آئے اور راہ حق پر چلنے لگے۔ انہوں نے کہا: ''میرے بیٹے آج حکم خدا کے مقابلے میں کوئی طاقت پناہ نہیں دے سکتی، نجات صرف اس شخص کے لئے ہے رحمت خدا جس کے شامل حال ہو''۔ [2] پہاڑ تو معمولی سی چیز ہے خود کرہ ارض بھی معمولی سی چیز ہے سورج اور تمام نظام شمسی اپنے خیرہ کن عظمت کے باوجود خدا کی قدرت لایزال کے سامنے ذرۂ بے مقدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اسی دوران ایک موج اٹھی اور آگے آئی، مزید آگے بڑھی اور پسر نوح کو ایک تنکے کی طرح اس کی جگہ سے اٹھایا اور اپنے اندر درہم برہم کر دیا، ''اور باپ بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دی اور اسے غرق ہونے والوں میں شامل کر دیا''۔ [3]

اے نوح علیہ السلام تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے

جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو موجوں کے درمیان دیکھا تو شفقت پدری نے جوش مارا انہیں اپنے بیٹے کی نجات کے بارے میں وعدہ الٰہی یاد آیا انہوں نے درگاہ الٰہی کا رخ کیا اور کہا: ''پروردگارا میرا بیٹا میرے اہل اور میرے خاندان میں سے ہے اور تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ میرے خاندان کو طوفان اور ہلاکت سے نجات دے گا اور تو تمام حکم کرنے والوں سے برتر ہے اور تو ایفائے عہد کرنے میں محکم تر ہے''۔ [4]

یہ وعدہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو سورہ ہود میں موجود ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

''ہم نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ جانوروں کی ہر نوع میں سے ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلو اور اسی طرح اپنے خاندان کو سوائے اس شخص کے جس کی نابودی کے لئے فرمان خدا جاری ہو چکا ہے''۔ [5]

حضرت نوح علیہ السلام نے خیال کیا کہ ''سوائے اس کے کہ جس کی نابودی کے لئے فرمان خدا جاری ہو چکا ہے، اس سے مراد صرف ان کی بے ایمان اور مشرک بیوی ہے اور ان کا بیٹا کنعان اس میں شامل نہیں ہے لہٰذا انہوں نے بارگاہ خداوندی میں ایسا تقاضا کیا لیکن فوراً جواب ملا (ہلا دینے والا جواب اور ایک عظیم حقیقت واضح کرنے والا جواب) ''اے نوح وہ تیرے اہل اور خاندان میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ غیر صالح عمل ہے''۔ [6]

---

[1] سورہ ہود آیت 43

[2] سورہ ہود آیت 43

[3] سورہ ہود آیت 43

[4] سورہ ہود آیت 45

[5] سورہ ہود آیت 40

[6] سورہ ہود آیت 46

وہ نالائق شخص ہے اور تجھ سے مکتبی اور مذہبی رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے خاندانی رشتے کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔

''اب جبکہ ایسا ہے تو مجھ سے ایسی چیز کا تقاضا نہ کر جس کے بارے میں تجھے علم نہیں، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جا''۔[1]

حضرت نوح علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ تقاضا بارگاہ الٰہی میں صحیح نہ تھا اور ایسے بیٹے کی نجات کو خاندان کی نجات کے بارے میں خدا کے وعدے میں شامل نہیں سمجھنا چاہئے تھا لہٰذا آپ نے پروردگار کا رخ کیا اور کہا:

''پروردگارا: میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس امر سے تجھ سے کسی ایسی چیز کی خواہش کروں جس کا علم مجھے نہیں، اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور اپنی رحمت میرے شامل حال نہ کی تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا''۔[2]

اس داستان کا اختتام

آخر کار پانی کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہروں نے تمام جگہوں کو گھیر لیا پانی کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی جاہل گنہگاروں نے یہ گمان کیا کہ یہ ایک معمولی سا طوفان ہے وہ اونچی جگہوں اور پہاڑوں پر پناہ گزین ہو جائیں گے، لیکن پانی ان کے اوپر سے بھی گزر گیا اور تمام جگہیں پانی کے نیچے چھپ گئیں ان طغیان گروں کے جسم، ان کے بچے کچے، گھر اور زندگی کا ساز وسامان پانی کی جھاگ میں نظر آرہا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے زمام کشتی خدا کے ہاتھ میں دی موجیں کشتی کو ادھر سے ادھر لے جاتی تھیں روایات میں آیا ہے کہ کشتی پورے چھ ماہ سرگرداں رہی یہ مدت ابتدائے ماہ رجب سے لے کر ذی الحجہ کے اختتام تک تھی ایک اور روایت کے مطابق دس رجب سے لے کر روز عاشورہ تک کشتی پانی کی موجوں میں سرگرداں رہی۔

اس دوران کشتی نے مختلف علاقوں کی سیر کی یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق سرزمین مکہ اور خانہ کعبہ کے اطراف کی بھی سیر کی، آخر کار عذاب کے خاتمے کا اور زمین کے معمول کی حالت میں لوٹ آنے کا حکم صادر ہوا، قرآن میں اس فرمان کی کیفیت، جزئیات اور نتیجہ بہت مختصر مگر انتہائی عمدہ اور جاذب وخوبصورت عبارت میں چھ جملوں میں بیان کیا گیا ہے: پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''حکم دیا گیا کہ اے زمین: اپنا پانی نگل جا اور آسمان کو حکم ہوا اے آسمان ہاتھ روک لے''۔

''پانی نیچے بیٹھ گیا''

''اور کام ختم ہو گیا''

''اور کشتی کوہ جودی کے دامن سے آ لگی''۔

''اس وقت کہا گیا: دور ہو ظالم قوم''۔[3]

مندرجہ بالا قرآنی تعبیرات مختصر ہوتے ہوئے بھی نہایت موثر اور دلنشین ہیں، یہ بولتی ہوئی زندہ تعبیرات ہیں اور تمام

---

[1] سورہ ہود آیت 46

[2] سورہ ہود آیت 47

[3] سورہ ہود آیت 44

تر زیبائی کے باوجود ہلا دینے والی ہیں بعض علماء عرب کے بقول مذکورہ آیت قرآن میں سے فصیح ترین اور بلیغ ترین آیت ہے۔ [۱]

کوہ جودی کہاں ہے؟

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ کوہ جودی جس کے کنارے کشتی نوح علیہ السلام آ کر لگی تھی اور جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہی مشہور پہاڑ ہے جو موصل کے قریب ہے، بعض دوسرے مفسرین نے اسے حدود شام میں یا ''آمد'' کے نزدیک یا عراق کے شمالی پہاڑ سمجھا ہے۔

کتاب مفردات راغب نے کہا ہے کہ یہ وہ پہاڑ ہے جو موصل اور الجزیرہ کے درمیان ہے ''الجزیرہ'' شمالی عراق میں ایک جگہ ہے اور یہ ''الجزائر'' یا ''الجزیرہ'' نہیں جو آج کل مشہور ہے، بعید نہیں کہ ان سب کی بازگشت ایک ہی طرف ہو کیونکہ موصل، آمد اور الجزیرہ سب عراق کے شمالی علاقوں میں ہیں اور شام کے نزدیک ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ جودی سے مراد ہر مضبوط پہاڑ اور محکم زمین ہے، یعنی کشتی نوح ایک محکم زمین پر لنگر انداز ہوئی جو اس کی سواریوں کے اترنے کے لئے مناسب تھی لیکن مشہور معروف وہی پہلا معنی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام باسلامت اتر آئے

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی سبق آموز سرگزشت کے بارے میں یہ آخری حصہ ہے ان میں حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی سے اترنے اور نئے سرے سے روئے زمین پر معمول کی زندگی گزارنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ''نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ سلامتی اور برکت کے ساتھ جو ہماری طرف سے تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر ہے، اتر آؤ''۔ [۲]

اس میں شک نہیں کہ ''طوفان'' نے زندگی کے تمام آثار کو درہم برہم کر دیا تھا فطری طور پر آباد زمینیں، لہلہاتی چراگاہیں اور سرسبز باغ سب کے سب ویران ہو چکے تھے اس موقع پر شدید خطرہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب اور ساتھی زندگی گزارنے اور غذا کے سلسلے میں بہت تنگی کا شکار ہوں گے۔ لیکن خدا نے ان مومنین کو اطمینان دلایا کہ برکات الٰہی کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور زندگی اور معاش کے حوالے سے تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

علاوہ ازیں ممکن تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کو اپنی سلامتی کے حوالے سے یہ پریشانی ہوتی کہ طوفان کے بعد باقی ماندہ ان گندے پانیوں، جوہڑوں اور دلدلوں کے ہوتے ہوئے زندگی خطرے سے دوچار ہوگی لہٰذا خدا تعالیٰ اس سلسلے میں بھی انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور وہ ذات جس نے ظالموں کی نابودی کے لئے طوفان بھیجا ہے اہل ایمان کی سلامتی اور برکت کے لئے بھی ماحول فراہم کر سکتی ہے۔

---

[۱] روایات اور تواریخ میں اس کی شہادت موجود ہے، لکھا ہے: کچھ کفار قریش قرآن سے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قرآنی آیات جیسی کچھ آیات گھڑیں ان سے تعلق رکھنے والوں نے انہیں چالیس دن تک بہترین غذائیں مہیا کیں، مشروبات فراہم کیے اور ان کی ہر فرمائش پوری کی خالص گندم کا میدہ، بکرے کا گوشت، پرانی شراب غرض سب کچھ انہیں لا کر دیا تا کہ وہ آرام و راحت کے ساتھ قرآنی آیات جیسے جملوں کی ترکیب بندی کریں لیکن جب وہ مذکورہ آیت تک پہنچے تو اس نے انہیں اس طرح سے ہلا کر رکھ دیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ ایسی گفتگو ہے کوئی کلام اس سے مشابہت نہیں رکھتا، یہ کہہ کر انہوں نے اپناہ ارادہ ترک کر دیا اور مایوس ہو کر ادھر ادھر چلے گئے۔

[۲] سورہ ہود آیت 48

اس بناء پر جس طرح حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی پروردگار کے لا متناہی لطف وکرم کے سائے میں طوفان کے بعد ان تمام مشکلات کے باوجود سلامتی و برکت کے ساتھ جیتے رہے، اسی طرح مختلف قسم کے جانور جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی سے اترے تھے خدا کی طرف سے سلامتی وحفاظت کے ساتھ اور اس کے لطف وکرم کے سائے میں زندگی بسر کرتے رہے۔

کیا طوفان نوح علیہ السلام عالمگیر تھا؟

قرآن کی بہت سی آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کسی خاص علاقے کے لئے نہ تھا بلکہ پوری زمین پر رونما ہوا تھا کیونکہ لفظ "ارض" (زمین) مطلق طور پر آیا ہے:

''خداوندا روئے زمین پر ان کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ رہنے دے کہ جن کے بارے میں اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے''۔[۱]

اسی طرح سورہ ہود میں ارشاد ہوتا ہے: ''اے زمین اپنا پانی نگل لے''۔[۲]

بہت سی تواریخ سے بھی طوفان نوح علیہ السلام کے عالمگیر ہونے کی خبر ملتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ موجودہ تمام نسلیں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث کی اولاد میں سے ہیں جو کہ زندہ بچ گئے تھے۔

طبیعی تاریخ سے بھی سیلابی بارشوں کے نام سے ایک دور کا پتہ چلتا ہے اس دور کو اگر لازمی طور پر جانداروں کی پیدائش سے قبل سے مربوط نہ سمجھیں تو وہ بھی طوفان نوح پر منطبق ہوسکتا ہے۔[۳]

طوفان کے ذریعے سزا کیوں دی گئی؟

یہ صحیح ہے کہ ایک فاسد اور بری قوم کو نابود ہونا چاہئے، چاہے وہ کسی ذریعے سے نابود ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن آیات قرآنی میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ عذاب وسزا اور قوموں کے گناہوں میں ایک قسم کی مناسبت تھی اور ہے، فرعون نے عظیم دریائے نیل اور اس کے پر برکت پانی کو اپنی قوت وطاقت کا ذریعہ بنا رکھا تھا یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہی اس کی نابودی کا سبب بنا نمرود کو اپنے عظیم ظلم پر بھروسہ تھا اور ہم جانتے ہیں کہ حشرات الارض کے چھوٹے سے لشکر نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو شکست دے دی۔ قوم نوح زراعت پیشہ تھی ان کی کثیر دولت کا دارومدار زراعت پر ہی تھا۔

جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کوفہ میں رہتے تھے دوسری طرف بعض روایات کے مطابق

---

[۱] سورہ نوح آیت 26

[۲] سورہ ہود آیت 44

[۳] زمین کی طبیعی تاریخ میں یہ نظریہ بھی ہے کہ کرہ زمین کا محور تدریجی طور پر تغیر پیدا کرتا ہے یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی خطّ استوا میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور خط استوا قطب جنوبی کی جگہ لے لیتا ہے، واضح ہے کہ جب قطب شمالی وجنوبی میں موجود بہت زیادہ برف پگھل پڑے تو دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی سطح اس قدر اوپر آجائے گی کہ بہت سی خشکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور پانی زمین میں جہاں جہاں اسے گنجائش ملے گی ابلتے ہوئے چشموں کی صورت میں نکلے گا، پانی کی یہی وسعت بادلوں کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اور پھر زیادہ سے زیادہ بارشیں انہی بادلوں سے ہوتی ہیں۔

یہ امر کہ حضرت نوح نے زمین کے جانوروں کے چند نمونے بھی اپنے ساتھ لئے تھے طوفان کے عالمگیر ہونے کا موید ہے۔

(4) اس روئے زمین پر سبھی حضرت نوح کی اولاد سے ہیں؟ رجوع کریں تفسیر نمونہ ج10 ص503 سورہ صافات آیت 82 کی تفسیر میں ہم جانتے ہیں کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ بارش کے حیات بخش قطروں کو سمجھتے ہیں لیکن آخر کار بارش ہی نے انہیں تباہ وبرباد کرڈالا۔

طوفان مکہ اور خانہ کعبہ تک پھیلا ہوا تھا تو یہ صورت بھی اس بات کی موید ہے کہ طوفان عالمگیر تھا۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس امر کی بھی بالکل نفی نہیں کی جاسکتی کہ طوفان نوح ایک منطقہ کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ لفظ ''ارض'' (زمین) کا اطلاق قرآن میں کئی مرتبہ زمین کے ایک وسیع قطعے پر بھی ہوا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی سرگزشت میں ہے:

''ہم نے زمین کے مشارق اور مغارب بنی اسرائیل کے مستضعفین کے قبضے میں دیئے''[1]

کشتی میں جانوروں کو شاید اس بناء پر رکھا گیا ہو کہ زمین کے اس حصے میں جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو خصوصاً اس زمانے میں جانوروں کا دور دراز علاقوں سے منتقل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسی طرح دیگر مذکورہ قرائن اس بات پر منطبق ہو سکتے ہیں کہ طوفان نوح ایک خاص علاقہ میں آیا تھا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ طوفان نوح تو اس سرکش قوم کی سزا اور عذاب کے طور پر تھا اور ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین پر پہنچی تھی اصولی طور پر اس زمانے کے وسائل وذرائع کے ساتھ ایک پیغمبر کی دعوت کا (اس کے اپنے زمانے میں) زمین کے تمام خطوں اور علاقوں تک پہنچنا بعید نظر آتا ہے بہرحال اس عبرت خیز واقعے کو بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس میں چھپے اہم تربیتی نکات بیان کیے جائیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ یہ واقعہ عالمی ہو یا کسی ایک علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔

جناب نوح علیہ السلام کی بیوی

قرآن مجید دو بے تقویٰ عورتوں کی سرنوشت جو دو بزرگ پیغمبروں کے گھر میں تھیں، اور دو مومن وایثارگر خواتین کی سرنوشت بیان کرتا ہے جن میں سے ایک تاریخ کے جابر ترین شخص کے گھر میں تھی۔

پہلے فرماتا ہے ''خدا نے کافروں کے لئے ایک مثال بیان کی ہے نوح کی بیوی کی مثال اور لوط کی بیوی کی مثال'' وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے ان سے خیانت کی لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذاب الٰہی کے مقابلہ میں انہیں کوئی نفع نہیں دیا''۔[2]

حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام ''والھہ'' اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا نام ''والعۃ'' تھا1 اور بعض نے اس کے برعکس لکھا ہے یعنی نوح کی بیوی کا نام ''والعۃ'' اور لوط کی بیوی کا نام ''والھہ'' یا ''واہلہ'' کہا ہے۔

بہرحال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جائدہ عفت سے انحراف ہرگز نہیں تھا کیونکہ کسی پیغمبر کی بیوی ہرگز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے: ''کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافی عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی''۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور ان کے گھر کے راز انہیں بتاتی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

قرآن آخر میں کہتا ہے: ''اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ''[3]

---

[1] سورہ اعراف آیت 137

[2] سورہ تحریم آیت 10

[3] سورہ تحریم آیت 10

حضرت ہود علیہ السلام

قرآن مجید میں ذکر شدہ انبیاء کے ناموں میں حضرت ہود علیہ السلام بھی ہیں، جو قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے ،بعض مؤرخین کا نظریہ ہے کہ عاد کا اطلاق دو قبیلوں پر ہوتا ہے ایک وہ جو بہت پہلے تھا اور قرآن نے اسے عاد الاولی سے تعبیر کیا، وہ غالباً تاریخ سے پہلے موجود تھا، دوسرا قبیلہ جو تاریخ بشر کے دَور میں اور تقریباً ولادت مسیح سے سات سو سال پہلے تھا اور وہ عاد کے نام سے مشہور تھا۔ یہ احقاف یا یمن میں رہائش پزیر تھا۔

اس قبیلہ کے افراد بلند قامت اور قوی الجثہ تھے اور اسی بنا پر بہت نمایاں جنگجو شمار ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ وہ متمدن بھی تھے۔ان کے شہر آباد اور زمینیں سرسبز و شاداب تھیں۔ان کے باغات پر بہار تھے اور انہوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کیے تھے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ عاد اس قبیلے کے جد اعلی کا نام تھا اور وہ قبیلے کو اپنے جدّ (دادا) کے نام سے موسوم کر کے پکارتے تھے۔

شہرِ اِرم اور شداد کی بہشت

بعض مفسرین نے جزیرۃ العرب کے بیابانوں اور عدن کے صحراؤں میں شہر ارم کے برآمد ہونے کی ایک دلچسپ داستان بیان کی ہے جس میں وہ اس شہر کی بلند و بالا عمارات اور سامان زینت وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔لیکن مذکورہ داستان واقعیت کی نسبت خواب یا افسانے سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔

لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ قوم عاد طاقتور قبائل پر مشتمل تھی، ان کے شہر ترقی یافتہ تھے اور جیسا کہ قرآن اشارہ کرتا ہے، ان جیسے شہر پھر آباد نہیں ہو سکے۔

بہت سی داستانیں شداد کی جو عاد کا بیٹا تھا، زبان زد عام ہیں اور تاریخ میں مرقوم ہیں۔ یہاں تک کہ شداد کی بہشت اور اس کے باغات ضرب المثل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔لیکن ان داستانوں کی حقیقت کچھ نہیں ہے، یہ محض افسانے ہیں۔ یہ ایسے افسانے ہیں کہ ان کی حقیقت پر بعد میں حاشیہ آرائی کر لی گئی۔

حضرت ہود علیہ السلام برادر قوم عاد

قرآن نبی اللہ کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ''ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا''۔ [1]

یہاں حضرت ہود علیہ السلام کو بھائی کہا گیا تھا یہ تعبیر یا تو اس بناء پر ہے کہ عرب اپنے تمام اہل قبیلہ کو بھائی کہتے ہیں کیونکہ نسب کی اصل میں سب شریک ہوتے ہیں مثلاً بنی اسد کے شخص کو ''اخو اسدی'' کہتے ہیں اور مذحج قبیلہ کے شخص کو ''اخو مذحج'' کہتے ہیں، یا ہوسکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ حضرت ہود علیہ السلام کا سلوک اپنی قوم سے دیگر انبیاء کی طرح بالکل برادرانہ تھا نہ کہ ایک حاکم کا سا بلکہ ایسا بھی نہیں جو باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے بلکہ آپ کا سلوک ایسا تھا جو ایک بھائی دوسرے بھائیوں سے کرتا ہے کہ جس میں کوئی امتیاز اور برتری کا اظہار نہ ہو۔

---

[1] سورہ ہود آیت 50

حضرت ہود علیہ السلام کی بہترین دلیل

حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی دعوت کا آغاز دیگر انبیاء کی طرح کیا آپ کی پہلی دعوت توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی دعوت تھی، ہود نے ان سے کہا: ”اے میری قوم خدا کی عبادت کرو، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اللہ اور معبود لائق پرستش نہیں، بتوں کے بارے میں تمہارا اعتقاد غلطی اور اشتباہ پر مبنی ہے اور اس میں تم خدا پر افتراء باندھتے ہو“۔[۱]

یہ بت خدا کے شریک نہیں ہیں، نہ خیر وشر کے منشاء و مبداء، ان سے کوئی کام بھی نہیں ہوسکتا اس سے بڑھ کر کیا افتراء اور تہمت ہوگی کہ اس قدر بے وقعت موجودات کے لئے تم اتنے بڑے مقام و منزلت کا اعتقاد رکھتے ہو؟۔

اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام نے مزید کہا: ”اے میری قوم میں اپنی دعوت کے سلسلے میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا تم سے کسی قسم کی اجرت نہیں چاہتا“۔[۲]

کہ ”تم یہ گمان کرو کہ میری یہ داد و فریاد اور جوش و خروش مال و مقام کے حصول کے لئے ہے یا تم خیال کرو کہ تمہیں مجھے کوئی بھاری معاوضہ دینا پڑے گا جس کی وجہ سے تم تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو، میری اجرت صرف اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جس نے مجھے روح و جسم بخشے ہیں اور تمام چیزیں جس نے مجھے عطا کی ہیں وہی جو میرا خالق و رازق ہے میں اگر تمہاری ہدایت وسعادت کے لئے کوئی قدم اٹھاتا ہوں تو وہ اصولاً اس کے حکم اطاعت میں ہوتا ہے لہٰذا اجر و جزا بھی میں اسی سے چاہتا ہوں نہ کہ تم سے، علاوہ ازیں کیا تمہارے پاس اپنی طرف سے کچھ ہے جو تم مجھے دو، جو کچھ تمہارے پاس ہے اسی خدا کی طرف سے ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟“۔[۳]

آخر میں انہیں شوق دلانے کے لئے اور اس گمراہ قوم میں حق و حق طلبی کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے تمام ممکن وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے مشروط طور پر مادی جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو اس جہان میں خدا مومنین کو عطا فرماتا ہے ارشاد ہوتا ہے: ”اے میری قوم اپنے گناہوں پر خدا سے بخشش طلب کرو، پھر توبہ کرو اور اس کی طرف لوٹ آؤ اگر تم ایسا کرلو تو وہ آسمان کو حکم دے گا کہ وہ بارش کے حیات بخش قطرے پیہم تمہاری طرف بھیجے۔“[۴]

تا کہ تمہارے کھیت اور باغات کم آبی یا بے آبی کا شکار نہ ہوں اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں علاوہ ازیں تمہارے ایمان و تقوی، گناہ سے پرہیز اور خدا کی طرف رجوع اور توبہ کی وجہ سے ”تمہاری قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔“[۵]

یہ کبھی گمان نہ کرو کہ ایمان و تقویٰ سے تمہاری قوت میں کمی واقع ہوگی ایسا ہرگز نہیں بلکہ تمہاری جسمانی و روحانی قوت میں اضافہ ہوگا۔

اس کمک سے تمہارا معاشرہ آباد تر ہوگا، جمعیت کثیر ہوگی، اقتصادی حالات بہتر ہونگے اور تم طاقتور، آزاد اور خود مختار ملت بن جاؤ گے لہٰذا راہ حق سے روگردانی نہ کرو اور شاہراہ گناہ پر قدم نہ رکھو۔

---

[۱] سورہ ہود آیت 50

[۲] سورہ ہود آیت 51

[۳] سورہ ہود آیت 51

[۴] سورہ ہود آیت 52

[۵] سورہ ہود آیت 52

اے ہود تم ہمارے خداؤں کے غضب سے دیوانہ ہوگئے ہو

اب دیکھتے ہیں کہ اس سرکش اور مغرور قوم یعنی قوم عاد نے اپنے بھائی ہود، ان کے پند و نصائح اور ہدایت و رہنمائی کے مقابلے میں کیا ردّعمل ظاہر کیا۔

انہوں نے کہا: ''اے ہود: تو ہمارے لئے کوئی واضح دلیل نہیں لایا، ہم ہرگز تیری باتوں پر ایمان نہیں لائیں گے''۔[1]

ان تین غیر منطقی جملوں کے بعد انہوں نے مزید کہا: ''ہمارا خیال ہے کہ تو دیوانہ ہوگیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تو ہمارے خداؤں کے غضب کا شکار ہوا ہے اور انہوں نے تیری عقل کو آسیب پہنچایا ہے''۔[2]

اس میں شک نہیں کہ (جیسے تمام انبیاء کا طریقہ کار ہوتا ہے اور ان کی ذمہ داری ہے) حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کئی ایک معجزے دکھائے ہوں گے لیکن انہوں نے اپنے کبر و غرور کی وجہ سے دیگر ہٹ دھرم قوموں کی طرح معجزات کا انکار کیا اور انہیں جادو قرار دیا اور انہیں اتفاقی حوادث گردانا کہ جنہیں کسی معاملے میں دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام پر ''جنون'' کی تہمت لگائی اور ''جنون'' بھی وہ جو ان کے زعم ناقص میں ان کے خداؤں کے غضب کا نتیجہ تھا، ان کے بے ہودہ پن اور خرافات پرستی کی خود ایک بہترین دلیل ہے۔

بے جان اور بے شعور پتھر اور لکڑیاں جو خود اپنے ''بندوں'' کی مدد کی محتاج ہیں وہ ایک عقلمند انسان سے کس طرح اس کا عقل و شعور چھین سکتی ہیں علاوہ ازیں ان کے پاس ہود کے دیوانہ ہونے کی کونسی دلیل تھی، اگر یہ دیوانگی کی دلیل ہے تو پھر تمام مصلحین جہان اور انقلابی لوگ جو غلط روش اور طریقوں کے خلاف قیام کرتے ہیں سب دیوانے ہونے چاہئیں۔

کیوں بت مجھے نابود نہیں کرتے

بہرحال حضرت ہود علیہ السلام کی ذمہ داری تھی کہ اس گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کو دندان شکن جواب دیتے، ایسا جواب جو منطق کی بنیاد پر بھی ہوتا اور طاقت سے بھی ادا ہوتا، قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے ان کے جواب میں چند جملے کہے: ''میں خدا کو گواہی کے لئے بلاتا ہوں، اور تم سب بھی گواہ رہو کہ میں ان بتوں اور تمہارے خداؤں سے بیزار ہوں''۔[3]

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ اگر یہ بت طاقت رکھتے ہیں تو ان سے کہو کہ مجھے ختم کردیں، میں جو علی الاعلان ان کے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور اعلانیہ ان سے بیزاری اور نفرت کا اعلان کر رہا ہوں وہ کیوں خاموش اور معطل ہیں، کس چیز کے منتظر ہیں اور کیوں مجھے نابود اور ختم نہیں کردیتے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ نہ فقط یہ کہ ان سے کچھ نہیں ہوسکتا بلکہ تم بھی اتنی کثرت کے باوجود کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے ''اگر سچ کہتے ہو تو تم سب مل کر میرے خلاف جو سازش کرسکتے ہو کر گزرو اور مجھے لحہ بھر کی بھی مہلت نہ دو''۔[4]

میں تمہاری اتنی کثیر تعداد کو کیوں کچھ نہیں سمجھتا اور کیوں تمہاری طاقت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، تم جو کہ میرے خون کے پیاسے

---

[1] سورہ ہود آیت 53

[2] سورہ ہود آیت 54

[3] سورہ ہود آیت 54

[4] سورہ ہود آیت 50

ہواور ہرقسم کی طاقت رکھتے ہو،اس لئے کہ میرا رکھوالا اللہ ہے، وہ جس کی قدرت سب طاقتوں سے بالاتر ہے”میں نے خدا پرتوکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے“۔[۱]

یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، یہ اس امر کی نشانی ہے کہ میں نے دل کسی اور جگہ نہیں باندھ رکھا اگر صحیح طور پر سوچو تو یہ خود ایک قسم کا معجزہ ہے کہ ایک انسان تن تنہا بہت سے لوگوں کے بے ہودہ عقائد کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔

جبکہ وہ طاقتور اور متعصب بھی ہوں یہاں تک کہ انہیں اپنے خلاف قیام کی تحریک کرے اس کے باوجود اس میں خوف وخطر کے کوئی آثار نظر نہ آئیں اور پھر نہ اس کے دشمن اس کے خلاف کچھ کر سکتے ہوں۔

آخرکار حضرت ہود علیہ السلام ان سے کہتے ہیں:

”اگر تم راہ حق سے روگردانی کرو گے تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے“۔[۲]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ اگر میری دعوت قبول نہ کی جائے تو میرے لئے کوئی شکست ہے میں نے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے اور فریضہ کی انجام دہی کامیابی ہے اگرچہ میری دعوت قبول نہ کی جائے۔

دراصل یہ سچے رہبروں اور راہ حق کے پیشواؤں کے لئے ایک درس ہے کہ انہیں اپنے کام پر کبھی بھی خستگی و پریشانی کا احساس نہیں ہونا چاہئے چاہے لوگ ان کی دعوت کو قبول نہ بھی کریں۔

جیسا کہ بت پرستوں نے آپ کو دھمکی دی تھی، اس کے بعد آپ انہیں شدید طریقے پر عذاب الٰہی کی دھمکی دیتے ہوئے کہتے ہیں:

”اگر تم نے دعوت حق قبول نہ کی تو خدا عنقریب تمہیں نابود کر دے گا اور کسی دوسرے گروہ کو تمہارا جانشین بنا دے گا اور تم اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“[۳]

”اور یہ بھی جان لو کہ میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ ہے اور ہر حساب و کتاب کی نگہداری کرتا ہے“۔[۴]

نہ موقع اس کے ہاتھ سے جاتا ہے اور نہ وہ موقع کی مناسبت کو فراموش کرتا ہے نہ وہ اپنے انبیاء اور دوستوں کو طاق نسیاں کرتا ہے اور نہ کسی شخص کا حساب و کتاب اس کے علم سے پوشیدہ ہوتا ہے بلکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے۔

اس ظالم قوم پر ابدی لعنت

قوم عاد اور ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کی سرگذشت سے مربوط آیات کے آخری حصے میں ان سرکشوں کی دردناک سزا اور عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن پہلے کہتا ہے:

”جب ان کے عذاب کے بارے میں ہمارا حکم آ پہنچا تو ہود اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لا چکے تھے ہماری ان پر رحمت اور لطف خاص نے انہیں نجات بخشی“۔[۵]

---

[۱] سورہ ہود آیت 56

[۲] سورہ ہود آیت 57

[۳] سورہ ہود آیت 57

[۴] سورہ ہود آیت 57

[۵] سورہ ہود آیت 58

پھر مزید تاکید کے لئے فرمایا: ''ہم نے اس صاحب ایمان قوم کو شدید عذاب سے رہائی بخشی''۔[1]

یہ امر جاذب نظر ہے کہ بے ایمان، سرکش اور ظالم افراد کے لئے عذاب وسزا معین کرنے سے پہلے صاحب ایمان قوم کی نجات کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ خیال پیدا نہ ہو جیسا کہ مشہور ضرب المثل ہے کہ عذاب الٰہی کے موقع پر خشک وتر سب جل جاتے ہیں کیونکہ وہ حکیم اور عادل ہے اور محال ہے کہ وہ ایک بھی صاحب ایمان شخص کو بے ایمان اور گنہگار لوگوں کے درمیان عذاب کرے، بلکہ رحمت الٰہی ایسے افراد کو عذاب وسزا کے نفاذ سے پہلے ہی امن وامان کی جگہ پر منتقل کر دیتی ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس سے پہلے کہ طوفان آئے، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نجات تیار تھی، اور اس سے پہلے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے شہر تباہ وبرباد ہوں حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے انصار راتوں رات حکم الٰہی سے وہاں سے نکل آئے۔

یہ مناسبت بھی قابل ملاحظہ ہے کہ قوم عاد کے لوگ سخت اور بلند قامت تھے ان کے قد کو کھجور کے درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے اسی مناسبت سے ان کی عمارتیں مضبوط، بڑی اور اونچی تھیں یہاں تک کہ قبل اسلام کی تاریخ میں ہے کہ عرب بلند اور مضبوط عمارتوں کی نسبت قوم عاد ہی کی طرف دیتے ہوئے انہیں ''عدی'' کہتے تھے، اسی لئے ان پر آنے والا عذاب بھی انہی کی طرح غلیظ اور سخت تھا، نہ صرف اخرت کا عذاب، بلکہ اس دنیا میں سخت سے سخت عذاب دیا گیا۔

عذاب الٰہی ایک نحس دن میں

قرآن مجید قوم عاد پر عذاب الٰہی کے بارے میں فرماتا ہے: ''ہم نے ان پر وحشت ناک، سرد اور تیز آندھی، ایک ایسے منحوس دن میں جو بہت طویل تھا، ان کی طرف بھیجی''۔

اس کے بعد اس تیز آندھی کی کیفیت کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے کہ ''لوگوں کو گھن کھائے ہوئے کھجور کے تنوں کی طرح اکھاڑ دیا اور وہ ان کو ہر طرف پھینکتی تھی۔[2]

قوم عاد کے لوگ قوی الجثہ تھے، انہوں نے تیز آندھی سے بچنے کے لئے زمین میں گڑھے کھود رکھے تھے اور زیر زمین پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لیکن اس روز آنے والی آندھی اتنی زوردار اور طاقتور تھی کہ ان کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالتی تھی اور ادھر اُدھر پھینکتی تھی وہ ان کو اس زور سے زمین پر پٹختی تھی کہ ان کے سر تن سے جدا ہو جاتے تھے۔ آندھی اس قدر تیز تھی کہ پہلے ان کے ہاتھ پیروں اور سروں کو جدا کرتی تھی، اس کے بعد ان کے اجسام کو بے شاخ وبرگ کھجور کی طرح زمین سے اکھاڑتی تھی اور ادھر ادھر لئے پھرتی تھی۔

قرآن کریم اس قوم کے عذاب کے بارے میں دوسری جگہ کہتا ہے: ''قوم عاد کی سرگذشت میں بھی ایک آیت وعبرت ہے، جبکہ ہم نے ان پر ایک عقیم اور بغیر بارش کا طوفان بھیجا''۔[3]

ہواؤں کا عقیم اور بانجھ ہونا اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ بارش برسانے والے بادل اپنے ساتھ لے کر نہ چلیں، گیاہ ونباتات میں اپنے عمدہ اثرات نہ چھوڑیں، ان میں کوئی فائدہ اور برکت نہ ہو اور ہلاکت ونابودی کے سوا کوئی چیز ہمراہ نہ لائیں۔

اس کے بعد اس سخت آندھی کی خصوصیت جو قوم عاد پر مسلط ہوئی تھی، بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''وہ جس چیز کے

---

[1] سورہ ہود آیت 58

[2] سورہ قمر آیت 20

[3] سورہ ذاریات آیت 41

پاس سے گزرتی تھی اس کو نابود کئے بغیر نہ چھوڑتی تھی، اور خشک کٹی پھٹی گھاس یا بوسیدہ ہڈیوں کی صورت میں بدل دیتی تھی''۔[1]

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قوم عاد کی تیز آندھی ایک عام تیز آندھی نہیں تھی، بلکہ انہیں تباہ کرنے اور کوٹنے چھٹنے یا پھر پیٹنے کے علاوہ اور اصطلاح کے مطابق فزیکل دباؤ سے، جلانے اور زہریلا بنانے کی خاصیت رکھتی تھی، جو طرح طرح کی اشیاؤں کو بوسیدہ اور کہنہ بنا دیتی تھی، جی ہاں، اس طرح خدا کی قدرت ''نسیم سحر'' کو ایک تیز آندھی میں بدل کر بڑی بڑی طاقتور قوموں کو اس طرح درہم وبرہم کر دیتی ہے کہ صرف ان کے بوسیدہ جسم باقی رہ جاتے ہیں۔

کیا ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو

قرآن اس کے بعد اس تیز اور سرکوب کرنے والی آندھی کی ایک دوسری توصیف کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''خدا نے اس کو اس قوم پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان کی بنیادیں اکھاڑنے کے لئے مسلط کئے رکھا''۔[2]

سات راتوں اور آٹھ دنوں میں اس عظیم قوم کی وسیع اور بارونق زندگی کو بالکل تباہ وبرباد کیا اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پراگندہ کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ''اگر تو وہاں ہوتا تو مشاہدہ کرتا کہ وہ ساری قوم منہ کے بل گری پڑی ہے اور سوکھے اور کھوکھلے درختوں کی طرح ڈھیر ہو گئے ہیں''۔[3]

کتنی عمدہ تشبیہ ہے، جو ان کے طویل قد وقامت کو بھی مشخص کرتی ہے، ان کے جڑ سے اکھڑ جانے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور خدا کے عذاب کے مقابلہ میں ان کے اندر سے خالی ہونے کو بھی بیان کرتی ہے اس طرح کہ وہ تیز آندھی جدھر چاہتی ہے انہیں آسانی کے ساتھ لے جاتی ہے۔

قرآن اس واقعہ کے آخر میں مزید کہتا ہے ''کیا تم ان سے کسی کو باقی دیکھتے ہو''؟۔[4]

ہاں: آج نہ صرف قوم عاد کا کوئی نام ونشان باقی نہیں بلکہ ان کے آباد شہروں اور پرشکوہ عمارتوں کے کھنڈرات اور ان کے سبز کھیتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام

قوم ثمود اور اس کے پیغمبر جناب صالح علیہ السلام کی جو ''وادی القریٰ'' میں رہتے تھے جو ''مدینہ'' اور ''شام'' کے درمیان واقع ہے یہ قوم اس سرزمین میں خوشحال زندگی بسر کر رہی تھی لیکن اپنی سرکشی کی بناء پر صفحہ ہستی سے یوں مٹ گئی کہ آج اس کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔

قرآن اس سلسلے میں فرماتا ہے: ''قوم ثمود نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا''۔[5]

کیونکہ تمام انبیاء کی دعوت حق ایک جیسی تھی اور اس قوم کا اپنے پیغمبر جناب صالح کی تکذیب کرنا درحقیقت تمام رسولوں کی

[1] سورہ ذاریات آیت 32

[2] سورہ حاقہ آیت 7

[3] سورہ حاقہ آیت 7

[4] سورہ حاقہ آیت 8

[5] سورہ شعراء آیت 141

تکذیب کے مترادف تھا۔

''جبکہ ان کے ہمدرد پیغمبر صالح نے ان لوگوں سے کہا آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟''[1]

وہ جو کہ تمہارے بھائی کی طرح تمہارا ہادی اور رہبر تھا اس کی نظر میں نہ برتری جتانا تھا اور نہ ہی مادی مفادات، اسی لئے قرآن نے جناب صالح علیہ السلام کو ''اخوہم'' سے تعبیر کیا ہے جناب صالح علیہ السلام نے بھی دوسرے انبیاء کی مانند اپنی دعوت کا آغاز تقویٰ اور فرض کے احساس سے کیا۔

پھر اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں: ''میں تمہارے لئے امین پیغمبر ہوں''[2]

میرا ماضی میرے اس دعویٰ کی بین دلیل ہے۔

''اسی لئے تم تقویٰ اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو''[3]

کیونکہ میرے مدنظر رضائے الٰہی، تمہاری خیر و خوبی اور سعادت کے سوا اور کچھ نہیں۔

بنابریں ''اس دعوت کے بدلے میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔''[4]

میں تو کسی اور کے لئے کام کرتا ہوں اور میرا اجر بھی اسی کے پاس ہے ''ہاں تو میرا اجر صرف عالمین کے پروردگار کے پاس ہے''۔[5]

یہ جناب صالح علیہ السلام کی داستان کا ابتدائی حصہ تھا جو دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے ایک دعوت کا پیش کرنا اور دوسرے رسالت کو بیان کرنا۔

پھر دوسرے حصے میں افراد قوم کی زندگی کے قابل تنقید اور حساس پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے: ''آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ امن وسکون اور ناز ونعمت کی زندگی بسر کرتے رہو گے''۔[6]

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ مادی اور غفلت کی زندگی ہمیشہ کے لئے ہے اور موت، انتقام اور سزا کا ہاتھ تمہارے گریبانوں تک نہیں پہنچے گا؟

''کیا تم گمان کرتے ہو کہ یہ باغات اور چشمے اور یہ کھیت اور کھجور کے درخت جن کے پھل شیریں وشاداب اور پکے ہوئے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں گے۔''[7]

پھر ان پختہ اور خوشحال گھروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں: ''تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو اور اس میں عیاشی کرتے ہو''۔[8]

---

[1] سورہ شعراء آیت 142

[2] سورہ شعراء آیت 143

[3] سورہ شعراء آیت 145

[4] سورہ شعراء آیت 145

[5] سورہ شعراء آیت 145

[6] سورہ شعراء آیت 145

[7] سورہ شعراء آیت 147 تا 148

[8] سورہ شعراء آیت 149

جبکہ قوم ثمود شکم کی اسیر اور ناز ونعمت بھری خوشحال زندگی سے بہرہ مند تھی۔

فاسداوراسراف کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو

حضرت صالح علیہ السلام اس تنقید کے بعد انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''حکم خدا کی مخالفت سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اور مسرفین کا حکم نہ مانو، وہی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔''[1] ''یہ دھیان میں رہے کہ خدا نے قومِ عاد کے بعد تمہیں ان کا جانشین اور خلیفہ قرار دیا ہے اور زمین میں تمہیں جگہ دی ہے''[2]

یعنی ایک طرف تو تم کو اللہ کی نعمتوں کا خیال رہنا چاہئے، دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ تم سے پہلے جو قوم تھی وہ اپنی سرکشی اور طغیانی کے باعث عذاب الٰہی سے تباہ و برباد ہو چکی ہے۔

پھر اس کے بعد انہیں عطا کی گئی کچھ نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''تم ایک ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتے ہو جس میں ہموار میدان بھی ہیں جن کے اوپر تم عالیشان قصر اور آرام دہ مکانات بنا سکتے ہو، نیز اس میں پہاڑی علاقے بھی ہیں جن کے دامن میں تم مضبوط مکانات تراش سکتے ہو (جو سخت موسم، اور سردیوں کے زمانے میں) تمہارے کام آ سکتے ہیں''۔[3]

اس تعبیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ (قوم عاد) سردی اور گرمی میں اپنی سکونت کی جگہ بدل دیتے تھے فصل بہار اور گرمیوں میں وسیع اور پر برکت میدانوں میں زراعت کرتے تھے اور پرندے اور چوپائے پالنے میں مشغول رہا کرتے تھے اس وجہ سے وہ وہاں خوبصورت اور آرام دہ مکانات بناتے تھے جو انہوں نے پہاڑوں پر تراش کر بنائے تھے اور یہ مکانات انہیں سیلابوں اور طوفانوں سے محفوظ رکھتے تھے یہاں وہ اطمینان سے سردی کے دن گزار دیتے تھے۔ آخر میں فرمایا گیا ہے:

''خداوند کریم کی ان سب نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ کرو اور کفران نعمت نہ کرو''۔[4]

قوم صالح کی ہٹ دھرمی

آپ حضرات، گمراہ قوم کے سامنے حضرت صالح علیہ السلام کی منطقی اور خیر خواہی پر مبنی گفتگو ملاحظہ فرما چکے ہیں جناب صالح علیہ السلام کے جواب میں اس قوم کی گفتگو بھی سنیے۔

انھوں نے کہا: ''اے صالح: تم سحر زدہ ہو کر اپنی عقل کھو چکے ہو، لہٰذا غیر معقول باتیں کرتے ہو''۔[5]

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بسا اوقات جادوگر لوگ جادو کے ذریعے انسان کی عقل و ہوش کو بیکار بنا دیتے ہیں صرف انھوں نے جناب صالح پر ہی یہ تہمت نہیں لگائی بلکہ اور لوگوں نے بھی دوسرے انبیاء پر ایسی تہمتیں لگائی ہیں، حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک کو متہم کیا۔

جی ہاں ان کے نزدیک عقل مند انسان وہ ہوتا ہے جو ماحول میں ڈھل جائے ابن الوقت بن جائے اور خود تمام برائیوں پر منطبق ہو جائے اگر کوئی انقلابی مرد خدا فاسد عقائد اور غلط نظام کے بطلان کے لئے قیام کرتا تو وہ اپنی اس منطق کی رو سے اسے

---

[1] سورہ شعراء آیات 150 تا 152

[2] سورہ اعراف آیت 74

[3] سورہ اعراف آیت 74

[4] سورہ اعراف آیت 74

[5] سورہ شعراء آیت 53

دیوانہ، مجنون اور سحر زدہ کہتے۔

اسی طرح قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے''اس خود پسند طبقے نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا کہ آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، حالانکہ ہم نے انہیں دنیا کی بہت سی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ تمہاری ہی طرح کا انسان ہے جو تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے۔اور جو تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے''۔[1]

بے شک وہ اشراف کا خوشحال طبقہ جو قرآن مجید کی اصطلاح میں صرف ظاہر بین تھا اور کور باطن تھا وہ اس عظیم پیغمبر کے مشن کو اپنے مفاد کا مخالف، ناجائز منافع خواری، استحصال اور بے جا بالا دستی سے متصادم دیکھ رہا تھا، یہ طبقہ اپنی پر عیش زندگی کی وجہ سے اللہ سے کوسوں دور چلا گیا تھا اور آخرت کا منکر تھا۔

انہوں نے اللہ کے نمائندوں کے انسان ہونے اور دیگر انسانوں کی طرح کھانے پینے کو ان کی رسالت کی نفی کی دلیل قرار دیا حالانکہ یہ بات ان مایہ ناز شخصیتوں کی نبوت و رسالت کی پرزور تائید تھی کہ وہ عام لوگوں میں سے ہوں تاکہ انسان کی ضروریات اور مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہوں، مزید برآں وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے:''اگر تم اپنے ہی جیسے آدمی کے مطیع بنو گے تو یہ بڑی نقصان دہ بات ہوگی''۔[2]

یہ کور باطن اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ خود تو یہ توقع کر رہے ہیں کہ لوگ ان کے شیطانی عزائم کی تکمیل اور پیغمبر سے مقابلے کے لئے ان کی پیروی کریں، مگر اس شخصیت کی اطاعت و پیروی کو جو مرکز وحی سے وابستہ ہے اور جس کا دل نور علم پروردگار عالمین سے منور ہے انسان کے لئے ذلت، ننگ و عار اور حریت کے منافی بتا رہے تھے۔

کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے

اس کے بعد انھوں نے معاد اور قیامت کا انکار کیا، جس کو ماننا ہمیشہ سے خودسر اور ہوا و ہوس کے رہبروں کے لئے مشکل رہا ہے اور کہا:

''کیا یہ شخص تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ مرنے کے بعد مٹی اور بوسیدہ ہڈی ہو جانے کے بعد تم ایک بار پھر قبروں سے نکلو گے اور ایک نئی زندگی پاؤ گے۔''(یہ بہت دور اور بہت دور کی بات ہے وہ وعدے جو تم سے کئے گئے ہیں وہ بالکل بے بنیاد اور کھوکھلے ہیں)[3]

مجموعی طور پر کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جو مر گیا ہو، مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہو، اس کے اجزاء ادھر ادھر بکھر گئے ہوں، وہ دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ محال ہے، یہ محال بات ہے۔

آخر میں اپنے نبی پر ایک مجموعی الزام لگاتے ہوئے انہوں نے کہا یہ ایک جھوٹا شخص ہے، جس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے''[4]

نہ اس کی رسالت اللہ کی طرف سے ہے نہ قیامت سے متعلق اس کے وعدے سچے ہیں اور نہ ہی دوسرے احکام ایسے ہیں، کوئی عقلمند آدمی اس پر کیسے ایمان لا سکتا ہے۔

---

[1] سورہ مومنون آیت 33

[2] سورہ مومنون آیت 34

[3] سورہ مومنون 35 تا 36

[4] سورہ مومنون آیت 37

اے صالح علیہ السلام ہم تم پر امید رکھتے تھے

انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو غیر مؤثر بنانے کے لئے یا کم از کم ان کی باتوں کو بے تاثر کرنے کے لئے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا وہ آپ کو دھوکا دینا چاہتے تھے، کہنے لگے: ''اے صالح اس سے پہلے تو ہماری امیدوں کا سرمایہ تھا۔''[۱]

مشکلات میں ہم تیری پناہ لیتے تھے، تجھ سے مشورہ کرتے تھے، تیرے عقل وشعور پر ایمان رکھتے تھے، اور تیری خیر خواہی اور ہمدردی میں ہمیں ہرگز کوئی شک نہ تھا۔

لیکن افسوس کہ تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، دین بت پرستی کی اور ہمارے خداؤں کی مخالفت کرکے کہ جو ہمارے بزرگوں کا رسم ورواج تھا اور ہماری قوم کے افتخارات میں سے تھا تو نے ظاہر کر دیا کہ تو بزرگوں کے احترام کا قائل نہیں ہے نہ ہماری عقل پر تمہیں کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی تو ہمارے طور طریقوں کا حامی ہے۔ ''کیا سچ مچ تو ہمیں ان کی پرستش سے روک دینا چاہتا ہے جن کی عبادت ہمارے آباؤاجدا کیا کرتے تھے۔''[۲]

تم کتنے نحس قدم ہو

بہر حال اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کی ہمدردانہ نصیحتوں کو دل کے کانوں سے سننے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی بجائے واہیات اور بے کار باتوں کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی، منجملہ اور باتوں کے انھوں نے کہا: ''ہم تمہیں اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں سب کو ایک بری فال سمجھتے ہیں''۔[۳]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ سال خشک سالی اور قحط سالی کا تھا اسی لئے وہ صالح علیہ السلام سے کہنے لگے: ''کہ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے نامبارک قدموں کی بدولت ہوا ہے''۔ تم منحوس لوگ ہو، ہمارے معاشرے میں تم ہی بدبختی اور نحوست لائے ہو، وہ بری فال کو اس بہانے سے جو درحقیقت بے کار اور شریر لوگوں کا بہانہ ہوتا ہے، جناب صالح علیہ السلام کے بہترین دلائل کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

لیکن جناب صالح علیہ السلام نے جواب میں کہا: ''بری فال (اور تمہارا نصیب) تو خدا کے پاس ہی ہے''۔[۴]

اسی نے تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں ان مصائب میں ڈال دیا ہے اور تمہارے اعمال ہی تمہاری اس سزا کا سبب بنے ہیں۔

درحقیقت تمہارے لئے یہ خدا کی ایک عظیم آزمائش ہے جی ہاں: ''تم ہی ایسے لوگ ہو جن کی آزمائش کی جائے گی''۔[۵]

یہ خدا کی آزمائش ہوتی ہے اور خبر دار کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں تاکہ جو لوگ سنبھل جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سنبھل جائیں، خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں، غلط راستے کو چھوڑ کر خدائی راستے کو اختیار کر لیں۔

---

[۱] سورہ ہود آیت 62

[۲] سورہ ہود آیت 62

[۳] سورہ نمل آیت 47

[۴] سورہ نمل آیت 47

[۵] سورہ نمل آیت 47

ناقہ صالح علیہ السلام

اس کے بعد آپ نے اپنی دعوت کی حقانیت کے لئے معجزے اور نشانی کی نشاندہی کی، ایسی نشانی جو انسانی قدرت سے ماورا ہے اور صرف قدرت الٰہی کے سہارے پیش کی گئی ہے ان سے کہا: ''اے میری قوم: یہ ناقہ الٰہی تمہارے لئے آیت اور نشانی ہے اسے چھوڑ دو کہ یہ بیابانوں چراگاہوں میں گھاس پھوس کھائے''، ''اور اسے ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچانا اگر ایسا کرو گے تو فوراً تمہیں دردناک عذاب الٰہی گھیر لے گا''۔[1]

لغت میں ''ناقہ'' اونٹنی کے معنی میں ہے۔ یہاں اور قرآن کی بعض دیگر آیات میں اس کی اضافت خدا کی طرف سے کی گئی ہے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اونٹنی کچھ خصوصیات رکھتی تھی

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہاں پر اس کا ذکر آیت الٰہی اور دلیل حقانیت کے طور پر آیا ہے، واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اونٹنی ایک عام اونٹنی نہ تھی اور ایک حوالے سے یا کئی حوالوں سے معجزہ کے طور پر تھی لیکن قرآن میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ نہیں آیا کہ اس ناقہ کی خصوصیات کیا تھیں اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام اونٹنی نہ تھی۔ بس یہی ایک چیز قرآن میں دو مواقع پر موجود ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اس ناقہ کے بارے میں اپنی قوم کو بتایا کہ اس علاقے میں پانی کی تقسیم ہونا چاہئے ''ایک دن پانی ناقہ کا حصہ ہے اور ایک دن لوگوں کا''۔[2]

لیکن یہ بات پوری طرح مشخص نہیں ہو سکی کہ پانی کی یہ تقسیم کس طرح خارق العادت تھی ایک احتمال یہ ہے کہ وہ اونٹنی بہت زیادہ پانی پیتی تھی اس طرح چشمہ کا تمام پانی اس کے لئے مخصوص ہو جاتا دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس وقت وہ پانی پینے کے لئے آتی تو دوسرے جانور پانی پینے کی جگہ پر آنے کی جرأت نہ کرتے۔

ایک سوال یہ ہے کہ یہ جانور تمام پانی سے کس طرح استفادہ کرتا تھا اس سلسلے میں یہ احتمال ہے کہ اس بستی کا پانی کم مقدار میں ہو جیسے بعض بستیوں میں ایک ہی چھوٹا سا چشمہ ہوتا ہے اور بستی والے مجبور ہوتے ہیں کہ دن بھر کا پانی ایک گڑھے میں اکٹھا کریں تاکہ کچھ مقدار جمع ہو جائے اور اسے استعمال کیا جا سکے۔

لیکن دوسری طرف قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''قوم ثمود تھوڑے پانی والے علاقے میں زندگی بسر نہیں کرتی تھی بلکہ وہ لوگ تو باغوں، چشموں، کھیتوں اور نخلستان کے مالک تھے''۔[3]

بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ناقہ صالح کے بارے میں اس مسئلہ پر قرآن نے اجمالاً ذکر کیا نیز سورۂ قمر کی آیت 28 میں ہے:

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾

سورۂ شمس آیت ۱۳ میں بھی اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے:

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾

---

[1] سورہ ہود آیت 64

[2] سورۂ شعراء آیت 155

[3] سورہ شعراء آیت 146 تا 148

ہے لیکن بعض روایات جو شیعہ اور سنی دونوں فریقوں کے یہاں نقل ہوئی ہیں ان میں بیان ہوا ہے کہ اس ناقہ کے عجائب خلقت میں سے یہ تھا کہ وہ پہاڑ کے اندر سے باہر نکلی اس کے بارے میں کچھ اور خصوصیات بھی منقول ہیں۔

بہر کیف حضرت صالح علیہ السلام جیسے عظیم نبی نے اس ناقہ کے بارے میں بہت سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے آخر کار ناقہ کو ختم کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا کیونکہ اس کی خارق العادۃ اور غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو رہی تھی اور وہ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف مائل ہو رہے تھے لہٰذا قوم ثمود کے کچھ سرکشوں نے جو حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کے اثرات کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے اور وہ ہرگز لوگوں کی بیداری نہیں چاہتے تھے کیونکہ خلق خدا کی بیداری سے ان کے استعماری مفادات کو نقصان پہنچتا، لہٰذا انھوں نے ناقہ کو ختم کرنے کی سازش تیار کی کچھ افراد کو اس کام پر مامور کیا گیا آخر کار ان میں سے ایک نے ناقہ پر حملہ کیا اور اس پر ایک یا کئی وار کئے" اور اسے مار ڈالا"۔[1]

اگر تم سچے ہو تو عذاب میں جلدی کرو

انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس کے بعد وہ حضرت صالح علیہ السلام کے پاس آئے اور اعلانیہ ان سے کہنے لگے: "اگر تم واقعاً خدا کے رسول ہو تو جتنی جلد ہو سکے عذاب الٰہی لے آؤ"۔[2]

لیکن صالح علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم: تم نیکیوں کی کوشش اور ان کی تلاش سے پہلے ہی عذاب اور برائیوں کے لئے جلدی کیوں کرتے ہو؟"[3]

تم اپنی تمام تر فکر عذاب الٰہی کے نازل ہونے پر ہی کیوں مرکوز کرتے ہو؟ اگر تم پر عذاب نازل ہو گیا تو پھر تمہارا خاتمہ ہو جائے گا اور ایمان لانے کا موقع بھی ہاتھ سے چلا جائے گا۔ آؤ اور خدا کی برکت اور اس کی رحمت کے ساتھ ایمان کے زیر سایہ میری سچائی کو آزماؤ تم خدا کی بارگاہ سے اپنے گناہوں کی بخشش کا سوال کیوں نہیں کرتے ہو؟ تا کہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ صرف برائیوں اور عذاب نازل ہونے کا تقاضا کیوں کرتے ہو؟ یہ ہٹ دھرمی اور پاگل پن کی باتیں آخر کس لئے؟ یہ بات واقعاً عجیب ہے کہ انسان دعوائے محبت کی صداقت کو تباہ کن عذاب کے ذریعہ جانچ رہا ہے نہ کہ رحمت کا سوال کر کے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبی طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کی صداقت کے معترف تھے لیکن زبان سے اس کا انکار کیا کرتے تھے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے کوئی شخص علم طب کا مدعی ہو اور اسے معلوم ہو کہ فلاں دوا سے صحت اور شفا حاصل ہوتی ہے اور فلاں چیز سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن وہ ایسی دوا حاصل کرنے کی کوشش کرے جو مہلک ہے نہ کہ جو مفید اور شفاء بخش۔ یہ تو واقعاً جہالت و نادانی کی حد ہے، کیونکہ یہ سب جہالت ہی کا نتیجہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کی سرکشی، نافرمانی اور اس کے ہاتھوں قتل ناقہ کے بعد اسے خطرے سے آگاہ کیا اور کہا:

"پورے تین دن تک اپنے گھروں میں جس نعمت سے چاہو استفادہ کر و اور جان لو کہ ان تین دنوں کے بعد عذاب الٰہی آ کے رہے گا"۔[4]

---

[1] سورہ اعراف آیت 77

[2] سورہ اعراف آیت 77

[3] سورہ نمل آیت 46

[4] سورہ ہود آیت 65

قوم ثمود کا انجام

قرآن کریم میں اس سرکش قوم (قوم ثمود) پر تین دن کی مدت ختم ہونے پر نزول عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے: ''اس گروہ پر عذاب کے بارے میں جب ہمارا حکم آ پہنچا تو صالح اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہم نے اپنی رحمت کے زیر سایہ نجات بخشی''۔[1]

انہیں نہ صرف جسمانی و مادی عذاب سے نجات بخشی بلکہ ''رسوائی، خواری اور بے آبروئی سے بھی انہیں نجات عطا کی کہ جو اس روز اس سرکش قوم کو دامنگیر تھی''۔[2]

کیونکہ تمہارا پروردگار ہر چیز پر قادر اور ہر کام پر تسلط رکھتا ہے اس کے لئے کچھ محال نہیں ہے اور اس کے ارادے کے سامنے کوئی طاقت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، ''لہٰذا اکثر جمعیت کے عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے سے صاحب ایمان گروہ کو کسی قسم کی کوئی مشکل اور زحمت پیش نہیں ہوگی یہ رحمت الٰہی ہے جس کا تقاضا ہے کہ بے گناہ، گنہگاروں کی آگ میں نہ جلیں اور بے ایمان افراد کی وجہ سے مومنین گرفتار بلا نہ ہوں۔

''لیکن ظالموں کو صیحہ آسمانی نے گھیر لیا اس طرح سے کہ یہ چیخ نہایت سخت اور وحشت ناک تھی اس کے اثر سے وہ سب کے سب گھروں ہی میں زمین پر گر کر مر گئے، وہ اس طرح مرے اور نابود ہوئے اور ان کے آثار مٹ گئے کہ گویا وہ اس سرزمین میں کبھی رہتے ہی نہ تھے''۔[3]

جان لو کہ قوم ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا تھا اور انہوں نے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ''دور ہو قوم ثمود، اللہ کے لطف و رحمت سے اور ان پر لعنت ہو''۔[4]

''صیحة'' سے کیا مراد ہے؟

''صیحة'' لغت میں ''بہت بلند آواز'' کو کہتے ہیں جو عام طور پر کسی انسان یا جانور کے منہ سے نکلتی ہے لیکن اس کا مفہوم اسی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی ''نہایت بلند آواز'' اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

آیات قرآنی کے مطابق صیحہ آسمانی کے ذریعہ چند ایک گنہگار قوموں کو سزا دی گئی ہے ان میں سے ایک یہی قوم ثمود تھی، دوسری قوم لوط[5]، اور تیسری قوم شعیب۔[6]

قرآن کی دوسری آیات سے قوم ثمود کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اسے صاعقہ کے ذریعہ سزا ہوئی ارشاد الٰہی ہے: ''اگر وہ منہ پھیر لیں تو پھر کہہ دو کہ میں ایسی بجلی سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر گری''۔[7]

---

[1] سورہ ہود آیت 66
[2] سورہ ہود آیت 66
[3] سورہ ہود آیت 67-68
[4] سورہ ہود آیت 86
[5] سورہ حجر آیت 73
[6] سورہ ہود آیت 94
[7] سورہ فصلت آیت 13

یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ ''صیحہ'' سے مراد ''صاعقہ'' کی وحشت ناک آواز ہے۔ [1]

آیات قرآنی کے مطابق اس دنیا کا اختتام بھی ایک عمومی صیحہ کے ذریعے ہوگا۔

فطری اور طبیعی ہے کہ اگر آواز کی لہروں کی شدت اس سے بھی زیادہ ہوجائے تو آسانی سے ممکن ہے کہ اعصاب میں، دماغ کی رگوں میں اور دل کی دھڑکن میں تباہ کن اختلال پیدا ہوجائے جو انسانوں کی موت کا سبب بن جائے۔ آیات قرآنی کے مطابق اس دنیا کا اختتام میں تباہ کن اختلال پیدا ہوجائے گا جو انسانوں کی موت کا سبب بن جائے گا۔

حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ نجات پانے والے افراد

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کے دوستوں کی تعداد چار ہزار تھی۔ جو آپ کے ساتھ عذاب سے بچ گئے تھے اور حکم پروردگار کے مطابق فساد و گناہ سے لبریز اس علاقہ سے کوچ کر کے ''حضرموت'' جا پہنچے تھے۔

وادی القریٰ میں نو (9) مفسد ٹولوں کی سازش

یہاں پر حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کی داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت گزشتہ حصے کا تتمہ ہے اور اسی پر اس داستان کا اختتام ہوتا ہے۔ اس میں حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کا ذکر ہے جو نو کافر اور منافق لوگوں نے تیار کیا تھا اور خدا نے ان کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

فرمایا گیا ہے: ''اس شہر (وادی القریٰ) میں نو ٹولے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔'' [2]

ان نو میں سے ہر گروہ کا ایک ایک سربراہ بھی تھا اور شاید ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی قبیلے کی طرف منسوب بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ جب صالح علیہ السلام نے ظہور فرمایا اور اپنا مقدس اور اصلاحی آئین لوگوں کے سامنے پیش کیا تو ان ٹولوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا یہی وجہ ہے کہ قرآن کے مطابق انھوں نے کہا: ''آؤ خدا کی قسم اٹھا کر عہد کریں کہ صالح علیہ السلام اور ان کے خاندان پر شب خون مار کر انہیں قتل کر دیں گے پھر ان کے خون کے وارث سے کہیں گے کہ ہمیں اس کے خاندان کے قتل کی کوئی خبر نہیں اور اپنی اس بات میں ہم بالکل سچے ہیں۔'' [3]

پھر لائق غور بات یہ ہے کہ انھوں نے قسم بھی ''اللہ'' کی کھائی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بتوں کو پوجنے کے علاوہ زمین و آسمان کے خالق اللہ پر بھی عقیدہ رکھتے تھے اور اپنے اہم مسائل میں اسی کے نام کی قسم کھاتے تھے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اتنے مغرور اور بدمست ہو چکے تھے کہ اس قدر ہولناک جرم کے ارتکاب کے لئے بھی انھوں نے خدا ہی کا نام لیا گویا وہ کوئی اہم عبادت یا کوئی ایسا کام انجام دینے لگے ہوں جو اللہ کو بہت منظور ہے خدا سے بے خبر مغرور اور گمراہ لوگوں کا وطیرہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

---

[1] سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صاعقہ کی وحشت ناک آواز کسی جمعیت کو نابود کر سکتی ہے؟ اس کا جواب مسلماً مثبت ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے گزر جائیں تو وہ شیشے کو توڑ دیتی ہیں یہاں تک کہ بعض عمارتوں کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسانی بدن کے لئے اندر کے آرگانزم کو بیکار کر دیتی ہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ جب ہوائی جہاز صوتی دیوار توڑ دیتے ہیں (اور آواز کی لہروں سے تیز رفتار سے چلتے ہیں) تو کچھ لوگ بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں یا عورتوں کے حمل ساقط ہو جاتے ہیں یا ان علاقوں میں موجود عمارتوں کے تمام شیشے ٹوٹ جاتے ہیں۔

[2] سورہ نمل آیت 48

[3] سورہ نمل آیت 49

وہ صالح علیہ السلام کے ہمنواؤں اور ان کے قوم وقبیلہ سے خوف کھاتے تھے لہٰذا انھوں نے ایسا منصوبہ بنایا کہ جس سے وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہوجائیں اور صالح علیہ السلام کے طرفداروں کے غیظ وغضب کا بھی شکار نہ ہوں۔ گویا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے بنابرایں انھوں نے رات کے وقت حملہ کی ترکیب سوچی اور طے کرلیا کہ جب بھی کوئی شخص ان سے پوچھ گچھ کرے گا تو سب متفق ہوکر قسم اٹھائیں گے کہ اس منصوبے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا یہاں تک کہ وہ اس وقت موجود بھی نہیں تھے۔ (کیونکہ ان کی صالح علیہ السلام کے ساتھ مخالفت پہلے سے دنیا کو معلوم تھی)۔

تاریخوں میں ہے کہ ان کی سازش کچھ یوں تھی کہ شہر کے اطراف میں ایک پہاڑ تھا اور پہاڑ میں ایک غار تھی جس میں جناب صالح علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے اور کبھی کبھار وہ رات کو بھی اسی غار میں جا کر اپنے پروردگار کی عبادت کرتے تھے اور اس سے رازونیاز کیا کرتے تھے۔

انھوں نے طے کرلیا کہ وہاں کمین لگا کر بیٹھ جائیں گے جب بھی صالح وہاں آئیں گے انہیں قتل کردیں گے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ پر حملہ کرکے انہیں بھی راتوں رات موت کے گھاٹ اتار دیں گے پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے اگر ان سے اس بارے میں کسی نے پوچھ بھی لیا تو اس سے لاعلمی کا اظہار کردیں گے۔

یہ خالی گھر ان کے ہیں؟

لیکن خداوندعالم نے ان کی اس سازش کو عجیب وغریب طریقے سے ناکام بنادیا اور ان کے اس منصوبے کو نقش برآب کردیا۔

جب وہ ایک کونے میں گھات لگائے بیٹھے تھے تو پہاڑ سے پتھر گرنے لگے اور ایک بہت بڑا ٹکڑا پہاڑ کی چوٹی سے گرا اور آن کی آن میں اس نے ان سب کا صفایا کردیا۔

پھر قرآن پاک ان کی ہلاکت کی کیفیت اور ان کے انجام کو یوں بیان کرتا ہے: ''دیکھو یہ ان لوگوں ہی کے گھر ہیں کہ جواب ان کے ظلم وستم کی وجہ سے ویران پڑے ہیں''۔ [1]

نہ وہاں سے کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

نہ کسی قسم کا شور شرابہ سننے میں آتا ہے۔

اور نہ ہی وہ زرق برق گناہ بھری محفلیں دکھائی دیتی ہیں۔

جی ہاں: وہاں پر ظلم وستم کی آگ بھڑکی جس نے سب کو جلا کر راکھ کردیا۔

''ظالموں کے اس انجام میں خداوندعالم کی قدرت کی واضح نشانی اور درس عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو علم وآگہی رکھتے ہیں''۔ [2]

لیکن اس بھٹی میں سب خشک وتر نہیں جلے بلکہ بے گناہ افراد، گناہگاروں کی آگ میں جلنے سے بچ گئے ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لاچکے تھے اور تقویٰ اختیار کرچکے تھے۔

---

[1] سورہ نمل آیت 52

[2] سورہ نمل آیت 52

بنابراین حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کی سازش کے بعد ہی عذاب نازل نہیں ہوا بلکہ قوی احتمال یہ ہے کہ خدا کے اس پیغمبر کے قتل کی سازش کے واقعے میں فقط سازشی ٹولے ہلاک ہوئے اور دوسرے ظالموں کو سنبھل جانے کے لئے مہلت دی گئی، لیکن ناقہ کے قتل کے بعد تمام ظالم اور بے ایمان گناہگار فنا ہو گئے جیسا کہ سورہ ہود اور سورہ اعراف کی آیات کے ملانے سے یہی نکلتا ہے۔

حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق (علیہم السلام)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں 69 مقامات پر آیا ہے اور 65 سورتوں میں ان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے، قرآن کریم میں اس عظیم پیغمبر کی بہت مدح وثناء کی گئی ہے۔ اور ان کے بلند صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کی ذات ہر لحاظ سے راہنما اور اسوہ ہے اور وہ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے۔

خدا کے بارے میں ان کی معرفت، بت پرستوں کے بارے میں ان کی منطق، جابر و قاہر بادشاہوں کے سامنے ان کا انتھک جہاد، حکم خدا کے سامنے ان کا ایثار اور قربانیاں، طوفان، حوادث اور سخت آزمائشوں میں ان کی بے نظیر استقامت، صبر اور حوصلے اور ان جیسے دیگر امور، ان میں سے ہر ایک مفصل داستان ہے اور ان میں مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہے۔ قرآنی ارشادات کے مطابق وہ ایک نیک اور صالح،[1] فروتنی کرنے والے،[2] صدیق،[3] بردبار[4] اور ایفائے عہد کرنے والے تھے۔[5] وہ ایک بے مثال شجاع اور بہادر تھے۔ نیز بہت زیادہ سخی تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پر تلاطم زندگی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو تین دور میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1۔ قبل بعثت کا دور۔

2۔ دور نبوت اور بابل کے بت پرستوں سے مقابلہ۔

3۔ بابل سے ہجرت اور مصر، فلسطین اور مکہ میں سعی و کوشش کا دور۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش

حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل میں پیدا ہوئے۔ یہ دنیا کا حیرت انگیز اور عمدہ خطہ تھا۔ اس پر ایک ظالم و جابر اور طاقتور حکومت مسلط تھی۔[6]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھ کھولی تو بابل پر نمرود جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمراں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بابل کا بڑا خدا سمجھتا تھا۔ البتہ بابل کے لوگوں کے لئے یہی ایک بت نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں مختلف مواد کے بنے ہوئے مختلف شکلوں کے کئی ایک بت تھے۔ وہ ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔

---

[1] سورہ ص آیت 44

[2] سورہ نحل آیت 122

[3] سورہ نحل آیت 120

[4] سورہ مریم آیت 41

[5] سورہ توبہ آیت 114

[6] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپؑ ملک بابل کے شہر آور میں پیدا ہوئے۔

حکومت وقت سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنانے اور انہیں افیون زدہ رکھنے کے لئے بت پرستی کو ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی تھی لہٰذا وہ بت پرستی کی سخت حامی تھی۔ وہ کسی بھی بت کی اہانت کو بہت بڑا نا قابل معافی جرم قرار دیتی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے سلسلے میں مؤرخین نے عجیب وغریب داستان نقل کی ہے جس کا خلاصہ یوں پیش کیا جاتا ہے: بابل کے نجومیوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو نمرود کی غیر متنازعہ طاقت سے مقابلہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے اپنی تمام قوتیں اس بات پر صرف کر دیں کہ وہ بچہ پیدا نہ ہو۔ اس کی کوشش تھی کہ ایسا بچہ پیدا ہو بھی جائے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ بچہ آخر کار پیدا ہو گیا اس بچے کی جائے ولادت کے قریب ہی ایک غار تھی۔ اس کی ماں اس کی حفاظت کے لئے اسے اس میں لے گئی اور اسکی پرورش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی عمر کے تیرہ برس وہیں گزر گئے۔

اب بچہ نمرود کے جاسوسوں سے بچ بچ کر نو جوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس عالم تنہائی کو چھوڑ دیا جائے اور لوگوں تک وہ درس توحید پہنچائے جو اس نے باطنی الہام اور فکری مطالعے سے حاصل کیا تھا۔

دور نبوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کب مبعوث نبوت ہوئے، اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ البتہ سورہ مریم سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؑ نے اپنے چچا آزر سے بحث چھیڑی تو آپؑ مقام نبوت پر فائز ہو چکے تھے۔ آیت کہتی ہے کہ: ”اس کتاب میں ابراہیمؑ کو یاد کرو، وہ خدا کا بہت ہی سچا نبی تھا“۔ جب اس نے اپنے باپ (چچا) سے کہا: ”اے بابا تو ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتا ہے کہ جو نہ سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور تیری کوئی مشکل بھی حل نہیں کرتی“۔ [1]

ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ بت پرستوں کے ساتھ شدید معرکہ آرائی اور آپ کو آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر 16 سال تھی۔ ہم اس کے ساتھ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عظیم کار رسالت آغاز نو جوانی میں آپؑ کے دوش پر آن پڑا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ برجستہ صفات

قرآن مجید میں خدا کی شکرگزاری ایک کامل مصداق یعنی مکتب توحید کے مجاہد اور علمبردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے ان کا ذکر اس لحاظ سے بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ مسلمان بالعموم اور عرب بالخصوص حضرت ابراہیم کو اپنا پہلا پیشوا اور مقتداء سمجھتے ہیں۔

اس عظیم اور بہادر انسان کی صفات میں سے یہاں صرف پانچ صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

پہلے فرمایا گیا ہے: ”ابراہیم اپنی ذات میں ایک امت تھے“۔ [2]

اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ”امت“ کیوں قرار دیا گیا، مفسرین نے مختلف نکات بیان کیے ہیں ان میں سے چار قابل ملاحظہ ہیں:

1۔ ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے عظیم رہبر، مقتداء اور معلم تھے اسی بناء پر انہیں امت کہا گیا ہے کیونکہ ”امت“ اسم مفعول کے معنی میں اسے کہا جاتا ہے جس کی لوگ اقتداء کریں اور جس کی رہبری لوگ قبول کریں۔

---

[1] سورہ مریم آیت 41،42

[2] سورہ نحل آیت 120

2۔ابراہیم علیہ السلام ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ اپنی ذات میں ایک امت تھے۔کیونکہ بعض اوقات کسی انسان کی شخصیت کا نور اتنی وسیع شعاعوں کا حامل ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک دو یا بہت سے افراد سے زیادہ ہوجاتی ہے اور اس کی شخصیت ایک عظیم امت کے برابر ہوجاتی ہے۔

ان دونوں معانی میں ایک خاص روحانی تعلق ہے کیونکہ جو شخص کسی ملت کا سچا پیشوا ہوتا ہے وہ ان سب کے اعمال میں شریک اور حصہ دار ہوتا ہے اور گویا وہ خود امت ہوتا ہے۔

3۔وہ ماحول کہ جس میں کوئی خدا پرست نہ تھا اور جس میں سب لوگ شرک و بت پرستی کے جوہڑ میں غوطہ زن تھے۔اس میں ابراہیم علیہ السلام تن تنہا موحد اور توحید پرست تھے پس آپ تنہا ایک امت تھے اور اس دور کے مشرکین ایک الگ امت تھے۔

4۔ابراہیم علیہ السلام ایک امت کے وجود کا سرچشمہ تھے اسی لئے آپ کو "امت" کہا گیا ہے۔اس میں کوئی اشکال نہیں کہ یہ چھوٹا سا لفظ اپنے دامن میں یہ تمام وسیع معانی لئے ہوئے ہو۔

جی ہاں، ابراہیم ایک امت تھے۔

وہ ایک عظیم پیشوا تھے۔

وہ ایک امت ساز جواں مرد تھے۔

جس ماحول میں کوئی توحید کا دم بھرنے والا نہ تھا وہ توحید کے عظیم علمبردار تھے۔

2۔ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ "وہ اللہ کے مطیع بندے تھے"۔[1]

3۔"وہ ہمیشہ اللہ کے سیدھے راستے اور طریق حق پر چلتے تھے"۔[2]

4۔"وہ کبھی بھی مشرکین میں سے نہ تھے"۔[3]

ان کے فکر کے ہر پہلو میں، ان کے دل کے ہر گوشے میں اور ان کی زندگی کے ہر طرف اللہ ہی کا نور جلوہ گر تھا۔

5۔ان تمام خصوصیات کے علاوہ "وہ ایسے جواں مرد تھے کہ اللہ کی سب نعمتوں پر شکر گزار تھے"۔[4]

ان پانچ صفات کو بیان کرنے کے بعد ان کے اہم نتائج بیان کیے گئے ہیں:

1۔"اللہ نے ابراہیم کو نبوت اور دعوت کی تبلیغ کے لئے منتخب کیا"۔[5]

2۔"اللہ نے انہیں راہ راست کی ہدایت کی"۔[6]

اور انہیں ہر قسم کی لغزش اور انحراف سے بچایا۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدائی ہدایت ہمیشہ لیاقت و اہلیت کی بنیاد پر ہوتی ہے کہ جس کا مظاہرہ خود انسان کی طرف سے ہوتا

---

[1] سورہ نحل آیت 120
[2] سورہ نحل آیت 120
[3] سورہ نحل آیت 120
[4] سورہ نحل آیت 121
[5] سورہ نحل آیت 121
[6] سورہ نحل آیت 121

ہے اس کی طرف سے کسی کو کوئی چیز استعداد اور کسی حساب کتاب کے بغیر نہیں دی جاتی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی بنیاد پر یہ ہدایت نصیب ہوئی۔

3۔ ''ہم نے دنیا میں انہیں ''حسنہ'' سے نوازا وسیع معنی کے اعتبار سے ''حسنہ'' میں ہر قسم کی نیکی اور اچھائی کا مفہوم موجود ہے اس میں مقام نبوت رسالت سے لے کر اچھی اولاد وغیرہ تک کا مفہوم موجود ہے۔

4۔ ''اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہوں گے''۔ [1]

5۔ ان صفات کے ساتھ ساتھ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسا امتیاز عطا فرمایا ہے کہ ان کا مکتب و مذہب صرف ان کے اہل زمانہ کے لئے نہ تھا بلکہ ہمیشہ کے لئے تھا خاص طور پر اسلامی امت کے لئے بھی یہ ایک الہام بخش مکتب قرار پایا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''پھر ہم نے تجھے وحی کی دین ابراہیم کی اتباع کر کہ جو خالص توحید کا دین ہے''۔ [2]

ابراہیم علیہ السلام سب کے لئے نمونہ ہیں

قرآن مجید بہت سے موارد میں اپنی تعلیمات کی تکمیل کے لئے ایسے نمونے جو جہان انسانیت میں موجود ہیں، گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس لئے قرآن میں بھی دشمنان خدا سے دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرنے کے بعد، ابراہیم علیہ السلام اور ان کے طریقہ کار میں ایک ایسے عظیم پیشوا کے عنوان سے جو تمام اقوام کے لئے اور خاص طور پر قوم عرب کے لئے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔'' [3]

ابراہیم علیہ السلام پیغمبروں کے بزرگ تھے۔ ان کی زندگی سرتاسر خدا کی عبودیت، جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی پاک ذات کے عشق کے لئے ایک سبق تھی۔ وہ ابراہیم علیہ السلام کہ امت اسلامی ان کی بابرکت دعا کا نتیجہ ہے اور ان کے رکھے ہوئے نام پر فخر کرتی ہے؛ وہ تمہارے لئے اس سلسلہ میں ایک اچھا نمونہ بن سکتے ہیں۔

''**والذین معه**'' (جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھے) کی تعبیر سے مراد وہ مومنین ہیں جو اس راہ میں ان کے پیرو اور ساتھی رہے۔ اگر چہ وہ قلیل تعداد میں تھے۔ باقی رہا یہ احتمال کہ اس سے مراد وہ پیغمبر ہیں جو آپ کے ساتھ ہم آواز تھے یا ان کے زمانے کے پیغمبر، جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ تاہم یہ بہت بعید نظر آتا ہے۔ خصوصاً جبکہ مناسب یہ ہے کہ قرآن یہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اور مسلمانوں کو ان کے اصحاب اور انصار سے تشبیہ دے۔

یہ تواریخ میں بھی آیا ہے کہ بابل میں ایک گروہ ایسا تھا، جو ابراہیم علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے بعد ان پر ایمان لے آیا تھا اور شام کی طرف ہجرت میں وہ آپ کے ساتھ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے کچھ وفادار یار و انصار بھی تھے۔

شائستہ اولاد

قرآن کریم میں بعض ان نعمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کی تھیں، اور وہ نعمت ہے صالح اور آبرومند اور لائق نسل جو نعمات الٰہی میں سے ایک عظیم ترین نعمت ہے۔

---

[1] سورہ نحل آیت 122

[2] سورہ نحل آیت 4

[3] سورہ ممتحنہ آیت 4

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب (فرزند اسحاق) عطا کئے''۔[1]

اور اگر یہاں ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند اسماعیل کی طرف اشارہ نہیں ہوا بلکہ بحث کے دوران کہیں ذکر آیا ہے شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اسحاق کا سارہ جیسی بانجھ ماں سے پیدا ہونا، وہ بھی بڑھاپے کی عمر میں، بہت عجیب وغریب امر اور ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

اس کے بعد یہ بتانے کے لئے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے دور میں کوئی علم بردار توحید نہیں تھا اور یہ کام بس انہی کے زمانے سے شروع ہوا ہے مزید کہتا ہے: ''اس سے پہلے ہم نے نوح کی بھی ہدایت ورہبری کی تھی''۔[2]

اور ہم جانتے ہیں کہ نوح پہلے اولوالعزم پیغمبر ہیں جو آئین وشریعت کے حامل تھے اور وہ پیغمبران اولوالعزم کے سلسلے کی پہلی کڑی تھے۔

حقیقت میں حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت اور ان کے مقام کی طرف اشارہ کر کے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں، اور اسی طرح پیغمبروں کے اس گروہ کے مقام کا تذکرہ کر کے کہ جو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ذریت میں سے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ممتاز حیثیت کو وراثت، اصل اور ثمرہ کے حوالے سے مشخص کیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد بہت سے انبیاء کے نام گنوائے ہیں جو ذریت ابراہیم علیہ السلام میں سے تھے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون تھے''۔[3]

اس کے بعد: ''زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کا نام لیا گیا ہے اور مزید کہا گیا ہے کہ یہ سب صالحین میں سے تھے۔''[4]

آزر سے گفتگو

اس کے بعد ان کی اپنے باپ آزر کے ساتھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔ (یہاں باپ سے مراد چچا ہے اور لفظ ''ابا'' عربی لغت میں کبھی باپ کے معنی میں اور کبھی چچا کے معنی میں آتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے: اس وقت جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا: ''تو ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے''۔[5]

یہ مختصر اور زوردار بیان شرک اور بت پرستی کی نفی ونقصان کا احتمال ہے اسے علمائے عقائد ''دفع ضرر محتمل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں کہ تو ایسے معبود کی طرف کیوں جاتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ تیری کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ تو اصلاً سننے اور دیکھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

دوسرے لفظوں میں عبادت ایسی ہستی کی کرنی چاہئے کہ جو مشکلات حل کرنے کی قدرت رکھتی ہو، اپنی عبادت کرنے والے کی حاجات وضروریات کو جانتی، دیکھتی اور سن سکتی ہو لیکن ان بتوں میں یہ تمام باتیں مفقود ہیں۔

---

[1] سورہ انعام آیت 84

[2] سورہ انعام آیت 84

[3] سورہ انعام آیت 84

[4] سورہ انعام آیت 85

[5] سورہ مریم آیت 42

درحقیقت ابراہیم علیہ السلام یہاں اپنی دعوت اپنے چچا سے شروع کرتے ہیں، کیونکہ قریبی رشتہ داروں میں اثر ونفوذ پیدا کرنا زیادہ ضروری ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس بات پر مامور ہوئے تھے کہ پہلے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں۔

اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام واضح منطق کے ساتھ اسے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس امر میں ان کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں: ''اے بابا! مجھے وہ علم ودانش ملی ہے جو تجھے نصیب نہیں ہوئی اس بنا پر تو میری پیروی کر اور میری بات سن میری پیروی کر تا کہ میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں''۔

میں نے وحی الٰہی کے ذریعہ سے بہت علم وآگہی حاصل کی ہے اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں خطا کے راستے پر نہیں چلوں گا تجھے بھی ہرگز غلط راستے کی دعوت نہیں دوں گا میں تیری خوش بختی وسعادت کا خواہاں ہوں تو میری بات مان لے تا کہ فلاح ونجات حاصل کر سکے اور اس صراط مستقیم کو طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ جا۔

اس کے بعد اس اثباتی پہلو کو منفی پہلو اور ان آثار کے ساتھ ملاتے ہوئے، کہ جو اس دعوت پر مترتب ہوتے ہیں، کہتے ہیں: ''اے بابا: شیطان کی پرستش نہ کر کیونکہ شیطان ہمیشہ خدائے رحمٰن کا نافرمان رہا ہے''۔[۱]

البتہ ظاہر ہے کہ یہاں عبادت سے مراد شیطان کے لئے سجدہ کرنے اور نماز روزہ بجالانے والی عبادت نہیں ہے بلکہ اطاعت اور اس کے علم کی پیروی کرنے کے معنی میں ہے اور یہ بات خود ایک قسم کی عبادت شمار ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر اسے شرک اور بت پرستی کے برے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اے بابا: میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تیرے اختیار کردہ شرک وبت پرستی کے سبب خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھ پر عذاب آئے اور تو اولیائے شیطان میں سے ہو جائے''۔[۲]

اے ابراہیم تم پر پتھر برساؤں گا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان کے چچا کی ہدایت کے سلسلے میں منطقی باتیں جو خاص لطف ومحبت کی آمیزش رکھتی تھیں گزر چکی ہیں اب آزر کے جوابات بیان کرنے کی نوبت ہے تا کہ ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے حقیقت اور واقعیت ظاہر ہو جائے۔قرآن کہتا ہے کہ نہ صرف ابراہیم کی دل سوزیاں اور ان کا مدلل بیان آزر کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکا بلکہ وہ ان باتوں کو سن کر سخت برہم ہوا، اور اس نے کہا: ''اے ابراہیم علیہ السلام کیا تو میرے خداؤں سے روگردان ہے، اگر تو اس کام سے باز نہیں آئے گا تو میں ضرور ضرور تجھے سنگسار کروں گا، اور تو اب مجھ سے دور ہو جا میں پھر تجھے نہ دیکھوں''۔[۳]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اولاً آزر یہ تک کہنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ بتوں کے انکار، یا مخالفت اور ان کے بارے میں بدگوئی کا ذکر زبان پر لائے، بلکہ بس اتنا کہا: کیا تو بتوں سے روگردان ہے؟ تا کہ کہیں ایسا نہ ہو بتوں کے حق میں جسارت ہو جائے ثانیاً ابراہیم علیہ السلام کو تہدید کرتے وقت اسے سنگسار کرنے کی تہدید کی وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ جو''لام'' اور ''نون'' تاکید ثقیلہ سے جو ''لارجمنك'' میں وارد ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ سنگسار کرنا قتل کرنے کی ایک بدترین قسم ہے ثالثاً اس مشروط تہدید اور دھمکی پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس حالت میں جناب ابراہیم کو ایک ناقابل برداشت وجود شمار کرتے ہوئے ان سے کہا کہ تو ہمیشہ کے لئے میری

[۱] سورہ مریم آیت44

[۲] سورہ مریم آیت45

[۳] سورہ مریم آیت46

نظروں سے دور ہوجا۔

یہ تعبیر بہت ہی توہین آمیز ہے، جسے سخت مزاج افراد اپنے مخالفین کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور فارسی زبان میں اس کی جگہ ''گورت راگم کن'' کہتے ہیں، یعنی نہ صرف اپنے آپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھپالے بلکہ کسی ایسی جگہ چلے جاؤ کہ میں تمہاری قبر تک کو بھی نہ دیکھوں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام پیغمبروں اور آسمانی رہبروں کی مانند اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھا، اور تندی اور تیزی اور شدید خشونت وسختی کے مقابلے میں انتہائی بزرگواری کے ساتھ کہا: ''سلام ہو تجھ پر''۔ [1]

ممکن ہے کہ یہ ایسا سلام الوداعی اور خدا حافظی کا سلام ہو، کیونکہ اس کے چند جملوں کے کہنے کے بعد حضرت ابرہیم علیہ السلام نے آزر کو چھوڑ دیا یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسا سلام ہو کہ جو دعویٰ اور بحث کو ترک کرنے کے لئے کہا جاتا ہے جیسا کہ سورہ قصص میں ہے: ''اب جبکہ تم ہماری بات قبول نہیں کرتے ہو، ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہے ہم جاہلوں کے ہواخواہ نہیں ہیں''۔ [2]

اس کے بعد مزید کہا: ''میں عنقریب تیرے لئے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا، کیونکہ وہ میرے لئے رحیم ولطیف اور مہربان ہے''۔ [3]

حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کی خشونت وسختی اور تہدید ودھمکی کے مقابلے میں اسی جیسا جواب دینے کی بجائے اس کے برخلاف جواب دیا اور اس کے لئے پروردگار سے استغفار کرنے اور اس کے لئے بخشش کی دعا کرنے کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ: ''میں تم سے (تجھ سے اور اس بت پرست قوم سے) کنارہ کشی کرتا ہوں اور اسی طرح ان سے بھی کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو، یعنی بتوں سے بھی (کنارہ کشی کرتا ہوں)'' اور میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری دعا میرے پروردگار کی بارگاہ میں قبول ہوئے بغیر نہیں رہے گا''۔ [4]

قرآن ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آزر کے مقابلے میں ادب کی نشاندہی کرتا ہے۔ کہ اس نے کہا کہ مجھ سے دور ہوجا تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسے قبول کرلیا اور دوسری طرف ان کی اپنے عقیدہ میں قاطعیت اور یقین کو واضح کرتی ہے یعنی وہ واضح کررہے ہیں کہ میری تم سے یہ دوری اس بناء پر نہیں ہے کہ میں نے اپنے توحیدا عتقاد راسخ سے دستبرداری اختیار کرلی ہے بلکہ اس بناء پر ہے کہ میں تمہارے نظریہ کو حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، لہٰذا میں اپنے عقیدے پر اسی طرح قائم ہوں۔

ضمنی طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے خدا سے دعا کروں تو وہ میری دعا کو قبول کرتا ہے لیکن تم بیچارے تو اپنے سے زیادہ بیچاروں کو پکارتے ہو اور تمہاری دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ تو تمہاری باتوں کو سنتے تک نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قول کی وفا کی اور اپنے عقیدہ پر جتنا زیادہ سے زیادہ استقامت کے ساتھ رہا جاسکتا ہے، باقی رہے، ہمیشہ توحید کی منادی کرتے رہے اگرچہ اس وقت کے تمام فاسد اور برے معاشرے نے ان کے خلاف قیام کیا لیکن وہ جناب بالآخر اکیلے نہ رہے اور تمام قرون واعصار میں بہت سے پیروکار پیدا کرلئے اس طور پر کہ دنیا کے تمام خدا پرست لوگ ان کے وجود پر

---

[1] سورہ مریم آیت 47

[2] سورہ قصص آیت 55

[3] سورہ مریم آیت 47

[4] سورہ مریم آیت 48

فخر کرتے ہیں۔[1]

لفظ "اب" عربی زبان میں عام طور پر باپ کے لئے بولا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعض اوقات چچا، نانا، مربی ومعلم اور اسی طرح وہ افراد کہ جو انسان کی تربیت میں کچھ نہ کچھ زحمت ومشقت اٹھاتے ہیں ان پر بھی بولا جاتا ہے۔
لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ بولا جائے اور کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر معنی کے لئے پہلے باپ ہی ذہن میں آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سچ مچ قرآن کہتا ہے کہ وہ بت پرست شخص (آزر) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا، تو کیا ایک بت پرست اور بت ساز شخص ایک اولوالعزم پیغمبر کا باپ ہو سکتا ہے، اس صورت میں کیا انسان کی نفسیات وصفات کی وراثت اس کے بیٹے میں غیر مطلوب اثرات پیدا نہیں کر دے گی۔

اہل سنت مفسرین کی ایک جماعت نے پہلے سوال کا مثبت جواب دیا ہے اور آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ سمجھا ہے، جب کہ تمام مفسرین وعلماء شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا، بعض اسے آپ کا نانا اور بہت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا سمجھتے ہیں۔

وہ قرائن جو شیعہ علماء کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں حسب ذیل ہیں:

1۔ کسی تاریخی منبع ومصدر اور کتاب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر شمار نہیں کیا گیا بلکہ سب نے "تارخ" لکھا ہے۔ کتب عہدین میں بھی یہی نام آیا ہے، قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر تھا، یہاں انہوں نے ایسی توجیہات کی ہیں جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ اور اس کا لقب آزر تھا۔ حالانکہ یہ لقب بھی منابع تاریخ میں ذکر نہیں ہوا۔ یا یہ کہ آزر ایک بت تھا کہ جس کی ابراہیم علیہ السلام کا باپ پوجا کرتا تھا، حالانکہ یہ احتمال قرآنی آیت کے ظاہر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ آزر ان کا باپ تھا کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتی، مگر یہ کہ کوئی جملہ یا لفظ مقدر مانیں جو کہ خلاف ظاہر ہو۔

2۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ مسلمان یہ حق نہیں رکھتے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں اگر چہ وہ ان کے عزیز وقریب ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے بعد اس غرض سے کہ کوئی آزر کے بارے میں ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو دستاویز قرار نہ دے اس طرح کہتا ہے:

"ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ آزر کے لئے استغفار صرف اس وعدہ کی بنا پر تھی جو انہوں نے اس سے کیا تھا۔[2]

چونکہ آپ نے یہ کہا تھا کہ: "یعنی میں عنقریب تیرے لئے استغفار کروں گا۔"

یہ اس امید پر تھا کہ شاید وہ اس وعدہ کی وجہ سے خوش ہو جائے اور بت پرستی سے باز آجائے لیکن جب اسے بت پرستی کی راہ میں پختہ اور ہٹ دھرم پایا تو اس کے لئے استغفار کرنے سے دستبردار ہو گئے۔

یہاں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے مایوس ہو جانے کے بعد پھر کبھی اس کے لئے طلب مغفرت نہیں کی۔ اور ایسا کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جوانی کے زمانے کا ہے جب کہ آپ شہر بابل میں رہائش پذیر تھے اور بت پرستوں کے ساتھ مبارزہ اور مقابلہ کر رہے تھے۔

[1] کیا آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا؟

[2] سورہ توبہ آیت 114

لیکن قرآن کی دوسری آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آخری عمر میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے باپ کے لئے طلب مغفرت کی ہے (البتہ ان آیات میں جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا، باپ سے ''اب'' کو تعبیر نہیں کیا بلکہ ''والد'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو صراحت کے ساتھ باپ کے مفہوم کو ادا کرتا ہے)۔

جیسا کہ قرآن میں ہے: ''حمد وثنا اس خدا کے لئے ہے کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے، میرا پروردگار دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اے پروردگار مجھے، میرے ماں باپ اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے''۔ (سورہ ابراہیم آیت 39 و 41 سورہ ابراہیم کی اس آیت کو سورہ توبہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے جو مسلمانوں کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے منع کرتی ہے اور ابراہیم کو بھی ایسے کام سے سوائے ایک مدت محدود کے وہ بھی صرف ایک مقدس مقصد و ہدف کے لئے روکتی ہے، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زیر بحث قرآنی آیت میں ''اب'' سے مراد باپ نہیں ہے بلکہ چچا یا نانا یا کوئی اور اسی قسم کا رشتہ ہے دوسرے لفظوں میں ''والد'' باپ کے معنی میں صریح ہے جب کہ ''اب'' میں صراحت نہیں پائی جاتی۔

قرآن کی آیات میں لفظ ''اب'' ایک مقام پر چچا کے لئے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ بقرہ آیت 133:

یعقوبؑ کے بیٹوں نے اس سے کہا ہم تیرے خدا اور تیرے آباء ابراہیم واسماعیل واسحاق کے خدائے یکتا کی پرستش کرتے ہیں۔

ہم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے باپ نہیں تھے۔

3۔ مختلف اسلامی روایات سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''خداوند تعالیٰ مجھے ہمیشہ پاک آباؤ اجداد کے صلب سے پاک ماؤں کے رحم میں منتقل کرتا رہا اور اس نے مجھے کبھی زمانہ جاہلیت کی آلودگیوں اور گندگیوں میں آلودہ نہیں کیا''۔

طبری جو علمائے اہل سنت میں سے ہے اپنی تفسیر جامع البیان میں مشہور مجاہد سے نقل کرتا ہے۔ وہ صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔

اہل سنت کا ایک دوسرا مفسر الوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں مندرجہ ذیل قرآنی گفتگو میں کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ ازر، ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا شیعوں سے مخصوص ہے ان کی کم اطلاعی کی وجہ سے ہے کیونکہ بہت سے علماء (اہل سنت) بھی اسی بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔

''سیوطی''، مشہور سنی عالم کتاب ''مسالک الحنفاء'' میں فخر الدین رازی کی کتاب ''اسرار التنزیل'' سے نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماں باپ اور اجداد کبھی بھی مشرک نہیں تھے اور اس حدیث سے جو ہم اوپر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کر چکے ہیں استدلال کیا ہے، اس کے بعد سیوطی خود اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم اس حقیقت کو دو طرح کی اسلامی روایات سے ثابت کر سکتے ہیں:

پہلی قسم کی روایات تو وہ ہیں کہ جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر کے آباء واجداد حضرت آدم علیہ السلام تک ہر ایک اپنے زمانہ کا بہترین فرد تھا (ان احادیث کو ''صحیح بخاری'' اور ''دلائل النبوۃ'' سے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے)۔

اور دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہر زمانے میں مؤحد وخدا پرست افراد موجود رہے ہیں، ان دونوں قسم کی

روایت کو باہم ملانے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ اجداد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جن میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کے باپ بھی ہیں یقیناً مؤحد تھے۔

آسمانوں میں توحید کے دلائل

اس میں شک نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کی واضح ترین آلودگی شرک وبت پرستی ہے اور جنہوں نے اسے آلودگی کو زنا میں منحصر سمجھا ہے ان کے پاس اپنے قول پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے خصوصا جبکہ قرآن کہتا ہے: ''مشرکین گندگی میں آلودہ اور ناپاک ہیں''۔ [1]

اس سرزنش اور ملامت کے بعد جو ابراہیم علیہ السلام بتوں کی کرتے تھے، اور اس دعوت کے بعد جو آپ نے آزر کو بت پرستی کو ترک کرنے کے لئے کی تھی یہاں خدا ابراہیم علیہ السلام کے بت پرستوں کے مختلف گروہوں کے ساتھ منطقی مقابلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے واضح عقلی استدلالات کے طریق سے اصل توحید کو ثابت کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

قرآن پہلے کہتا ہے: ''جس طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا اسی طرح ہم نے اس کے لئے تمام آسمانوں اور زمین پر پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تسلط کی نشاندہی کی''۔ [2]

اس میں شک نہیں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خدا کی یگانگت کا استدلال وفطری یقین رکھتے تھے، لیکن اسرار آفرینش کے مطالعہ سے یہ یقین درجہ کمال کو پہنچ گیا، جیسا کہ وہ قیامت اور معاد کا یقین رکھتے تھے، لیکن سر بریدہ پرندوں کے زندہ کرنے کے مشاہدہ سے ان کا ایمان ''عین الیقین'' کے مرحلہ کو پہنچ گیا۔

اس کے بعد میں اس موضوع کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو ستاروں اور افتاب کے طلوع وغروب سے ابراہیم علیہ السلام کے استدلال کو ان کے خدانہ ہونے پر واضح کرتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''جب رات کے تاریک پردے نے سارے عالم کو چھپا لیا تو ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ستارہ ظاہر ہوا، ابراہیم علیہ السلام نے پکار کر کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو انھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میں ہرگز ہرگز غروب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں عبودیت وربوبیت کے لائق نہیں سمجھتا''۔ [3]

انھوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں صفحہ آسمان پر گاڑ دیں، اس دفعہ چاند کی چاندی جیسی ٹکیہ وسیع اور دل پذیر روشنی کے ساتھ صفحہ آسمان پر ظاہر ہوئی، جب چاند کو دیکھا تو ابراہیم علیہ السلام نے پکار کر کہا کہ کیا یہ ہے میرا پروردگار؟ لیکن اخرکار چاند کا انجام بھی اس ستارے جیسا ہی ہوا اور اس نے بھی اپنا چہرہ پردہ افق میں چھپا لیا، تو حقیقت کے متلاشی ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اپنی طرف رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہوں کی صف میں جا کھڑا ہوں گا۔ [4]

اس وقت رات اخر کو پہنچ چکی تھی اور اپنے تاریک پردوں کو سمیٹ کر آسمان کے منظر سے بھاگ رہی تھی، آفتاب نے افق مشرق سے سر نکالا اور اپنی زیبا اور لطیف نور کو زربفت کے ایک ٹکڑے کی طرح دشت وکوہ وبیابان پر پھیلا دیا، جس وقت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت بین نظر اس کے خیرہ کرنے والے نور پر پڑی تو پکار کر کہا: کیا میرا خدا یہ ہے؟ جو سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ روشن ہے، لیکن سورج کے غروب ہوجانے اور آفتاب کی ٹکیہ کے ہیولائے شب کے منہ میں چلے جانے سے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آخری بات

---

[1] سورہ توبہ آیت 28

[2] سورہ انعام آیت 76

[3] سورہ انعام آیت 76

[4] سورہ انعام آیت 77

ادا کی، اور کہا: ''اے گروہ (قوم) میں ان تمام بناوٹی معبودوں سے جنھیں تم نے خدا کا شریک قرار دے لیا ہے بری و بیزار ہوں''۔[1]

اب جبکہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس متغیر و محدود اور قوانین طبیعت کے چنگل میں اسیر مخلوقات کے ماوراء ایک ایسا خدا ہے کہ جو اس سارے نظام کائنات پر قادر و حاکم ہے،'' تو میں تو اپنا رخ ایسی ذات کی طرف کرتا ہوں کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدے میں کم سے کم شرک کو بھی راہ نہیں دیتا، میں تو مؤحد خالص ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں''۔[2]

توحید کی دعوت

قرآن دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا؛ اور جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ: خدائے واحد کی پرستش کرو اور اس کے لئے تقویٰ اختیار کرو کیونکہ اگر تم جان لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے''۔[3]

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دلائل بت پرستی کا باطل ہونا ثابت کرتے ہیں آپ نے اس دعویٰ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے اور ان مشرکین کے معتقدات اور روش حیات کو نادرست ثابت کیا ہے۔

پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ: ''تم خدا سے منحرف ہو کے بتوں کی عبادت کرتے ہو''۔[4]

حالانکہ یہ بت بے روح مجسمے ہیں نہ یہ صاحب ارادہ ہیں نہ صاحب عقل اور نہ صاحب شعور وہ ان تمام اوصاف سے محروم ہیں ان کی ہیت ہی بت پرستی کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: ''صرف ان بتوں کی وضع ہی یہ ثابت نہیں کرتی کہ یہ معبود نہیں ہیں'' بلکہ تم بھی جانتے ہو کہ ''تم جھوٹی باتیں کرتے ہو اور ان بتوں کو معبود کہتے ہو''۔[5]

تمہارے پاس اس جھوٹ کو ثابت کرنے کی بجز چند اوہام و خرافات کے اور کیا دلیل ہے۔

---

[1] سورہ انعام آیت 78

[2] سورہ انعام آیت 79

جناب ابراہیم علیہ السلام جیسے موحد و یکتا پرست نے کس طرح آسمان کے ستارے کی طرف اشارہ کیا اور یہ کہا کہ یہ میرا خدا ہے مفسرین نے بہت بحث کی ہے، ان تمام تفاسیر میں سے دو تفسیریں زیادہ قابل ملاحظہ ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کو بعض بزرگ مفسرین نے اختیار کیا ہے ہم ان میں سے ایک کو بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ستارہ پرستوں اور سورج پرست لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کی اور احتمال یہ ہے کہ بابل میں بت پرستوں کے ساتھ سخت قسم کے مقابلے اور مبارزات کرنے اور اس زمین سے شام کی طرف نکلنے کے بعد جب ان اقوام سے ان کا سامنا ہوا تو اس وقت یہ گفتگو کی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل میں نادان قوموں کی ہٹ دھرمی کو ان کی غلط راہ و رسم میں آزما چکے تھے لہٰذا اس بنا پر کہ آفتاب و ماہتاب کے پجاریوں اور ستارہ پرستوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، پہلے ان کے ہم صدا ہو گئے اور ستارہ پرستوں سے کہنے لگے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ زہرہ ستارہ میرا پروردگار ہے، بہت اچھا چلو اسے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اس عقیدے کا انجام تمہارے سامنے پیش کروں، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس ستارے کا چمکدار چہرہ افق کے تاریک پردے کے پیچھے چھپ گیا، یہ وہ مقام تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک محکم ہتھیار آ گیا اور وہ کہنے لگے میں تو کبھی ایسے معبود کو قبول نہیں کر سکتا، اس بنا پر ''ھذا ربی'' کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق یہ میرا خدا ہے، یا یہ کہ آپ نے بطور استفہام فرمایا: ''کیا یہ میرا خدا ہے''؟

ستارہ سے کون سا ستارہ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین نے زہرہ یا مشتری کا ذکر کیا ہے اور کچھ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانوں میں ان دونوں ستاروں کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور خداوں کے حصہ شمار ہوتے تھے لیکن اس حدیث میں جو امام علی بن موسی رضا علیہ السلام سے عیون الاخبار میں نقل ہوئی ہے یہ تصریح ہوئی ہے کہ یہ زہرہ ستارہ تھا، تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہی بات مروی ہے۔

[3] سورہ عنکبوت آیت 16

[4] سورہ عنکبوت آیت 17

[5] سورہ عنکبوت آیت 17

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تیسری دلیل دیتے ہیں: اگر تم ان بتوں کو مادی منفعت کے لئے پوجتے ہو یا دوسرے جہان میں فائدے کے لئے، دونوں صورتوں میں تمہارا یہ خیال باطل ہے'' کیونکہ تم خدا کے علاوہ جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق اور روزی نہیں دے سکتے''۔ [۱]

تم خود اقرار کرتے ہو کہ یہ بت خالق نہیں ہیں بلکہ خالق حقیقی خدا ہے اس بناء پر روزی دینے والا بھی وہی ہے ''لہٰذا تم روزی خدا سے طلب کرو''۔ [۲]

اور چونکہ روزی دینے والا وہی ہے ''لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر بجالاؤ''۔ [۳]

اس مفہوم کا ایک پہلو یہ بھی ہے منعم حقیقی کے حضور میں ''حس شکر گزاری'' سے بھی عبادت کی تحریک ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ منعم حقیقی خدا ہی ہے پس شکر اور عبادت بھی اسی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔

''نیز اگر تم آخرت کی زندگی کے خواستگار ہو تو سمجھ لو کہ ہم سب کی بازگشت اسی طرف ہے'' نہ کہ بتوں کی طرف۔ [۴]

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تہدید کے طور پر ان مشرکین کی سرکشی سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اگر تم میرے پیام کی تکذیب کرتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں انھوں نے بھی اس طرح اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے اور آخر کار ان کا انجام بڑا دردناک ہوا''۔ [۵]

''رسول اور فرستادۂ خدا کا فرض واضح ابلاغ کے علاوہ اور کچھ نہیں''۔ [۶]

خواہ لوگ اسے قبول کریں یا نہ کریں۔

ہمارے بڑے بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے

ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں انھوں نے کہا: ''ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور سارا دن ان پر توجہ رکھتے ہیں اور نہایت ہی ادب اور احترام کے ساتھ ان کی عبادت میں لگے رہتے ہیں''۔ [۷]

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ فقط اپنے اس عمل پر شرمندہ نہیں تھے بلکہ اس پر فخر و مباہات بھی کیا کرتے تھے کیونکہ (''ہم بتوں کی عبادت و پرستش کرتے ہیں'') کا جملہ ان کے مقصود اور مدعا کے بیان کے لئے کافی تھا، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ''ہم سارا سارا دن ان کے آستان پر جبہ سائی کرتے رہتے ہیں''۔

بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے ان کی یہ باتیں سن کر ان پر اعتراضات کی بوچھار کردی اور دوز بردست منطقی اور معتدل جملوں کے ذریعہ انہیں ایسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' کے مصداق ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا آپ نے ان

---

[۱] سورہ عنکبوت آیت 17
[۲] سورہ عنکبوت آیت 17
[۳] سورہ عنکبوت آیت 17
[۴] سورہ عنکبوت آیت 17
[۵] سورہ عنکبوت آیت 17
[۶] سورہ عنکبوت آیت 18
[۷] سورہ شعراء آیت 71

سے فرمایا: ''جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری فریاد سنتے بھی ہیں؟'' ''یا کیا وہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں'' [1]

لیکن متعصب لوگ بجائے اس کے کہ اس منطقی سوال کا کوئی ٹھوس جواب دیتے وہی پرانا اور بار بار کا دہرایا ہوا جواب پیش کرتے ہیں: ''انھوں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے'' [2]

ان کا یہ جواب اپنے جاہل اور نادان بزرگوں کی اندھی تقلید کو بیان کر رہا ہے وہ جو جواب ابراہیم علیہ السلام کو دے سکتے تھے یہی تھا اور بس یہ ایسا جواب جس کے بطلان کی دلیل خود اسی میں موجود ہے اور کوئی بھی عقل مند انسان اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے لگ جائے، خاص کر جبکہ آنے والے لوگوں کے تجربے گزشتہ لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی اندھی تقلید کا نہ تو کوئی جواز رہتا ہے اور نہ ہی کوئی دلیل۔

ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا زبردست منظر

یہاں پر پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کے واقعہ اور ان سے بت پرستوں کی شدید مڈھ بھیڑ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ [3]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ یہ بات سو فی صد صحیح اور محکم ہے اور وہ اس عقیدہ پر ہر مقام تک قائم ہیں اور اس کے نتائج و لوازم کو جو کچھ بھی ہوں انہیں جان و دل سے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، مزید کہتے ہیں: ''مجھے خدا کی قسم جس وقت تم یہاں پر موجود نہیں ہو گے اور یہاں سے کہیں باہر جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کو نابود کرنے کا منصوبہ بناؤں گا''۔ [4]

ان کی مراد یہ تھی کہ انہیں صراحت کے ساتھ سمجھا دیں کہ آخر کار میں اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں نابود اور درہم و برہم کر دوں گا۔

لیکن شاید ان کی نظر میں بتوں کی عظمت اور رعب اس قدر تھا کہ انھوں نے اس کو کوئی سنجیدہ بات نہ سمجھا اور کوئی ردّ عمل ظاہر نہ کیا شاید انھوں نے یہ سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قوم وملّت کے مقدسات کے ساتھ ایسا کھیل کھیلے، جبکہ ان کی حکومت بھی سو فی صد ان کی حامی ہے وہ کس طاقت کے بل بوتے پر ایسا کام کرے گا۔

وہ اسی راہ توحید وعدل اور اسی راہ تقویٰ واخلاص پر گامزن تھا جو نوح کی سنت تھی، کیونکہ انبیاء سارے کے سارے ایک ہی مکتب کے مبلغ اور ایک ہی یونیورسٹی کے استاد ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے پروگرام کو دوام بخشتا اسے آگے بڑھاتا اور اس کی تکمیل کرتا ہے، کیسی عمدہ تعبیر ہے کہ ابراہیم، علیہ السلام نوح کے شیعوں میں سے تھے حالانکہ ان دونوں کے زمانے میں بہت فاصلہ تھا (بعض مفسرین کے قول کے مطابق تقریباً 2600 سال فاصلہ تھا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ مکتبی رشتے میں زمانے کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو بعض نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ اپنے دل میں کہا تھا یا بعض مخصوص افراد سے کہا تھا کسی لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں ہے، خاص طور پر جبکہ یہ بات کامل طور سے قرآن کریم کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی یہ بات یاد آ گئی اور انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا

---

[1] سورہ شعراء آیات 72، 73

[2] سورہ شعراء آیت 74

[3] قرآن مجید میں واقعہ ابراہیم کو قصہ کے ساتھ اس طرح سے منسلک کیا گیا ہے: ''اور ابراہیم، نوح کے پیروکاروں میں سے تھے۔'' (سورہ صافات آیت 83)

[4] سورہ انبیاء آیت 57

ہے کہ ایک جوان بتوں کے خلاف ایک سازش کی بات کرتا ہے۔

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن جبکہ بُت خانہ خالی پڑا تھا، اور بُت پرستوں میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھا، اپنے منصوبہ کو عملی شکل دے دی۔

بابل کے بت پرست ہر سال ایک مخصوص عید کے دن کچھ رسومات ادا کیا کرتے تھے بت خانہ میں کھانے تیار کرتے ہیں اور وہیں انہیں دسترخوان پر چن دیتے تھے اس خیال سے کہ یہ کھانے متبرک ہو جائیں گے۔اس کے بعد سب کے سب مل کر اکٹھے شہر سے باہر چلے جاتے تھے اور دن کے آخر میں واپس لوٹتے تھے اور عبادت کرنے اور کھانا کھانے کے لئے بت خانہ میں آجاتے تھے۔ایک روز اسی طرح جب شہر خالی ہو گیا اور بتوں کو توڑنے اور انہیں درہم برہم کرنے کے لئے ایک اچھا موقع حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ آ گیا۔ یہ ایسا موقع تھا جس کا ابراہیم عرصے سے انتظار کر رہے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

لہٰذا جب انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی تو ''اس نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا میں تو بیمار ہوں''۔[1] اور اس طرح سے اپنی طرف سے عذر خواہی کی۔

''انھوں نے رخ پھیرا اور جلدی سے اس سے دور ہو گئے''۔[2]

اور اپنے رسم ورواج کی طرف روانہ ہو گئے۔[3]

تم یہ بہترین اور شیرین غذا کیوں نہیں کھاتے

حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے شہر میں رہ گئے اور بت پرست شہر خالی کر کے باہر چلے گئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ادھر ادھر دیکھا، شوق کی بجلی ان کی آنکھوں میں چمکی، وہ لمحات جن کا وہ ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے آن پہنچے، انھوں نے اپنے آپ

---

[1] سورہ صافات 88-89

[2] سورہ صافات آیت 90

[3] یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف کیوں دیکھا، اس دیکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟۔
دوسرا یہ کہ کیا واقعاً وہ بیمار تھے کہ انھوں نے کہا میں بیمار ہوں؟ انھیں کیا بیماری تھی؟
پہلے سوال کا جواب بابل کے لوگوں کے اعتقادات اور رسوم وعادات کو دیکھتے ہوئے واضح وروشن ہے وہ علم نجوم میں بہت ماہر تھے۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ ان کے بت بھی ستاروں کے ہیکلوں اور شکلوں میں تھے اور اسی بنا پر ان کا احترام کرتے تھے کہ وہ ستاروں کے سمبل تھے۔
البتہ علم نجوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ بہت سی خرافات بھی ان کے یہاں پائی جاتی تھیں منجملہ یہ کہ وہ ستاروں کو اپنی تقدیر میں مؤثر جانتے تھے اور ان سے خیر وبرکت طلب کرتے تھے اور ان کی وضع وکیفیت سے آنے والے واقعات پر استدلال کرتے تھے، ابراہیم نے اس غرض سے کہ انہیں مطمئن کر دیں، ان کی رسوم کے مطابق آسمان کے ستاروں پر ایک نظر ڈالی تا کہ وہ یہ تصور کریں کہ انھوں نے اپنی بیماری کی پیشن گوئی ستاروں کے اوضاع کے مطالعے سے کی ہے اور وہ مطمئن ہو جائیں۔
بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ستاروں کی حرکت سے اپنی بیماری کا وقت ٹھیک طور سے معلوم کر لیں کیونکہ ایک قسم کی بیماری انہیں تھی وہ یہ کہ بخار انہیں ایک خاص وقفہ کے ساتھ آتا تھا لیکن بابل کے لوگوں کے افکار ونظریات کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔
بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان کا آسمان کی طرف دیکھنا درحقیقت اسرار آفرینش میں مطالعہ کے لئے تھا اگرچہ وہ آپ کی نگاہ کو ایک منجم کی نگاہ سمجھ رہے تھے جو یہ چاہتا ہے کہ ستاروں کے اوضاع سے آئندہ کے واقعات کی پیش بینی کرے۔
دوسرے سوال کے مفسرین نے متعدد جواب دیئے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ واقعاً بیمار تھے، اگرچہ وہ صحیح وسالم بھی ہوتے تب بھی جشن کے پروگرام میں ہرگز شرکت نہ کرتے، لیکن ان کی بیماری ان مراسم میں شرکت نہ کرنے اور بتوں کو توڑنے کے لئے ایک سنہری موقع اور اچھا بہانہ بھی تھا، اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انھوں نے یہاں ''توریہ'' کیا تھا، کیونکہ انبیاء کے لئے ''توریہ'' کرنا مناسب نہیں ہے۔

سے کہا، بتوں سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے پیکروں پر سخت ضرب لگا ایسی ضرب جو بت پرستوں کے سوئے دماغوں کو ہلا کر رکھ دے اور انہیں بیدار کر دے۔

قرآن کہتا ہے: ''وہ ان کے خداؤں کے پاس آیا، ایک نگاہ ان پر اور کھانے کے ان برتنوں پر جو ان کے اطراف میں موجود تھے، ڈالی اور تمسخر کے طور پر کہا: تم یہ کھانے کھاتے کیوں نہیں''؟[۱]

یہ کھانے تو تمہاری عبادت کرنے والوں نے فراہم کیے ہیں۔ مرغن وشیرین، طرح طرح کی رنگین غذائیں ہیں، کھاتے کیوں نہیں ہو؟

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم بات کیوں نہیں کرتے؟ تم گونگے کیوں بن گئے ہو؟ تمہارا منہ کیوں بند ہے۔''[۲]

اس طرح کے تمام بیہودہ اور گمراہ عقائد کا مذاق اڑایا بلاشک وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ ہی بات کرتے ہیں اور بے جان موجودات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن حقیقت میں وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی بت شکنی کے اقدام کی دلیل اس عمدہ اور خوبصورت طریقہ سے پیش کریں۔

پھر انھوں نے اپنی آستین چڑھالی، کلہاڑا ہاتھ میں اٹھایا اور پوری طاقت کے ساتھ اسے گھمایا اور بھرپور ''توجہ کے ساتھ ایک زبردست ضرب ان کے پیکر پر لگائی''۔[۳]

بہرحال تھوڑی سی دیر میں وہ آباد اور خوبصورت بت خانہ ایک وحشت ناک ویرانہ ہو گیا۔ تمام بت ٹوٹ پھوٹ گئے ہر ایک ہاتھ پاؤں تڑوائے ہوئے ایک کونے میں پڑا تھا اور سچ مچ بت پرستوں کے لئے ایک دلخراش، افسوسناک اور غم انگیز منظر تھا۔ ابراہیم اپنا کام کر چکے اور پورے اطمینان وسکون کے ساتھ بتکدہ سے باہر آئے اور اپنے گھر چلے گئے اب وہ اپنے آپ کو آئندہ کے حوادث کے لئے تیار کر رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ انھوں نے شہر میں بلکہ پورے ملک بابل میں ایک بہت بڑا دھاکہ کیا ہے جس کی صدا بعد میں بلند ہوگی۔ غصہ اور غضب کا ایک ایسا طوفان اٹھے گا اور وہ اس طوفان میں اکیلے ہوں گے۔ لیکن ان کا خدا موجود ہے اور وہی ان کے لئے کافی ہے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام نمرودیوں کی عدالت میں

آخر وہ عید کا دن ختم ہو گیا اور بت پرست خوشی مناتے ہوئے شہر کی طرف پلٹے اور سب بت خانے کی طرف گئے تاکہ بتوں سے اظہار عقیدت بھی کریں اور وہ کھانا بھی کھائیں کہ جو ان کے گمان کے مطابق بتوں کے پاس رکھے رہنے سے بابرکت ہو گیا تھا جو نہی وہ بت خانے کے اندر پہنچے تو ایک ایسا منظر دیکھا کہ ان کہ ہوش اڑ گئے آباد بت خانہ کے بجائے بتوں کا ایک ڈھیر تھا ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے۔''وہ تو چیخنے چلانے لگے: ''یہ بلا اور مصیبت ہمارے خداؤں کے سر

---

[۱] سورہ صافات آیت 91

[۲] سورہ صافات آیت 92

[۳] سورہ صافات آیت 93

پر کون لا یا ہے''؟''یقیناً جو کوئی بھی تھا، ظالموں میں سے تھا''۔ [۱]

اس نے ہمارے خداؤں پر بھی ظلم کیا ہے، ہماری قوم اور معاشرے پر بھی، اور خود اپنے او پر بھی کیونکہ اس نے اپنے اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو بتوں کے بارے میں ابراہیم کی دھمکیوں سے آگاہ تھے اور ان جعلی خداؤں کے بارے میں ان کی اہانت آمیز باتوں کو جانتے تھے، کہنے لگے:''ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کے بارے میں باتیں کرتا تھا اور انہیں برا بھلا کہتا تھا، اس کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے۔'' [۲]

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق حضرت ابرہیم علیہ السلام اس وقت مکمل طور پر جوان تھے اور احتمال یہ ہے کہ ان کی عمر 16 سال سے زیادہ نہیں تھی اور یہ بھی درست ہے کہ جواں مردی کی تمام خصوصیات، شجاعت، شہامت، صراحت اور قاطعیت ان کے وجود میں جمع تھیں لیکن اس طرح سے بات کرنے سے بت پرستوں کی مراد یقیناً تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں تھی، بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ کام کیا ہے، کہتے ہیں کہ ایک جوان ہے کہ جسے ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں، وہ اس طرح کہتا تھا یعنی ایک ایسا شخص کہ جو بالکل گمنام اور ان کی نظر میں بے حیثیت ہے۔

اصولاً معمول یہ ہے کہ جب کسی جگہ کوئی جرم ہو جائے تو اس شخص کو تلاش کرنے کے لئے کہ جس سے وہ جرم سرزد ہوا ہو ان سے دشمنی رکھنے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے اور اس ماحول میں ابراہیم علیہ السلام کے سوا مسلماً کوئی شخص بتوں کے ساتھ دست وگریبان نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا تمام افکار انہیں کی طرف متوجہ ہو گئے اور بعض نے کہا:''اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو جاؤ اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرو تا کہ وہ لوگ کہ جو پہچانتے ہیں اور خبر رکھتے ہیں گواہی دیں''۔ [۳]

منادی کرنے والوں نے شہر میں ہر طرف یہ منادی کی کہ جو شخص بھی ابراہیم علیہ السلام کی بتوں سے دشمنی اور ان کی بدگوئی کے بارے میں آگاہ ہے، حاضر ہو جائے، جلد ہی جو آگاہ تھے وہ لوگ بھی اور تمام دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تاکہ دیکھیں کہ اس ملزم کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایک عجیب و غریب شور وغل لوگوں میں پڑا ہوا تھا، چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ایک ایسا جرم جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا جس نے ان کے دینی ماحول میں ایک دھما کہ کر دیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دندان شکن دلیل

آخر کار عدالت لگی اور باز پرس ہوئی زعمائے قوم وہاں جمع ہوئے بعض کہتے ہیں کہ خود نمرود اس عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔

پہلا سوال جو انہوں نے ابراہیم سے کیا وہ یہ تھا:''اے ابراہیم: کیا تو نے ہی ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔'' [۴]

وہ اس بات تک کے لئے تیار نہیں تھے کہ یہ کہیں کہ تو نے ہمارے خداؤں کو توڑا ہے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بلکہ صرف یہ کہا کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام کیا ہے؟

---

[۱] سورہ انبیاء آیت 59

[۲] سورہ انبیاء آیت 60

[۳] سورہ انبیاء آیت 61

[۴] سورہ انبیاء آیت 62

ابراہیم علیہ السلام نے ایسا جواب دیا کہ وہ خود گھر گئے اور ایسے گھرے کہ نکلنا ان کے بس میں نہ تھا" ابراہیم علیہ السلام نے کہا: یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے، ان سے پوچھو اگر یہ بات کرتے ہوں۔"[۱]

جرائم کی تفتیش کے اصول یہ ہیں، کہ جس کے پاس آثار جرم ملے، وہ ملزم ہے (مشہور روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ کلہاڑا بڑے بت کی گردن میں ڈال دیا تھا)۔

اصلاً، تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ تم اپنے بڑے خدا کو ملزم قرار کیوں نہیں دیتے؟ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ وہ چھوٹے خداؤں پر غضبناک ہو گیا ہو یا اس نے انہیں اپنا آئندہ کا رقیب فرض کرتے ہوئے ان سب کا حساب ایک ہی ساتھ پاک کر دیا ہو؟

ابراہیم علیہ السلام نے قطعی طور پر اس عمل کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا، لیکن تمام قرائن اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس بات سے کوئی پختہ اور مستقل قصد نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ بت پرستوں کے مسلمہ عقائد کو، جو کہ خرافاتی اور بے بنیاد تھے، ان کے منہ پر دے ماریں اور ان کا مذاق اڑائیں اور انہیں یہ سمجھائیں کہ یہ بے جان پتھر اور لکڑیاں اس قدر حقیر ہیں کہ ایک جملہ تک بھی منہ سے نہیں نکال سکتیں، کہ اپنی عبادت کرنے والوں سے مدد طلب کر لیں، چہ جائیکہ وہ یہ چاہیں کہ ان کی مشکلات کو حل کر دیں۔

اس تعبیر کی نظیر ہمارے روزمرہ کے محاورات میں بہت زیادہ ہے کہ مدمقابل کی بات کو باطل کرنے کے لئے اس کے مسلمات کو امر یا خبر یا استفہام کی صورت میں اس کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ وہ مغلوب ہو جائے اور یہ بات کسی طرح بھی جھوٹ نہیں ہوتی "جھوٹ وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کوئی قرینہ نہ ہو"۔

اس روایت میں کہ جو کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ بیان ہوا ہے کہ: "ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ ان کے افکار کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ ایسے کام بتوں سے نہیں ہو سکتے۔" اس کے بعد امام علیہ السلام نے مزید فرمایا: "خدا کی قسم یہ کام بتوں نے نہیں کیا تھا اور ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔"

زودگذر بیداری

ابراہیم علیہ السلام کی باتوں نے بت پرستوں کو ہلا کر رکھ دیا، ان کے سوئے ہوئے وجدان کو بیدار کیا اور اس طوفان کی مانند کہ جو آگ کی چنگاریوں کے اوپر پڑی ہوئی بہت سی راکھ کو ہٹا دیتا ہے اور اس کی چمک کو آشکار کر دیتا ہے، ان کی فطرت توحیدی کو تعصب، جہالت اور غرور کے پردوں کے پیچھے سے آشکار و ظاہر کر دیا۔ زودگزر لمحے میں وہ موت کی سی ایک گہری نیند سے بیدار ہو گئے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "وہ اپنے وجدان اور فطرت کی طرف پلٹے اور خود اپنے آپ سے کہنے لگے کہ حق بات یہ ہے کہ ظالم تو تم خود ہی ہو۔"[۲]

تم نے تو خود اپنے اوپر بھی ظلم و ستم کیا ہے اور اس معاشرے کے اوپر بھی کہ جس کے ساتھ تمہارا تعلق ہے اور نعمتوں کے بخشنے والے پروردگار کی ساحت مقدس میں بھی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے ابراہیم پر ظالم ہونے کا اتہام لگایا تھا لیکن اب انہیں یہاں معلوم ہو گیا کہ اصلی اور حقیقی ظالم تو وہ خود ہیں۔

---

[۱] سورہ انبیاء آیت 63

[۲] سورہ انبیاء آیت 64

اور واقعاً ابراہیم علیہ السلام کا اصل مقصد بتوں کے توڑنے سے یہی تھا۔ مقصد تو بت پرستی کی فکر اور بت پرستی کی روح کو توڑنا تھا ورنہ بتوں کے توڑنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے، ہٹ دھرم بت پرست ان سے زیادہ اور ان سے بھی بڑے اور بنا لیتے اور ان کی جگہ پر رکھ دیتے جیسا کہ نادان، جاہل اور متعصب اقوام کی تاریخ میں اس مسئلے کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام اس حد تک کامیاب ہوئے کہ انہوں نے اپنی تبلیغ کے ایک بہت ہی حساس اور ظریف مرحلہ کو ایک نفسیاتی طوفان پیدا کر کے طے کر لیا اور وہ تھا سوئے ہوئے وجدانوں کو بیدار کرنا۔

بت تو بولتے ہی نہیں

لیکن افسوس: کہ جہالت و تعصب اور اندھی تقلید کا زنگ اس سے کہیں زیادہ تھا کہ وہ توحید کے اس علمبردار کی صیقل بخش پکار سے کلی طور پر دور ہو جاتا ہے۔

افسوس کہ یہ روحانی اور مقدس بیداری زیادہ دیر تک نہ رہ سکی اور ان کے آلودہ اور تاریک ضمیر میں، جہالت اور شیطانی قوتوں کی طرف سے اس نور توحید کے خلاف قیام عمل میں آ گیا اور ہر چیز اپنی پہلی جگہ پر پلٹ آئی قرآن کتنی لطیف تعبیر پیش کر رہا ہے:

''اس کے بعد وہ اپنے سر کے بل الٹے ہو گئے۔''[1]

اور اس غرض سے کہ اپنے گونگے اور بے زبان خداؤں کی طرف سے کوئی عذر پیش کریں، انہوں نے کہا: ''تو تو جانتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کرتے۔''[2]

یہ تو ہمیشہ چپ رہتے ہیں اور خاموشی کے رعب کو نہیں توڑتے۔

اور اس تراشے ہوئے عذر کے ساتھ انہوں نے یہ چاہا کہ بتوں کی کمزوری، بدحالی اور ذلت کو چھپائیں۔

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں ابراہیم جیسے ہیرو کے سامنے منطقی استدلال کے لئے میدان کھل گیا تا کہ ان پر بھرپور حملے کریں اور ان کے ذہنوں کو ایسی سرزنش اور ملامت کریں کہ جو منطقی اور بیدار کرنے والی ہو، (ابراہیم نے) پکار کر کہا: ''کیا تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو کہ جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ضرر''۔[3]

یہ خیالی خدا کہ جو نہ بات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نہ شعور و ادراک رکھتے ہیں، نہ خود اپنا دفاع کر سکتے ہیں، نہ بندوں کو اپنی حمایت کے لئے بلا سکتے ہیں، اصلاً ان سے کونسا کام ہو سکتا ہے اور یہ کس درد کی دوا ہیں؟ ایک معبود کی پرستش یا تو اس بناء پر ہوتی ہے کہ وہ عبودیت کے لائق ہے تو یہ بات بتوں کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتی، یا کسی فائدہ کی امید میں ہوتی ہے اور یا ان سے کسی نقصان کے خوف سے، لیکن بتوں کے توڑنے کے میرے اقدام نے بتا دیا کہ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو کیا اس حال میں تمہارا یہ کام احمقانہ نہیں ہے؟

پھر یہ معلم توحید بات کو اس سے بھی بالاتر لے گیا اور سرزنش کے تازیانے ان کی بے درد روح پر لگائے اور کہا: ''تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی کہ جنہیں تم نے خدا کو چھوڑ کر اپنا رکھا ہے۔''

---

[1] سورہ انبیاء آیت 65

[2] سورہ انبیاء آیت 65

[3] سورہ انبیاء آیت 66

''کیاتم کچھ سوچتے نہیں ہواورتمہارے سر میں عقل نہیں ہے۔''[1]

لیکن انہیں برا بھلا کہنے اور سرزنش کرنے میں نرمی اور ملائمت کوبھی نہیں چھوڑا کہ کہیں اور زیادہ ہٹ دھرمی نہ کرنے لگیں درحقیقت ابراہیمؑ نے بہت ہی جچے تلے انداز میں اپنا منصوبہ آگے بڑھایا پہلی مرتبہ انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہیں پکار کر کہا: یہ بے روح مجسمے کیا ہیں؟ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ تمہارے بڑوں کی سنت ہے توتم بھی گمراہ ہواور وہ بھی گمراہ تھے۔

دوسرے مرحلے میں ایک عملی اقدام کیا تا کہ یہ بات واضح کردیں کہ یہ بت اس قسم کی کوئی قدرت نہیں رکھتے کہ جوشخص ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے تواس کونابود کردیں، خصوصیت کے ساتھ پہلے سے خبردار کر کے بتوں کی طرف گئے اور انہیں بالکل درہم وبرہم کردیا تا کہ یہ بات واضح کریں کہ وہ خیالات وتصورات جوانہوں نے باندھے ہوئے ہیں سب کے سب فضول اور بے ہودہ ہیں۔

تیسرے مرحلے میں اس تاریخی عدالت میں انہیں بری طرح پھنسا کے رکھ دیا کبھی ان کی فطرت کوابھارا، کبھی ان کی عقل کو جھنجھوڑا، کبھی پند ونصیحت کی اور کبھی سرزنش وملامت۔

خلاصہ یہ کہ اس عظیم خدائی معلم نے ہر ممکن راستہ اختیار کیا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا اسے بروئے کار لایا لیکن تاثیر کے لئے ظرف میں قابلیت کا ہونا بھی مسلمہ شرط ہے۔افسوس یہ اس قوم میں موجود نہیں تھی۔

لیکن بلاشبہ ابراہیمؑ کی باتیں اور کام، توحید کے بارے میں کم ازکم استفہامی علامات کی صورت میں ان کے ذہنوں میں باقی رہ گئے اور یہ آئندہ کی وسیع بیداری اور آگاہی کے لئے ایک مقدمہ اور تمہید بن گئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ افراد اگرچہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت تھے، ان پر ایمان لے آئے تھے اور نسبتاً کچھ آمادگی کا سامان دوسروں کے لئے بھی پیدا ہوگیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کوجلا دیا جائے

اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کے عملی ومنطقی استدلالات کے ذریعے سب کے سب بت پرست مغلوب ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے دل میں اس شکست کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔

لیکن تعصب اور شدید ہٹ دھرمی حق کوقبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے ابراہیم کے بارے میں بہت ہی سخت اور خطرناک قسم کا ارادہ کرلیا اور وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کو بدترین صورت میں قتل کرنا چاہتے تھے انہوں نے پروگرام بنایا کہ انہیں جلا کر راکھ کردیا جائے۔

عام طور پر طاقت اور منطق کے درمیان معکوسی رابطہ ہوتا ہے، جس قدر انسان میں طاقت اور قدرت زیادہ ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی اس کی منطق کمزور ہوتی جاتی ہے سوائے مردان حق کے کہ وہ جتنا زیادہ قوی اور طاقتور ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ متواضع اور منطقی ہوجاتے ہیں۔

جولوگ طاقت کی زبان سے بات کرتے ہیں جب وہ منطق کے ذریعے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں توفوراً اپنی طاقت وقدرت کا

---

[1] سورہ انبیاء آیت 67

سہارا لے لیتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا گیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''ان لوگوں نے (چیخ کر) کہا: اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم سے کوئی کام ہوسکتا ہے۔''[1]

طاقتور صاحبان اقتدار بے خبر عوام کو مشتعل کرنے کے لئے عام طور پر ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ نفسیات کو پہچانتے ہیں اور اپنا کام کرنا خوب جانتے ہیں۔

جیسا کہ انہوں نے اس قصہ میں کیا اور ایسے نعرے لگائے اور ان کی غیرت کو للکارا: یہ تمہارے خدا ہیں، تمہارے مقدسات خطرے میں پڑ گئے ہیں، تمہارے بزرگوں کی سنت کو پاؤں تلے روند ڈالا گیا ہے، تمہاری غیرت وحمیت کہاں چلی گئی؟ تم اس قدر ضعیف حال کیوں ہو گئے ہو؟ اپنے خداؤں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ ابراہیم کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر کچھ کام تم سے ہوسکتا ہے اور بدن میں توانائی اور جان ہے، دیکھو: سب لوگ اپنے مقدسات کا دفاع کرتے ہیں، تمہارا تو سب کچھ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے اس قسم کی بہت سی فضول اور مہمل باتیں کیں اور لوگوں کو ابراہیم کے خلاف بھڑکایا اس طرح سے کہ لکڑیوں کے چند گٹھوں کی بجائے کہ جو کئی افراد کے جلانے کے لئے کافی ہوتے ہیں، لکڑیوں کے ہزارہا گٹھے ایک دوسرے پر رکھ کر لکڑیوں کا ایک پہاڑ بنا دیا اور اس کے بعد آگ کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تا کہ اس عمل کے ذریعہ سے اپنا انتقام بھی اچھی طرح سے لے سکیں اور بتوں کا وہ خیالی رعب ودبدبہ اور عظمت بھی، جس کو ابراہیم علیہ السلام کے طرز عمل سے سخت نقصان پہنچا تھا، کسی حد تک بحال ہو سکے۔

تاریخ دانوں نے اس مقام پر بہت سے مطالب تحریر کیے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی بعید نظر نہیں آتا۔

فرشتوں کی فریاد

سب لوگ چالیس دن تک لکڑیاں جمع کرنے میں لگے رہے اور ہر طرف سے بہت سی خشک لکڑیاں لالا کر جمع کرتے رہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ عورتیں تک بھی کہ جن کا کام گھر میں بیٹھ کر چرخا کاتنا تھا، وہ اس کی آمدنی سے لکڑیوں کا گٹھا لے کر اس میں ڈلواتی تھیں اور وہ لوگ کہ جو قریب مرگ ہوتے تھے، اپنے مال میں سے لکڑیاں خریدنے کی وصیت کرتے تھے اور حاجت منداپنی حاجتوں کے پورے ہونے کے لئے یہ منت مانتے تھے کہ اگر ان کی حاجت پوری ہوگئی، تو اتنی مقدار لکڑیوں کا اضافہ کریں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ان لکڑیوں میں مختلف اطراف سے آگ لگائی گئی تو اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ پرندے اس علاقے کے اوپر سے نہیں گزر سکتے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی آگ کے تو قریب بھی نہیں جایا جاسکتا چہ جائیکہ ابراہیم علیہ السلام کو لے جا کر اس میں پھینکیں مجبوراً منجنیق سے کام لیا گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے اندر بٹھا کر بڑی تیزی کے ساتھ آگ کے اس دریا میں پھینک دیا گیا

ان روایات میں کہ جو شیعہ اور سنی فرقوں کی طرف سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان ہوا ہے کہ: ''جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے اوپر بٹھایا گیا اور انہیں آگ میں پھینکا جانے لگا تو آسمان، زمین اور فرشتوں نے فریاد بلند کی اور بارگاہ خداوندی میں

---

[1] سورہ انبیاء آیت 68

درخواست کی کہ توحید کے اس علمبردار اور حریت پسندوں کے لیڈر کو بچالے۔''

اس وقت جبرائیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے کہا: کیا تمہاری کوئی حاجت ہے کہ میں تمہاری مدد کروں؟

ابراہیم علیہ السلام نے مختصر سا جواب دیا: تجھ سے حاجت؟ نہیں، نہیں، (میں تو اسی ذات سے حاجت رکھتا ہوں کہ جو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے)

تو اس موقع پر جبرائیل نے کہا: تو پھر تم اپنی حاجت خدا سے طلب کرو۔

انہوں نے جواب میں کہا: ''میرے لئے یہی کافی ہے کہ وہ میری حالت سے آگاہ ہے''۔

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے اس طرح راز و نیاز کیا:

"یا احد یا احد یا صمد یا صمد یا من لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد توکلت علی الله۔"

اے اکیلے، اے اکیلے اے بے نیاز اے بے نیاز اے وہ کہ جس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ جو جنا گیا اور جس کا کوئی ہم پلہ نہیں: میں اللہ پر ہی بھرسہ رکھتا ہوں۔

آگ گلزار ہوگئی

بہر حال لوگوں کے شور وغل اور جوش وخروش کے اس عالم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ کے شعلوں کے اندر پھینک دیئے گئے لوگوں نے خوشی سے اس طرح نعرے لگائے گو یا بتوں کو توڑنے والا ہمیشہ کے لئے نابود اور خاکستر ہو گیا۔

لیکن وہ خدا کہ جس کے فرمان کے سامنے تمام چیزیں سرخم کیے ہوئے ہیں۔ جلانے کی صلاحیت اسی نے آگ میں رکھی ہے اور ماؤں کے دل میں محبت بھی اسی نے ڈالی ہے اس نے ارادہ کرلیا کہ یہ خالص بندۂ مومن آگ کے اس دریا میں صحیح وسالم رہے تا کہ اس کے افتخار اور اعزاز کی سندوں میں ایک اور سند کا اضافہ ہو جائے۔

جیسا کہ قرآن اس مقام پر کہتا ہے: ''ہم نے آگ سے کہا: اے آگ: ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا۔''[1]

مشہور ہے کہ آگ اس قدر ٹھنڈی ہوگئی کہ ابراہیم کے دانت ٹھنڈک کی شدت سے بجنے لگے اور بعض مفسرین کے قول کے مطابق تو اگر ''سلاماً'' کی تعبیر ساتھ نہ ہوتی تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ ابراہیمؑ کی جان سردی سے خطرے میں پڑ جاتی۔ مشہور روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ نمرود کی آگ خوبصورت گلستان میں تبدیل ہوگئی۔ یہاں تک کہ بعض نے تو کہا ہے کہ جس دن ابراہیمؑ آگ میں رہے، ان کی زندگی کے دنوں میں سب سے بہترین راحت و آرام کا دن تھا؟[2]

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابراہیمؑ کے آگ میں صحیح وسالم رہ جانے سے صورت حال بالکل بدل گئی خوشی اور مسرت کا شور وغل ختم ہو گیا، تعجب سے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کچھ لوگ ایک دوسرے کے کان میں رونما ہونے والی اس عجیب چیز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے خدا کی عظمت کا ورد زبانوں پر جاری ہو گیا نمرود کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا لیکن پھر بھی

---

[1] سورہ انبیاء آیت 69

[2] آگ نے حضرت ابراہیم کو کیوں نہ جلایا؟ مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اجمالاً بات یہ ہے کہ بینش توحیدی کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی سبب سے بھی خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ایک دن وہ ابراہیم کے ہاتھ میں موجود چھری سے کہتا ہے: نہ کاٹ اور دوسرے دن آگ سے کہتا: نہ جلا اور ایک دن پانی کو جو سبب حیات ہے حکم دیتا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں کو غرق کردے۔

تعصب اور ہٹ دھرمی حق کو قبول کرنے میں پوری طرح حائل ہوگئی اگر چہ کچھ بیدار دل اس واقعہ سے بہرہ ور بھی ہوئے اور ابراہیم کے خدا کے بارے میں ان کے ایمان میں زیادتی اور اضافہ ہوا، مگر یہ لوگ اقلیت میں تھے۔

بہادر نوجوان

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ان کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور بعض نے اس وقت ان کا سن 26 سال کا ذکر کیا ہے۔

بہرحال وہ جوانی کی عمر میں تھے اور باوجود اس کے کہ ظاہری طور پر ان کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا، اپنے زمانے کے اس عظیم طاغوت کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کہ جو دوسرے طاغوتوں کا سرپرست تھا، آپ تن تنہا جہالت، خرافات اور شرک کے خلاف جنگ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور ماحول کے تمام خیالی مقدسات کا مذاق اڑایا اور لوگوں کے غصے اور انتقام سے ذرا بھی نہ گھبرائے کیونکہ ان کا دل عشق خدا سے معمور تھا اور ان کا اس پاک ذات پر ہی توکل اور بھروسہ تھا۔

ہاں: ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ یہ جہاں پیدا ہوجاتا ہے وہاں جرأت و شجاعت پیدا کردیتا ہے اور جس میں یہ موجود ہو، اسے شکست نہیں ہوسکتی۔

ابراہیم علیہ السلام اور نمرود

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا، نمرود کو یقین ہوگیا تھا کہ ابراہیم مٹی بھر خاک میں تبدیل ہوگئے ہیں لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہیں تو اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے

کہنے لگا مجھے تو ابراہیم زندہ دکھائی دے رہا ہے شاید مجھے اشتباہ ہو رہا ہے وہ ایک بلند مقام پر چڑھ گیا اور خوب غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ تو اسی طرح ہے۔

نمرود نے پکار کر کہا: اے ابراہیم علیہ السلام: واقعاً تیرا خدا عظیم ہے اور اس قدر قدرت رکھتا ہے کہ اس نے تیرے اور آگ کے درمیان ایک رکاوٹ پیدا کردی اب جبکہ یہ بات ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس کی قدرت اور عظمت کی وجہ سے اس کے لئے قربانی کروں (اور اس نے چار ہزار قربانیاں اس مقصد کے لئے تیار کیں) لیکن ابراہیم نے اس سے کہا: تجھ سے کسی قسم کی قربانی اور کار خیر قبول نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ تو پہلے ایمان لے آئے۔

نمرود نے جواب میں کہا: ''اس صورت میں تو میری حکومت ختم ہوجائے گی اور میں یہ بات گوارا نہیں کرسکتا۔''

بہرحال یہی حادثات اس بات کا سبب بن گئے کہ کچھ آگاہ اور بیدار دل لوگ ابراہیم کے خدا پر ایمان لے آئے یا ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا (اور شاید یہی واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ نمرود ابراہیم کے مقابلہ میں کسی سخت ردعمل کا اظہار نہ کرے اور صرف ان کو سرزمین بابل سے جلاوطن کرنے پر قناعت کرے۔)

نمرود سے گفتگو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مدمقابل اس اجتماع میں کون تھا اور کون آپؑ سے حجت بازی کر رہا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن فرمایا گیا ہے:

اس غرور و تکبر کے باعث جو اس میں نشہ حکومت کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا وہ ابراہیم علیہ السلام سے حجت بازی کرنے لگا۔ لیکن

حضرت علی علیہ السلام سے منقول در منثور کی ایک حدیث میں اور اسی طرح تواریخ میں اس کا نام ''نمرود بن کنعان'' بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر اس مباحثے کا وقت نہیں بتایا گیا۔لیکن قرائن سے اندازا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور آگ کی بھٹی سے نجات کے بعد کا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ آگ میں ڈالے جانے سے قبل اس گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اور اصولی طور پر بت پرست آپ کو ایسے مباحثے کا حق نہ دے سکتے تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسا مجرم اور گنہ گار سمجھتے تھے جسے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے اعمال اور خدایان مقدس کے خلاف قیام کی سزا ملے۔ وہ تو انہوں نے بت شکنی کے اقدام کا صرف سبب پوچھا تھا اور اس کے بعد انتہائی غصے اور سختی سے انہیں آگ میں جلانے کا حکم صادر ہوا تھا لیکن جب آپؑ حیرت انگیز طریقے سے آگ سے نجات پا گئے تو پھر اصطلاحی الفاظ میں ''نمرود کے حضور رسائی ہوئی'' اور پھر بحث و مباحثے کے لیے بیٹھ سکے۔ بہر حال نمرود اپنی حکومت کی وجہ سے بادہ غرور سے سرمست تھا لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھنے لگا تیرا خدا کون ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''وہی جو زندہ کرتا اور مارتا ہے''، حقیقت میں آپؑ نے عظیم ترین شاہکار قدرت کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ مبداء جہان ہستی کے علم و قدرت کی واضح نشانی یہی قانون موت و حیات ہے لیکن اس نے مکر و فریب کی راہ اختیار کی اور مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں اور اپنے حمایتیوں کو غافل رکھنے کے لئے کہا وہ تو میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور موت و حیات کا قانون میرے ہاتھ میں ہے۔ قرآن میں اس کے جملے کے بعد واضح نہیں ہے کہ اس نے اپنے پیدا کئے گئے مغالطے کی تائید کے لئے کس طرح عملی اقدام کیا لیکن احادیث و تواریخ میں آیا ہے کہ اس نے فوراً دو قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ قیدی لائے گئے تو اس نے فرمان جاری کیا کہ ایک کو آزاد کر دو اور دوسرے کو قتل کر دو۔ پھر کہنے لگا: تم نے دیکھا کہ موت و حیات کس طرح میرے قبضے میں ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت و حیات سے متعلق دلیل ہر لحاظ سے قوی تھی لیکن دشمن سادہ لوح لوگوں کو جھل دے سکتا تھا لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا کہ خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے اگر جہاں ہستی کی حکومت تیرے ہاتھ میں ہے تو تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہاں دشمن خاموش، مبہوت اور عاجز ہو گیا۔ اس میں سکت نہ رہی کہ اس زندہ منطق کے بارے میں کوئی بات کر سکے۔ ایسے ہٹ دھرم دشمنوں کو لاجواب کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ موت و حیات کا مسئلہ کئی جہات سے آسمان اور گردش شمس و قمری کی نسبت پروردگار عالم کے علم و قدرت پر زیادہ گواہی دیتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے وہی مسئلہ پیش کیا اور یہ فطری امر ہے کہ اگر صاحب فکر اور روشن ضمیر افراد اس مجلس میں ہوں گے تو وہ اسی دلیل سے مطمئن ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک قیدی کو آزاد کرنا اور دوسرے کو قتل کر دینا یہ طبیعی اور حقیقی موت و حیات سے بالکل ربط نہیں رکھتا، لیکن جو لوگ کم عقل تھے اور اس دور کے ظالم حکمران کے پیدا کردہ مغالطے سے متاثر ہو سکتے تھے ان کی فکر راہ حق سے منحرف ہو سکتی تھی لہٰذا آپؑ نے دوسرا استدلال پیش کیا اور سورج کے طلوع و غروب کا مسئلہ پیش کیا تا کہ حق ہر دو طرح کے افراد کے سامنے واضح ہو جائے۔ اس بات کی طرف توجہ کرنا مناسب ہے کہ قرآنی گفتگو سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ وہ ظالم اپنے بارے میں الوہیت کا مدعی تھا، یہی نہیں کہ وہ اپنی پرستش کرواتا تھا بلکہ اپنے آپ کو عالم ہستی کا پیدا کرنے والا بھی بتاتا تھا، یعنی اپنے آپ کو ''معبود'' بھی سمجھتا تھا اور ''خالق'' بھی۔

بت پرستوں کی سرزمین سے ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت

ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ اور اس خطرناک مرحلہ سے ان کی معجزانہ نجات نے نمرود کے ارکان

حکومت کولرزہ براندام کردیا،نمرودتو بالکل حواس باختہ ہوگیا کیونکہ اب وہ ابراہیمؑ کوایک فتنہ کھڑا کرنے والا اور نفاق ڈالنے والا جوان نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ابراہیم اب ایک خدائی رہبر اور بہادر رہبر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا اس نے دیکھا کہ ابراہیمؑ اس کے تمام تر طاقت ووسائل کے باوجوداس کے خلاف جنگ کی ہمت رکھتا ہےاس نے سوچا کہ اگرابراہیم ان حالات میں اس شہراوراس ملک میں رہا تو اپنی باتوں،قوی منطق اور بےنظیر شجاعت کے ساتھ،مسلمہ طور پراس جابر،خودسراورخودغرض حکومت کے لئے ایک خطرے کا مرکز بن سکتا ہےلہٰذااس نے فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو ہر حالت میں اس سرزمین سے چلا جانا چاہیئے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ حقیقت میں اپنی رسالت کا کام اس سرزمین میں انجام دے چکے تھے وہ حکومت کی بنیادوں پر یکے بعد دیگرے چکنا چور کرنے والی ضربیں لگا چکے تھے اس سرزمین میں ایمان وآ گاہی کا بیج بو چکے تھے اب صرف ایک مدت کی ضرورت تھی کہ جس سے یہ بیج آہستہ آہستہ بارآور ہواور بت پرستی کی بساط الٹ جائے۔

اب ان کے لئے بھی مفید یہی تھا کہ یہاں سے کسی دوسری سرزمین کی طرف چلے جائیں اوراپنی رسالت کے کام کو وہاں بھی عملی شکل دیں لہٰذاانہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ لوط (جوآپ کے بھتیجے تھے)اوراپنی بیوی سارہ اوراحتمالاً مومنین کے ایک چھوٹے سے گروہ کوساتھ لےکراس سرزمین سے شام کی طرف ہجرت کرجائیں۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے:''ہم نے ابراہیم اورلوط کوایسی سرزمین کی طرف نجات دی کہ جسے ہم نے سارے جہان والوں کے لئے برکتوں والا بنایا تھا۔''[1]

اگرچہ قرآن میں اس سرزمین کا نام صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا ہےلیکن سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت (''سبحان الذی''۔ ''بارکنا حولہ''۔) پرتوجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہی شام کی سرزمین ہے جوظاہری اعتبار سے بھی پر برکت،زرخیز اورسرسبزوشاداب ہےاورمعنوی لحاظ سےبھی،کیونکہ وہ انبیاءکی پرورش کا مرکزتھی۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہ ہجرت خود اپنے آپ کی تھی یا نمرود کی حکومت نے انہیں جلاوطن کیا یا یہ دونوں ہی صورتیں واقع ہوئیں، اس بارے میں تفاسیر وروایات میں مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا مجموعی مفہوم یہی ہے کہ ایک طرف تونمرود اوراس کے ارکان حکومت ابراہیم علیہ السلام کواپنے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے،لہٰذا انھوں نے انہیں اس سرزمین سے نکلنے پر مجبور کردیا اور دوسری طرف ابرہیم علیہ السلام بھی اس سرزمین میں اپنی رسالت کا کام تقریباً مکمل کرچکے تھےاوراب کسی دوسرے علاقے میں جانے کےخواہاں تھے کہ دعوت توحید کو وہاں بھی پھیلائیں خصوصاً بابل میں باقی رہنے سے ممکن تھا کہ آپ کی جان چلی جاتی اورآپ کی عالمی دعوت نامکمل رہ جاتی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں یہ بیان ہوا کہ جس وقت نمرود نے یہ ارادہ کیا کہ ابراہیمؑ کواس سرزمین سے جلاوطن کردے تواس نے یہ حکم دیا کہ ابراہیمؑ کی بھیڑیں اوران کا سارا مال ضبط کرلیا جائے اوروہ اکیلا ہی یہاں سے باہر جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے اگرتم میرا مال لینا چاہتے ہوتو میری اس عمر کو جو میں نے اس سرزمین میں گزاری ہے مجھے واپس دے دولہٰذا طے یہ پایا کہ حکومت کے قاضیوں میں سے ایک اس بارے میں فیصلہ دے،قاضی نے حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مال لےلیاجائے اور جوعمرانہوں نے اس سرزمین میں خرچ کی ہے وہ انہیں واپس کردی جائے۔

---

[1] سورہ انبیاءآیت71

جس وقت نمرود اس واقعے سے آگاہ ہوا تو اس نے بہادر قاضی کے حقیقی مفہوم کو سمجھ لیا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کا مال اور اس کی بھیڑیں اسے واپس کر دی جائیں تاکہ وہ انہیں ساتھ لے جائے اور کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ یہاں رہ گیا تو وہ تمہارے دین و آئین کو خراب کر دے گا اور تمہارے خداؤں کو نقصان پہنچائے گا''۔

کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا؟

ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔آپ نے دریا کے کنارے ایک مردار پڑا ہوا دیکھا، اس کا کچھ حصہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے،اس منظر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسے مسئلہ کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت ابراہیم علیہ السلام سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جزء بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے عمل میں آئے گا جب کہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: خدایا مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا متعال نے حکم دیا: چار پرندے لے لو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کر دو اور ہر حصہ کو ایک پہاڑ پر رکھ دو اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تاکہ میدان حشر کا منظر دیکھ سکو۔انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آ گئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے:

''اس وقت (کو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا: مجھے دکھا دے تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے،فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لائے۔کہنے لگے: کیوں نہیں، میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کر لو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر لو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملا دو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئیں گے، اور جان لو کہ خدا غالب اور حکیم ہے''۔[1] (وہ مردوں کے اجزائے بدن کو بھی جانتا ہے اور انہیں جمع کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔)

چند اہم نکات

1۔ چار پرندے: اس میں شک نہیں کہ مذکورہ چار پرندے مختلف قسم کے پرندوں میں سے تھے کیونکہ اس کے بغیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا ہے۔اس کے لئے ضروری تھا کہ ہر ایک کے اجزاء اس کے اصلی بدن میں واپس آئیں اور یہ مختلف قسم کے ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا تھا۔مشہور روایت کے مطابق وہ چار پرندے اس طرح تھے مور، مرغ، کبوتر اور کوا جو کہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

بعض ان پرندوں کو انسانوں کی مختلف صفات اور جذبات کا مظہر سمجھتے ہیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت 259

مور: خودنمائی، زیبائش اور تکبر کا مظہر ہے۔

مرغ: شدید جنسی میلانات کا مظہر ہے۔

کبوتر: لہو ولعب اور کھیل کود کا مظہر ہے۔

کوا: لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔

2۔ پہاڑوں کی تعداد: جن پہاڑوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے اجزاء رکھے تھے ان کی تعدا کی صراحت قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن روایات اہل بیت علیہم السلام میں یہ تعداد دس بتائی گئی ہے۔[1]

3۔ واقعہ کب رونما ہوا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل میں تھے یا جب شام چلے آئے تھے، یوں لگتا ہے، یہ شام میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ سرزمین بابل میں پہاڑ نہیں ہیں۔

اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو منتقل کرنے کا حکم

سالہا سال گذر گئے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام اس صالح فرزند کے انتظار اور خواہش میں زندگی بسر کرتے رہے، انھوں نے عرض کیا: ''پروردگارا: مجھے ایک فرزند صالح عطا فرما۔''[2]

آخر کار خدا نے ان کی دعا قبول کر لی، پہلے انھیں اسماعیل علیہ السلام اور پھر اسحاق علیہ السلام مرحمت فرمائے کہ جن میں سے ہر ایک بزرگ پیغمبر اور صاحب منزلت تھے۔

آپ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو اپنی بیوی بنالیا تھا۔ اس سے انہیں اسمٰعیلؑ جیسا بیٹا نصیب ہوا آپ کی پہلی بیوی سارہ نے ان سے حسد کیا یہی حسد سبب بنا کہ آپ ہاجرہ اور اپنے شیرخوار بچے کو حکم خدا سے فلسطین سے لے کر مکہ کی جلتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں کی سرزمین میں لے گئے یہ وہ علاقہ تھا جہاں پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہ تھی آپ حکم خدا سے ایک عظیم امتحان سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں چھوڑ کر واپس فلسطین آ گئے۔

وہاں چشمہ زمزم پیدا ہوا اس اثناء میں جرہم قبیلہ ادھر سے گزرا اس نے جناب ہاجرہؑ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی۔۔ گویا واقعات کا ایک طولانی سلسلہ ہے کہ جو اس علاقے کی آبادی کا باعث بنا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تھی کہ اس جگہ کو آباد اور پر برکت شہر بنادے اور لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کردے ان کی اولاد وہاں پھلنے پھولنے لگی تھی۔[3]

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہاجرہؑ اور شیرخوار اسماعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے تو جناب ہاجرہؑ نے فریاد کی: اے ابراہیم علیہ السلام آپ کو کس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پر چھوڑ جائیں کہ جہاں نہ کوئی سبزہ ہے، نہ دودھ دینے والا کوئی جانور، یہاں تک کہ یہاں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں ہے آپ پھر بھی ہمیں بغیر زادوتوشہ اور مونس ومددگار کے چھوڑے جا رہے ہیں۔

---

[1] اسی لئے بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مال کا ایک جزء فلاں سلسلے میں صرف کرنا اور اس کی مقدار معین نہ کر جائے تو مال کا دسواں حصہ دینا کافی ہے۔

[2] سورہ ابراہیم آیت 37 تا 41

[3] سورہ صافات آیت 100

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مختصر سا جواب دیا: میرے پروردگار نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

ہاجرہؑ نے یہ سنا تو کہنے لگیں: اگر ایسا ہے تو پھر خدا ہرگز ہمیں یونہی نہیں چھوڑے گا۔

ابراہیم علیہ السلام نے حکم خدا کی اطاعت کی اور انہیں سرزمین مکہ میں لے گئے جو ایسی خشک اور بے آب وگیاہ تھی کہ وہاں کسی پرندے کا بھی نام ونشان نہ تھا جب ابراہیمؑ انہیں چھوڑ کر تنہا واپس ہولئے تو ان کی اہلیہ رونے لگیں کہ ایک عورت اور ایک شیر خوار بچہ اس بے آب وگیاہ بیابان میں کیا کریں گے۔

اس خاتون کے گرم آنسو اور ادھر بچے کا نالہ وگریہ زاری اس منظر نے ابراہیم علیہ السلام کا دل ہلا کے رکھ دیا۔

انہوں نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا:

خداوندا: میں تیرے حکم پر اپنی بیوی اور بچے کو اس جلا دینے والے بے آب وگیاہ بیابان میں تنہا چھوڑ رہا ہوں، تاکہ تیرا نام بلند اور تیرا گھر آباد ہو۔

یہ کہہ کر غم واندوہ اور شدید محبت کے عالم میں الوداع ہوئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ماں کے پاس آب وغذا کا جو توشہ تھا ختم ہوگیا اور اس کی چھاتی کا دودھ بھی خشک ہوگیا شیر خوار بچے کی بے تابی اور تضرع وزاری نے ماں کو ایسا مضطرب کردیا کہ وہ اپنی پیاس بھول گئی وہ پانی کی تلاش میں اٹھ کھڑی ہوئی، پہلے کوہ صفا کے قریب گئی تو پانی کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا، سراب کی چمک نے اسے کوہ مروہ کی طرف کھینچا تو وہ اس کی طرف دوڑی لیکن وہاں بھی پانی نہ ملا، وہاں ویسی چمک صفا پر دکھائی دی تو پلٹ کر آئی، زندگی کی بقاء اور موت سے مقابلہ کے لئے اس نے سات چکر لگائے، آخر شیر خوار بچہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگا کہ اچانک اس کے پاؤں کے پاس انتہائی تعجب خیز طریقہ سے زمزم کا چشمہ ابلنے لگا، ماں اور بچے نے پانی پیا اور موت جو یقینی ہوگئی تھی اس سے بچ نکلے۔

زمزم کا پانی گویا آب حیات تھا، ہر طرف سے پرندے اس چشمہ کی طرف آنے لگے، قافلوں نے پرندوں کی پرواز دیکھی تو اپنے رُخ کو اس طرف موڑ دیا اور ظاہراً ایک چھوٹے سے خاندان کی فداکاری کے صلے میں ایک عظیم مرکز وجود میں آگیا۔

آج خانہ خدا کے پاس اس خاتون اور اس کے فرزند اسماعیل علیہ السلام کا مسکن ہے، ہر سال تقریباً 20 لاکھ افراد اطراف عالم سے آتے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ اس مسکن کو جسے مقام اسماعیل کہتے ہیں اپنے طواف میں شامل کریں گویا اس خاتون اور اس کے بیٹے کے مدفن کو طواف کعبہ کا یا حج کا جزء سمجھیں۔

اسماعیل علیہ السلام قربان گاہ میں

اسماعیلؑ کا سن 13 سال کا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عجیب اور حیرت انگیز خواب دیکھا، یہ خواب اس عظیم الشان پیغمبر کے لئے ایک اور آزمائش کو بیان کرتا تھا۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ انہیں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قربانی کریں اور اسے ذبح کردیں۔

ابراہیم علیہ السلام وحشت زدہ خواب سے بیدار ہوئے، وہ جانتے تھے کہ پیغمبروں کے خواب حقیقت اور شیطانی وسوسوں سے دور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود دوراتوں میں بھی یہی خواب دیکھا جو اس امر کے لازم ہونے اور اسے جلد انجام دینے کے لئے تاکید تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی مرتبہ ''شب ترویہ'' (آٹھ ذی الحجہ کی رات) یہ خواب دیکھا اور ''عرفہ'' اور ''عید قربان'' (نویں اور دسویں ذی الحجہ) کی راتوں میں خواب کا تکرار ہوا۔ لہٰذا اب ان کے لئے ذرا سا بھی شک باقی نہ رہا کہ یہ خدا کا قطعی فرمان ہے۔

ابراہیم علیہ السلام جو بارہا امتحان خداوندی کی گرم بھٹی سے سرفراز ہو کر باہر آ چکے تھے، اس دفعہ بھی چاہئے کہ بحر عشق میں کود پڑیں اور خداوند عالم کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیں، اور اس فرزند کو جس کے انتظار میں عمر کا ایک حصہ گذار دیا تھا اور اب وہ ایک آبرومند نوجوان تھا، اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہر چیز سے پہلے اپنے فرزند کو اس کام کے لئے آمادہ کریں، لہٰذا اس کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''میرے بیٹے: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تم دیکھو: تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے''؟[1]

بیٹا بھی تو ایثار پیشہ باپ کے وجود کا ایک حصہ تھا اور جس نے صبر و استقامت اور ایمان کا درس اپنی چھوٹی سی عمر میں اسی کے مکتب میں پڑھا تھا، اس نے خوشی خوشی خلوص دل کے ساتھ اس فرمان الٰہی کا استقبال کیا اور صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: ''ابا جان: جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجئے''۔[2]

میری طرف سے بالکل مطمئن رہئے۔ ''انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے''۔[3]

باپ اور بیٹے کی یہ باتیں کس قدر معنی خیز ہیں اور کتنی باریکیاں ان میں چھپی ہوئی ہیں۔

ایک طرف تو باپ، 13 سالہ بیٹے کے سامنے اسے ذبح کرنے کی بات بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے اور اس سے اس کی رائے معلوم کرتا ہے اس کے لئے مستقل شخصیت اور ارادے کی آزادی کا قائل ہوتا ہے، وہ ہرگز اپنے بیٹے کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا اور اسے اندھیرے میں رکھتے ہوئے امتحان کے اس عظیم میدان میں آنے کی دعوت نہیں دیتا وہ چاہتا ہے کہ بیٹا بھی اس عظیم امتحان میں پورے خلوص دل کے ساتھ شرکت کرے اور باپ کی طرح تسلیم و رضا کا مزہ چکھے۔

دوسری طرف بیٹا بھی یہ چاہتا ہے کہ باپ اپنے عزم و ارادہ میں پکا اور مضبوط رہے، یہ نہیں کہتا کہ مجھے ذبح کریں بلکہ کہتا ہے: جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجا لائیں میں اس کے امر و فرمان کے سامنے سر تسلیم خم ہوں، خصوصاً باپ کو ''یا ابت'' (ابا جان:) کہہ کر مخاطب کرتا ہے، تاکہ اس بات کی نشاندہی کر دے کہ اس مسئلے پر جذبات فرزند و پدر کا سوئی کی نوک کے برابر بھی اثر نہیں، کیونکہ فرمان خدا ہر چیز پر حاکم ہے۔

اور تیسری طرف سے پروردگار کی بارگاہ میں مراتب آداب کی اعلیٰ ترین طریقے سے پاسداری کرتا ہے، ہرگز اپنے ایمان اور عزم و ارادہ کی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ پر تکیہ کرتا ہے اور اس عبادت کے ساتھ اس سے پامردی اور استقامت کی توفیق چاہتا ہے۔

اس طرح سے باپ بھی اور بیٹا بھی اس عظیم آزمائش کے پہلے مرحلے کو مکمل کامیابی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

شیطانی وسوسہ

شیطان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کوئی ایسا کام کرے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میدان سے کامیاب ہو کر نہ نکلیں، کبھی

---

[1] سورہ صافات آیت 102

[2] سورہ صافات آیت 102

[3] سورہ صافات آیت 102

وہ (اسمٰعیلؑ کی) ماں ہاجرہ کے پاس آیا اور ان سے کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابراہیم نے کیا ارادہ کیا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ آج اپنے بیٹے کو ذبح کردے۔

ہاجرہؑ نے کہا: دور ہوجا، محال اور نہ ہونے والی بات نہ کر، کیونکہ وہ تو بہت مہربان ہے اپنے بیٹے کو کیسے ذبح کرسکتا ہے؟ اصولاً کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان پیدا ہوسکتا ہے جو اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کردے؟

شیطان نے اپنے وسوسہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا: اس کا دعویٰ ہے کہ خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ ہاجرہؑ نے کہا: اگر خدا نے اسے حکم دیا ہے تو پھر اسے اطاعت کرنا چاہیے، اور سوائے رضا و تسلیم کے کوئی دوسری راہ نہیں ہے

پھر شیطان ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے پاس آیا، اور انہیں ورغلانے لگا، ان سے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ اس نے اسماعیل علیہ السلام کو تسلیم و رضا کا پیکر پایا۔

آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراہیم علیہ السلام: جو خواب تم نے دیکھا ہے وہ شیطانی خواب ہے، تم شیطان کی اطاعت نہ کرو۔

ابراہیم علیہ السلام نے نور ایمان اور نبوت کے پرتو میں اسے پہچان لیا: چلا کر کہا: ''دور ہوجا اے دشمن خدا۔''

ایک حدیث میں منقول ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے ''مشعر الحرام'' میں آئے تا کہ بیٹے کی قربانی دیں، تو شیطان ان کے پیچھے دوڑا۔ وہ ''جمرہ اولیٰ'' کے پاس آئے شیطان کو دیکھا، اس کو سات پتھر مارے، اس کے بعد وہاں سے جمرہ دوم پر آئے وہاں شیطان کو دیکھا تو دوبارہ سات پتھر اسے مارے یہاں تک کہ ''جمرہ عقبہ'' میں آئے تو سات اور پتھر اسے مارے۔ (اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سے مایوس کردیا)۔

میری والدہ کو سلام کہنا

اس دوران کیا کیا حالات پیش آئے، قرآن نے انہیں تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا اور صرف اس عجیب ماجرے کے نہایت حساس پہلو ذکر کئے ہیں۔

بعض نے لکھا ہے کہ فداکار بیٹے نے اس بنا پر کہ باپ کی اس ماموریت کی انجام دہی میں مدد کرے اور ماں کے رنج و اندوہ میں کمی کرے جس وقت وہ اسے سرزمین ''منیٰ'' کے خشک اور جلا ڈالنے والے گرم پہاڑوں کے درمیان، قربان گاہ میں لائے تو باپ سے کہا: ابا جان: رسی کو مضبوطی کے ساتھ باندھ دیجئے، تا کہ میں فرمان خداوندی کے اجراء کے وقت ہاتھ پاؤں نہ ہلاسکوں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس سے میرے اجر میں کمی واقع نہ ہوجائے۔

ابا جان: چھری تیز کر لیجیے اور تیزی کے ساتھ میرے گلے پر چلایئے کہ اسے برداشت کرنا مجھ پر بھی (اور آپ پر بھی) زیادہ آسان ہوجائے۔

ابا جان: میرا کرتا پہلے ہی میرے بدن سے اتار لیجئے تا کہ وہ خون آلود نہ ہو، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میری ماں اسے دیکھے تو دامن صبر اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

پھر مزید کہا: میرا سلام میری ماں کو پہنچا دیجئے گا اور اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو میرا کرتا اس کے لئے لے جایئے جو اسکی تسلی خاطر اور تسکین کا باعث بنے گا کیونکہ وہ اس سے بیٹے کی خوشبو سونگھے گی اور جس وقت دل بے قرار ہوگا تو اسے اپنی آغوش میں لے لے گی

اس طرح یہ اس کے درد دل میں تخفیف کا باعث ہوگا۔

باپ بیٹے ایک دوسرے سے مل کر رونے لگے

آخر وہ حساس لمحے آن پہنچے جب فرمان الٰہی کی تعمیل ہونا تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بیٹے کے مقام تسلیم کو دیکھا، اسے اپنی آغوش میں لے لیا، اس کے رخساروں کے بوسے لئے اور اس گھڑی دونوں رونے لگے۔ ایسا گریہ تھا کہ ان کے جذبات اور لقائے خدا کے لئے ان کا شوق ظاہر ہوتا تھا۔

قرآن مختصر اور معنی خیز عبارت میں صرف اتنی سی بات کہتا ہے: ''جب دونوں آمادہ وتیار ہو گئے اور (باپ) ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا''۔[1]

قرآن یہاں پھر اختصار کے ساتھ گزر گیا ہے اور سننے والے کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے احساسات کی موجوں کے ساتھ قصے کو سمجھے۔

بعض نے کہا ہے کہ ''تله للجبين'' سے مراد یہ تھی کہ پیشانی خود اس کی فرمائش پر زمین پر رکھی کہ مبادا ان کی نگاہ بیٹے کے چہرے پر پڑے اور پدری جذبات جوش میں آجائیں اور فرمان خدا کے اجراء میں مانع ہو جائیں۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کے چہرے کو خاک پر رکھا اور چھری کو حرکت دی اور تیزی اور طاقت کے ساتھ اسے بیٹے کے گلے پر پھیر دیا جب کہ ان کی روح ہیجان میں تھی اور صرف عشق خدا ہی انہیں اپنی راہ میں کسی شک کے بغیر آگے بڑھا رہا تھا۔

لیکن تیز دھار چھری نے بیٹے کے لطیف و نازک گلے پر معمولی سا بھی اثر نہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حیرت میں ڈوب گئے، دوبارہ چھری کو چلایا، لیکن پھر بھی وہ کارگر ثابت نہ ہوئی، ہاں: خلیل تو کہتے ہیں کہ ''کاٹ''، لیکن خداوند جلیل یہ حکم دے رہا ہے کہ ''نہ کاٹ'' اور چھری تو صرف اسی کی فرمانبردار ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں قرآن ایک مختصر اور معنی خیز جملے کے ساتھ انتظار کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اس وقت ہم نے ندا دی (اور پکار کر کہا) کہ اے ابراہیم: خواب میں جو حکم تمہیں دیا گیا تھا وہ تم نے پورا کر دیا، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔''[2]

ہم ہی انہیں امتحان میں کامیابی کی توفیق دیتے ہیں اور ہم ایسا بھی نہیں ہونے دیں گے کہ ان کا فرزند دل بند ان کے ہاتھ ہی سے چلا جائے ہاں: جو شخص سرتاپا ہمارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اس نے نیکی کو اعلیٰ حد تک پہنچا دیا ہے، اس کی اس کے سوا اور کوئی جزا نہیں ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ''بے شک یہ اہم اور آشکار امتحان ہے۔''[3]

بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا، وہ بھی نیک اور لائق بیٹا، اس باپ کے لئے جس نے ایک عمر ایسے فرزند کے انتظار میں گذاری ہو، آسان کام نہیں ہے۔ ایسے فرزند کی یاد کس طرح دل سے نکال سکتا تھا؟ اس سے بھی بالاتر یہ کہ وہ انتہائی تسلیم و رضا کے ساتھ ماتھے پر شکن لائے بغیر ایسے فرمان کی تعمیل کے لئے آگے بڑھے اور اس کے تمام مقدمات کو آخری مرحلے تک انجام دے، اس

---

[1] سورہ صافات آیت 103

[2] سورہ صافات آیت 104

[3] سورہ صافات آیت 106

طور پر کہ روحانی اور عملی آمادگی کے لحاظ سے کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔

اس سے بھی بڑھ کر عجیب، اس فرمان کے آگے اس نوجوان کی اطاعت شعاری کی انتہا، وہ خوشی خوشی، اطمینان قلب کے ساتھ پروردگار کے لطف سے، اس کے ارادے کے سامنے، سر تسلیم خم کرتے ہوئے، ذبح کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔

جبرائیل علیہ السلام کی فریاد تکبیر

جس وقت یہ کام انجام پاچکا تو جبرائیل نے (تعجب کرتے ہوئے) پکار کر کہا ''اللہ اکبر'' ''اللہ اکبر'' ابراہیم علیہ السلام کے فرزند نے کہا: ''لا الہ الا اللہ واللہ اکبر''۔ اور عظیم فداکار باپ نے بھی کہا ''اللہ اکبر واللہ الحمد''۔

اور یہ ان تکبیروں کے مشابہ ہے جو ہم عید قربان کے دن پڑھتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی روایات میں عید الاضحیٰ کے بارے میں جو احکام آئے ہیں ان میں کچھ مخصوص تکبیریں ہیں جو تمام مسلمان پڑھتے ہیں چاہے وہ مراسم حج میں شریک ہوں اور یا منیٰ میں موجود ہوں اور چاہے دوسرے مقامات پر ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ جو منیٰ میں ہیں وہ ان نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں جن سے پہلی عید کے دن کی نماز ظہر ہے اور جو منیٰ میں نہیں ہوتے وہ ان نمازوں کے بعد تکرار کرتے ہیں اور ان تکبیرات کی صورت اس طرح ہے:

''اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر، اللہ اکبر، وللہ الحمد، اللہ اکبر علی ما ھدانا''۔

جس وقت ہم اس حکم کا اس حدیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں، جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکبیریں حقیقت میں جبرائیل علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی تکبیروں کا مجموعہ ہیں، اور کچھ اس پر اضافہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ الفاظ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس عظیم آزمائش میں کامیابی کی یاد لوگوں کی نظروں میں زندہ کرتے ہیں، اور تمام مسلمانوں کو ایک پیغام الٰہی دیتے ہیں چاہے وہ منیٰ میں ہوں یا منیٰ کے علاوہ دوسرے مقامات پر۔ [1]

ذبح عظیم

لیکن اس غرض سے کہ ابراہیم علیہ السلام کا پروگرام بھی نامکمل نہ رہ جائے اور خدا کی بارگاہ میں ان کی طرف سے قربانی بھی ہو جائے اور ابراہیمؑ کی آرزو پوری ہو جائے، خدا نے ایک بہت بڑا مینڈھا بھیج دیا تاکہ بیٹے کی جگہ اس کی قربانی کریں اور مراسم ''حج'' اور سرزمین ''منیٰ'' میں آنے والوں کے لئے اپنی سنت چھوڑ جائیں چنانچہ قرآن کہتا ہے: ''ہم نے ذبح عظیم کو اس کا فدیہ قرار دیا۔'' [2]

اس ذبح کی عظمت کی ایک نشانی یہ ہے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال زیادہ وسعت پا رہی ہے۔

اس وقت ہر سال اس ذبح عظیم کی یاد میں بیس لاکھ سے زیادہ ''منیٰ'' میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس یاد کو زندہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] سورہ حجر آیت 51

[2] سورہ صافات آیت 107

اس بارے میں کہ اس ذبح کی عظمت کس لحاظ سے تھی، جسمانی اور ظاہری لحاظ سے یا اس جہت سے کہ فرزند ابراہیم کا فدیہ تھی یا اس لحاظ سے کہ خدا کی راہ میں اور خدا کے لئے تھی یا اس لحاظ سے کہ قربانی خدا کی طرف سے ابراہیم کے لئے بھیجی گئی تھی۔

مفسرین نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام جہات ذبح عظیم میں جمع ہوں اور وہ مختلف جہات سے عظمت کی حامل ہو۔

وہ بہت بڑا مینڈھا ابراہیمؑ کو کس طرح دیا گیا اس بارے میں زیادہ تر اس بات کے معتقد ہیں کہ اسے جبرائیل لائے تھے، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ''منیٰ'' کے پہاڑوں کے دامن سے نیچے اترا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا خدا کے حکم اور اس کے ارادے سے تھا، خدا نے نہ صرف اس دن کے عظیم امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کی تعریف وتوصیف کی بلکہ اس کی یاد کو جاویدانی بنا دیا۔

جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے ابراہیم کے نیک نام کو بعد کی امتوں میں باقی رہنے والا بنایا۔''[1]

وہ آنے والی سب نسلوں اور لوگوں کے لئے نمونہ اور تمام پاکباز اور کوئے دوست کے دلدادہ عاشقوں کے لئے راہنما بن گئے اور ہم نے ان کے طرز عمل کو رہتی دنیا تک کے لئے حج کی سنت کے طور پر جاویدانی بنادیا وہ عظیم پیغمبروں کے باپ تھے وہ امت اسلامی اور پیغمبر اسلام کے باپ تھے۔

''ابراہیم پر سلام (جو مخلص اور پاکباز تھے)۔''[2] ہاں ''ہم اسی طرح سے نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔''[3] عظمت دنیا کا صلہ، تمام زمانوں میں باقی رہنے والا صلہ، خدائے بزرگ کے لائق درود وسلام کا صلہ۔

ذبیح اللہ کون ہے؟

اس بارے میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں فرزندوں (اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام) میں سے کون قربان گاہ میں لایا گیا اور کس نے ذبیح اللہ کا لقب پایا؟ مفسرین کے درمیان شدید بحث ہے ایک گروہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ''ذبیح'' جانتا ہے اور ایک جماعت حضرت اسماعیل علیہ السلام، کو پہلے نظریہ کو بہت سے مفسرین اہل سنت اور دوسرے نظریہ کو مفسرین شیعہ نے اختیار کیا ہے، لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے وہ یہی ہے کہ ''ذبیح'' ''اسماعیل علیہ السلام'' تھے۔

جناب اسحاق علیہ السلام کی بشارت

یہ امر جاذب نظر ہے کہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے واقعہ سے شروع کی گئی ہے (وہی فرشتے کہ جو آپ کے پاس انسانی لباس میں آئے تھے پہلے انھوں نے آپ کو ایک ذی وقار بیٹے کی پیدائش کی بشارت دی اور پھر قوم لوط کے دردناک انجام کی خبر دی)۔

ارشاد فرمایا: ''میرے بندوں کو ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں خبر دو۔''[4]

یہ بن بلائے مہمان وہی فرشتے تھے جنھوں نے ''ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچ کر پہلے انجانے طور پر اسے سلام کیا۔''[5]

جیسا کہ ایک بزرگوار میزبان کا فریضہ ہے، ابراہیم علیہ السلام نے ان کی پذیرائی کا اہتمام کیا فوراً ان کے لئے مناسب غذا فراہم کی لیکن جب دسترخوان بچھایا گیا تو انجانے مہمانوں نے غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس پر وحشت

---

[1] سورہ صافات آیت 108

[2] سورہ صافات آیت 109

[3] سورہ صافات آیت 110

[4] سورہ حجر آیت 51

[5] سورہ حجر آیت 52

ہوئی، انھوں نے اپنی پریشانی چھپائی نہیں صراحت سے ان سے کہا: ''ہم تم سے خوفزدہ ہیں۔''[1]

یہ خوف اس رواج کی بناء پر تھا کہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی بلکہ ہمارے زمانے تک بعض قوموں کا معمول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا نان نمک کھالیتا ہے تو اسے ضرر نہیں پہنچاتا اور اپنے آپ کو اس کا ممنون احسان سمجھتا ہے لہٰذا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کو برا سمجھتا ہے اور اسے کینہ وعداوت کی دلیل شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پریشانی سے نکال دیا اور ''ان سے کہا: ''ڈرو نہیں ہم تجھے ایک عالم ودانا بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔''[2]

یہ کہ ''غلام علیم''(صاحب علم لڑکے) سے کون مراد ہے؟ قرآن کی دیگر آیات کو سامنے رکھتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے کہ اس سے مراد اسحاق ہیں کیونکہ فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ بشارت دی تو ان کی بیوی سارہ جو ظاہراً ایک بانجھ عورت تھی وہ بھی موجود تھی انھوں نے اسے بھی یہ بشارت دی۔[3]

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سارہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی والدہ تھیں اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا سے صاحب اولاد تھے حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کے فرزند تھے (حضرت ہاجرہ وہ کنیز تھیں جنھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زوجیت کے لئے انتخاب کیا تھا) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اچھی طرح جانتے تھے کہ طبیعی اصولوں کے لحاظ سے ان سے ایسے بیٹے کی پیدائش بہت بعید ہے اگر چہ خدا کی قدرت کاملہ کے لئے کوئی چیز محال نہیں ہے، مگر انھوں نے معمول کے طبیعی قوانین کی طرف توجہ کی جس نے ان کے تعجب کو ابھارا لہٰذا انھوں نے کہا مجھے ایسی بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، واقعاً مجھے کس چیز کی بشارت دے رہے ہو۔[4]

''کیا تمہاری یہ بشارت حکم الٰہی سے ہے یا خود تمہاری طرف سے ہے صراحت سے کہو تا کہ مجھے زیادہ اطمینان ہو''۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اس لحاظ سے ابراہیم ایک اچھے تجربے سے گذرے تھے کہ بڑھاپے میں ہی ان کے بیٹے اسماعیل پیدا ہوئے تھے لہٰذا نئے بیٹے یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں انہیں تعجب نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن معلوم ہونا چاہئے، کہ بعض مفسرین کے بقول حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی پیدائش میں دس سال سے زیادہ کا فاصلہ تھا لہٰذا بڑھاپے میں دس سال گذر جائیں تو بچے کی پیدائش کا احتمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔

ثانیاً اگر کوئی واقعہ خلاف معمول ہو اگر چہ استثنائی طور پر ہو، اس سے مشابہ مواقع پر تعجب کرنے سے مانع نہیں ہے۔

کیونکہ ایسے سن وسال میں بچے کی پیدائش بہرحال ایک امر عجیب ہے، کہتے ہیں کہ جناب اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے وقت جناب ابرہیم علیہ السلام کی 99 سال کی عمر تھی اور جناب اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت 112 کی عمر ہوچکی تھی۔[5]

بہرحال فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تردد یا زیادہ تعجب کا موقع نہ دیا، اور ان سے صراحت وقاطعیت سے کہا: ''ہم

---

[1] سورہ حجر آیت 52

[2] سورہ حجر آیت 53

[3] سورہ ہود کی آیہ 71 میں ہے ''اس کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنسی اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی''

[4] سورہ حجر آیت 54

[5] سورہ حجر آیت 55

تجھے حق کے ساتھ بشارت دے رہے ہیں۔''[1]

وہ بشارت کہ جو خدا کی طرف سے ہے اور اس کے حکم سے ہے اسی بناء پر یہ حق ہے مسلم ہے۔

اس کے بعد اس لئے کہ مبادا ابراہیم مایوس و نا امید ہوں تاکید کے طور پر کہنے لگے: ''اب جبکہ ایسا ہے تو مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہو''۔

لیکن ابراہیم علیہ السلام نے فوراً ان کے اس خیال کو دور کر دیا کہ یہاں پر مایوسی اور رحمت خدا سے نا امیدی کا غلبہ نہیں ہے اور واضح کیا کہ یہ تو صرف طبیعی معمولات کے حوالے سے تعجب ہے، لہٰذا صراحت سے کہا: ''گمراہوں کے سوا اپنے پروردگار کی رحمت سے کون مایوس ہوگا۔''[2]

وہی گمراہ کہ جنھوں نے خدا کو اچھی طرح نہیں پہچانا اور اس کی بے پایاں قدرت پر ان کی نگاہ نہیں۔ وہ خدا کہ جو مشت خاک سے ایسا عجیب و غریب انسان پیدا کرتا ہے اور ناچیز نطفہ سے ایک مکمل بچہ وجود میں لاتا ہے خرمے کا خشک درخت جس کے حکم سے پھل سے لد جاتا ہے اور جلانے والی آگ جس کے حکم سے گلزار ہو جاتی ہے، کون شخص ایسے پروردگار کی قدرت میں شک کرے یا اس کی رحمت سے مایوس ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر نو

قرآن کی مختلف آیات، احادیث اور تواریخ اسلامی سے واضح ہوتا ہے خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھا کیونکہ سورہ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر کی زبانی یوں آیا ہے:

''پروردگار: میں اپنی ذریت میں سے (بعض کو) اس بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسا رہا ہوں۔'' [3]

یہ آیت واضح طور پر گواہی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے شیرخوار بیٹے اسماعیل اور اپنی زوجہ کے ساتھ سرزمین مکہ میں آئے تو خانہ کعبہ کے آثار موجود تھے۔

اسی طرح سورہ آل عمران میں بھی ہے:

''پہلا گھر جو عبادت خدا کی خاطر انسانوں کے لئے بنایا گیا وہ سرزمین مکہ میں تھا''۔[4]

یہ مسلم ہے کہ عبادت خدا اور مرکز عبادت کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے نہیں پڑی بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

اتفاقاً قرآن کی تعبیر بھی اس معنی کو تقویت دیتی ہے کہ فرمایا گیا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام (جب اسماعیل علیہ السلام کچھ بڑے ہو گئے تو) خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے اور کہتے تھے: ''پروردگارا ہم سے قبول فرما، تو سننے والا اور

---

[1] سورہ حجر آیت 53
[2] سورہ حجر آیت 55
[3] سورہ حجر آیت 53
[4] سورہ آل عمران آیت 96

جاننے والا ہے۔"[1]

آیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس کے ستون بلند کر رہے تھے۔

نہج البلاغہ کے مشہور خطبہ قاصعہ میں بھی ہے: "کیا دیکھتے نہیں کہ ہو کہ خدا نے آدم سے لے کر آج تک کچھ پتھروں کے ذریعہ امتحان لیا (وہ پتھر کہ) جنھیں اپنا محترم گھر قرار دیا، پھر آدم اور اولاد آدم کو حکم دیا کہ اس کے گرد طواف کریں"۔

مختصر یہ کہ آیات قرآن اور روایات، تاریخ کی اس مشہور بات کی تائید کرتی ہیں کہ خدا کعبہ پہلے پہل حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بنا۔ پھر طوفان نوح علیہ السلام میں گر گیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں اس کی تعمیر نو ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انعام میں امامت ملی

قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے اہم ترین موڑ یعنی ان کی بڑی بڑی آزمائشوں اور ان میں ان کی کامیابی کے متعلق گفتگو کرتا ہے وہ آزمائشیں جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی عظمت، مقام اور شخصیت کو مکمل طور پر نکھار دیا اور ان کی شخصیت کی بلندی کو روشن کر دیا، ارشاد ہوتا ہے:

"اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے ابراہیم کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں اچھی طرح سے کامیاب ہوئے۔"[2]

جب ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات میں کامیاب ہو گئے تو وہ منزل آئی کہ خدا انہیں انعام دے، تو فرمایا: "میں تمہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔"[3]

"ابراہیم علیہ السلام نے درخواست کی کہ میری ذریت اور خاندان سے بھی آئمہ قرار دے تا کہ یہ رشتہ نبوت و امامت منقطع نہ ہو، اور صرف مجھ سے قائم نہ رہے۔"[4]

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا: "میرا عہدہ یعنی مقام امامت ظالموں تک ہر گز نہیں پہنچے گا۔"[5]

یعنی ہم نے تمہاری درخواست قبول کر لی ہے لیکن تمہاری ذریت میں سے صرف وہ لوگ اس مقام کے لائق ہیں جو پاک اور معصوم ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کا کن چیزوں کے ذریعہ امتحان لیا گیا

آیات قرآن سے اور ابراہیم علیہ السلام کے وہ نظر نواز اعمال جن کی خدا نے تعریف کی ہے، ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلمات (وہ جملے جو خدا نے ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے) دراصل ذمہ داریوں کا ایک گراں اور مشکل سلسلہ تھا جو خدا نے ابراہیم علیہ السلام کے ذمہ

[1] سورہ بقرہ آیت 127

[2] سورہ بقرہ آیت 124

[3] سورہ بقرہ آیت 124

[4] سورہ بقرہ آیت 124

[5] سورہ بقرہ آیت 124

کیااوراس مخلص پیغمبر نے انہیں بہترین طریقے سے انجام دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات میں یہ امور شامل تھے:

(1) بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانا اور فرمان خدا سے اسے قربان کرنے کے لئے پرعزم آمادگی کا مظاہرہ کرنا۔

(2) اپنی بیویاں اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب وگیاہ سرزمین میں لے جانا جہاں کوئی انسان نہ بستا تھا۔

(3) بابل کے بت پرستوں کے مقابلے میں قیام کرنا، بتوں کو توڑنا اور اس تاریخی مقدموں میں پیش ہونا اور نتیجتاً آگ میں پھینکا جانا اور ان تمام مراحل میں اطمینان وایمان کا ثبوت دینا۔

(4) بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا اور اپنی زندگی کے سرمائے کو ٹھوکر مارنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا، ایسے اور بھی بہت سے امور ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہت سخت اور مشکل آزمائش تھی لیکن ابراہیم علیہ السلام ایمانی قوت کے ذریعہ ان تمام امتحانات میں پورا اترے اور ثابت کیا کہ وہ مقام ''امامت'' کی اہلیت رکھتے تھے۔

امام کسے کہتے ہیں؟

قرآن کریم سے اجمالاً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مقام امامت بخشا گیا وہ مقام نبوت ورسالت سے بالاتر تھا۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خداوند عالم نے نبی بنانے سے قبل ابراہیم علیہ السلام کو عبد قرار دیا، اور اللہ نے انہیں رسول بنانے سے قبل نبی قرار دیا، اور انہیں خلیل بنانے سے پہلے اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ امام بناتا انہیں اپنا خلیل بنایا جب یہ تمام مقامات ومناصب انہیں حاصل ہو چکے تو اللہ نے فرمایا: میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بناتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ مقام عظیم دیا تو انہوں نے عرض کیا: خدایا میری ذریت میں سے بھی امام قرار دے۔ ارشاد ہوا: میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا، بے وقوف شخص متقی لوگوں کا امام نہیں ہوسکتا۔''

حضرت لوط علیہ السلام

جناب لوط علیہ السلام خدا کے عظیم پیغمبر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر تھے اور جناب ابراہیم علیہ السلام سے قریبی رشتہ داری تھی (کہا جاتا ہے کہ آپ جناب ابراہیم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی تھے)۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام عراق اور سرزمین بابل سے ہجرت کرنے کے بعد شامات کی طرف گئے، کہتے ہیں کہ لوط بھی ان کے ساتھ تھے لیکن کچھ مدت کے بعد (توحید کی طرف دعوت دینے اور فتنہ وفساد سے مبارزہ کے لئے) شہر ''سدوم'' کی طرف گئے۔

''سدوم'' قوم لوط کے ایک شہر اور آبادی کا نام تھا جو شامات (ملک اردن میں) ''بحر المیت'' کے قریب واقع تھا جو آباد اور درختوں اور سبزہ زار سے بھرا تھا، لیکن اس بدکار و بے غیرت قوم پر عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے بعد، ان کے شہر مسمار اور تہ وبالا ہوگئے، چنانچہ انہیں ''مدائن موتفکات''۔ (تہ وبالا ہونے والے شہر) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ، یہ ہے کہ ان شہروں کے ویرانے زیر آب آ گئے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ''بحر المیت'' کے ایک گوشہ میں کچھ ستون اور دوسرے آثار جو ان شہروں کے خرابوں پر دلالت کرتے ہیں دیکھے ہیں۔

جب کہ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ قوم لوط کے شہر زیر آب نہیں آئے، اور اب بھی ''بحر المیت'' کے قریب ایک علاقہ ہے جو سیاہ پتھروں کے نیچے ڈھکا ہوا ہے، احتمال ہے کہ قوم لوط کے شہروں کی جگہ یہیں ہو۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا مرکز شہر ''حبرون'' میں تھا، جو شہر ''سدوم'' سے چنداں دور فاصلہ پر نہیں تھا، اور جس وقت زلزلہ یا صاعقہ کے زیر اثر ان کے شہروں کو آگ لگی تو اس وقت ابراہیم حبرون کے قریب کھڑے ہوئے تھے، اور شہر سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔

اس گفتگو کے مجموعہ سے ان شہروں کے قریباً حدود واضح ہو گئے، اگر چہ ان کے جزئیات کے ابھی تک پردہ ابہام میں ہیں۔

قوم لوط کا سب سے بڑا اخلاقی انحراف

قرآن کریم اس عظیم پیغمبر اور ان کی قوم کے واقعہ کو اس طرح شروع کرتا ہے کہ ''لوط کی قوم نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تکذیب کی۔''[1]

''مرسلین'' رسولوں کو جمع کی صورت میں بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک ہوتی ہے لہٰذا کسی بھی پیغمبر کی تکذیب سب کی تکذیب شمار کی جاتی ہے یا پھر اس لئے ہے کہ وہ گزشتہ کسی بھی پیغمبر پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے:
میں تمہارے لئے امین رسول ہوں۔

اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو پرہیز گاری اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، کیونکہ میں راہ سعادت کا رہبر ہوں۔''[2]

''کیا اب تک تم نے مجھ سے کوئی خیانت دیکھی ہے؟ اس کے بعد وحی الٰہی اور تمہارے رب کا پیغام پہنچانے میں بھی یقیناً امانت کو مد نظر رکھوں گا۔''

''یہ نہ سمجھو کہ یہ دعوت الٰہی میرے گزر اوقات کا ایک ذریعہ ہے یا کسی مادی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ایسا کام کر رہا ہوں، نہ، میں تو ذرہ بھر بھی تم سے اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے رب کے پاس ہے۔''[3]

پھر وہ ان کے ناشائستہ اعمال اور ان کی کچھ اخلاقی بے راہ روی کی باتوں کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ ان کا بڑا انحراف اور ہم جنس بازی تھا لہٰذا اسی بات پر زیادہ زور دے کر کہتے ہیں: ''آیا تم ساری دنیا میں صرف مردوں کے پاس ہی جاتے ہو''۔[4]

یعنی باوجود یکہ خداوند عالم نے اس قدر جنس مخالف تمہارے لئے خلق فرمائی ہے جن سے صحیح طریقے سے شادی کر کے پاک و پاکیزہ اور اطمینان بخش زندگی بسر کر سکتے ہوں خدا کی اس پاک اور فطری نعمت کو چھوڑ کر تم نے خود کو اس طرح کے پست اور حیا سوز کام سے آلودہ کر لیا ہے۔

---

[1] سورہ شعراء آیت 161
[2] سورہ شعراء آیت 162
[3] سورہ شعراء آیت 163
[4] سورہ شعراء آیت 165

''اپنی ازواج کوترک کر دیتے ہو جنھیں خدا نے تمہارے لئے خلق فرمایا ہے تم تو تجاوز کرنے والی قوم ہو۔''[۱]
یقیناً کسی روحانی یا جسمانی فطری ضرورت نے تمہیں اس بے راہ روی پر آمادہ نہیں کیا بلکہ یہ تمہاری سرکشی ہے جس نے تمہارے دامن کو اس شرمناک فعل کی گندگی سے آلودہ کر دیا ہے۔
تمہارے کام کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص خوشبودار میوے، مقوی اور صحیح سالم غذائیں چھوڑ کر زہر آلود اور مار ڈالنے والی غذاؤں کو استعمال کرے یہ فطری خواہش نہیں بلکہ سرکشی ہے۔

جہاں پر عفت ایک عیب ہو

قوم لوط کے افراد جو بادہ شہوت وغرور سے مست ہو چکے تھے، اس رہبر الٰہی کی نصیحتوں کو جان ودل سے قبول کرنے اور خود کو اس دلدل سے باہر نکالنے کی بجائے اس کے مقابلے پر تل گئے اور ان سے کہا: ''اے لوط علیہ السلام کافی ہو چکا ہے، اب خاموش رہو اگر ان باتوں سے باز نہ آئے تو تمہارا شمار بھی اس شہر سے نکال دیئے جانے والوں میں سے ہوگا''۔[۲]
تمہاری باتیں ہماری فکر اور آرام میں خلل ڈال رہی ہیں ہم ان باتوں کے سننے کے ہرگز روادار نہیں، اگر تمہاری یہی حالت رہی تو ہم تمہیں سزا دیں گے جو کم از کم جلاوطنی کی صورت میں ہوگی۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ہے کہ انھوں نے اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنایا اور حکم دیا کہ لوط علیہ السلام کے خاندان کو شہر سے باہر نکال دو کیونکہ وہ پاک لوگ ہیں اور گناہ نہیں کرتے۔
ان گمراہ اور گناہ سے آلودلوگوں کی جسارت اس حد تک جا پہنچی کہ تقویٰ اور طہارت ان کے درمیان بہت بڑا عیب سمجھا جانے لگا اور ناپاکی اور گناہ سے آلودگی سرمایہ افتخار اور یہ کسی معاشرے کی تباہی کی علامت ہوتی ہے جو تیزی کے ساتھ برائیوں کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فاسق وفاجر گروہ نے ایسے پاک وپاکیزہ لوگوں کو پہلے باہر نکال دیا جو ان کو ان کے بے ہودہ اعمال سے روکا کرتے تھے لہٰذا انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھی یہی دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنے اس تبلیغی سلسلے کو جاری رکھا تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا۔ بعض تفسیروں میں صراحت کے ساتھ تحریر ہے کہ وہ پاک دامن لوگوں کو بدترین طریقے سے جلاوطن کر دیا کرتے تھے۔
قرآن کہتا ہے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے کہا: ''لوط کے خاندان کو اپنے شہر اور علاقے سے نکال باہر کرو کیونکہ یہ برے پاکباز لوگ ہیں اور یہ اپنے تئیں ہم سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے''۔[۳]
یہ ایک ایسا جواب ہے جو ان کی فکری پستی اور انتہائی اخلاقی تنزل کا آئینہ دار ہے۔
جی ہاں: مجرم اور گناہ سے آلودہ ماحول میں پاکیزگی ایک جرم وعیب ہوا کرتی ہے یوسفؑ جیسے پاکدامن کو عفت وپارسائی کے جرم میں زندانوں میں ڈالا جاتا ہے جبکہ زلیخائیں اس ماحول میں آزاد اور صاحب جاہ ومقام ہوا کرتی ہیں اور قوم لوط علیہ السلام اپنے اپنے گھروں میں آرام وآسائش کے ساتھ رہتی ہے۔
یہیں پر قرآن مجید کا مصداق واضح ہوجاتا ہے جو وہ گمراہ لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ: ہم (ان کے اپنے اعمال کی بنا پر) ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتے ہیں اور ان کے کان بہرے ہوجاتے ہیں۔

[۱] سورہ شعراء آیت 166
[۲] سورہ شعراء آیت 167
[۳] سورہ شعراء آیت 167

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ گناہوں کی دلدل میں اس حد تک پھنس چکے تھے کہ لوط کے خاندان کا تمسخر اڑا کر کہتے تھے کہ وہ ہمیں ناپاک سمجھتے ہیں اور خود بڑے پاکباز بنتے ہیں، یہ کیسا مذاق ہے؟

یہ عجیب بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بے حیائی اور بے شرمی کے فعل سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے انسان کی حس شناخت ہی یکسر بدل جائے یہ بالکل اس چمڑا رنگنے والے کی مثال ہے جو بدبو سے مانوس ہو چکا تھا اور جب ایک مرتبہ وہ عطاروں کے بازار سے گزر رہا تھا تو عطر کی نامانوس بو کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا، جب اسے حکیم کے پاس لے گئے تو اس نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ چمڑا رنگنے والوں کے بازار میں لے جایا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ ہوش میں آ گیا اور مرنے سے بچ گیا یہ واقعاً اس بارے میں ایک دلچسپ حسی مثال ہے۔

30 سال سعی وکوشش

جناب لوط علیہ السلام نے اس قوم کو تیس سال تک تبلیغ کی، لیکن اپنے خاندان کے سوا (اور وہ بھی بیوی کو مستثنیٰ کر کے کیونکہ وہ مشرکین کے ساتھ ہم عقیدہ ہو گئی تھی)، اور کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔

لیکن حضرت لوط علیہ السلام نے ان دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام جاری رکھا اور کہا: ''میں تمہارے ان کاموں کا دشمن ہوں۔''[1]

یعنی میں اپنا احتجاج برابر جاری رکھوں گا، تم جو کچھ میرا بگاڑنا چاہتے ہو بگاڑ لو، مجھے راہ خدا اور برائیوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ان دھمکیوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے۔

اس احتجاج میں اور بھی بہت سے لوگ جناب لوط علیہ السلام کے ہمنوا ہو چکے تھے، یہ اور بات ہے کہ سرکش قوم نے آخر کار انہیں جلاوطن کر دیا۔

لائق توجہ بات یہ کہ حضرت لوط علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ''تمہارے اعمال کا دشمن ہوں'' یعنی مجھے تمہاری ذات سے دشمنی نہیں بلکہ تمہارے شرمناک اعمال سے نفرت ہے اگر ان اعمال کو اپنے سے دور کر دو تو پھر تم میرے پکے دوست بن جاؤ گے۔

بہرحال جناب لوط علیہ السلام کی ذمہ داری کا آخری مرحلہ آن پہنچا لہٰذا وقت آ پہنچا کہ جناب لوط علیہ السلام خود کو بھی اور جو لوگ ان پر ایمان لا چکے ہیں انہیں بھی اس گناہ آلود علاقے سے باہر نکال کر لے جائیں تاکہ ہولناک عذاب اس بے حیا قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں دست دعا بلند کر کے کہا: ''پروردگار: جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں مجھے اور میرے خاندان کو اس سے نجات دے۔''[2]

یہ ہے گناہ گاروں کا انجام

آخر کار حضرت لوط علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی اور خدا کی طرف سے اس قوم تباہ کار کے خلاف سخت سزا کا حکم صادر ہوا، وہ فرشتے جو عذاب نازل کرنے پر مامور تھے قبل اس کے کہ سرزمین لوط پر اپنا فرض ادا کرنے کے لئے جاتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

---

[1] سورہ شعراء آیت 167

[2] سورہ شعراء آیت 169

پاس ایک اور پیغام لے کر گئے اور وہ پیغام تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی پیدائش کی خوشخبری۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ابراہیمؑ شام کی طرف جلاوطن ہونے کے بعد لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے اور ہر قسم کے شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کرنے میں مصروف تھے، حضرت لوط علیہ السلام جو ایک عظیم پیغمبر تھے، ان ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور احتمال یہ ہے کہ آپ ہی کی طرف سے مامور ہوئے تھے، کہ گمراہوں کو تبلیغ و ہدایت کرنے کے لئے شام کے ایک علاقہ (یعنی سدوم کے شہروں کی طرف) سفر کریں، وہ ایک ایسی گناہگار قوم کے درمیان آئے جو شرک اور بہت سے گناہوں میں آلودہ تھی، اور سب سے قبیح گناہ اغلام اور لواطت تھی، آخرکار فرشتوں کا ایک گروہ، اس قوم کی ہلاکت پر مامور ہوا لیکن وہ پہلے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔

ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کی وضع وقطع سے سمجھ گئے کہ یہ کسی اہم کام کے لئے جا رہے ہیں، اور صرف بیٹے کی ولادت کی بشارت کے لئے نہیں آئے، کیونکہ اس قسم کی بشارت کے لئے تو ایک ہی شخص کافی تھا، یہ اس عجلت کی وجہ ہے جو وہ چلنے کے لئے کر رہے تھے، اس سے محسوس کیا کہ کوئی اہم ڈیوٹی رکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر ہے چنانچہ کہا گیا ہے: ''جس وقت ہمارے ایلچی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر گئے۔ انہیں اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی اور پھر (قوم لوط کی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا کہ ہم اس شہر اور اس میں رہنے والوں کو ہلاک کر دیں گے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں''۔ [1]

چونکہ فرشتوں نے ''ھذہ القریۃ'' کہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم لوط اسی مقام کے قرب جوار میں رہتی تھی جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام رہتے تھے۔، اور اس قوم کو لفظ ''ظالم'' سے یاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے یہاں تک کہ اس طرف سے گزرنے والے مسافروں اور قافلوں پر بھی ستم کرتے تھے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات سنی تو انہیں حضرت لوط علیہ السلام پیغمبر خدا کی فکر ہوئی اور کہا: ''اس آبادی میں تو لوط بھی ہے''۔ [2]

اس پر کیا گزرے گی؟

مگر فرشتوں نے فوراً جواب دیا: ''آپ فکر نہ کریں ہم ان سب لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس بستی میں رہتے ہیں''۔ [3]

ہم اندھا دھند عذاب نازل نہیں کریں گے ہمارا پروگرام نہایت سنجیدہ اور نپا تلا ہے۔

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ''ہم لوط علیہ السلام اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے بجز اس کی بیوی کے کہ جو اس قوم کے ساتھ ہی مبتلائے عذاب ہوگی''۔ [4]

صرف ایک خاندان مومن اور پاک

قرآن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے کی تمام آبادیوں اور بستیوں میں صرف ایک ہی خاندان مومن اور پاک نفس

---

[1] سورہ عنکبوت آیت 31

[2] سورہ عنکبوت آیت 32

[3] سورہ عنکبوت آیت 32

[4] سورہ عنکبوت آیت 32

تھااور خدانے بھی اسے عذاب سے نجات دی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے:

''ہم نے وہاں ایک خاندان کے سوا کوئی بھی مسلمان نہ پایا۔''[۱]

یہاں تک کہ حضرت لوط علیہ السلام کی زوجہ بھی مومنین کی صف سے خارج تھی اس لئے وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئی۔

وہ عورت جو خانوادہ نبوت میں شامل تھی اسے تو ''مومنین اور مسلمین'' سے جدا نہیں ہونا چاہئے تھا مگر وہ اپنے کفر وشرک اور بت پرستی کی وجہ سے اس صنف سے جدا ہو گئی۔

اس طرح کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت منحرف العقیدہ تھی کچھ بعید نہیں کہ اس میں یہ بدعقیدگی اس مشرک معاشرے کے اثر سے پیدا ہو گئی ہو اور ابتدا میں مومن وموحد ہو اس صورت میں حضرت لوط علیہ السلام پر یہ اعتراض نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایسی مشرکہ سے نکاح ہی کیوں کیا تھا؟

یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ اور لوگ حضرت لوط علیہ السلام پر ایمان لائے ہوں گے تو وہ حتما نزول عذاب سے پہلے اس گناہ آلود زمین سے ہجرت کر گئے ہوں گے، تنہا حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال اس مقام پر اس توقع سے آخری وقت تک ٹھہرے ہوں گے کہ ممکن ہے ان کی تبلیغ اور ڈرانے کا لوگوں پر اثر ہو۔

یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرشتوں کی گفتگو ختم ہو گئی اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت لوط علیہ السلام مہمانوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

''جب ہمارے رسول، لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے پر بہت ہی ناراحت اور پریشان ہوئے، ان کی فکر اور روح مضطرب ہوئی اور غم واندوہ نے انہیں گھیر لیا۔''[۲]

اسلامی روایات اور تفاسیر میں آیا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اس وقت اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے، اچانک انہوں نے خوبصورت نوجوانوں کو دیکھا جو ان کی طرف آرہے تھے وہ ان کے یہاں مہمان ہونا چاہتے تھے، اب حضرت لوط علیہ السلام مہمانوں کی پذیرائی بھی چاہتے تھے لیکن اس حقیقت کی طرف بھی ان کی توجہ تھی کہ ایسے شہر میں جو انحراف جنسی کی آلودگی میں غرق ہے۔

ان خوبصورت نوجوانوں کا آنا طرح طرح کے مسائل کا موجب ہے اور ان کی آبروریزی کا بھی احتمال ہے، اس وجہ سے حضرت لوط علیہ السلام سخت مشکل سے دوچار ہو گئے یہ مسائل، روح فرسا افکار کی صورت میں ان کے دماغ میں ابھرے اور انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: ''آج بہت سخت اور وحشت ناک دن ہے۔''[۳]

بہرحال حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے نووارد مہمانوں کو اپنے گھر لے جاتے، لیکن اس بناء پر کہ وہ غفلت میں نہ رہیں راستے میں چند مرتبہ ان کے گوش گزار کر دیا کہ اس شہر میں شریر اور منحرف لوگ رہتے ہیں تاکہ اگر مہمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو صورت حال کا اندازہ کر لیں۔

خداوند عالم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ جب تک یہ پیغمبر تین مرتبہ اس قوم کی برائی اور انحراف کی گواہی نہ دے انہیں عذاب

[۱] سورہ ذاریات آیت 36

[۲] سورہ ہود آیت 77

[۳] سورہ ہود آیت 77

نہ دیا جائے (یعنی یہاں تک کہ ایک گنہگار قوم سے متعلق بھی حکم خدا عدالت کے ایک عادلانہ فیصلے کی روشنی میں انجام پائے) اور ان رسولوں نے راستے میں تین مرتبہ لوط علیہ السلام کی گواہی سن لی۔

حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کو اتنی دیر تک (کھیت میں) ٹھہرائے رکھا کہ رات ہوگئی تا کہ شاید اس طرح اس شریر اور آلودہ قوم کی آنکھ سے بچ کر حفظ آبرو کے ساتھ ان کی پذیرائی کر سکیں لیکن جب انسان کا دشمن خود اس کے گھر کے اندر موجود ہو تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کہ جو ایک بے ایمان عورت تھی اور اس گنہگار قوم کی مدد کرتی تھی جب اسے ان نو جوانوں اور خوبصورت مہمانوں کے آنے کی خبر ہوئی تو چھت پر چڑھ گئی پہلے اس نے تالی بجائی پھر آگ روشن کر کے اس کے دھوئیں کے ذریعے اس نے منحرف قوم کے بعض لوگوں کو آگاہ کیا کہ لقمہ تر جال میں پھنس چکا ہے۔

قوم لوط علیہ السلام آپ کے گھر میں داخل ہوگئی

شہر والوں کو جب لوط علیہ السلام کے پاس آنے والے نئے مہمانوں کا پتہ چلا تو وہ ان کے گھر کی طرف چل پڑے، راستے میں وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے تھے۔ گمراہی کی شرمناک وادی میں بھٹکنے والے ان افراد کا خیال تھا کہ گویا نرمال ان کے ہاتھ آگیا ہے خوبصورت اور خوش رنگ نو جوان اور وہ بھی لوط کے گھر میں۔

قرآن میں اس جگہ اہل مدینہ استعمال ہوا ہے اور یہ کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کم از کم شہر کے بہت سے لوگ ٹولیوں میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کی طرف چل پڑے، اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک بے شرم، ذلیل اور جسور تھے خصوصا لفظ "یستبشرون" (ایک دوسرے کو بشارت دیتے تھے) ان کی آلودگی کی گہرائی کی حکایت کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا شرمناک عمل ہے کہ شاید کسی نے اس کی نظیر جانوروں میں بھی بہت ہی کم دیکھی ہوگی اور یہ عمل اگر کوئی انجام دیتا بھی ہے تو کم از کم چھپ چھپا کر اور احساس شرمندگی کے ساتھ ایسا کرتا ہے لیکن یہ بدکار اور کمینہ صفت قوم کھلم کھلا ایک دوسرے کو مبارکباد دیتی تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب ان کا شور وغل سنا تو بہت گھبرائے اور مضطرب ہوئے انہیں اپنے مہمانوں کے بارے میں بہت خوف ہوا کیونکہ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مہمان مامورین عذاب ہیں اور قادر وقاہر خدا کے فرشتے ہیں لہٰذا وہ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "یہ میرے مہمان ہیں، میری آبرو نہ گنواؤ۔" [1]

یعنی اگر تم خدا، پیغمبر اور جزاء وسزا کے مسئلہ سے صرف نظر کر لو تو بھی کم از کم یہ انسانی مسئلہ ہے اور یہ بات تو سب انسانوں میں چاہے مومن ہوں یا کافر، موجود ہے کہ وہ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں تم کیسے انسان ہو کہ اتنی سی بات بھی نہیں مانتے ہو اگر تمہارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزاد انسان تو بنو۔ اس کے بعد آپ نے مزید کہا: "آؤ خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمسار نہ کرو۔" [2]

لیکن، وہ بہت جسور اور منہ پھٹ تھے بجائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اللہ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام سے کیسا مطالبہ کیا ہے الٹا اس طرح سے پیش آئے جیسے لوط علیہ السلام سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے انھوں نے زبان اعتراض دراز کی اور کہنے لگے: "کیا ہم نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ دنیا والوں کو اپنے یہاں مہمان نہ ٹھہرانا اور کسی کو اپنے یہاں نہ آئے دینا۔" [3]

---

[1] سورہ حجر آیت 68

[2] سورہ حجر آیت 69

[3] سورہ حجر آیت 70

تم نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی اور ہمارے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔

یہ اس بناء پر تھا کہ یہ قوم انتہائی کم ظرف اور کنجوس تھی یہ لوگ ہرگز کسی کو اپنے یہاں مہمان نہیں ٹھہراتے تھے اور اتفاق سے ان کے شہر قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام بعض آنے والوں کے ساتھ اس لئے کہ کوئی ان کے یہاں ٹھہرے نہ، آہستہ آہستہ ان کی عادت بن گئی لہٰذا جب حضرت لوط علیہ السلام کو شہر میں کسی مسافر کے آنے کی خبر ہوتی تو اسے اپنے گھر میں دعوت دیتا کہ وہ کہیں ان کے چنگل میں نہ پھنس جائے ان لوگوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت سیخ پا ہوئے اور حضرت لوط علیہ السلام سے کھل کر کہنے لگے کہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اب تم کسی مہمان کو اپنے گھر لے جاؤ۔

اے کاش میں تم سے مقابلہ کرسکتا

بہرحال جب حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی یہ جسارت اور کمینہ پن دیکھا تو انھوں نے ایک طریقہ اختیار کیا تا کہ انہیں خواب غفلت اور انحراف و بے حیائی کی مستی سے بیدار کرسکیں۔ آپ نے کہا: ''تم کیوں انحراف کے راستے پر چلتے ہو اگر تمہارا مقصد جنسی تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو جائز اور صحیح طریقے سے شادی کر کے انہیں پورا کیوں نہیں کرتے،، یہ میری بیٹیاں ہیں (تیار ہوں کہ انہیں تمہاری زوجیت میں دے دوں) اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے۔''[1]

اس میں شک نہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی تو چند بیٹیاں تھیں اور ان افراد کی تعداد زیادہ تھی لیکن مقصد یہ تھا کہ ان پر اتمام حجت کیا جائے اور کہا جائے کہ میں اپنے مہمانوں کے احترام اور حفاظت اور تمہیں برائی کی دلدل سے نکالنے کے لئے اس حد تک ایثار کے لئے تیار ہوں۔ یہ بات واضح ہے کہ جناب لوط علیہ السلام یونہی اپنی لڑکیوں کا عقد ان مشرکوں اور گمراہوں سے نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ مقصد یہ تھا کہ پہلے ایمان لے آؤ تا کہ بعد میں اپنے لڑکیوں کی شادی تم سے کردوں۔

لیکن افسوس شہوت، انحراف اور ہٹ دھرمی کے اس عالم میں ان میں ذرہ بھر بھی انسانی اخلاق اور جذبہ باقی ہوتا تو کم از کم اس امر کے لئے کافی تھا کہ وہ شرمندہ ہوتے اور پلٹ جاتے، مگر نہ صرف یہ کہ وہ شرمندہ نہ ہوئے بلکہ اپنی جسارت میں اور بڑھ گئے اور چاہا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

وہ قوم حرص اور شوق کے عالم میں اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے بڑی تیزی سے لوط کی طرف آئی۔

مگر اس تباہ کار قوم نے نبی خدا حضرت لوط علیہ السلام کو بڑی بے شرمی سے جواب دیا: ''تو خود اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ہمارا تیری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں، اور یقیناً تو جانتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔''[2]

یہ وہ مقام تھا کہ اس بزرگوار پیغمبر نے اپنے آپ کو ایک محاصرے میں گھرا ہوا پایا اور انہوں نے ناراحتی و پریشانی کے عالم میں فریاد کی: ''اے کاش: مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ میں اپنے مہمانوں کا دفاع کرسکتا اور تم جیسے سرپھروں کی سرکوبی کرسکتا''۔[3]

یا کوئی مستحکم سہارا ہوتا، کوئی قوم وقبیلہ میرے پیروکاروں میں سے ہوتا اور میرے کوئی طاقتور ہم پیمان ہوتے کہ جن کی مدد سے تم منحرف لوگوں کا مقابلہ کرتا۔[4]

---

[1] سورہ حجر آیت 71

[2] سورہ حجر آیت 79

[3] سورہ حجر آیت 80

[4] سورہ حجر آیت 80

اے لوط! آپ پریشان نہ ہوں:

آخر کار پروردگار کے رسولوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی شدید پریشانی دیکھی اور دیکھا کہ وہ روحانی طور پر کس اضطراب کا شکار ہیں تو انہوں نے اپنے اسرار کار سے پردہ اٹھایا اور ان سے کہا: ''اے لوط: ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، پریشان نہ ہو مطمئن رہو کہ وہ ہرگز تم پر دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے''۔[1]

قرآن میں دوسری جگہ پر ہے: وہ لوط کے مہمانوں کے بارے میں تجاوز کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ اس وقت حملہ آور قوم پروردگار کے ارادے سے اپنی بینائی کھو بیٹھی تھی اور حملے کی طاقت نہیں رکھتی تھی بعض روایات میں بھی ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر خاک ان کے چہروں پر پھینکی جس سے وہ نابینا ہو گئے۔

بہر حال جب لوط اپنے مہمانوں کے بارے میں ان کی ماموریت کے بارے میں آگاہ ہوئے تو یہ بات اس عظیم پیغمبر کے جلتے ہوئے دل کے لئے ٹھنڈک کی مانند تھی، ایک دم انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے دل سے غم کا بار گراں ختم ہو گیا ہے اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، ایسا ہوا جیسے ایک شدید بیمار کی نظر مسیحا پر جا پڑے، انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور سمجھ گئے کہ غم واندوہ کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور اس بے شرم حیوان صفت قوم کے چنگل سے نجات پانے کا اور خوشی کا وقت آ پہنچا ہے۔

مہمانوں نے فوراً لوط علیہ السلام کو حکم دیا: تم تاریکی شب میں اپنے خاندان کو اپنے ساتھ لے لو اور اس سرزمین سے نکل جاؤ لیکن یہ پابندی ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص پس پشت نہ دیکھے۔''[2]

''اس حکم کی خلاف ورزی فقط تمہاری معصیت کار بیوی کرے گی کہ جو تمہاری گنہگار قوم کو پہنچنے والی مصیبت میں گرفتار ہو گی۔''[3]

کیا صبح قریب نہیں ہے؟

بالآخر انھوں نے لوط علیہ السلام سے آخری بات کہی: ''نزول عذاب کا لمحہ اور وعدہ کی تکمیل کا موقع صبح ہے اور صبح کی پہلی شعاع کے ساتھ ہی اس قوم کی زندگی غروب ہو جائے گی۔''[4]

ابھی اٹھ کھڑے ہو اور جتنا جلدی ممکن ہو شہر سے نکل جاؤ ''کیا صبح نزدیک نہیں ہے۔''[5]

---

[1] سورہ ہود آیت 81

[2] "ولا یلتفت منکم احد" کی تفسیر میں مفسرین نے چند احتمال ذکر کیے ہیں:
پہلا یہ کوئی شخص اپنی پس پشت نہ دیکھے۔
دوسرا یہ کہ شہر میں سے مال اور وسائل لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ صرف اپنے آپ کو اس ہلاکت سے نکال لے جائے۔
تیسرا یہ کہ اس خاندان کے اس چھوٹے سے قافلہ میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہ جائے۔
چوتھا یہ کہ تمہارے نکلنے کے وقت زمین ہلنے لگے گی اور عذاب کے آثار نمایاں ہو جائیں گے لہٰذا اپنے پس پشت نگاہ نہ کرنا اور جلدی سے دور نکل جانا۔
البتہ کوئی مانع نہیں ہے کہ یہ سب احتمالات اس آیت کے مفہوم میں جمع ہوں

[3] سورہ ہود آیت 81

[4] سورہ ہود آیت 81

[5] سورہ ہود آیت 81

بعض روایات میں ہے کہ جب ملائکہ نے کہا کہ عذاب کے وعدہ پر عمل درآمد صبح کے وقت ہوگا تو حضرت لوط علیہ السلام کو جو اس آلودہ قوم سے سخت ناراحت اور پریشان تھے، وہی قوم کہ جس نے اپنے شرمناک اعمال سے ان کا دل مجروح کررکھا تھا اور ان کی روح کو غم واندوہ سے بھر دیا تھا، فرشتوں سے خواہش کی کہ اب جب کہ ان کو نابود ہی ہونا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ جلدی ایسا ہو لیکن انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی دلجوئی اور تسلی کے لئے کہا: کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟

آخرکار عذاب کا لمحہ آن پہنچا اور لوط پیغمبر علیہ السلام کے انتظار کے لمحے ختم ہوئے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''جس وقت ہمارا فرمان آن پہنچا تو ہم نے اس زمین کو زیروزبر کردیا اور ان کے سروں پر مٹیلے پتھروں کی پیہم بارش برسائی۔''[1]

پتھروں کی یہ بارش اس قدر تیز اور پے در پے تھی کہ گویا پتھر ایک دوسرے پر سوار تھے۔ لیکن یہ معمولی پتھر نہ تھے بلکہ تیرے پروردگار کے یہاں معین اور مخصوص تھے ''مسومة عند ربك'' البتہ یہ تصور نہ کریں کہ یہ پتھر قوم لوط کے ساتھ ہی مخصوص تھے بلکہ ''یہ کسی ظالم قوم اور جمعیت سے دور نہیں ہیں۔''[2]

اس بے راہ رو اور منحرف قوم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور اپنے معاشرے پر بھی وہ اپنی قوم کی تقدیر سے بھی کھیلے اور انسانی ایمان واخلاق کا بھی مذاق اڑایا، جب ان کے ہمدرد رہبر نے دادوفریاد کی تو انہوں نے کان نہ دھرے اور تمسخر کیا اعلی ڈھٹائی، بےشرمی اور بےحیائی یہاں تک آ پہنچی کہ وہ اپنے رہبر کے مہمانوں کی حرمت وعزت پر تجاوز کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا ان کے شہروں کو بھی الٹ جانا چاہئے تھا فقط یہی نہیں کہ ان کے شہر تباہ وبرباد ہوجاتے بلکہ ان پر پتھروں کی بارش بھی ہونا چاہئے تھی تاکہ ان کے آخری آثار حیات بھی درہم وبرہم ہوجائیں اور وہ ان پتھروں میں دفن ہوجائیں اس سے کہ ان کا نام ونشان اس سرزمین میں نظر نہ آئے، صرف وحشت ناک، تباہ وبرباد بیابان، خاموش قبرستان اور پتھروں میں دبے ہوئے مردوں کے علاوہ ان میں کچھ باقی نہ رہے۔

کیا صرف قوم لوط علیہ السلام کو یہ سزا ملنی چاہئے نہیں، یقیناً ہرگز نہیں بلکہ ہر منحرف گروہ اور ستم پیشہ قوم کے لئے ایسا ہی انجام انتظار میں ہے کبھی سنگریزوں کی بارش کے نیچے، کبھی آگ اگلتے بموں کے نیچے اور کبھی معاشرے کے لئے تباہ کن اختلافات کے تحت خلاصہ یہ کہ ہر ستمگر کو کسی نہ کسی صورت میں ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

صبح کے وقت نزول عذاب کیوں؟

یہاں پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزول عذاب کے لئے صبح کا وقت کیوں منتخب کیا گیا رات کے وقت ہی عذاب کیوں نازل نہیں ہوا؟

ایسا اس لئے تھا کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پر چڑھ آنے والے افراد اندھے ہوگئے اور قوم کے پاس لوٹ کر گئے اور واقعہ بیان کیا تو وہ کچھ غور وفکر کرنے لگے، معاملہ کیا ہے خدا نے صبح تک انہیں مہلت دی کہ شاید بیدار ہوجائیں اور اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں یا یہ کہ خدا نہیں چاہتا تھا کہ رات کی تاریکی میں ان پر شب خون مارا جائے اسی بناء پر حکم دیا کہ صبح تک مامور عذاب سے ہاتھ روکے رکھیں۔ تفاسیر میں اس کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں لکھا گیا لیکن جو کچھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ اس

---

[1] سورہ ہود آیت 82

[2] سورہ ہود آیت 83

سلسلے میں پند قابل مطالعہ احتمالات ہیں۔

زیروزبر کیوں کیا گیا

ہم کہہ چکے ہیں کہ عذاب کی گناہ سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہونا چاہئے، اس قوم نے انحراف جنسی کے ذریعہ چونکہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا تھا لہٰذا خدا نے بھی ان شہروں کو زیروزبر کر دیا اور چونکہ روایات کے مطابق ان کے منہ سے ہمیشہ رکیک اور گندی گندگی کی بارش ہوتی تھی لہٰذا خدا نے بھی ان پر پتھروں کی بارش برسائی

جس نکتے کا ہم آخر میں ذکر ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ جنسی انحراف کی طرف افراد کے میلان کے بہت سے علل واسباب ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ماں باپ کا اپنی اولاد سے سلوک یا ہم جنس اولاد کی نگرانی نہ کرنا، ان کے طرز معاشرت اور ایک ہی جگہ پر سونا وغیرہ بھی ہوسکتا ہے اس آلودگی کا ایک عامل بن جائے۔

بعض اوقات ممکن ہے کہ اس انحراف سے ایک اور اخلاقی انحراف جنم لے لے، یہ امر قابل توجہ ہے کہ قوم لوط کے حالات میں ہے کہ ان کے اس گناہ میں آلودہ ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ بخیل اور کنجوس لوگ تھے اور چونکہ ان کے شہر شام جانے والے قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مہمانوں اور مسافروں کی پذیرائی کریں لہٰذا ابتداء میں وہ اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ مہمانوں اور مسافروں کو اپنے سے دور بھگائیں لیکن تدریجاً یہ عمل ان کی عادت بن گیا اور انحراف جنسی کے میلانات آہستہ آہستہ ان کے وجود میں بیدار ہوگئے اور معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس میں آلودہ ہوگئے۔ [1]

قوم لوط علیہ السلام کا اخلاق

اسلامی روایات وتواریخ میں جنسی انحراف کے ساتھ ساتھ قوم لوط علیہ السلام کے برے اور شرمناک اعمال اور گھٹیا کردار بھی بیان ہوا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ان کی مجالس اور بیٹھکیں طرح طرح کے منکرات اور برے اعمال سے آلودہ تھیں وہ آپس میں رکیک جملوں، فحش کلامی اور پھبتیوں کا تبادلہ کرتے تھے ایک دوسرے کی پشت پر مکے مارتے تھے قمار بازی کرتے تھے بچوں والے کھیل کھیلتے تھے گزرنے والوں کو کنکریاں مارتے تھے طرح طرح کے آلات موسیقی استعمال کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے برہنہ ہوجاتے تھے اور اپنی شرمگاہوں کو ننگا کر دیتے تھے۔

واضح ہے کہ اس قسم کے گندے ماحول میں ہر روز انحراف اور بدی نئی شکل میں رونما ہوتی ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے ایسے ماحول میں اصولی طور پر برائی کا تصور ختم ہوجاتا ہے اور لوگ اس طرح سے اس راہ پر چلتے ہیں کہ کوئی کام ان کی نظر میں برا اور قبیح نہیں رہتا ان سے زیادہ بدبخت وہ قومیں ہیں جو علم کی پیش رفت کے زمانے میں انہی راہوں پر گامزن ہیں، بعض اوقات تو ان کے اعمال اس قدر شرمناک اور رسوا کن ہوتے ہیں کہ قوم لوط کے اعمال بھول جاتے ہیں۔

---

[1] یہاں تک کے فضول قسم کا مذاق جو کبھی کبھی لڑکوں کے درمیان اپنے ہم جنسوں کے بارے میں ہوتا ہے بعض اوقات ان انحرافات کی طرف کھینچ لے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافروں کے لئے مثال

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ”خدانے کافروں کے لئے ایک مثال بیان کی ہے“ نوح علیہ السلام کی بیوی کی مثال اور لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال ”وہ دونوں ہمارے دوصالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے ان سے خیانت کی، لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذاب الٰہی کے مقابلہ میں انہیں کوئی نفع نہیں دیا اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ۔“[1]

حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام ”والھہ“ اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا نام ”والعۃ“ تھا اور بعض نے اس کے بر عکس لکھا ہے یعنی نوح کی بیوی کا نام ”والعۃ“ اور لوط کی بیوی کا نام ”والھہ“ یا ”واہلہ“ کہا ہے۔

بہر حال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جائدہ عفت سے انحراف ہر گز نہیں تھا کیونکہ کسی پیغمبر کی بیوی ہر گز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبر اسلام سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے: ”کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہر گز منافی عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی“۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور ان کے گھر کے راز انہیں بتاتی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہما السلام

داستان عشق یا پاکیزگی کا بہترین سبق

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے چند چیزوں کا بیان کرنا ضروری ہے:

1۔ بے ہدف داستان پردازوں یا پست اور غلیظ مقاصد رکھنے والوں نے اس اصلاح کنندہ واقعہ کو ہوس بازوں کے لئے ایک عاشقانہ داستان بنانے اور حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے واقعات کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ انھوں نے اسے ایک رومانی فلم بنا کر پردہ سیمیں پر پیش کرنا چاہا ہے، لیکن قرآن مجید نے کہ جس کی ہر چیز نمونہ اور اسوہ ہے اس واقعے کے مختلف مناظر سے پیش کرتے ہوئے اعلیٰ ترین عفت و پاکدامنی، خودداری، تقویٰ، ایمان اور ضبط نفس کے درس دیئے ہیں اس طرح سے کہ ایک شخص اسے جتنی مرتبہ بھی پڑھے ان قوی جذبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اسی بنا پر قرآن نے اسے ”احسن القصص“ (بہترین داستان) جیسا خوبصورت نام دیا ہے اور اس میں صاحبان فکر و نظر کے لئے متعدد عبرتیں بیان کی ہیں۔

قہرمان پاکیزگی

2۔ اس واقعہ میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن تمام پہلوؤں سے معجزہ ہے اور اپنے واقعات میں جو ہیرو پیش کرتا ہے وہ حقیقی ہیرو ہوتے ہیں نہ کہ خیالی۔ کہ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، وہ بت شکن ہیرو، جن کی روح بلند تھی اور جو طاغوتیوں کی کسی سازش میں نہ آئے۔

---

[1] سورہ تحریم آیت 10

حضرت نوح علیہ السلام ،طویل اور پر برکت عمر میں ۔صبر واستقامت ، پامردی اوردلسوزی کے ہیرو بنے ۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ ہیرو کہ جنہوں نے ایک سرکش اورعصیان گر طاغوت کے مقابلے کے لئے ایک ہٹ دھرم قوم کو تیار کرلیا۔
حضرت یوسف علیہ السلام ؛ایک خوبصورت ،ہوس باز اور حیلہ گر عورت کے مقابلے میں پا کیز گی ، پارسائی اورتقویٰ کے ہیرو بنے ۔

علاوہ ازیں اس واقعے میں قرآنی وحی کی قدرت بیان اس طرح جھلکتی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہوجاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کئی مواقع پر یہ واقعہ عشق کے بہت ہی باریک مسائل تک جا پہنچتا ہے اور قرآن انہیں چھوڑ کر ایک طرف سے گزرے بغیر ان تمام مناظر کو ان کی باریکیوں کے ساتھ اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ سامع میں ذرہ بھر منفی اور غیر مطلوب احساس پیدا نہیں ہوتا۔قرآن تمام واقعات کے تن سے گزرتا ہے لیکن تمام مقامات پر تقویٰ و پاکیزگی کی قوی شعاعوں نے مباحث کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد

3۔اس میں شک نہیں کہ قبل از اسلام بھی داستان یوسفؑ لوگوں میں مشہور تھی کیونکہ توریت میں سفر پیدائش کی چودہ فصلوں (فصل 37 تا50) میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔البتہ ان چودہ فصلوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ توریت میں جو کچھ ہے وہ قرآن سے بہت ہی مختلف ہے۔ان اختلافات کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ کس حد تک پیراستہ اور ہرقسم کے خرافات سے پاک ہے۔ یہ جو قرآن پیغمبر سے کہتا ہے:''اس سے پہلے آپ کو علم نہیں تھا،،اس عبرت انگیز داستان کی خالص واقعیت سے ان کی عدم آگہی کی طرف اشارہ ہے''(اگر احسن القصص سے مراد واقعہ یوسفؑ ہو)۔
موجودہ توریت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خون آلود قمیص دیکھی تو کہا:''یہ میرے بیٹے کی قبا ہے جسے جانور نے کھالیا ہے یقیناً یوسفؑ چیر پھاڑ ڈالا گیا ہے۔''
پھر یعقوبؑ نے اپنا گریبان چاک کیا ٹاٹ اپنی کمر سے باندھا اور مدت دراز تک اپنے بیٹے کے لئے گریہ کرتے رہے،تمام بیٹوں اور بیٹیوں نے انہیں تسلی دینے میں کسر اٹھا نہ رکھی لیکن انہیں قرار نہ آیا اور کہا کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ اسی طرح غمزدہ قبر میں جاؤں گا۔

جبکہ قرآن کہتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی فراست سے بیٹوں کے جھوٹ کو بھانپ گئے اور انہوں نے اس مصیبت میں دادوفریاد نہیں کی اور نہ اضطراب دکھایا بلکہ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اس مصیبت کا بڑے صبر سے سامنا کیا اگر چہ ان کا دل جل رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، فطری طور پر کثرت گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔لیکن قرآن کی تعبیر کے مطابق انہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا اور اپنے اوپر قابو رکھا(کظیمۃ) انہوں نے گریبان چاک کرنے ، دادوفریاد کرنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے گریز کیا جو کہ عزاداری کی مخصوص علامات تھیں۔
بہر حال اسلام کے بعد بھی یہ واقعہ مشرق مغرب کے مؤرخین کی تحریروں میں بعض اوقات حاشیہ آرائی کے ساتھ آیا ہے فارسی اشعار میں سب سے پہلے ''یوسفؑ زلیخا،، کے قصے کی نسبت فردوسی کی طرف دی جاتی ہے اس کے بعد شہاب الدین عمق اور مسعودی قمی کی ''یوسفؑ زلیخا'' ہے اور ان کے بعد نویں صدی کے مشہور شاعر عبدالرحمٰن جامی کی ''یوسفؑ زلیخا'' ہے۔

احسن القصص

4۔قرآن میں داستان یوسفؑ کوشروع کرتے ہوئے خدافرماتا ہے:''ہم اس قرآن کے ذریعہ (جو آپ پر وحی ہوتی ہے)،کے ذریعہ''احسن القصص''بیان کرتے ہیں''۔[1]

یہ واقعہ کیسے بہترین نہ ہو جب کہ اس کے ہیجان انگیز پیچ وخم میں زندگی کے اعلیٰ ترین دروس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس واقعے میں ہر چیز پر خدا کے ارادے کی حاکمیت کا ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں۔

حسد کرنے والوں کا منحوس انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اوران کی سازشوں کو نقش برآب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

بے عفتی کی عار وننگ اور پارسائی وتقویٰ کی عظمت وشکوہ اس کی سطور میں ہم مجسم پاتے ہیں کنویں کی گہرائی میں ایک ننھے بچے کی تنہائی،زندان کی تاریک کوٹھری میں ایک بے گناہ قیدی کے شب وروز، یاس وناامیدی کے سیاہ پردوں کے پیچھے نورامید کی تجلی اورآخرکار ایک وسیع حکومت کی عظمت وشکوہ کہ جوآگاہی وامانت کا نتیجہ ہے یہ تمام چیزیں اس داستان میں انسان کی آنکھوں کے سامنے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں۔

وہ لمحے کہ جب ایک معنی خیز خواب سے ایک قوم کی سرنوشت بدل جاتی ہے۔

وہ وقت کہ جب ایک قوم کی زندگی ایک بیدار خدائی زمام دار کے علم وآگہی کے زیر سایہ نابودی سے نجات پالیتی ہے۔

اور ایسے ہی دسیوں درس،جس داستان میں موجود ہوں وہ کیوں نہ''احسن القصص''ہو۔

البتہ یہی کافی نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان''احسن القصص''ہے اہم بات یہ ہے کہ ہم میں یہ لیاقت ہو کہ یہ عظیم درس ہماری روح میں اتر جائے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کوایک اچھے رومانوی واقعہ کے عنوان سے دیکھتے ہیں،ان جانوروں کی طرح جنھیں ایک سرسبز وشاداب اور پھل پھول سے لدے ہوئے باغ میں صرف کچھ گھاس نظر پڑتی ہے کہ جوان کی بھوک کو زائل کردے۔

ابھی تک بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس داستان کوجھوٹے پر و بال دے کر کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ایک سیکسی (sexsi)داستان بنالیں جب کہ اس واقعہ کے لئے یہ بات ناشائستہ ہے اوراصل داستان میں تمام اعلیٰ انسانی قدریں جمع ہیں آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ اس واقعہ کے جامع خوبصورت پیچ وخم کونظرانداز کرکے نہیں گزراجاسکتا ایک شاعر شیریں سخن کے بقول:

''کبھی کبھی اس داستان کے پرکشش پہلوؤں کی مہک انسان کواس طرح سرمست کردیتی ہے کہ وہ بے خود ہوجاتا ہے۔''

امید کی کرن اورمشکلات کی ابتداء

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کا آغاز قرآن ان کے عجیب اورمعنی خیز خواب سے کرتا ہے کیونکہ یہ خواب دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاطم خیز زندگی کا پہلا موڑ شمار ہوتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے آپ بڑے شوق اوروارفتگی سے باپ کے پاس آئے اورانہیں ایک نیاواقعہ سنایا جوظاہراً کوئی زیادہ

---

[1] سورہ یوسف آیت3

اہم نہ تھا لیکن درحقیقت ان کی زندگی میں ایک تازہ باب کھلنے کا پتہ دے رہا تھا۔

''یوسفؑ نے کہا: ابا جان:! میں نے کل رات گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نیچے اترے سورج اور چاند ان کے ہمراہ تھے سب کے سب میرے پاس آئے اور میرے سامنے سجدہ کیا۔''[1]

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب شب جمعہ دیکھا تھا کہ جو شب قدر بھی تھی (وہ رات جو مقدرات کے تعین کی رات ہے)۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب دیکھا اس وقت آپ کی عمر کتنے سال تھی اس سلسلے میں بعض نے نو سال بعض نے بارہ سال اور بعض نے سات سال عمر لکھی ہے جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ بہت کم سن تھے۔

اس ہیجان انگیز اور معنی خیز خواب پر خدا کے پیغمبر یعقوبؑ فکر میں ڈوب گئے کہ سورج، چاند اور آسمان کے گیارہ ستارے، وہ گیارہ ستارہ نیچے اترے اور میرے بیٹے یوسفؑ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

یہ کس قدر معنی آفریں ہے یقیناً سورج اور چاند میں اور اس کی ماں (یا میں اور اس کی خالہ) ہیں اور گیارہ ستارے اس کے بھائی ہیں میرے بیٹے کی قدر ومنزلت اور مقام اس قدر بلند ہو گا کہ آسمان کے ستارے، سورج اور چاند اس کے آستانہ پر جبیں سائی کریں گے یہ بارگاہ الٰہی میں اس قدر عزیز اور باوقار ہو گا کہ آسمان والے بھی اس کے سامنے خضوع کریں گے کتنا پرشکوہ اور پرکشش خواب ہے۔

لہٰذا پریشانی اور اضطراب کے انداز میں کہ جس میں ایک مسرت بھی تھی، اپنے بیٹے سے کہنے لگے ''میرے بیٹے: اپنا یہ خواب بھائیوں کو نہ بتانا، کیونکہ وہ تیرے خلاف خطرناک سازش کریں گے، میں جانتا ہوں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔[2]

وہ موقع کی تاڑ میں ہے تاکہ اپنے وسوسوں کا آغاز کرے، کینہ وحسد کی آگ بھڑکائے یہاں تک کہ بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دے۔ لیکن یہ خواب صرف مستقبل میں یوسفؑ کے مقام کی ظاہری ومادی عظمت بیان نہیں کرتا تھا بلکہ نشاندہی کرتا تھا کہ وہ مقام نبوت تک بھی پہنچیں گے کیونکہ آسمان والوں کا سجدہ کرنا آسمانی مقام کے بلندی پر پہنچنے کی دلیل ہے اسی لئے تو ان کے پدر بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام نے مزید کہا: ''اور اس طرح تیرا پروردگار تجھے منتخب کرے گا اور تجھے تعبیر خواب کا علم دے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوبؑ پر تمام کرے گا، جیسے اس نے قبل ازیں تیرے باپ ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر تمام کی۔ ہاں! تیرا پروردگار عالم ہے اور حکمت کے مطابق کام کرتا ہے۔''[3]

بھائیوں کی سازش

یہاں سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش شروع ہوتی ہے، قرآن میں ان بہت سے اصلاحی دروس کی طرح اشارہ کیا گیا ہے جو اس داستان میں موجود ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ''یقیناً یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کی داستان میں سوال کرنے والوں کے لئے نشانیاں تھیں۔''[4]

---

[1] سورہ یوسف آیت 4

[2] سورہ یوسف آیت 5

[3] سورہ یوسف آیت 6

[4] سورہ یوسف آیت 7

اس سے بڑھ کر اور کیا درس ہوگا کہ چند طاقتور افراد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہ جس کا سرچشمہ حسد تھا ظاہراً ایک کمزور اور تنہا شخص کو نابود کرنے کے لئے اپنی تمام تر کوشش صرف کرتے ہیں مگر اس کام سے انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ اسے ایک حکومت کے تخت پر بٹھا رہے ہیں اور ایک وسیع مملکت کا فرماں روا بنا رہے ہیں اور آخر کار وہ سب اس کے سامنے سر تعظیم و تسلیم خم کرتے ہیں یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ جب خدا کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اس کام کو اس کے مخالفین کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا دے تاکہ یہ واضح ہوجائے گا کہ ایک پاک اور صاحب ایمان انسان اکیلا نہیں ہے اور اگر سارا جہان اس کی نابودی پر کمر باندھ لے لیکن خدا نہ چاہے تو کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے ان میں یوسفؑ اور بنیامین ایک ماں سے تھے ان کی والدہ کا نام ''راحیل'' تھا یعقوب علیہ السلام ان دونوں بیٹوں سے خصوصاً یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ ایک تو یہ ان کے چھوٹے بیٹے تھے لہٰذا فطرتاً زیادہ توجہ اور محبت کے محتاج تھے اور دوسرا ان کی والدہ ''راحیل'' فوت ہوچکی تھیں اس بناء پر بھی انہیں زیادہ توجہ اور محبت کی ضرورت تھی علاوہ ازیں خصوصیت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام میں نابغہ اور غیر معمولی شخصیت ہونے کے آثار نمایاں تھے؟ مجموعی طور پر ان سب باتوں کی بناء پر حضرت یعقوب علیہ السلام واضح طور پر ان سے زیادہ پیار محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

حاسد بھائیوں کی توجہ ان پہلوؤں کی طرف نہیں تھی اور وہ اس پر بہت ناراحت اور ناراض تھے۔ خصوصاً شاید ماؤں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے بھی فطرتاً ان میں رقابت موجود تھی لہٰذا وہ اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے: ''یوسفؑ اور اس کے بھائی کو باپ ہم سے زیادہ پیار کرتا ہے حالانکہ ہم طاقتور اور مفید لوگ ہیں۔'' [۱]

اور باپ کے امور کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں اس لئے اسے ان چھوٹے بچوں کی نسبت ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے جب کہ ان سے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اس طرح یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے باپ کے خلاف کہا کہ ''ہمارا باپ واضح گمراہی میں ہے۔'' [۲]

حسد اور کینے کی آگ نے انہیں اجازت نہ دی کہ وہ معاملے کے تمام اطراف پر غور و فکر کرتے اور ان دو بچوں سے اظہار محبت پر باپ کے دلائل معلوم کرتے کیونکہ ہمیشہ ذاتی مفادات ہر شخص کی فکر پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اسے یک طرفہ فیصلوں پر آمادہ کردیتے ہیں کہ جن کا نتیجہ حق و عدالت کے راستے سے گمراہی ہے۔ البتہ ان کی مراد دین و مذہب کے اعتبار سے گمراہی نہ تھی کیونکہ بعد میں آنے والی گفتگو نشاندہی کرتی ہے کہ اپنے باپ کی عظمت اور نبوت پر ان کا عقیدہ تھا اور انہیں صرف ان کے طرز معاشرت پر اعتراض تھا۔

یوسفؑ کو قتل کردیا جائے

بغض، حسد اور کینے کے جذبات نے آخر کار بھائیوں کو ایک منصوبہ بنانے پر آمادہ کیا وہ ایک جگہ جمع ہوئے اور دو تجاویز ان کے سامنے تھیں کہنے لگے: ''یا یوسفؑ کو قتل کردو یا اسے دور دراز کے کسی علاقے میں پھینک آؤ تاکہ باپ کی محبت کا پورا رخ ہماری طرف ہوجائے''۔ [۳]

---

[۱] سورہ یوسف آیت 8

[۲] سورہ یوسف آیت 8

[۳] سورہ یوسف آیت 9

یہ ٹھیک ہے کہ اس کام پر تمہیں احساس گناہ ہوگا اور وجدان کی ندامت ہوگی کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی پر یہ ظلم کرو گے لیکن اس گناہ کی تلافی ممکن ہے، توبہ کر لینا'' اور اس کے بعد صالح جمعیت بن جانا''۔[۱]

لیکن بھائیوں میں سے ایک بہت سمجھدار تھا یا اس کا ضمیر نسبتاً زیادہ بیدار تھا اسی لئے اس نے یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کے منصوبے کی مخالفت کی اور اسی طرح کسی دور دراز علاقے میں پھینک آنے کی تجویز پیش کی، کیونکہ اس منصوبے میں یوسف علیہ السلام کی ہلاکت کا خطرہ تھا۔ اس نے ایک تیسرا منصوبہ پیش کیا، وہ کہنے لگا: ''اگر تمہیں ایسا کام کرنے پر اصرار ہی ہے تو یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو بلکہ اسے کسی کنویں میں پھینک دو (اس طرح سے کہ وہ زندہ رہے) تاکہ راہ گزاروں کے کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس طرح یہ ہماری اور باپ کی آنکھوں سے دور ہو جائے''۔[۲]

منحوس سازش

یوسفؑ کے بھائیوں نے جب یوسفؑ کو کنویں میں ڈالنے کی آخری سازش پر اتفاق کر لیا تو یہ سوچنے لگے کہ یوسفؑ کو کس طرح لے کر جائیں لہٰذا اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک اور منصوبہ تیار کیا اس کے لئے وہ باپ کے پاس آئے اور اپنا حق جتانے کے انداز میں، نرم و نازک لہجے میں محبت بھرے شکوے کی صورت میں کہنے لگے: ''بابا جان: آپ یوسفؑ کو کیوں کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے اور ہمارے سپرد نہیں کرتے آپ ہمیں بھائی کے بارے میں امین کیوں نہیں سمجھتے حالانکہ ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں''۔[۳]

''آیئے: جس کا آپ ہمیں متہم سمجھتے ہیں اسے جانے دیجئے، علاوہ ازیں ہمارا بھائی نوعمر ہے، اس کا بھی حق ہے اسے بھی شہر سے باہر کی آزاد فضا میں گھومنے پھرنے کی ضرورت ہے اسے گھر کے اندر قید کر دینا درست نہیں کل اسے ہمارے ساتھ بھیجئے تاکہ یہ شہر سے باہر نکلے، چلے پھرے، درختوں کے پھل کھائے، کھیلے کودے اور سیر و تفریح کرے''۔[۴]

اور اگر آپ کو اس کی سلامتی کا خیال ہے اور پریشانی ہے'' تو ہم سب اپنے بھائی کے محافظ و نگہبان ہوں گے''۔[۵]

کیونکہ آخر یہ ہمارا بھائی ہے اور ہماری جان کے برابر ہے۔ اس طرح انہوں نے بھائی کو باپ سے جدا کرنے کا بڑا ماہرانہ منصوبہ تیار کیا، ہوسکتا ہے انہوں نے یہ باتیں یوسفؑ کے سامنے کی ہوں تاکہ وہ بھی باپ سے تقاضا کریں اور ان سے صحرا کی طرف جانے کی اجازت لے لیں۔

اس منصوبہ میں ایک طرف باپ کے لئے انہوں نے یہ مشکل پیدا کر دی تھی کہ اگر وہ یوسفؑ کو ہمارے سپرد نہیں کرتے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمیں متہم سمجھتے ہیں اور دوسری طرف کھیل کود اور سیر و تفریح کے لئے شہر سے باہر جانے کی یوسفؑ کے لئے تحریک تھی۔

کنعان کے بھیڑئے

حضرت یعقوب علیہ السلام نے برادران یوسفؑ کی باتوں کے جواب میں بجائے اس کے کہ انہیں برے ارادے کا الزام دیتے،

---

[۱] سورہ یوسف آیت 9

[۲] سورہ یوسف آیت 10

[۳] سورہ یوسف آیت 11

[۴] سورہ یوسف آیت 12

[۵] سورہ یوسف آیت 12

کہنے لگے کہ میں جو تمہارے ساتھ یوسفؑ کو بھیجنے پر تیار نہیں ہوں تو اس کی دو وجوہ ہیں: "پہلی یہ کہ یوسفؑ کی جدائی میرے لئے غم انگیز ہے"۔[1] اور دوسری یہ کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے اردگرد کے بیابانوں میں خونخوار بھیڑیئے ہوں "اور مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی بھیڑیا میرے فرزند دلبند کو کھا جائے اور تم اپنے کھیل کود، سیر و تفریح اور دوسرے کاموں میں مشغول رہو"۔[2]

یہ بالکل فطری امر تھا کہ اس سفر میں بھائی اپنے آپ میں مشغول ہوں اور اپنے چھوٹے بھائی سے غافل ہوں اور بھیڑیوں سے بھرے اس بیابان میں کوئی بھیڑیا یوسفؑ کو اٹھائے البتہ بھائیوں کے پاس باپ کی پہلی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ یوسفؑ کی جدائی کا غم ایسی چیز نہ تھی کہ جس کی وہ تلافی کر سکتے بلکہ شاید اس بات نے بھائیوں کے دل میں حسد کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہو۔

دوسری طرف بیٹے کو باہر لے جانے کے بارے میں باپ کی دلیل کا جواب تھا کہ جس کے ذکر کی چنداں ضرورت نہ تھی اور وہ یہ کہ آخر کار بیٹے کو نشوونما اور تربیت کے لئے چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے باپ سے جدا ہونا ہے اور اگر وہ "نورستہ" کے پودے کی طرح ہمیشہ باپ کے زیر سایہ رہے تو نشوونما نہیں پاسکے گا اور بیٹے کے تکامل وارتقاء کے لئے باپ مجبور ہے کہ یہ جدائی برداشت کرے آج کھیل کود ہے کل تحصیل علم و دانش ہے پرسوں زندگی کے لئے کسب و کار اور سعی و کوشش ہے آخر کار جدائی ضروری ہے۔

لہٰذا اصلاً انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری دلیل کا جواب شروع کیا کہ جو ان کی نگاہ میں اہم اور بنیادی تھی اور کہنے لگے: "کیسے ممکن ہے کہ ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم طاقتور لوگ ہیں اگر ایسا ہوجائے تو ہم زیاں کار و بدبخت ہوں گے" [3]

یعنی کیا ہم مردہ ہیں کہ بیٹھ جائیں اور دیکھتے رہیں گے اور بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھا جائے گا، بھائی کو بھائی سے جو تعلق ہوتا ہے اس کے علاوہ جو بات اس کی حفاظت پر ہمیں ابھارتی ہے یہ ہے کہ ہماری لوگوں میں عزت و آبرو ہے، لوگ ہمارے متعلق کیا کہیں گے، یہی نا کہ طاقتور موٹی گردنوں والے بیٹھے رہے اور اپنے بھائی پر بھیڑیئے کو حملہ کرتے دیکھتے رہے کیا پھر ہم لوگوں میں جینے کے قابل رہیں گے۔[4]

انہوں نے ضمناً باپ کی اس بات کا بھی جواب دیا کہ ہوسکتا ہے تم کھیل کود میں لگ جاؤ اور یوسفؑ سے غافل ہوجاؤ اور وہ یہ کہ یہ مسئلہ گویا ساری دولت اور عزت و آبرو کے ضائع ہونے کا ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ کھیل کود ہمیں غافل کردے کیونکہ اس صورت میں ہم لوگ بے وقعت ہوجائیں گے اور ہماری کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

بہر حال انہوں نے بہت حیلے کئے خصوصاً حضرت یوسف علیہ السلام کے معصوم جذبات کو تحریک کیا اور انہیں شوق دلایا کہ وہ شہر سے باہر تفریح کے لئے جائیں اور شاید یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ باپ کو اس کے لئے راضی کریں اور بہر صورت اس کام کے

---

[1] سورہ یوسف آیت 13

[2] سورہ یوسف آیت 13

[3] سورہ یوسف آیت 14

[4] یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تمام خطرات میں سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف بھیڑیئے کے حملے کے خطرے کی نشاندہی کیوں کی تھی۔
بعض کہتے ہیں کہ کنعان کا بیابان بھیڑیوں کا مرکز تھا، اس لئے زیادہ خطرہ اسی طرف سے محسوس ہوتا تھا۔
بعض دیگر کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب کی وجہ سے تھا کہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے پہلے دیکھا تھا کہ بھیڑیوں نے ان کے بیٹے یوسفؑ پر حملہ کردیا ہے۔
یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنائے کی زبان میں بات کی تھی اور ان کی نظر بھیڑیا صفت انسانوں کی طرف تھی، جیسے یوسف کے بعض بھائی تھے۔

لئے ان کی رضامندی حاصل کریں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنائے کی زبان میں بات کی تھی اور ان کی نظر بھیڑیا صفت انسانوں کی طرف تھی، جیسے یوسفؑ کے بعض بھائی تھے۔

روتے ہوئے جناب یوسف علیہ السلام کو وداع کیا

آخرکار بھائی کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے باپ کو راضی کرلیا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ بھیج دے۔ وہ رات انہوں نے اس خوش خیالی کے ساتھ گزاری کہ کل یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان کا منصوبہ عملی شکل اختیار کرے گا اور راستے کی رکاوٹ اس بھائی کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹادیں گے۔ پریشانی انہیں صرف یہ تھی کہ باپ پشیمان نہ ہو اور اپنی بات واپس نہ لے لے۔

صبح سویرے وہ باپ کے پاس گئے اور یوسف علیہ السلام کی حفاظت کے بارے میں باپ نے ہدایات دہرائیں۔ انہوں نے بھی اظہار اطاعت کیا۔ باپ کے سامنے اسے بڑی محبت واحترام سے اٹھایا اور چل پڑے۔

کہتے ہیں شہر کے دروازے تک باپ ان کے ساتھ آئے اور آخری دفعہ یوسف علیہ السلام کو ان سے لے کر اپنے سینے سے لگایا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ پھر یوسف علیہ السلام کو ان کے سپرد کرکے ان سے جدا ہوگئے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں اسی طرح بیٹوں کے پیچھے تھیں۔ جہاں تک باپ کی آنکھیں کام کرتی تھیں وہ بھی یوسف علیہ السلام پر نوازش اور محبت کرتے رہے لیکن جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ اب باپ انہیں نہیں دیکھ سکتا تو اچانک انہوں نے آنکھیں پھیرلیں۔ سالہا سال سے حسد کی وجہ سے جوان کے اندر تہ بہ تہ بغض وکینہ موجود تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نکلنے لگا۔ ہر طرف سے اسے مارنے لگے وہ ایک سے بچ کر دوسرے کی پناہ لیتے لیکن کوئی انہیں پناہ نہ دیتا۔

یوسف علیہ السلام کی ہنسی اور ان کا رونا

ایک روایت میں ہے کہ اس طوفان بلا میں حضرت یوسف علیہ السلام آنسو بہار ہے تھے اور جب وہ انہیں کنویں میں پھینکنے لگے تو اچانک حضرت یوسف علیہ السلام ہنسنے لگے، بھائیوں کو بہت تعجب ہوا یہ ہنسنے کا کونسا مقام ہے گویا یوسفؑ نے اس مسئلے کو مذاق سمجھا ہے اور بات سے بے خبر ہے کہ سیاہ وقت اور بدبختی اس کے انتظار میں ہے لیکن یوسفؑ نے اس ہنسنے کے مقصد سے پردہ اٹھایا اور سب کو عظیم درس دیا، وہ کہنے لگے:

''میں نہیں بھولتا کہ ایک دن تم طاقتور بھائیوں، تمہارے قوی بازوؤں اور بہت زیادہ جسمانی طاقت پر میں نے نظر ڈالی تو میں بہت خوش ہوا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جس کے اتنے دوست اور مددگار ہوں اسے سخت حوادث کا کیا غم ہے اس دن میں نے تم پر بھروسہ کیا اور پناہ لیتا ہوں اور تم مجھے پناہ نہیں دیتے خدا نے تمہیں مجھ پر مسلط کیا ہے تاکہ میں یہ درس سیکھ لوں کہ اس کے غیر پر یہاں تک کہ بھائیوں پر بھی بھروسہ نہ کروں''؟

اس کے آگے قرآن مزید کہتا ہے: ''اس وقت ہم نے یوسفؑ کی طرف وحی بھیجی، اسے تسلی دی اور اس کی دلجوئی کی اور اس سے کہا کہ غم نہ کھاؤ۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تم انہیں ان تمام منحوس سازشوں اور منصوبوں سے آگاہ کروگے اور وہ تمہیں پہچان نہیں سکیں گے''۔[1]

[1] سورہ یوسف آیت 15

وہ دن کہ جب تم تخت حکومت پر تکیہ لگائے ہوگے اور تمہارے یہ بھائی تمہاری طرف دست نیاز پھیلائیں گے اور ایسے تشنہ کاموں کی طرح کہ جو چشمۂ خوش گوار کی تلاش میں تپتے ہوئے بیابان میں سرگرداں ہوتے ہیں تمہارے پاس بڑے انکسار اور فروتنی سے آئیں گے لیکن تم اتنے بلند مقام پر پہنچے ہوں گے کہ انہیں خیال بھی نہ ہوگا کہ تم ان کے بھائی ہو اس روز تم ان سے کہو گے کہ کیا تم ہی تھے جنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی یوسفؑ کے ساتھ یہ سلوک کیا اور اس دن یہ کس قدر شرمسار اور پشیمان ہوں گے۔ [۱]

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ انھوں نے اتفاق کیا کہ اسے کنویں کی مخفی جگہ پر ڈال دیں یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا نہیں تھا بلکہ نیچے لے گئے تھے، کنویں کی تہ میں ایک چبوترا سا نیچے جانے والوں کے لئے بنایا جاتا ہے اور سطح آب کے قریب ہوتا ہے انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی کمر میں طناب ڈال کر وہاں تک پہنچایا اور وہاں چھوڑ دیا۔

جناب یوسف علیہ السلام برہنہ کنویں میں

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں پھینکا تو ان کا کرتہ اتار لیا اور ان کا بدن برہنہ ہوگیا تو یوسف علیہ السلام نے بہت داد و فریاد کی کہ کم از کم میرا کرتہ تو مجھے دے دو تا کہ اگر میں زندہ رہوں تو میرا بدن ڈھانپے اور اگر مر جاؤں تو میرا کفن بن جائے۔ بھائی کہنے لگے: اسی سورج، چاند اور ستاروں سے کہہ جنہیں خواب میں دیکھا تھا، تقاضا کرو کہ اس کنویں میں تیرے مونس و غمخوار ہوں اور تجھے لباس پہنائیں۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جو منصوبہ بنا رکھا تھا اس پر انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق عمل کر لیا۔ لیکن آخر کار انہیں واپس لوٹنے کے بارے میں سوچنا تھا کہ جا کر کوئی ایسی بات کریں کہ باپ کو یقین آجائے کہ یوسفؑ کسی سازش کے تحت نہیں بلکہ طبیعی طور پر وادی عدم میں چلا گیا ہے اور اس طرح وہ باپ کی نوازشات کو اپنی جانب موڑ سکیں۔

ذلیل کنندہ جھوٹ

قرآن کہتا ہے: ''رات کے وقت بھائی روتے ہوئے آئے''۔ [۲]

ان کے جھوٹے آنسوؤں اور ٹسوے بہانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹا رونا بھی ممکن ہے اور صرف روتی ہوئی آنکھ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

باپ جو بڑی بے تابی اور بے قراری سے اپنے فرزند دلبند یوسفؑ کی واپسی کے انتظار میں تھا اس نے جب انہیں واپس آتے دیکھا اور یوسفؑ ان میں دکھائی نہ دیا تو وہ لرز گئے اور کانپ اٹھے۔ حالات پوچھے تو انہوں نے کہا: ''ابا جان ہم گئے اور ہم (سواری اور تیر اندازی کے) مقابلوں میں مشغول ہوگئے اور یوسفؑ کہ چھوٹا تھا اور ہم سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ہم اسے اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے، اس کام میں ہم اتنے محو ہوگئے کہ ہر چیز یہاں تک کہ بھائی کو بھی بھول گئے، اس اثنا میں ایک بے رحم بھیڑیا اس طرف آپہنچا اور اس نے اسے چیر پھاڑ کھایا''۔ [۳] ''لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم ہرگز ہماری باتوں کا یقین نہیں کرو گے اگرچہ ہم سچے

---

[۱] سورہ یوسف کی آیت 22 کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی الٰہی وحی نبوت نہ تھی بلکہ یوسفؑ کے دل پر الہام تھا تا کہ وہ جان لے کہ وہ تنہا نہیں ہے اور اس کا ایک حافظ و نگہبان ہے، اس وحی نے قلب یوسفؑ پر امید کی ضیا پاشی کی اور یاس و ناامیدی کی تاریکیوں کو اس کی روح سے نکال دیا۔

[۲] سورہ یوسف آیت 16

[۳] سورہ یوسف آیت 17

ہوں کیونکہ تم نے پہلے ہی اس قسم کی پیش بینی کی تھی لہٰذا اسے بہانہ سمجھو گے۔''[1]

بھائیوں کی باتیں بڑی سوچی سمجھی تھیں پہلی بات یہ کہ انہوں نے باپ کو یا ''اے ہمارے والد'' کے لفظ سے مخاطب کیا کہ جس میں ایک جذباتی پہلو تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ فطری طور پر ایسی تفریح گاہ میں طاقتور بھائی بھاگ دوڑ میں مشغول ہوں گے اور چھوٹے کو سامان کی نگہداشت پر مقرر کریں گے اور اس کے علاوہ انہوں نے باپ کو غفلت میں رکھنے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور روتی ہوئی آنکھوں سے کہا کہ تم ہرگز یقین نہیں کرو گے اگر چہ ہم سچ بول رہے ہوں نیز اس بناء پر کہ باپ کو ایک زندہ نشانی بھی پیش کریں ''وہ یوسف ؑ کی قمیص کو جھوٹے خون میں تر کئے ہوئے تھے''۔[2] (وہ خون انہوں نے بکری یا بھیڑ کے بچے یا ہرن کا لگا رکھا تھا)۔

لیکن ''دروغ گو حافظہ ندارد'' اور ایک حقیقی واقعہ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کے مختلف کوائف اور مسائل ہوتے ہیں، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک فرضی کہانی میں سمویا جاسکے لہٰذا برادران یوسف ؑ بھی اس نکتے سے غافل رہے کہ کم از کم یوسف ؑ کے کرتے کو چند جگہ سے پھاڑ لیتے تا کہ وہ بھیڑیئے کے حملے کی دلیل بن سکے وہ بھائی کی قمیص کو اس کے بدن سے صحیح سالم اتار کر خون آلود کر کے باپ کے پاس لے آئے، سمجھدار اور تجربہ کار باپ کی جب اس کرتے پر نگاہ پڑی تو وہ سب کچھ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ تم جھوٹ بولتے ہو ''بلکہ نفسانی ہوا اور ہوس نے تمہارے لئے یہ کام پسندیدہ بنا دیا ہے''۔[3] اور یہ شیطانی سازشیں ہیں۔

مہربان بھیڑیا

جناب یعقوب علیہ السلام نے کرتہ اٹھایا اور اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کہ پھر اس میں بھیڑیئے کے پنجوں اور دانتوں کے نشان کیوں نہیں ہیں۔؟

ایک اور روایت کے مطابق: حضرت یقوب علیہ السلام نے کرتہ اپنے منہ پر ڈال لیا، فریاد کرنے لگے اور آنسو بہانے لگے، اور کہہ رہے تھے: یہ کیسا مہربان بھیڑیا تھا جس نے میرے بیٹے کو تو کھا لیا لیکن اس کے کرتے کو تو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچایا؟ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر خشک لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑے بعض بھائیوں نے فریاد کی: اے وائے ہو ہم پر روز قیامت عدل الٰہی کی عدالت میں ہم بھائی بھی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں اور باپ کو بھی ہم نے قتل کر دیا ہے، ادھر باپ اسی طرح سحری تک بے ہوش رہے لیکن سحر گاہی کی نسیم سرد کے جھونکے ان کے چہرے پر پڑے تو وہ ہوش میں آ گئے۔

باوجودیکہ یعقوب ؑ کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی، ان کی روح جل رہی تھی لیکن زبان سے ہرگز ایسی بات نہ کہتے تھے جو ناشکری، یاس و ناامیدی اور جزع وفزع کی نشانی ہو بلکہ کہا: ''میں صبر کروں گا، صبر جمیل، ایسی شکیبائی جو شکر گزاری اور حمد خدا کے ساتھ ہو''۔[4] اس کے بعد جناب یعقوب کہنے لگے ''جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلے میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں''۔[5]

میں اس سے چاہتا ہوں کہ جام صبر کی تلخی میرے حلق میں شیریں زبان؛ نادرست اور غلط بات سے آلودہ نہ ہو۔

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یوسف ؑ کی موت کی مصیبت پر مجھے شکیبائی دے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یوسف قتل نہیں ہوئے بلکہ

---

[1] سورہ یوسف آیت 17

[2] سورہ یوسف آیت 18

[3] سورہ یوسف آیت 18

[4] سورہ یوسف آیت 18

[5] سورہ یوسف آیت 18

کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو کہ جس کا نتیجہ بہر حال اپنے بیٹے سے میری جدائی ہے، میں صبر طلب کرتا ہوں۔

ایک ترک اولیٰ کے بدلے

ابوحمزہ ثمالی نے ایک روایت امام سجاد علیہ السلام سے نقل کی ہے ابوحمزہ کہتے ہیں: جمعہ کے دن میں مدینہ منورہ میں تھا نماز صبح میں نے امام سجاد علیہ السلام کے ساتھ پڑھی جس وقت امام نماز اور تسبیح سے فارغ ہوئے تو گھر کی طرف چل پڑے میں آپ کے ساتھ تھا۔

آپ نے خادمہ کو آواز دی اور کہا: خیال رکھنا، جو سائل اور ضرورت مند گھر کے دروازے سے گزرے اسے کھانا دینا کیونکہ آج جمعہ کا دن ہے۔

ابوحمزہ کہتے ہیں: میں نے کہا: ہر وہ شخص جو مدد کا تقاضا کرتا ہے مستحق نہیں ہوتا، تو امام نے فرمایا: ٹھیک ہے، لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ ان میں مستحق افراد ہوں اور انہیں غذا نہ دیں اور اپنے گھر کے دروازے سے دھتکار دیں تو کہیں ہمارے گھر والوں پر وہی مصیبت نہ آن پڑے جو یعقوب اور آل یعقوب پر آن پڑی تھی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: ان سب کو کھانا دو کہ (کیا تم نے سنا نہیں ہے کہ) یعقوبؑ کے لئے ہر روز ایک گوسفند ذبح کی جاتی تھی اس کا ایک حصہ مستحقین کو دیا جاتا تھا ایک حصہ وہ خود اور ان کی اولاد کھاتے تھے ایک دن ایک سائل آیا وہ مومن اور روزہ دار تھا خدا کے نزدیک اس کی بڑی قدر و منزلت تھی وہ شہر (کنعان) سے گزرا شب جمعہ تھی افطار کے وقت وہ دروازہ یعقوبؑ پر آیا اور کہنے لگا بچی کچی غذا سے مدد کے طالب غریب و مسافر بھوکے مہمان کی مدد کرو، اس نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی انہوں نے سنا تو سہی لیکن اس کی بات کو باور نہ کیا جب وہ مایوس ہو گیا اور رات کی تاریکی ہر طرف چھا گئی تو وہ لوٹ گیا، جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے بارگاہ الٰہی میں بھوک کی شکایت کی رات اس نے بھوک ہی میں گزاری اور صبح اسی طرح روزہ رکھا جب کہ وہ صبر کئے ہوئے تھا اور خدا کی حمد وثنا کرتا تھا لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے گھر والے مکمل طور پر سیر تھے اور صبح کے وقت ان کا کچھ کھانا بچا بھی رہ گیا تھا۔

امام نے اس کے بعد مزید فرمایا: خدا نے اسی صبح یعقوب کی طرف وحی بھیجی: اے یعقوبؑ! تو نے میرے بندے کو خوار کیا ہے اور میرے غضب کو بھڑکایا ہے اور تو اور تیری اولاد نزول سزا کی مستحق ہو گئی ہے اے یعقوبؑ میں اپنے دوستوں کو زیادہ جلدی سر زنش کرتا اور سزا دیتا ہوں اور یہ اس لئے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس حدیث کے بعد ہے کہ ابوحمزہ ثمالی کہتے ہیں: میں نے امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا کہ یوسفؑ نے وہ خواب کس موقع پر دیکھا تھا؟

امام نے فرمایا: اسی رات۔

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیاء کے حق سے ایک چھوٹی سی لغزش یا زیادہ صریح الفاظ میں ایک ''ترک اولیٰ'' کہ جو گناہ اور معصیت بھی شمار نہیں ہوتا تھا (کیونکہ اس سائل کی حالت حضرت یعقوب علیہ السلام پر واضح نہیں تھی) بعض اوقات خدا کی طرف سے ان کی تنبیہ کا سبب بنتا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کا بلند و بالا مقام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اور عمل کی طرف متوجہ رہیں کیونکہ: ''حسنات الابرار سیئات المقربین''

وہ کام جو نیک لوگوں کے لئے نیکی شمار ہوتے ہیں مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے برائی ہیں۔

(1) حضرت یوسف علیہ السلام کی دلکش دعا

روایات اہل بیت اور طرق اہل سنت میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کنویں کی تہ میں پہنچ گئے تو ان کی امید ہر طرف سے منقطع ہوگئی اور ان کی تمام تر توجہ ذات خدا کی طرف ہوگئی انہوں نے اپنے خدا سے مناجات کی اور جبرائیل کی تعلیم سے راز و نیاز کرنے لگے کہ جو روایات میں مختلف عبارتوں میں منقول ہے۔

سرزمین مصر کی جانب

یوسف علیہ السلام نے کنویں کی وحشت ناک تاریکی اور ہولناک تنہائی میں بہت تلخ گھڑیاں گزاریں لیکن خدا پر ایمان اور ایمان کے زیر سایہ ایک اطمینان نے ان کے دل میں نور امید کی کرنیں روشن کردیں تھیں اور انہیں ایک توانائی بخشی تاکہ وہ اس ہولناک تنہائی کو برداشت کریں اور آزمائش کی اس بھٹی سے کامیابی کے ساتھ نکل آئیں، اس حالت میں وہ کتنے دن رہے، یہ خدا جانتا ہے بعض مفسرین نے تین دن لکھے ہیں اور بعض نے دو دن، بہرحال ''ایک قافلہ آپہنچا''۔[1]

اور اس قافلے نے وہیں نزدیک ہی پڑاؤ ڈالا، واضح ہے کہ قافلے کی پہلی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ وہ پانی حاصل کرے اس لئے انہوں نے پانی پر مامور شخص کو پانی کی تلاش میں بھیجا''۔[2]

اس نے اپنا ڈول کنویں کی تہ میں ڈالا جس سے جناب یوسف علیہ السلام کنویں کے اندر متوجہ ہوئے کہ کنویں کے اوپر سے کوئی آواز آرہی ہے ساتھ ہی دیکھا کہ ڈول اور رسی تیزی سے نیچے آرہی ہے انہوں نے موقع غنیمت جانا اور اس عطیۂ الٰہی سے فائدہ اٹھایا اور فوراً اس سے لپٹ گئے بہشتی نے محسوس کیا کہ اس کا ڈول اندازے سے زیادہ بھاری ہے جب اس نے زور لگا کر اسے اوپر کھینچا تو اچانک اس کی نظر ایک چاند سے بچے پر پڑی وہ چلایا: خوشخبری ہو: ''یہ تو پانی کے بجائے بچہ ہے''[3]

آہستہ آہستہ قافلے میں سے چند لوگوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن اس بناء پر کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے اور یہ خود ہی مصر میں اس خوبصورت بچے کو ایک غلام کے طور پر بیچ دیں ''اسے انہوں نے ایک اچھا سرمایہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے مخفی رکھا''۔[4]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے خدا سے یوں مناجات کی: بارالہا: اے وہ جو غریب و مسافر کا مونس ہے اور تنہائی کا ساتھی ہے اے وہ جو ہر خائف کی پناہ گاہ ہے ہر غم کو برطرف کرنے والا ہے، ہر فریاد سے آگاہ ہے، ہر شکایت کرنے والے کی آخری امید ہے اور ہر مجمع میں موجود ہے اے حی: اے قیوم: اے زندہ: اے ساری کائنات کے حافظ و نگہبان میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ اپنی امید میرے دل میں ڈال دے تاکہ تیرے علاوہ کوئی فکر نہ رکھوں اور تجھ سے چاہتا ہوں کہ میرے لئے اس عظیم مشکل سے راہ نجات پیدا کردے کہ تو ہر چیز پر قادر ہے یہ امر جاذب نظر ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں ہے کہ فرشتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی آواز سنی تو عرض کیا:

''الھنا نسمع صوتاً ودعاء، الصوت صوت صبی والدعاء دعاء النبی''

---

[1] سورہ یوسف آیت 19

[2] سورہ یوسف آیت 19

[3] سورہ یوسف آیت 19

[4] سورہ یوسف آیت 19

پروردگار: ہم آواز اور دعا سن رہے ہیں آواز تو بچے کی ہے لیکن دعا نبی کی ہے۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب جبرائیل علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ دعا تعلیم کی: پروردگارا: میں تجھ سے دعا کرتا ہوں، اے وہ کہ حمد و تعریف تیرے لئے ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو ہے جو بندوں کو نعمت بخشتا ہے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے صاحب جلال و اکرام ہے، میں درخواست کرتا ہوں کہ محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج اور جس میں میں ہوں اس سے مجھے کشائش و نجات عطا فرما لیکن کوئی مانع نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دونوں دعائیں کی ہوں۔

جناب یوسف علیہ السلام کو کم داموں میں بیچنا

''آخر کار انہوں نے یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا، اور وہ اس کے بیچنے کے سلسلے میں بے رغبت تھے (تا کہ ان کا راز فاش نہ ہو)''۔[۱]

اگر چہ یوسف علیہ السلام کو بیچنے والے کون لوگ تھے، بعض لوگوں نے ان کو برادران یوسف علیہ السلام بتایا ہے، لیکن قرآن سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے یوسفؑ کو بیچا تھا۔[۲]

عزیز مصر کے محل میں

حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان جب یہاں تک پہنچی کہ بھائی انہیں کنویں میں پھینک چکے تو بہر صورت بھائیوں کے ساتھ والا مسئلہ ختم ہو گیا اب اس ننھے بچے کی زندگی کا ایک نیا مرحلہ مصر میں شروع ہوا اس طرح سے کہ آخر کار یوسفؑ مصر لائے گئے وہاں انہیں فروخت کے لئے پیش کیا گیا چونکہ یہ ایک نفیس تحفہ تھا لہٰذا معمول کے مطابق ''عزیز مصر'' کو نصیب ہوا کہ جو در حقیقت فرعونوں کی طرف سے وزیر اعظم تھا اور ایسے ہی لوگ ''تمام پہلوؤں سے ممتاز اس غلام'' کی زیادہ قیمت دے سکتے تھے، اب دیکھتے ہیں کہ عزیز مصر کے گھر یوسفؑ پر کیا گزرتی ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''جس نے مصر میں یوسفؑ کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے اس کی سفارش کی اور کہا کہ اس غلام کی منزلت کا احترام کرنا اور اسے غلاموں والی نگاہ سے نہ دیکھنا کیونکہ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں ہم اس غلام سے بہت فائدہ اٹھائیں گے یا اسے فرزند کے طور پر اپنا لیں گے۔''[۳]

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ بیٹے کے شوق میں زندگی بسر کر رہا تھا جب اس کی آنکھ اس خوبصورت اور آبرومند بچے پر پڑی تو اس کے دل میں آیا کہ یہ اس کے بیٹے کے طور پر ہو۔

---

[۱] سورہ یوسف آیت 20

[۲] یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تھوڑی سی قیمت پر کیوں بیچ دیا، قرآن نے اسے ''ثمن بخس'' سے تعبیر کیا ہے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کم از کم ایک قیمتی غلام سمجھے جا سکتے تھے۔

لیکن یہ معمول کی بات ہے کہ ہمیشہ چور یا ایسے افراد جن کے ہاتھ کوئی اہم سرمایہ بغیر کسی زحمت کے آجائے تو وہ اس خوف سے کہ کہیں دوسروں کو معلوم نہ ہو جائے اسے فوراً بیچ دیتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ اس جلد بازی میں وہ زیادہ قیمت حاصل نہیں کر سکتے اس بارے میں کہ انہوں نے حضرت یوسف کو کتنے داموں میں بیچا اور پھر یہ رقم آپس میں کس طرح تقسیم کی، اس سلسلے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ رقم 20 درہم، بعض نے 22 درہم، بعض نے 40 درہم اور بعض نے 18 درہم لکھی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بیچنے والوں کی تعداد دس بیان کی جاتی ہے، اس ناچیز رقم میں سے ہر ایک کا حصہ واضح ہو جاتا ہے۔

[۳] سورہ یوسف آیت 21

اس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے: ''اس طرح اس سرزمین میں ہم نے یوسفؑ کو متمکن اور صاحب نعمت و اختیار کیا، ہم نے یہ کام کیا تا کہ ان کو تعبیر خواب کا علم عطا ہو۔''[1]

جناب یوسفؑ کی پاکیزگی کا انعام

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم تعبیر خواب اور عزیز مصر کے محل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی موجودگی کا کیا ربط ہے کہ اسے کس طرف ''لنعلمه'' کی ''لام'' کہ جو لام غایت ہے کہ ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن اگر ہم اس نکتے کی طرف توجہ دیں تو ہوسکتا ہے مذکورہ سوال کا جواب واضح ہو جائے کہ خداوند عالم بہت سی علمی نعمتیں اور عنایات؛ گناہ سے پرہیز اور سرکش ہوا و ہوس کے مقابلے میں استقامت کی وجہ سے بخشتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ نعمات کہ جو دل کی نورانیت کا ثمرہ ہیں، ایک انعام ہیں کہ جو خدا اس قسم کے اشخاص کو بخشتا ہے۔

''ابن سیرین'' تعبیر خواب جاننے میں بڑے مشہور ہیں انکے حالات میں لکھا ہے کہ وہ کپڑا بیچا کرتے تھے اور بہت ہی خوبصورت تھے ایک عورت انہیں اپنا دل دے بیٹھی بڑے حیلے بہانے کر کے انہیں اپنے گھر میں لے گئی اور دروازے بند کر لئے، لیکن انہوں نے عورت کی ہوس کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور مسلسل اس عظیم گناہ کے مفاسد اس کے سامنے بیان کرتے رہے لیکن اس عورت کی ہوس کی آگ اس قدر سرکش تھی کہ وعظ و نصیحت کا پانی اسے نہیں بجھا سکتا تھا۔

''ابن سیرین'' کو اس چنگل سے نجات پانے کے لئے ایک تدبیر سوجھی وہ اٹھے اور اپنے بدن کو اس گھر میں موجود گندی چیزوں سے اس طرح کثیف، آلودہ اور نفرت انگیز کر لیا کہ جب عورت نے یہ منظر دیکھا تو ان سے متنفر ہوگئی اور انہیں گھر سے باہر نکال دیا۔

کہتے ہیں اس واقعے کے بعد ابن سیرین کو تعبیر خواب کے بارے میں بہت فراست نصیب ہوئی اور ان کی تعبیر سے متعلق کتابوں میں عجیب و غریب واقعات لکھے ہوئے ہیں کہ جو اس سلسلے میں ان کی گہری معلومات کی خبر دیتے ہیں۔ اس بناء پر ممکن ہے کہ یہ خاص علم و آگاہی حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کی بیوی کی انتہائی قوت جزب کے مقابلے میں نفس پر کنٹرول رکھنے کی بناء پر حاصل ہوئی ہو۔

جی ہاں: انہوں نے بہت سی چیزیں اس شور و غل کے ماحول میں سیکھیں ان کے دل میں ہمیشہ غم و اندوہ کا ایک طوفان موجزن ہوتا تھا کیونکہ ان حالات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، اس دور میں وہ مسلسل خودسازی اور تہذیب نفس میں مشغول تھے۔

قرآن کہتا ہے: ''جب وہ بلوغ اور جسم و روح کے تکامل کے مرحلے میں پہنچا اور انوار وحی قبول کرنے کے قابل ہوگیا، تو ہم نے اسے حکم (نبوت) اور علم دیا۔''[2]

عزیز مصر کی بیوی کا عشق سوزاں

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خوبصورت، پرکشش اور ملکوتی چہرے سے نہ صرف عزیز مصر کو اپنی طرف جذب کر لیا بلکہ عزیز کی بیوی بھی بہت جلد آپ کی گرویدہ ہوگئی آپ کا عشق اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گیا جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے عشق

---

[1] سورہ یوسف آیت 21

[2] سورہ یوسف آیت 22

کی حدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن یوسفؑ کہ جو پاکیزہ اور پرہیزگار انسان تھے انہیں خدا کے علاوہ کسی کی کوئی فکر اور سوچ نہ تھی ان کے دل نے عشق سوزاں کو اور بھڑکا دیا۔

ایک تو اسے اولاد ہونے کا ارمان تھا، دوسرا اس کی رنگینیوں سے بھرپور اشراف کی زندگی تھی، تیسرا داخلی زندگی میں اسے کوئی پریشانی اور مسئلہ نہ تھا جیسا کہ اشراف اور ناز و نعمت میں پلنے والوں کی زندگی ہوتی ہے اور چوتھا دربار مصر میں کسی قسم کی کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی ان حالات میں وہ عورت کہ جو ایمان و تقویٰ سے بھی بے بہرہ تھی شیطانی وسوسوں کی موجوں میں غوطہ زن ہوگئی یہاں تک کہ اس نے ارادہ کرلیا کہ اپنے دل کا راز یوسفؑ سے بیان کرے اور اپنے دل کی تمنا ان سے پورا کرنے کا تقاضا کرے۔

اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس نے ہر ذریعہ اور ہر طور طریقہ اختیار کیا اور بڑی خواہش کے ساتھ کوشش کی کہ ان کے دل کو متاثر کرے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''جس عورت کے گھر یوسفؑ تھے اس نے اپنی آرزو پوری کرنے کے لئے پیہم ان سے تقاضا کیا۔'' [1]

آخرکار جو آخری راستہ اسے نظر آیا یہ تھا کہ ایک دن انہیں تنہا اپنی خلوت گاہ میں پھنسا لے اور ان کے جذبات ابھارنے کے لئے تمام وسائل سے کام لے جاذب ترین لباس پہنے، بہترین بناؤ سنگھار کرے بہت مہک دار عطر لگائے اور اس طرح سے آرائش و زیبائش کرے کہ یوسفؑ جیسے قوی انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے۔

قرآن کہتا ہے: ''اس نے سارے دروازوں کو اچھی طرح بند کرلیا اور کہا آؤ میں تمہارے لئے حاضر ہوں''۔ [2]

زلیخا نے ساتوں دروازے بند کردیئے

اس نے تمام دروازے مضبوطی سے بند کئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوسفؑ کو محل کی ایسی جگہ پر لے گئی کہ جہاں کمرے بنے ہوئے تھے اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے اس نے سات دروازے بند کئے تاکہ یوسفؑ کے لئے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں شاید وہ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ راز فاش ہونے سے پریشان نہ ہوں کیونکہ ان بند دروازوں کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ اندر آسکے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ تمام حالات لغزش و گناہ کی حمایت میں ہیں اور ان کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تو انہوں نے زلیخا کو بس یہ جواب دیا: ''میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں''۔ [3]

اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے زوجۂ عزیز کی خواہش کو قطعی و حتمی طور پر رد کردیا اور اسے سمجھایا کہ وہ ہرگز اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے آپ نے ضمناً اسے اور تمام افراد کو یہ حقیقت سمجھادی کہ ایسے سخت اور بحرانی حالات میں شیطانی وسوسوں اور ان سے کہ جو شیطانی اخلاق و عادات رکھتے ہیں نجات کیلئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف پناہ لی جائے، وہ خدا جس کے لئے خلوت اور بزم ایک سی ہے اور جس کے ارادے کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ اس مختصر سے جملے سے انہوں نے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے خدا کی وحدانیت کا اعتراف کیا اس کے بعد مزید کہا کہ ''تمام چیزوں سے قطع نظر میں اس خواہش کے سامنے کس طرح سے

---

[1] سورہ یوسف آیت 23

[2] سورہ یوسف آیت 23

[3] سورہ یوسف آیت 23

سر تسلیم خم کرلوں جبکہ میں عزیز مصر کے گھر میں رہتا ہوں اس کے دسترخوان پر ہوں اور اس نے مجھے بہت احترام سے رکھا ہوا ہے''۔[1]

''کیا یہ واضح ظلم اور خیانت نہ ہوگی یقیناً ستمگار فلاح نہیں پائیں گے۔''[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں ایک طوفان

یہاں یوسفؑ اور زوجہ عزیز کا معاملہ نہایت باریک مرحلے اور انتہائی حساس کیفیت تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق قرآن بہت معنی خیز انداز میں گفتگو کرتا ہے: ''عزیز مصر کی بیوی نے اس کا قصد کیا اور اگر یوسفؑ بھی برہان پروردگار نہ دیکھتا تو ایسا ارادہ کر لیتا۔''[3]

اس جگہ ایک بت تھا کہ جو زوجہ عزیز کا معبود شمار ہوتا تھا اچانک اس عورت کی نگاہ اس بت پر پڑی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے گھور رہا ہے اور اس کی خیانت آمیز حرکات کو غیض وغضب کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے وہ اٹھی اور اس بت پر کپڑا ڈال دیا یوسفؑ نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو، اور وہ لرز گئے اور کہنے لگے: تو تو ایک بے عقل، بے شعور، بے حس، و بے تشخیص عاری بت سے شرم کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے پروردگار سے شرم نہ کروں جو تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام مخفی امور اور خلوت گاہوں سے باخبر ہے۔

اس احساس نے یوسفؑ کو ایک نئی توانائی اور قوت بخشی اور شدید جنگ کہ جوان کی روح کی گہرائیوں میں جذبات اور عقل کے درمیان جاری تھی اس میں ان کی مدد کی تا کہ وہ جذبات کی سرکش موجوں کو پیچھے ڈھکیل سکیں۔[4]

قرآن مجید کہتا ہے: ہم نے یوسفؑ کو اپنی ایسی برہان پیش کی تا کہ بدی اور فحشاء کو اس سے دور کریں، کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ اور مخلص بندوں میں سے تھا۔[5]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم نے جواس کے لئے غیبی اور روحانی مدد بھیجی تا کہ وہ بدی اور گناہ سے رہائی پائے، تو یہ بے دلیل نہیں تھا وہ ایک ایسا بندہ تھا جس نے اپنے آپ کو معرفت، ایمان پرہیز گاری اور پاکیزہ عمل سے آراستہ کیا ہوا تھا اور اس کا قلب وروح شرک کی تاریکیوں سے پاک اور خالص تھا اسی لئے وہ ایسی خدائی امداد کی اہلیت ولیاقت رکھتا تھا۔

اس دلیل کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ایسی خدائی امداد جو طغیانی و بحرانی لحات میں یوسفؑ جیسے نبی کو میسر آئی تھی ان سے مخصوص

---

[1] سورہ یوسف آیت 23

[2] سورہ یوسف آیت 23

[3] سورہ یوسف آیت 24

اس جملہ کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے، اسی طرح وہ برہان پروردگار جس کے ذریعہ سے جناب یوسف بچ گئے، کے بارے میں اختلاف ہے رجوع کریں تفسیر نمونہ ج 5 ص 413

[4] وہ بے بنیاد روایات جو مفسرین نے نقل کی ہیں کہ جن کے مطابق حضرت یوسف نے گناہ کا ارادہ کر لیا تھا اچانک حالت مکاشفہ میں جبرائیل یا حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا جو اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہے تھے انہیں دیکھا تو یوسفؑ پیچھے ہٹ گئے، ایسی روایات کی کوئی معتبر سند نہیں ہے، یہ اسرائیلیات کی طرح ہیں اور کوتاہ فکر انسانوں کے دماغوں کی پیداوار ہیں جنھوں نے مقام انبیاء کو بالکل نہیں سمجھا۔

[5] سورہ یوسف آیت 24

نہ تھی بلکہ جو شخص بھی خدا کے خالص بندوں اور "عباد اللہ المخلصین" کے زمرے میں آتا ہو ایسی نعمات کے لائق ہے۔ [1]

زوجہ عزیز مصر کی رسوائی

قرآن کی بیان کردہ تمام داستانوں میں ایک حقیقی عشقیہ داستان موجود ہے اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کی داستان ہے۔

ایک خوبصورت اور ہوس آلود عورت کے ایک زیرک اور پاک دل نوجوان سے شعلہ ور عشق کی داستان ہے۔

کہنے والے اور لکھنے والے جب ایسے مناظر تک پہنچتے ہیں تو وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ یا تو ہیرو اور اس واقعے کے اصلی مناظر کی تصویر کشی کے لئے قلم کھلا چھوڑ دیں اور بزبان اصطلاح حق سخن ادا کردیں اگرچہ اس میں ہزار ہا تحریک آمیز چبھنے والے اور غیر اخلاقی لفظ آجائیں۔

یا وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ زبان وقلم کی نزاکت وعفت کی حفاظت کے لئے کچھ مناظر کو پردہ ابہام میں لپیٹ دیں اور سامعین وقارئین کو سربستہ طور پر بات بتائیں۔

کہنے والا اور لکھنے والا کتنی بھی مہارت رکھتا ہو اکثر اوقات ان میں سے کسی ایک مشکل سے دوچار ہوجاتا ہے۔

کیا یہ باور کیا سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ شخص ایسے شور انگیز عشق کے نہایت حساس لحات کی دقیق اور مکمل تصوری کشی بھی کرے لیکن بغیر اس کے کہ اس میں معمولی سی تحریک آمیز اور عفت سے عاری تعبیر استعمال ہو۔

لیکن قرآن اس داستان کے حساس ترین مناظر کی تصویر کشی شگفتہ انداز میں متانت وعفت کے ساتھ کرتا ہے، بغیر اس کے کہ اس میں کوئی واقعہ چھوٹ جائے اور اظہار عجز ہو جب کہ تمام اصول اخلاق و پاکیزگی بیان بھی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس داستان کے تمام مناظر میں سے زیادہ حساس ''خلوت گاہ عشق'' کا ماجرا ہے جسے زوجہ عزیز مصر کی بیقراری اور ہوا وہوس نے وجود بخشا۔

قرآن اس واقعے کی وضاحت میں تمام کہنے کی باتیں بھی کہہ گیا ہے لیکن پاکیزہ اور عفت کے اصول سے ہٹ کر اس نے تھوڑی سے بات بھی نہیں کی۔

یوسفؑ کی انتہائی استقامت نے زوجہٴ عزیز کو تقریباً مایوس کردیا یوسفؑ اس معرکہ میں اس ناز وادا والی اور سرکش ہوا وہوس والی عورت کے مقابلے میں کامیاب ہوگئے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ اس لغزش گاہ میں مزید ٹھہرنا خطرناک ہے انہوں نے اس محل سے نکل جانے کا ارادہ کیا لہٰذا وہ تیزی سے قصر کے دروازے کی طرف بھاگے تاکہ دروازہ کھول کر نکل جائیں زوجہٴ عزیز بھی بے اعتنا نہ رہی وہ بھی یوسفؑ کے پیچھے دروازے کی طرف بھاگی تاکہ یوسفؑ کو باہر نکلنے سے روکے اس نے اس مقصد کے لئے یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچا اس طرح سے کہ قمیص پیچھے سے لمبائی کے رخ پھٹ گئی۔ [2]

لیکن جس طرح بھی ہوا یوسفؑ دروازے تک پہنچ گئے اور دروازہ کھول لیا اچانک عزیز مصر کو دروازے کے پیچھے دیکھا جیسا

---

[1] متین و پاکیزہ کلام: قرآن کے عجیب وغریب پہلوؤں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو اعجاز کی ایک نشانی بھی ہے، یہ کہ اس میں کوئی چبھنے والی، رکیک، ناموزوں، متبذل اور عفت وپاکیزگی سے عاری تعبیر نہیں ہے اور کسی عام، ان پڑھ جہالت کے ماحول میں پرورش پانے والے کا کلام طرز کا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر شخص کی باتیں اس کے افکار اور ماحول سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

[2] سورہ یوسف آیت 25

کہ قرآن کہتا ہے: ''ان دونوں نے اس عورت کے آقا کو دروازے پر پایا۔''[1]

اب جبکہ زوجہ عزیز نے ایک طرف اپنے کو رسوائی کے آستانے پر دیکھا اور دوسری طرف انتقام کی آگ اس کی روح میں بھڑک اٹھی تو پہلی بات جو اسے سوجھی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو حق بجانب ظاہر کرتے ہوئے اپنے شوہر کی طرف رخ کیا اور یوسفؑ پر تہمت لگائی: اس نے پکار کر کہا: ''جو شخص تیری اہلیہ سے خیانت کا ارادہ کرے اس کی سزا زندان یا دردناک عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔''[2]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس خیانت کار عورت نے جب تک اپنے آپ کو رسوائی کے آستانے پر نہیں دیکھا تھا، بھول چکی تھی کہ وہ عزیز مصر کی بیوی ہے لیکن اس موقع پر اس نے ''اہلک'' (تیری گھر والی) کا لفظ استعمال کر کے عزیز کی غیرت کو ابھارا کہ میں تیرے ساتھ مخصوص ہوں لہٰذا کسی دوسرے کو میری طرف حرص کی آنکھ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یوسفؑ میرے بارے میں برا ارادہ رکھتا تھا بلکہ عزیز مصر سے اس کی سزا کے بارے میں بات کی اس طرح سے کہ اصل مسئلہ مسلم ہے اور بات صرف اس کی سزا کے بارے میں ہے ایسے لمحے میں جب وہ عورت اپنے آپ کو بھول چکی تھی اس کی یہ جچی تلی گفتگو اس کی انتہائی حیلہ گری کی نشانی ہے۔

پھر یہ کہ پہلے وہ قید خانے کے بارے میں بات کرتی ہے اور بعد میں گویا وہ قید پر بھی مطمئن نہیں ہے ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے اور ''عذاب الیم'' کا ذکر کرتی ہے کہ جو سخت جسمانی سزا اور قتل تک بھی ہو سکتی ہے۔

اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام نے خاموشی کو کسی طور پر جائز نہ سمجھا اور صراحت سے زوجہ عزیز مصر کے عشق سے پردہ اٹھایا انہوں نے کہا: ''اس نے مجھے اصرار اور التماس سے اپنی طرف دعوت دی تھی۔''[3]

واضح رہے اس قسم کے موقع پر ہر شخص ابتداء میں بڑی مشکل سے یہ باور کر سکتا ہے کہ ایک نوخیز جوان غلام کہ جو شادی شدہ نہیں، بے گناہ ہو اور ایک شوہر دار عورت کہ جو ظاہراً باوقار ہے گنہگار ہو، اس بناء پر زیادہ الزام زوجہ عزیز کی نسبت یوسفؑ کے دامن پر لگتا تھا۔

شاہد گواہی دیتا ہے

لیکن چونکہ خدا نیک اور پاک افراد کا حامی و مددگار ہے وہ اجازت نہیں دیتا کہ یہ نیک اور پارسا مجاہد نوجوان تہمت کے شعلو ں کی لپیٹ میں آئے، لہٰذا قرآن کہتا ہے: اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اصلی مجرم کی پہچان کے لئے اس واضح دلیل سے استفادہ کیا جائے کہ اگر یوسفؑ کا کرتا آگے کی طرف سے پھٹا ہے تو وہ عورت سچ کہتی ہے اور یوسفؑ جھوٹا ہے'' اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو وہ عورت جھوٹی اور یوسفؑ سچا ہے۔''[4]

اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہوگی، کیونکہ زوجہ عزیز کی طرف سے تقاضا تھا تو وہ یوسفؑ کے پیچھے دوڑی ہے اور یوسفؑ اس سے بھاگ رہے تھے کہ وہ ان کے کرتے سے لپٹی ہے، تو یقیناً وہ پیچھے سے پھٹا ہے اور اگر یوسفؑ نے عزیز کی بیوی پر حملہ کیا ہے

---

[1] سورہ یوسف آیت 25

[2] سورہ یوسف آیت 25

[3] سورہ یوسف آیت 26

[4] سورہ یوسف آیت 27

اور وہ بھا گی ہے یا سامنے سے اپنا دفاع کیا ہے تو یقیناً یوسفؑ کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے، یہ امر کس قدر جاذب نظر ہے کہ کرتہ پھٹنے کا سادہ سا مسئلہ بے گناہی کا تعین کر دیتا ہے، یہی چھوٹی سی چیز ان کی پاکیز گی کی سند اور مجرم کی رسوائی کا سبب ہوگئی۔

عزیز مصر نے یہ فیصلہ کہ جو بہت ہی جچا تلا تھا بہت پسند کیا یوسفؑ کی قمیص کو غور سے دیکھا اور جب اس نے دیکھا کہ ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے (خصوصاًاس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس دن تک اس نے کبھی یوسفؑ سے کوئی جھوٹ نہیں سنا تھا)۔

اس نے اپنی بیوی کی طرف رخ کیا اور کہا: ''یہ کام تم عورتوں کے مکر وفریب میں سے ہے، بے شک تم عورتوں کا مکر وفریب عظیم ہے۔''[۱]

اس وقت عزیز کو خوف ہوا کہ یہ رسوا کن واقعہ ظاہر نہ ہو جائے اور مصر میں اس کی آبرو نہ جاتی رہے اس نے بہتر سمجھا کہ معا ملے کو سمیٹ کر دبا دیا جائے اس نے یوسفؑ کی طرف رخ کیا اور کہا:

''اے یوسف! تم صرف نظر کرو اور اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہ کہو''۔[۲]

پھر اس نے بیوی کی جانب رخ کیا اور کہا: ''تم بھی اپنے گناہ سے استغفار کرو کہ تم خطا کاروں میں سے تھی''۔[۳]

شاہد کون تھا؟

شاہد کون تھا کہ جس نے یوسفؑ اور عزیز مصر کی فائل اتنی جلدی درست کر دی اور مہر لگا دی اور بے گناہ کو، گنہگار سے الگ کر دکھایا، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ عزیز مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا اور قاعدتاً ایک حکیم، دانش منداور سمجھدار شخص تھا، اس واقعے میں کہ جس کا کوئی عینی شاہد نہ تھا اس نے شگاف پیراہن سے حقیقت معلوم کر لی، کہتے ہیں کہ یہ شخص عزیز مصر کے مشیروں میں سے تھا اور اس وقت اس کے ساتھ تھا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا یہ بچہ عزیز مصر کی بیوی کے رشتہ داروں میں سے تھا اس وقت یہ بچہ وہیں قریب تھا یوسفؑ نے عزیز سے خواہش کی اس سے فیصلہ کروالو، عزیز کو پہلے تو بہت تعجب ہوا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے لیکن جب وہ شیر خوار حضرت عیسیٰ کی طرح گہوارے میں بول اٹھا اور اس نے گنہگار کو بے گناہ سے الگ کر کے معیار بتایا تو وہ متوجہ ہوا کہ یوسفؑ ایک غلام نہیں بلکہ نبی ہے یا نبی جیسا ہے۔[۴]

حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے: ''شہادت دینے والا گہوارہ میں ایک چھوٹا بچہ تھا'' لیکن توجہ رہے کہ اس حدیث کی کوئی محکم سند نہیں ہے۔

زوجۂ عزیز مصر کی ایک اور سازش

زوجۂ عزیز کے اظہار عشق کا معاملہ مذکورہ داستان میں اگر چہ خاص لوگوں تک تھا اور خود عزیز نے بھی اسے چھپانے کی تاکید

---

[۱] سورہ یوسف آیت 28

[۲] سورہ یوسف آیت 29

[۳] سورہ یوسف آیت 29

[۴] سورہ یوسف آیت 29

کی تھی تاہم ایسی باتیں چھپائے نہیں چھپتیں خصوصاً بادشاہوں اوراہل دولت واقتدار کے تومحلوں کی دیواریں بھی سنتی ہیں بہرحال آخرکار یہ راز قصر سے باہر نکل گیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے شہر کی کچھ عورتیں اس بارے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں اور اس بات کا چرچا کرتی تھیں ''کہ عزیز کی بیوی نے اپنے غلام سے راہ ورسم پیدا کرلی ہے اوراسے اپنی طرف دعوت دیتی ہے''۔[۱]

''اور غلام کا عشق تواس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے''۔[۲]

پھر وہ یہ کہہ کر اس پر تنقید کرتیں کہ ''ہماری نظر میں تو وہ واضح گمراہی میں ہے''۔[۳]

واضح ہے کہ ایسی باتیں کرنے والی مصر کے طبقہ امراء کی عورتیں تھیں جن کے لئے فرعونیوں اور مستکبرین کے محلات کی گھٹیا کہانیاں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ ہمیشہ ان کی ٹوہ میں لگی رہتی تھیں۔

اشراف کی یہ عورتیں کہ جوخود بھی زوجہ عزیز کی نسبت ہوس رانی میں کسی طرح کم نہ تھیں ان کی چونکہ یوسفؑ تک رسائی نہیں تھی لہٰذا بقولے ''جانماز آب می کشیدند'' مکروفریب میں لگی ہوئی تھیں اور زوجۂ عزیز کو اس کے عشق پر واضح گمراہی میں قرار دیتی تھیں، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ راز بعض زنان مصر نے ایک سازش کے تحت پھیلایا وہ چاہتی تھیں کہ زوجۂ عزیز مصر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے انہیں اپنے محل میں دعوت دے تاکہ وہ خود وہاں یوسفؑ کو دیکھ سکیں ان کا خیال تھا کہ وہ یوسفؑ کے سامنے ہوں تو ہوسکتا ہے اس کی نظر ان کی طرف مائل ہوجائے کہ جو شاید زوجہ عزیز مصر سے بھی بڑھ کر حسین تھیں اور پھر یوسفؑ کے لئے ان کا جمال بھی نیا تھا اور پھر یوسفؑ کے لئے عزیز کی بیوی ماں یا مولی یا ولی نعمت کا مقام رکھتی تھی اور ایسی کوئی صورت ان کے لئے نہ تھی لہٰذا وہ سمجھتی تھیں کہ زوجہ عزیز کی نسبت ان کے اثر کا احتمال زیادہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کس شخص نے یہ راز فاش کیا تھا، زوجۂ عزیز تو یہ رسوائی ہرگز گوارا نہ کرتی تھی اور عزیز نے تو خود اسے چھپانے کی تاکید کی تھی رہ گیا وہ حکیم ودانا کہ جس نے اس کا فیصلہ کیا تھا، اس سے تو ویسے ہی یہ کام بعید نظر آتا ہے بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا کہ خرابیوں سے پُر ان محلات میں ایسی کوئی چیز نہیں کہ جسے مخفی رکھا جاسکے اور آخرکار ہر بات نامعلوم افراد کی زبانوں سے درباریوں تک اور ان سے باہر کی طرف پہنچ جاتی ہے اور یہ فطری امر ہے کہ لوگ اسے زیب داستان کے لئے اور بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

جناب یوسف علیہ السلام کے پاس مصر کی عورتیں

''زوجہ عزیز کو مصر کی حیلہ گر عورتوں کے بارے میں پتہ چلا تو پہلے وہ پریشان ہوئی پھر اسے ایک تدبیر سوجھی اس نے انہیں ایک دعوت پر مدعو کیا فرش سجایا اور قیمتی گاؤ تکیئے لگادیئے وہ آبیٹھیں تو ہر ایک کے ہاتھ میں پھل کاٹنے کے لئے چھری تھمادی''۔[۴] (یہ چھریاں پھل کاٹنے کی ضرورت سے زیادہ تیز تھیں)۔

یہ کام خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنے شوہر کی پرواہ نہ کرتی تھی اور گزشتہ رسوائی سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔

---

[۱] سورہ یوسف آیت30

[۲] سورہ یوسف آیت30

[۳] سورہ یوسف آیت30

[۴] سورہ یوسف آیت31

اس کے بعد اس نے یوسفؑ کو حکم دیا کہ "اس مجلس میں داخل ہو"[1]

"تا کہ تنقید کرنے والی عورتیں اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر اسے اس کے عشق پر ملامت نہ کریں"۔[2]

زوجہ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کہیں باہر نہیں بٹھا رکھا تھا بلکہ اندر کے کسی کمرے میں کہ غالباً جہاں غذا اور پھل رکھا گیا تھا مشغول رکھا تھا تا کہ وہ محفل میں داخل ہونے والے دروازے سے نہ آئیں بلکہ بالکل غیر متوقع طور پر اور اچانک آئیں۔

مصر کی عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے

زنان مصر جو بعض روایات کے مطابق دس یا اس سے زیادہ تھیں جب انہوں نے زیبا قامت اور نورانی چہرہ دیکھا اور ان کی نظر یوسفؑ کے دلربا چہرے پر پڑی تو انہیں یوں لگا جیسے اس محل میں آفتاب اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہے اور آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔

وہ اس قدر حیران اور دم بخود ہوئیں کہ انہیں ہاتھ اور پاؤں میں اور ہاتھ اور ترنج بین میں فرق بھول گئیں انہوں نے یوسفؑ کو دیکھتے ہی کہا یہ تو غیر معمولی ہے، وہ خود سے قدر بے خود ہوئیں کہ (ترنج بین کی بجائے) اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی دلکش آنکھوں میں تو عفت وحیا کا نور ضوفشاں ہے اور ان کے معصوم رخسار شرم وحیا سے گلگوں ہیں تو "سب پکار اٹھیں کہ نہیں یہ جوان ہرگز گناہ سے آلودہ نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگوار آسمانی فرشتہ ہے"۔[3]

تو پھر یوسفؑ سے عشق میں مجھے کیوں ملامت کرتی ہو؟

اس وقت مصر کی عورتیں پوری بازی ہار چکی تھیں ان کے زخمی ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا پریشانی کے عالم میں وہ بے روح مجسمے کی طرح اپنی جگہ چپکی سی بیٹھی تھیں ان کی حالت کہہ رہی تھی کہ وہ بھی نے زوجہ عزیز سے کچھ کم نہیں ہیں، کیا اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کہا: "یہ ہے وہ شخص جس کے عشق پر تم مجھے طعنے دیتی تھیں"۔[4]

گویا زوجہ عزیز چاہتی تھی کہ ان سے کہے کہ تم نے تو یوسفؑ کو ایک مرتبہ دیکھا ہے اور یوں اپنے ہوش وحواس گنوا بیٹھی ہو تو پھر مجھے کیونکر ملامت کرتی ہو جبکہ میں صبح وشام اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہوں، زوجہ عزیز نے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اپنی کامیابی پر وہ بہت مغرور اور پوری صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: جی ہاں: "میں نے اسے اپنی آرزو پورا کرنے کے لئے دعوت دی تھی لیکن یہ بچا رہا"۔[5]

اس کے بعد بجائے اس کے کہ اپنے گناہ پر اظہار ندامت کرتی یا کم از کم مہمانوں کے سامنے کچھ پردہ پڑا رہنے دیتی اس نے بڑی بے اعتنائی اور سخت انداز میں کہ جس سے اس کا قطعی ارادہ ظاہر ہوتا تھا، صراحت کے ساتھ اعلان کیا: "اگر اس (یوسفؑ) نے

---

[1] سورہ یوسف آیت 31

[2] سورہ یوسف آیت 31

[3] سورہ یوسف آیت 31

اس بارے میں کہ زنان مصر نے اس وقت اپنے ہاتھوں کی کتنی مقدار کاٹی تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے یہ بات مبالغہ آمیز طور پر نقل کی ہے لیکن قرآن سے اجمالاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

[4] سورہ یوسف آیت 32

[5] سورہ یوسف آیت 32

میرا حکم نہ مانا اور میرے عشق سوز اس کے سامنے سر نہ جھکایا تو یقیناً اسے قید میں جانا پڑے گا''[1] ''نہ صرف یہ کہ میں اسے زندان میں ڈال دوں گی بلکہ قید خانے کے اندر بھی ذلیل وخوار ہوگا۔''[2] فطری امر ہے کہ جب عزیز مصر نے اس واضح خیانت پر اپنی زوجہ سے فقط یہی کہنے پر قناعت کی کہ ''اپنے گناہ پر استغفار کر'' تو اس کی بیوی رسوائی کی اس منزل تک آ پہنچی اصولی طور پر جیسا کہ ہم نے کہا ہے مصر کے فرعون اور عزیزوں کے دربار میں ایسے مسائل کوئی نئی بات نہ تھی۔

اے یوسف علیہ السلام قبول کرلو

بعض نے تو اس موقع پر ایک تعجب انگیز روایت نقل کی ہے وہ یہ کہ چند زنان مصر جو اس دعوت میں موجود تھیں وہ زوجہ عزیز کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے حق بجانب قرار دیا وہ یوسفؑ کے گرد جمع ہوگئیں اور ہر ایک نے یوسفؑ کو رغبت دلانے کے لئے مختلف بات کی۔

ایک نے کہا: اے جوان: یہ اپنے آپ کو بچانا، یہ ناز ونخرے آخر کس لئے؟ کیوں اس عاشق دلدادہ پر رحم نہیں کرتے؟ اس خیرہ کن جمال دل آرا کو نہیں دیکھتے؟ کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا تم جوان نہیں ہو؟ کیا تمہیں عشق وزیبائی سے کوئی رغبت نہیں اور کیا تم پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے ہو۔

دوسری نے کہا: میں حیران ہوں چونکہ حسن وعشق کی وجہ سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ وہ عزیز مصر اور اس ملک کے صاحب اقتدار کی بیوی ہے؟ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اس کا دل تمہارے ہاتھ میں ہو تو یہ ساری حکومت تمہارے قبضے میں ہوگی اور تم جو مقام چاہو تمہیں مل جائے گا؟

تیسری نے کہا: میں حیران ہوں کہ نہ تم اس کے جمال زیبا کی طرف مائل ہو اور نہ اس کے مقام ومال کی طرف لیکن کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ایک خطرناک انتقام جو عورت ہے اور انتقام لینے کی طاقت بھی پوری طرح اس کے ہاتھ میں ہے؟ کیا تمہیں اس کے وحشتناک اور تاریک زندان کا کوئی خوف نہیں؟ کیا تم اس قید تنہائی کے عالم غربت وبیچارگی کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتے؟

زندان کی تمنا

ایک طرف عزیز کی دھمکی اور ان آلودہ گناہ عورتوں کا وسوسہ تھا کہ جو اس وقت دلالی کا کھیل کھیل رہیں تھیں اور دوسری طرف یوسفؑ کے لئے ایک شدید بحرانی لمحہ تھا، ہر طرف سے مشکلات کے طوفان نے انہیں گھیر رکھا تھا لیکن وہ تو پہلے سے اپنے آپ کو اسلحہ سے آراستہ کئے ہوئے تھے نور ایمان پاکیزگی اور تقویٰ نے ان کی روح میں ایک خاص اطمینان پیدا کر رکھا تھا وہ بڑی شجاعت اور عزم سے اپنے موقف پر اڑے رہے بغیر اس کے کہ وہ ان ہوس باز اور ہوس ران عورتوں سے باتوں میں الجھتے، انہوں نے پرورگار کی بارگاہ کا رخ کیا اور اس طرح سے دعا کرنے لگے: بارالہا: ''جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اس کی نسبت قید خانہ اپنی تمام تر سختیوں کے باوجود مجھے زیادہ محبوب ہے''۔[3]

اس کے بعد چونکہ وہ جانتے تھے کہ تمام حالات میں خصوصاً مشکلات میں لطف الٰہی کے سوا کوئی راہ نجات نہیں کہ جس پر بھر

---

[1] سورہ یوسف آیت 32

[2] سورہ یوسف آیت 32

[3] سورہ یوسف آیت 33

وسہ کیا جائے، انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کیا اور اس سے مدد مانگی اور پکارے: پروردگارا!''اگر تو مجھے ان عورتوں کے مکر اور خطرناک منصوبوں سے نہ بچائے تو میرا دل ان کی طرف مائل ہو جائے گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''۔[1]

خداوندا: میں تیرے فرمان کا احترام کرتے ہوئے اور اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہوئے اس وحشت ناک قید خانے کا استقبال کرتا ہوں وہ قید خانہ کہ جس میں میری روح آزاد ہے اور میرا دامن پاک ہے اس کے بدلے میں اس ظاہری آزادی کو ٹھوکر مارتا ہوں کہ جس میں میری روح کو زندان ہوس نے قید کر رکھا ہو اور جو میرے دامن کو آلودہ کر سکتی ہے۔

خدایا: میری مدد فرما، مجھے قوت بخش، اور میری عقل، ایمان اور تقویٰ کی طاقت میں اضافہ فرما تا کہ میں ان شیطانی وسوسوں پر کامیابی حاصل کروں۔

اور چونکہ خداوند عالم کا ہمیشہ سے وعدہ ہے کہ وہ مخلص مجاہدین کی (چاہے وہ نفس کے خلاف برسر پیکار ہوں یا ظاہری دشمن کے خلاف) مدد کرے گا، اس نے یوسفؑ کو اس عالم میں تنہا نہ چھوڑا حق تعالیٰ کا لطف وکرم اس کی مدد کو آگے بڑھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''اس کے پروردگار نے اس کی اس مخلصانہ دعا کو قبول کیا، ان کے مکر اور سازشوں کو پلٹا دیا، کیونکہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔''[2]

وہ بندوں کی دعا بھی سنتا ہے اور ان کے اندرونی اسرار سے بھی آگاہ ہے اور انہیں مشکلات سے بچانے کی راہ سے بھی واقف ہے۔

بے گناہی کی پاداش میں قید

قصر عزیز میں یوسفؑ کی موجودگی میں زنان مصر کی حیران کن محفل اس شور وغوغا کے عالم میں تمام ہوئی، فطری بات تھی کہ یہ خبر عزیز کے کان تک پہنچ گئی ان تمام واقعات سے واضح ہو گیا کہ یوسفؑ کوئی معمولی انسان نہیں ہے اور اس قدر پاکیزہ ہے کہ کوئی طاقت اسے گناہ پر ابھار نہیں سکتی مختلف حوالوں سے اس کی پاکیزگی کی نشانیاں واضح ہو گئیں۔

یوسف علیہ السلام کی قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہونا، زنان مصر کے وسوسے کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کرنا، قید خانے میں جانے کے لئے آمادہ ہونا اور زوجہ عزیز کی طرف سے قید اور دردناک عذاب کی دھمکیوں کے سامنے سر نہ جھکانا یہ سب اس کی پاکیزگی کی دلیلیں تھیں یہ ایسے دلائل تھے کہ کوئی شخص نہ اسے چھپا سکتا تھا نہ ان کا انکار کر سکتا تھا ان کا لازمی نتیجہ زوجہ عزیز مصر کی ناپاکی اور جرم تھا یہ جرم ثابت ہونے کے بعد عوام میں خاندان عزیز کی جنسی حوالے سے رسوائی کا خوف بڑھ رہا تھا عزیز مصر اور اس کے مشیروں کو اس کے لئے صرف یہی چارہ دکھائی دیا کہ یوسفؑ کو منظر سے ہٹا دیا جائے، اس طرح سے کہ لوگ اسے اور اس کے نام کو بھول جائیں اس کے لئے ان کی نظر میں بہترین راستہ اسے تاریک قید خانے میں بھیجنا تھا کہ جسے یوسفؑ کو بھلا بھی دیا جائے گا اور وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ اصلی مجرم یوسفؑ تھا اسی لئے قرآن کہتا ہے:

''جب انہوں نے (یوسفؑ کی پاکیزگی کی) نشانیاں دیکھ لیں تو پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے ایک مدت تک قید میں ڈال دیا جائے''۔[3]

پہلے اس کے بارے میں ان کا کوئی ارادہ نہ تھا اور پہلی مرتبہ زوجہ عزیز نے یہ بات احتمال کے طور پر پیش کی تھی، بہر حال اس

---

[1] سورہ یوسف آیت 33

[2] سورہ یوسف آیت 34

[3] سورہ یوسف آیت 35

طرح یوسفؑ پاکدامنی کے گناہ میں قید خانے میں پہنچ گئے اور یہ پہلی مرتبہ نہ تھا کہ ایک قابل اور لائق انسان پاکیزگی کے جرم میں زندان میں گیا۔

زندان کے واقعات

''یوسفؑ کے ساتھ زندان میں داخل ہونے والوں میں دو جوان بھی تھے''۔[1]

جب انسان کسی معمول کے طریقے سے خبروں تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو اس کے لئے دوسرے احساسات کو استعمال کرتا ہے تا کہ حوادث کا اندازہ لگا سکے، خواب بھی اس مقصد کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر دونوں جوان کہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ کے گھر مشروبات پر مامور تھا اور دوسرا باورچی خانے کا کنٹرولر دشمنوں کی چغل خوری اور بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں قید تھا، ایک روز یوسفؑ کے پاس آئے دونوں نے اپنا گزشتہ شب کا خواب سنایا جو کہ ان کے لئے عجیب تھا ایک نے کہا:

''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں۔''[2]

''دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے کچھ روٹیاں سر پر اٹھا رکھی ہیں اور آسمان کے پرندے آتے ہیں اور ان میں سے کھاتے ہیں۔''[3]

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا:

''ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر بتاؤ، کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نیکوکاروں میں سے ہو۔''[4]

قید خانہ یا مرکز تربیت

حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں آتے ہی اپنے نیک اطوار، حسن اخلاق اور قیدیوں کی دلجوئی، خدمت اور بیماروں کی عیادت سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایک نیک اور گرہ کشا انسان ہیں اسی لئے قیدی مشکلات میں انہی کی پناہ لیتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔

بہر حال وہ یوسفؑ کہ جو قیدیوں کی ہدایت اور راہنمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے انہوں نے ان دو قیدیوں کی طرف سے تعبیر خواب کے لئے رجوع کرنے کو غنیمت جانا اور اس بہانے سے ایسے اہم حقائق بیان کئے جو ان کے تعبیر خواب سے متعلق اپنی آگاہی کے بارے میں کہ جوان دو قیدیوں کے لئے بہت اہمیت رکھتے تھے، اور تمام انسانوں کے لئے راستہ کھولنے والے تھے آپ نے پہلے تو ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ان سے کہا: ''تمہارے کھانے کا راشن آنے سے پہلے وہ ان کے خواب کی تعبیر بتا دیں گے''۔[5]

اس کے بعد باایمان اور خدا پرست یوسفؑ کہ جن کے وجود کی گہرائیوں میں توحید پوری وسعت سے جڑ پکڑ چکی تھی، نے یہ

---

[1] سورہ یوسف آیت35

[2] سورہ یوسف آیت36

[3] سورہ یوسف آیت36

[4] سورہ یوسف آیت36

[5] سورہ یوسف آیت37

واضح کرنے کے لئے کہ امر الٰہی کے بغیر کوئی چیز حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتی، اپنی بات کو اسی طرح سے جاری رکھا: ''تعبیر خواب کے متعلق میرا یہ علم و دانش ان امور میں سے ہے کہ جن کی تعلیم مجھے میرے پروردگا نے دی ہے''۔[1]

نیز اس بناء پر کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ خدا کوئی چیز بغیر کسی بنیاد کے بخش دیتا ہے، آپ نے مزید فرمایا: ''میں نے ان لوگوں کا دین و مذہب ترک کر رکھا ہے کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے منکر ہیں اور اس نور ایمان اور تقویٰ نے مجھے اس نعمت کے لائق بنایا ہے''۔[2]

اس قوم وملت سے مصر کے بت پرست لوگ یا کنعان کے بت پرست مراد ہیں مجھے ایسے عقائد سے الگ ہی ہونا چاہئے کیونکہ یہ انسان کی پاک فطرت کے خلاف ہیں، علاوہ ازیں میں نے ایسے خاندان میں پرورش پائی ہے کہ جو وحی و نبوت کا خاندان ہے۔''میں نے اپنے آباءواجداد اور بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے۔''[3]

شاید یہ پہلا موقعہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدیوں سے اپنا تعارف کروایا تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ وحی و نبوت کے گھرانے سے ہیں اور دیگر بہت سے قیدیوں کی طرح کہ جو طاغوتی نظاموں میں قید ہوتے ہیں، بے گناہ زندان میں ڈالے گئے ہیں۔

قیدیوں کی تعبیر خواب

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے گذشتہ گفتگو کے بعد ان قیدیوں کے دلوں کو حقیقت توحید قبول کرنے کے لئے آمادہ کرلیا تو ان کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا: ''اے میرے قیدی ساتھیو: کیا منتشر خدا اور متفرق معبود بہتر ہیں یا یگانہ و یکتا اور قہار اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا''۔[4]

گو یا یوسفؑ انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ کیوں تم فقط عالم خواب میں آزادی کو دیکھتے ہو بیداری میں کیوں نہیں دیکھتے، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کا سبب تمہارا انتشار، تفرقہ بازی اور نفاق نہیں کہ جس کا سرچشمہ شرک، بت پرستی اور ارباب متفرق ہیں جن کی وجہ سے ظالم طاغوت تم پر غالب آ گئے ہیں تم لوگ پرچم توحید کے تلے کیوں جمع نہیں ہوتے اور ''اللہ واحد قھار،، کا دامن پرستش کیوں نہیں تھامتے تا کہ ان خودغرض ستمگروں کو اپنے معاشرے سے نکال باہر کرو کہ جو تمہیں بے گناہ اور صرف الزام کی بنیاد پر قید میں ڈال دیتے ہیں۔

اپنے دو قیدی ساتھیوں کو رہبری و ارشاد اور انہیں حقیقت توحید کی طرف مختلف پہلوؤں کے حوالے سے دعوت دینے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خواب کی تعبیر بیان کی کیونکہ وہ دونوں اسی مقصد کے لئے آپ کے پاس آئے تھے اور آپ نے بھی انہیں وعدہ دیا تھا کہ انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر بتائیں گے لیکن آپ نے موقع غنیمت جانا اور توحید کے بارے میں اور شرک کے خلاف واضح اور زندہ دلائل کے ساتھ گفتگو کی۔

اس کے بعد آپ نے ان دو قیدی ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہا: ''اے میرے قیدی ساتھیوں: تم میں سے ایک آزاد

---

[1] سورہ یوسف آیت 37

[2] سورہ یوسف آیت 37

[3] سورہ یوسف آیت 38

[4] سورہ یوسف آیت 39

ہو جائے گا اور اپنے ''ارباب'' کو شراب پلانے پر مامور ہو گا۔''[1]

''لیکن دوسرا سولی پر لٹکا یا جائے گا اور اتنی دیر تک اس کی لاش لٹکائی جائے گی کہ آسمانی پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھا ئیں گے۔''[2]

ان دونوں میں سے ایک لٹکا یا جائے گا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ چاہا کہ یہ نا گوار خبر اس سے زیادہ صراحت سے بیان کریں لہٰذا آپ نے تم میں سے ایک'' کہہ کر گفتگو کی اس کے بعد اپنی بات کی تائید کے لئے مزید کہا: یہ معاملہ جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے اور مسئلہ پوچھا ہے حتمی اور قطعی ہے۔''[3]

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ یہ خواب کی کوئی معمولی سی تعبیر نہیں ہے بلکہ ایک غیبی خبر ہے جسے میں نے الٰہی تعلیم سے حاصل کیا ہے لہٰذا اس مقام پر تردد وشک اور چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

جب دوسرے شخص نے یہ نا گوار خبر سنی تو وہ اپنی بات کی تکذیب کرنے لگا اور کہنے لگا: میں نے جھوٹ بولا تھا میں نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا میں نے مذاق کیا تھا اس کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے خواب کی تردید کر دے گا تو اس کی سرنوشت تبدیل ہو جائے گی لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے ساتھ ہی یہ بات کہہ دی کہ جس چیز کے بارے میں تم نے دریافت کیا وہ نا قابل تغیر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تعبیر خواب پر اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے یہ جملہ تاکید کے طور پر کہا۔

بادشاہ کے سامنے مجھے یاد کرنا

لیکن جس وقت آپ نے محسوس کیا کہ یہ دونوں عنقریب ان سے جدا ہو جائیں گے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعے آزادی کا کوئی دریچہ کھل جائے اور روشنی کی کوئی کرن پھوٹے اور جس گناہ کی آپ کی طرف نسبت دی گئی تھی اس سے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کریں'' آپ نے ان دو قیدی ساتھیوں میں سے جس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ آزاد ہوں گے، اس سے فرمائش کی کہ اپنے مالک وصاحب اختیار (بادشاہ) کے پاس میرے متعلق بات کرنا۔[4] تا کہ وہ تحقیق کرے اور میری بے گناہی ثابت ہو جائے''۔

لیکن اس فراموش کار غلام نے یوسفؑ کا مسئلہ بالکل بھلا دیا جیسا کہ کم ظرف لوگوں کا طریقہ ہے کہ جب نعمت حاصل کر لیتے ہیں تو صاحب نعمت کو فراموش کر دیتے ہیں البتہ قرآن نے بات یوں بیان کی ہے:''جب وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا تو شیطان نے اس کے دل سے یوسفؑ کی یاد بھلا دی۔''[5]

اور اس طرح یوسفؑ فراموش کر دیئے گئے''اور چند سال مزید قید خانے میں رہے۔''[6]

---

[1] سورہ یوسف آیت 40

[2] سورہ یوسف آیت 41

[3] سورہ یوسف آیت 41

[4] سورہ یوسف آیت 42

[5] سورہ یوسف آیت 42

[6] سورہ یوسف آیت 42

البتہ زندان یا دیگر مشکلات سے نجات کے لئے ایسی کوشش عام افراد کے لئے کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے اور طبیعی اسباب سے کام لینے کے ضمن میں ہے لیکن ایسے افراد کے لئے جو نمونہ ہوں اور ایمان و توحید کی بلند سطح پر فائز ہوں ان کے لئے اشکال سے خالی نہیں ہو سکتی، شاید اسی بناء پر خدا نے یوسف کے اس ''ترک اولیٰ'' کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ان کی قید چند سال مزید جاری رہی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے اپنے بھائی یوسفؑ پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے کیونکر خالق کے بجائے مخلوق کی پناہ لی اور اس سے مدد طلب کی۔

ایک اور روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اس واقعہ کے بعد جبرائیلؑ یوسفؑ کے پاس آئے اور کہا: کس نے تمہیں سب لوگوں سے زیادہ حسین بنایا؟ کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔ کہا: کس نے قافلے کو تمہاری طرف بھیجا تاکہ وہ تمہیں کنویں سے نجات دے؟

بولے: میرے پروردگار نے۔

کہا: کس نے مصر کی عورتوں کے مکر وفریب سے تمہیں دور رکھا؟

کہنے لگے: میرے پروردگار نے۔

اس پر جبرائیل نے کہا: تمہارا پروردگار کہہ رہا ہے کس چیز کے سبب تم اپنی حاجت مخلوق کے پاس لے گئے ہو اور میرے پاس نہیں لائے ہو لہٰذا تمہیں چند سال اور زندان میں رہنا چاہئے۔

بادشاہ مصر کا خواب

حضرت یوسف علیہ السلام سات برس تک قید خانے میں تنگی و سختی میں ایک فراموش شدہ انسان کی طرح رہے وہ خود سازی قیدیوں کو ارشاد و ہدایت بیماروں کی عیادت اور دردمندوں کی دلجوئی میں مصروف رہے یہاں تک کہ ایک ظاہراً چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا جس نے نہ صرف ان کی بلکہ مصر اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کی سرنوشت کو بدل کے رکھ دیا۔

بادشاہ مصر کہ جس کا نام کہا جاتا ہے کہ ولید بن ریان تھا (اور عزیز مصر اس کا وزیر تھا) اس نے ایک خواب دیکھا یہ ظاہراً ایک پریشان کن خواب تھا، دن چڑھا تو اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں اور اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہنے لگا میں نے خوب میں دیکھا ہے کہ ''سات کمزور سی اور سات موٹی تازی گائیں ہیں اور دبلی پتلی گائیں ان پر حملہ آور ہوئی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں نیز سات ہرے بھرے اور سات خشک شدہ خوشے ہیں اور خشک شدہ خوشے سبز خوشوں پر لپٹ گئے ہیں اور انہیں ختم کر دیا ہے''۔[۱]

اس کے بعد اس نے ان کی طرف روئے سخن کیا اور کہنے لگا: ''اے قوم کے سردارو: میرے خواب کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرو اگر تم خواب کی تعبیر بتا سکتے ہو''۔[۲] لیکن سلطان کے حواریوں نے فوراً کہا کہ: ''یہ خواب پریشان ہیں اور ہم لوگ ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے''۔[۳]

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح جرأت کی شاہ مصر کے سامنے اس رائے کا اظہار کریں کہ وہ اسے پریشان خواب دیکھنے کا الزام دیں، جبکہ ان حاشیہ نشینوں کا معمول یہ ہے کہ وہ ان کی ہر چھوٹی بڑی اور بے معنی حرکت کے لئے کوئی فلسفہ گھڑتے ہیں اور بڑی معنی خیز تفسیریں کرتے ہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس لئے ہو کہ انہوں نے دیکھا تھا کہ بادشاہ یہ خواب دیکھ کر پریشان و مضطرب ہے اور وہ پریشانی میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ کمزور اور لاغر گائیں توانا اور موٹی تازی گاؤں پر حملہ آور ہوتی ہیں اور انہیں کھا رہی ہیں اور یہی صورت خشک خوشوں کی تھی، کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور لوگ اچانک اس کے

---

[۱] سورہ یوسف آیت 43

[۲] سورہ یوسف آیت 44

[۳] سورہ یوسف آیت 44

ہاتھ سے حکومت چھین لیں گے لہٰذا انہوں نے بادشاہ کے دل کا اضطراب دور کرنے کے لئے اس سے کہا کہ خواب کسی چیز کی دلیل نہیں ہوتے۔

بادشاہ کے ساقی نے جناب یوسفؑ کو یاد کیا

اس موقع پر بادشاہ کا ساقی کہ جو چند سال قبل قید خانے سے آزاد ہوا تھا اسے قید خانے کا خیال آیا اسے یاد آیا کہ یوسفؑ اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہیں اس نے بادشاہ کے حاشیہ نشینوں کی طرف رخ کر کے کہا: ''میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں مجھے اس کام کے ماہر استاد کے پاس بھیجو کہ جو زندان میں پڑا ہے تا کہ تمہیں بالکل سچ خبر لا کر دوں''۔[۱]

جی ہاں اس گوشۂ زنداں میں ایک روشن ضمیر صاحب ایمان اور پاک دل انسان زندگی کے دن گزار رہا ہے کہ جس کا دل، حوادث آئندہ کا آئینہ ہے، وہ ہے کہ جو اس راز سے پردہ اٹھا سکتا ہے اور اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتا ہے۔

اس کی اس بات نے محفل کی کیفیت ہی بدل دی، سب کی آنکھیں ساقی پر لگ گئیں آخر کار اسے اجازت ملی اور حکم ملا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کام کے لئے نکل کھڑا ہو اور جلد نتیجہ پیش کرے ساقی زندان میں آیا اور اپنے پرانے دوست یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا، وہی دوست جس سے بڑی بے وفائی کی تھی لیکن اس کی عظمت سے توقع نہیں کہ وہ دفتر شکایت کھول بیٹھے۔اس نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''یوسفؑ اے سراپا صداقت اس خواب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو کہ کسی نے دیکھا ہے کہ سات لاغر گائیں موٹی تازی گایوں کو کھا رہی ہیں نیز سات ہرے گچھے ہیں اور سات خشک شدہ ہیں (کہ جن میں سے دوسرا پہلے سے لپٹ گیا ہے اور اسے نابود کر دیا ہے)'' ''شاید میں اس طرح ان لوگوں کے پاس لوٹ کے جاؤں تو وہ اس خواب کے اسرار سے آگاہ ہو سکیں''۔[۲]

بہرحال حضرت یوسف علیہ السلام نے بغیر کسی شرط کے اور بغیر کسی صلہ کے تقاضے کے فوراً خواب کی واضح اور نہایت اعلیٰ تعبیر بیان کی اس میں آپ نے کچھ چھپائے بغیر درپیش تاریک مستقبل کے بارے میں بتایا ساتھ ہی اس کے لئے راہنمائی کر دی اور ایک مرتب پروگرام بتا دیا آپ نے کہا: ''سات سال پیہم محنت سے کاشت کاری کرو کیونکہ ان سات برسوں میں بارش خوب ہوگی لیکن جو فصل کاٹو اسے خوشوں سمیت انباروں کی صورت میں جمع کر لو سوائے کھانے کے لئے جو تھوڑی سی مقدار ضروری ہو''۔[۳]

لیکن جان لو کہ ان سات برسوں کے بعد سات برس خشک سالی، بارش کی کمی اور سختی کے آئیں گے کہ جن میں صرف اس ذخیرے سے استفادہ کرنا ہوگا جو گزشتہ سالوں میں تمام ذخیرہ کیا ہوگا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے البتہ خیال رہے کہ خشکی اور قحط کے ان سات سالوں میں تمام ذخیرہ شدہ گندم نہ کھا جانا'' بلکہ کچھ مقدار بیج کے طور پر آئندہ کاشت کیلئے رکھ چھوڑنا کیونکہ بعد کا سال اچھا ہوگا''۔[۴]

اگر خشک سالی اور سختی کے یہ سال تم سوچے سمجھے پرگرام اور پلان کے تحت ایک ایک کر کے گزار لو تو پھر تمہیں کوئی خطرہ نہیں ''اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ خوب باران رحمت ہوگی اور لوگ اس آسمانی نعمت سے خوب بہرہ مند ہوں گے''[۵]

---

[۱] سورہ یوسف آیت 45

[۲] سورہ یوسف آیت 46

[۳] سورہ یوسف آیت 47

[۴] سورہ یوسف آیت 48

[۵] سورہ یوسف آیت 48

اس سے نہ صرف زراعت اور اناج کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ رس دار پھل اور روغن دار دانے بھی فراواں ہوں گے'' کہ لوگ جن سے رس اور روغن حاصل کریں گے''[1]

مصر کا قیدی یا بہترین رہبر

حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہ کس قدر جچی تلی تھی قدیمی کہانیوں میں گائے سال کا سنبل سمجھی جاتی تھی اور اس کا توانا ہونا فراواں نعمت کی دلیل ہے جبکہ لاغر ہونا مشکلات اور سختی کی دلیل ہے سات لاغر گائیں سات توانا گاؤں پر حملہ آور ہوئیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سختی کے سات سالوں میں قبل کے سالوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور سات خشک شدہ خوشہ یا گچھے جو سات سبز خوشوں سے لپٹ گئے تو یہ فراوانی نعمت اور خشک سالی کے دو مختلف ادوار کے لئے ایک اور دلیل تھی اس میں اس نکتہ کا اضافہ تھا کہ اناج کو خوشوں کی شکل میں ذخیرہ کیا جانا چاہئے تاکہ جلد خراب نہ ہو اور سات برس تک چل سکے۔ نیز یہ کہ لاغر گائیں اور خشک شدہ خوشوں کے سات سے زیادہ نہ تھے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان سخت سات سالوں کے بعد یہ کیفیت ختم ہو جائے گی اور فطری طور پر بیج کی فکر بھی کرنا چاہئے اور ذخیرے کا کچھ حصہ اس کے لئے محفوظ رکھنا چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام درحقیقت کہ عام تعبیر خواب بیان کرنے والے شخص نہ تھے بلکہ ایک رہبر تھے کہ جو گوشۂ زندان میں بیٹھے ایک ملک کے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کر رہے تھے اور انہیں کم از کم پندرہ برس کے لئے مختلف مراحل پر مشتمل ایک پلان دے رہے تھے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ یہ تعبیر جو آئندہ کے لئے منصوبہ بندی اور راہنمائی پر مشتمل تھی؛ نے جابر بادشاہ اور اس کے حواریوں کو ہلا کے رکھ دیا اور اہل مصر کے ہلاکت خیز قحط سے نجات کا سبب بنی اور اسی کے سبب حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان سے اور حکومت کو بھی خودغرض اور خودسر لوگوں سے نجات مل گئی۔

یوسفؑ ہر الزام سے بری ہو گئے

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر کے خواب کی جو تعبیر بیان کی وہ اس قدر جچی تلی اور منطقی تھی کہ اس نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو جذب کر لیا بادشاہ نے دیکھا کہ ایک غیر معروف سے قیدی نے کسی مفاد کی توقع کے بغیر اس خواب کی مشکل تعبیر کس بہترین طریقہ سے بیان کر دی ہے اور ساتھ ہی آئندہ کے لئے نہایت جچا تلا پروگرام بھی پیش کر دیا ہے۔ اجمالاً اس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام قیدی نہیں ہے بلکہ غیر معمولی شخصیت ہے کہ جو کسی پراسرار ماجرے کے باعث قید میں ڈالا گیا ہے لہٰذا اسے اس کے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا لیکن ایسا نہیں کہ سلطنت کا غرور ایک طرف رکھ کر وہ دیدار یوسفؑ کے لئے چل پڑے بلکہ ''اس نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ''۔[2]

لیکن جب اس کا فرستادہ یوسفؑ کے پاس آیا تو بجائے اس کے کہ یوسفؑ اس خوشی میں پھولے نہ سماتے کہ سالہا سال قید خانے کے گڑھے میں رہنے کے بعد اب نسیم آزادی چل رہی ہے آپ نے بادشاہ کے نمائندہ کو منفی جواب دیا اور کہا کہ میں اس وقت تک زندان سے باہر نہیں آؤں گا ''جب تک کہ تو اپنے مالک کے پاس جا کر اس سے یہ نہ پوچھے کہ وہ عورتیں جنھوں نے تیرے وزیر (

---

[1] سورہ یوسف آیت 49

[2] سورہ یوسف آیت 50

عزیزمصر کے محل میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا ماجرا کیا تھا''۔[1]

وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے ہی جیل سے رہا ہو جائیں اور شاہ کی طرف سے معین کئے گئے ایک مجرم یا کم از کم ایک ملزم کی صورت میں زندگی بسر کریں وہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ان کی قید کے سبب کے بارے میں تحقیق ہو اور ان کی بے گناہی اور پاکدامنی پوری طرح درجہء ثبوت کو پہنچ جائے اور برائت کے بعد وہ سربلندی سے آزاد ہوں اور ضمناً حکومت مصر کی مشینری کی آلودگی بھی ثابت ہو جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کے وزیر کے دربار میں کیا گزرتی ہے۔

جی ہاں: وہ اپنے عزوشرف کو آزادی سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور یہی حریت پسندوں کا راستہ ہے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں اس قدر عظمت کا مظاہرہ کیا کہ یہاں تک تیار نہ ہوئے کہ عزیزمصر کی بیوی کا نام لیں کہ جو ان پر الزام لگانے اور جیل بھجنے کا اصلی عامل تھی بلکہ مجموعی طور پر زنان مصر کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا کہ جو اس ماجرا میں دخیل تھیں۔

اس کے بعد آپ نے مزید کہا: اگر چہ اہل مصر نہ جانیں اور یہاں تک دربار سلطنت بھی بے خبر ہو کہ مجھے قید کئے جانے کا منصوبہ کیا تھا اور کن افراد کی وجہ سے پیش آیا لیکن ''میرا پروردگار ان کے مکروفریب اور منصوبہ سے آگاہ ہے''۔[2]

شاہ کا خاص نمائندہ اس کے پاس لوٹ آیا اور یوسفؑ کی تجویز کہ جس سے اعلیٰ ظرفی اور بلند نظری جھلکتی تھی، بادشاہ نے سنی تو وہ یوسفؑ کی بزرگواری سے بہت زیادہ متاثر ہوا لہٰذا اس نے فوراً اس ماجرے میں شریک عورتوں کو بلا بھیجا وہ حاضر ہوئیں تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''بتاؤ میں دیکھوں کہ جب تم نے یوسفؑ سے اپنی خواہش پورا کرنے کا تقاضا کیا تو اصل معاملہ کیا تھا''[3]

سچ کہنا، حقیقت بیان کرنا کہ کیا تم نے اس میں کوئی عیب تقصیر اور گناہ دیکھا ہے؟

ان کے خوابیدہ ضمیر اس سوال پر اچانک بیدار ہو گئے'' اور سب نے متفقہ طور پر یوسفؑ کی پاکدامنی کی گواہی دی اور کہا: منزہ ہے خدا ہم نے یوسفؑ میں کوئی گناہ نہیں دیکھا''۔[4]

زلیخا کا اعتراف

عزیزمصر کی بیوی وہاں موجود تھی بادشاہ اور زنان مصر کی باتیں سن رہی تھی بغیر اس کے کہ کوئی اس سے سوال کرے، ضبط نہ کر سکی اس نے محسوس کیا کہ اب وہ موقعہ آ گیا ہے کہ ضمیر کی سالہا سال کی شرمندگی یوسفؑ کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے ذریعہ تلافی کرے، خصوصاً جب کہ اس نے یوسف علیہ السلام کی بے نظیر عظمت کو اس پیغام میں دیکھ لیا تھا جو انہوں نے بادشاہ کو بھیجا تھا دیکھ لیا کہ اپنے پیغام میں انہوں نے اس کے بارے میں تھوڑی سی بات بھی نہیں کی اور اشارتاً صرف زنان مصر کے بارے میں بات کی ہے اس کے اندار گویا ایک ہلچل مچ گئی'' وہ چیخ اٹھی: اب حق آشکار ہو گیا ہے میں نے اس سے خواہش پوری کرنے کا تقاضا کیا تھا وہ سچا ہے۔[5] اور

---

[1] سورہ یوسف آیت 50

[2] سورہ یوسف آیت 50

[3] سورہ یوسف آیت 51

[4] سورہ یوسف آیت 51

[5] سورہ یوسف آیت 51

میں نے اس کے بارے میں اگر کوئی بات کی ہے تو وہ جھوٹ تھی، بالکل جھوٹ تھی''۔ [1]

زوجہ عزیز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: میں نے یہ صریح اعتراف اس بناء پر کیا ہے'' تا کہ یوسفؑ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی غیبت میں اس کے بارے میں خیانت نہیں کی''۔ [2]

کیونکہ اتنی مدت میں اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات کے بعد میں نے سمجھ لیا ہے'' کہ خدا خیانت کرنے والوں کے مکر وفریب کو چلنے نہیں دیتا''۔ [3]

درحقیقت [4] اس نے یوسفؑ کی پاکیزگی اور اپنی گنہگاری کے صریح اعتراف کے لئے دو دلیلیں قائم کیں: پہلی یہ کہ اس کا ضمیر اور احتمالاً یوسفؑ سے اس باقی ماندہ لگاؤ اسے اجازت نہیں دیتا اور اسی لئے محلوں کی پرخواب زندگی کے پردے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے اور وہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے لگی کے خصوصاً عشق میں شکست نے اس کے افسانوی غرور پر جو ضرب لگائی اس سے اس کی نگاہ حقیقت اور کھل گئی۔

اس حالت میں تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس طرح کا صریح اعتراف کرے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: ''میں ہرگز اپنے نفس کی برائت کا اعلان نہیں کرتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ نفس امارہ مجھے برائیوں کا حکم دیتا ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے''۔ [5]

اور اس کی حفاظت اور نصرت ومدد کے باعث بچ جاؤں [6] بہرحال اس گناہ پر میں اس سے عفو وبخشش کی امید رکھتی ہوں ''کیونکہ میرا پروردگار غفور ورحیم ہے''[7]

یوسفؑ، مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

''بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تا کہ میں اسے اپنا مشیر اور نمائندہ خاص بناؤں''۔ [8] اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے اس کے علم ودانش اور انتظامی صلاحیت سے مدد لوں۔

بادشاہ کا پرجوش پیام لے کر اس کا خاص نمائندہ قید خانے میں یوسفؑ کے پاس پہنچا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سے سلام ودعا پہنچایا اور بتایا کہ اسے آپ سے شدید لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس نے مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق سے متعلق آپ کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا ہے اور سب نے کھل کر آپ کی پاکدامنی اور بے گناہی کی گواہی دی ہے لہٰذا اب تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں رہی اٹھئے تا کہ ہم اس کے پاس چلیں حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پاس تشریف لائے'' ان کی آپس میں بات چیت ہوئی بادشاہ نے ان کی گفتگو سنی اور آپ کی پرمغز اور نہایت اعلیٰ باتیں سنیں اس نے دیکھا کہ آپ کی باتیں انتہائی علم ودانش اور دانائی سے معمور ہیں اور ہمارے

---

[1] سورہ یوسف آیت 51

[2] سورہ یوسف آیت 52

[3] سورہ یوسف آیت 52

[4] اگرچہ یہ جملہ عزیز مصر کی بیوی کا ہے جیسا کہ ظاہر عبارت کا تقاضا ہے

[5] سورہ یوسف آیت 35

[6] سورہ یوسف آیت 53

[7] سورہ یوسف آیت 53

[8] سورہ یوسف آیت 53

نزدیک قابل اعتماد رہیں گی''۔ [1]

آج سے اس ملک کے اہم کام آپ کے سپرد ہیں اور آپ کو امور کی اصلاح کے لئے کمر ہمت باندھ لینا چاہئے کیونکہ میرے خواب کی جو تعبیر آپ نے بیان کی ہے اس کے مطابق اس ملک کو شدید اقتصادی بحران درپیش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران پر صرف آپ ہی قابو پا سکتے ہیں۔

''حضرت یوسف علیہ السلام نے تجویز پیش کی مجھے اس علاقے کے خزانوں کی ذمہ داری سونپ دی جائے کیونکہ میں خواب کے اسرار سے بھی واقف ہوں۔'' [2]

حضرت یوسف علیہ السلام اچھی طرح جانتے تھے کہ ظلم سے بھرے اس معاشرے کی پریشانیوں کی ایک اہم بنیاد اس کے اقتصادی مسائل ہیں لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب جب کہ انہیں مجبوراً آپ کی طرف آنا پڑا ہے تو کیا ہی اچھا ہے کہ مصر کی اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محروم و مستضعف عوام کی مدد کے لئے آگے بڑھیں اور جتنا ہو سکے طبقاتی تفاوت اور اونچ نیچ کو کم کریں مظلوموں کا حق ظالموں سے لیں اور اس وسیع ملک کی بدحالی کو دور کریں۔

آپ کی نظر میں تھا کہ خاص طور پر زرعی مسائل اس ملک میں زیادہ اہم ہیں اس بات پر بھی توجہ رکھنا ہوگی کہ چند سال فراوانی کے ہوں گے اور پھر خشکی کے سال درپیش ہوں گے لہٰذا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کرنے اور پھر انہیں احتیاط سے محفوظ رکھنے اور نہایت کم خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا تاکہ قحط سالی کے لئے غلہ ذخیرہ کیا جاسکے، لہٰذا اس مقصد کے لئے آپ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ آپ مصر کے خزانوں کو اپنی سرپرستی میں لینے کی تجویز پیش کریں۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور کسی طرح ان سے نجات چاہتا تھا لہٰذا اس نے تمام امور کی باگ ڈور حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دی اور خود کنارہ کشی اختیار کر لی۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ اس نے عزیز مصر کی جگہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنا وزیر اعظم بنالیا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ [3] وہ صرف مصر کے خزانہ دار بنے ہوں۔ [4] بہرحال اس مقام پر خدا کہتا ہے: ''اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو سرزمین مصر پر قدرت عطا کی کہ وہ جیسے چاہتا تھا اس میں تصرف کرتا تھا''۔ [5]

جی ہاں: ''ہم اپنی رحمت اور مادی و روحانی نعمتیں جسے چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں عطا کرتے ہیں'' [6] اور ہم نیکوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کریں گے''۔ اگرچہ اس میں تاخیر ہو جائے تاہم آخرکار جو کچھ ان کے لائق ہوا نھیں دیں گے۔'' کیونکہ ہم کسی نیک

---

[1] سورہ یوسف آیت 54

[2] سورہ یوسف آیت 54

[3] سورہ یوسف آیت 55

[4] سورہ یوسف آیت 55 کے ظاہری مفہوم کے مطابق

[5] لیکن سورہ یوسف آیت 100، اور 101، اس امر کی دلیل ہیں کہ آخرکار آپ بادشاہ ہوگے اور تمام امور مملکت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ آگئی اگرچہ آیت 88، میں ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے ان سے کہا: (یا ایھا العزیز)۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نے عزیز مصر کا منصب سنبھالا مگر اس میں کوئی مانع نہیں کہ آپ نے یہ منصب تدریجاً حاصل کئے ہوں پہلے وزیر خزانہ ہوئے ہوں، پھر وزیر اعظم اور پھر بادشاہ۔

[6] سورہ یوسف آیت 56

کام کو فراموش نہیں کرتے''۔[1]

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم صرف دنیادی اجر ہی نہیں دیں گے بلکہ ''جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ اہل ایمان اور صاحبان تقویٰ کے لئے زیادہ اچھا ہے''۔[2]

سات سال پُر برکت اور سات سال قحط

آخر کار جیسا کہ پیشین گوئی ہوئی تھی سات سال پے در پے بارش ہونے کے سبب اور دریائے نیل کے پانی میں اضافہ کے باعث مصر کی زرعی پیداوار خوب تسلی بخش ہوگئی مصر کا خزانہ اور اقتصادی امور حضرت یوسف علیہ السلام کے زیر نظر تھے آپ نے حکم دیا کہ غذائی اجناس کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے چھوٹے بڑے گودام بنائے جائیں آپ نے عوام کو حکم دیا کہ پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لیں اور باقی حکومت کو بیچ دیں اس طرح گودام غلے سے بھر گئے۔

نعمت و برکت کی فراوانی کے یہ سات سال گزر گئے اور خشک سالی کا منحوس دور شروع ہوا یوں لگتا تھا جیسے آسمان زمین کے لئے بخیل ہو گیا ہے کھیتیاں اور نخلستان خشک ہو گئے عوام کو غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتے تھے کہ حکومت نے غلے کے ذخائر جمع کر رکھے ہیں لہٰذا وہ اپنی مشکلات حکومت ہی کے ذریعے دور کرتے تھے حضرت یوسفؑ بھی پوری منصوبہ بندی اور پروگرام کے تحت غلہ فروخت کرتے تھے اور عادلانہ طور پر ان کی ضرورت پوری کرتے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے لوگوں میں طبقاتی تفاوت اور لوٹ گھسوٹ کو ختم کرنے کے لئے قحط کے سالوں سے استفادہ کیا، آپ نے زیادہ پیداوار کے عرصے میں لوگوں سے غذائی مواد خرید لیا اور اس کے لئے تیار کئے گئے بڑے بڑے گوداموں میں اسے ذخیرہ کرلیا، جب یہ سال گزر گئے اور قحط کے سال شروع ہوئے تو پہلے سال اجناس کو درہم و دینار کے بدلے بیچا، اس طرح کرنسی کا ایک بڑا حصہ جمع کرلیا، دوسرے سال اسباب زینت اور جواہرات کے بدلے اجناس کو بیچا، البتہ جن کے پاس یہ چیزیں نہ تھیں انہیں مستثنیٰ رکھا تیسرے برس چوپایوں کے بدلے، چوتھے برس غلاموں اور کنیزوں کے عوض، پانچویں برس عمارت کے بدلے، چھٹے برس زرعی زمینوں اور پانی کے عوض اور ساتویں سال خود مصر کے لوگوں کے بدلے اجناس دیں، پھر یہ سب چیزیں انہیں (عادلانہ طور پر) واپس کر دیں اور کہا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بلا و مصیبت اور بے سروسامانی سے نجات دلاؤں۔

برادران یوسفؑ مصر پہونچے

یہ خشک سالی صرف مصر ہی میں نہ تھی، بلکہ اطراف کے ملکوں کا بھی یہی حال تھا فلسطین اور کنعان مصر کے شمال مشرق میں تھے وہاں کے لوگ بھی انہی مشکلات سے دو چار تھے حضرت یعقوب علیہ السلام کا خاندان بھی اسی علاقے میں سکونت پذیر تھا وہ بھی غلہ کی کمی سے دو چار ہو گیا حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان حالات میں مصمم ارادہ کیا کہ بنیامین کے علاوہ باقی بیٹوں کو مصر کی طرف بھیجیں یوسفؑ کی جگہ اب بنیامین ہی ان کے پاس تھا بہر حال وہ لوگ مصر کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ ہو لئے اور بعض مفسرین کے بقول اٹھارہ دن کی مسافت کے بعد مصر پہنچے۔

جیسا کہ تواریخ میں ہے، ضروری تھا کہ ملک کے باہر سے آنے والے افراد مصر میں داخل ہوتے وقت اپنی شناخت کروائیں

---

[1] سورہ یوسف آیت 56

[2] سورہ یوسف آیت 57

تا کہ مامورین حضرت یوسف علیہ السلام کو مطلع کریں جب مامورین نے فلسطین کے قافلے کی خبر دی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ غلے کی درخواست کرنے والوں میں ان کے بھائیوں کے نام بھی ہیں آپ انہیں پہچان گئے اور یہ ظاہر کئے بغیر کہ وہ آپ کے بھائی ہیں، آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''یوسفؑ کے بھائی آئے اور ان کے پاس پہنچے یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے یوسفؑ کو نہیں پہچانا''۔[1]

وہ یوسفؑ کو نہ پہچاننے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک طرف تو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا (اس دن سے لے کر جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا تھا ان کے مصر میں آنے تک) اور دوسری طرف وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہو گیا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اسے اپنے بھائی سے مشابہ بھی پاتے تو اسے ایک اتفاق ہی سمجھتے ان تمام امور سے قطع نظر حضرت یوسفؑ کے لباس کا انداز بھی بالکل بدل چکا تھا انہیں مصریوں کے نئے لباس میں پہچاننا کوئی آسان نہیں تھا بلکہ یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا اس کے بعد ان کی زندگی کا احتمال بھی ان کے لئے بہت بعید تھا۔

بہر حال انہوں نے اپنی ضرورت کا غلہ خریدا اور اس کی قیمت نقدی کی صورت میں اور یا موزے، جوتے یا کچھ اور اجناس کی صورت میں ادا کی کہ جو وہ کنعان سے مصر لائے تھے۔

جناب یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے ایک پیشکش کی

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ان سے بات چیت کرنے لگے بھائیوں نے کہا: ہم دس بھائی ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں ہمارے والد خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم خلیلؑ کے پوتے ہیں اگر آپ ہمارے باپ کو پہچانتے ہوتے تو ہمارا بہت احترام کرتے ہمارا بوڑھا باپ انبیاء الٰہی میں سے ہے لیکن ایک نہایت گہرے غم نے اس کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: یہ غم کس بناء پر ہے۔ انہوں نے کہا: ان کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے، عمر میں وہ ہم سے بہت چھوٹا تھا ایک دن وہ ہمارے ساتھ شکار اور تفریح کے لئے صحرا میں گیا ہم اس سے غافل ہو گئے تو ایک بھیڑیا اسے چیر پھاڑ گیا اس دن سے لے کر آج تک باپ اس کے لئے گریاں اور غمگین ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عادت تھی کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں بیچتے تھے حضرت یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی چونکہ دس تھے لہٰذا انہیں غلے کے دس بار دیئے گئے۔

انہوں نے کہا: ہمارا بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے جو وطن میں رہ گیا ہے باپ غم واندوہ کی شدت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتا اور چھوٹا بھائی خدمت کے لئے اور مانوسیت کی وجہ سے اس کے پاس رہ گیا ہے لہٰذا ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دے دیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ دو اونٹوں کے بار کا اضافہ کیا جائے پھر حضرت یوسف علیہ السلام ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہوش مند اور مؤدّب افراد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ تمہارے باپ کو تمہارے سب سے چھوٹے بھائی سے لگاؤ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام بچوں سے ہٹ کر ہے میری خواہش ہے کہ تمہارے آئندہ سفر میں میں اسے ضرور دیکھوں اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کو تمہارے بارے میں کئی بدگمانیاں ہیں کیونکہ تم ایک دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہو لہٰذا بدگمانی کی اس فضاء کو دور کرنے کے لئے آئندہ سفر میں چھوٹے بھائی کو نشانی کے طور پر ساتھ لے آنا۔

---

[1] سورہ یوسف آیت 58

یہاں قرآن کہتا ہے:

’’جب یوسفؑ نے ان کے بار تیار کئے تو ان سے کہا: تمہارا بھائی جو باپ کی طرف سے ہے اسے میرے پاس لے آؤ‘‘۔ [۱]

اس کے بعد مزید کہا:

’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پیمانہ کا حق ادا کرتا ہوں اور بہترین میزبان ہوں‘‘۔ [۲]

اس تشویق اور اظہار محبت کے بعد انہیں یوں تہدید بھی کی: ’’اگر اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں میرے پاس سے غلہ ملے گا اور نہ تم خود میرے پاس پھٹکنا‘‘۔ [۳]

حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو بنیامین کو اپنے پاس بلائیں اس کے لئے کبھی وہ لطف و محبت کا طریقہ اختیار کرتے اور کبھی تہدید کا۔

ان تعبیرات سے ضمنی طور پر واضح ہوتا ہے کہ مصر میں غلّات کی خرید و فروخت تول کر نہیں ہوتی تھی بلکہ پیمانے سے ہوتی تھی۔

نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں اور دوسرے مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے پذیرائی کرتے تھے اور ہر حوالے سے مہمان نواز تھے۔

بھائیوں نے ان کے جواب میں کہا: ’’ہم اس کے باپ سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ رضامند ہو جائیں اور ہم یہ کام ضرور کریں گے‘‘۔ [۴]

اس موقع پر ان کی ہمدردی اور توجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے ’’حضرت یوسفؑ نے اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کی نظر بچا کر وہ اموال ان کے غلے میں رکھ دیں جو انہوں نے غلہ اس کے بدلے میں دیئے ہیں تا کہ جب وہ واپس اپنے خاندان میں جا کر اپنا سامان کھولیں تو انہیں پہچان لیں اور دوبارہ مصر کی طرف لوٹ آئیں‘‘۔ [۵]

آخر کار باپ راضی ہو گیا

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مالا مال ہو کر خوشی خوشی کنعان واپس آئے لیکن آئندہ کی فکر تھی کہ اگر باپ چھوٹے بھائی (بنیا

---

[۱] سورہ یوسف آیت 59

[۲] سورہ یوسف آیت 59

[۳] سورہ یوسف آیت 60

[۴] سورہ یوسف آیت 61

[۵] سورہ یوسف آیت 62

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا: مندرجہ بالا واقعہ کے مطالعہ سے جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا کہ وہ جلد از جلد آپ کو پہچان لیتے اور باپ کے پاس واپس جا کر انہیں آپ کی جدائی کے جانکاہ غم سے نکالتے؟

یہ سوال زیادہ وسیع حوالہ سے بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت حضرت یوسف کے بھائی آپ کے پاس آئے اس وقت آپ کی زندان سے رہائی کو کوئی اٹھ سال گزر چکے تھے کیونکہ گزشتہ سات سال فراوان نعمتوں پر مشتمل گزر چکے تھے جن کے دوران آپ قحط سالی کے عرصہ کے لئے اناج ذخیرہ کرنے میں مشغول رہے آٹھویں سال قحط کا دور شرع ہوا اس سال یا اس کے بعد آپ کے بھائی غلہ لینے کے لئے مصر آئے، کیا چاہئے نہ تھا کہ ان آٹھ سالوں میں آپ کوئی قاصد کنعان کی طرف بھیجتے اور اپنے والد کو اپنے حالات سے اگاہ کرتے اور انہیں شدید غم سے نجات دلاتے؟

مین) کو بھیجنے پر راضی نہ ہوئے تو عزیز مصر ان کی پذیرائی نہیں کرے گا اور انہیں غلے کا حصہ نہیں دے گا۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:

''جب وہ باپ کے پاس لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: ابا جان حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ ہمیں غلے کا حصہ نہ دیا جائے اور پیمانہ ہم سے روک دیا جائے''۔

''اب جب یہ صورت درپیش ہے تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تا کہ ہم پیمانہ حاصل کر سکیں، اور آپ مطمئن رہیں، ہم اس کی حفاظت کریں گے''۔ [۱]

باپ کہ جو یوسفؑ کو ہرگز نہیں بھولتا تھا یہ بات سن کر پریشان ہو گیا، ان کی طرف رخ کر کے اس نے کہا: ''کیا میں تم پر اس بھائی کے بارے میں بھروسہ کرلوں جب کہ اس کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں گزشتہ زمانے میں تم پر بھروسہ کیا تھا'' [۲]

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور اس سلسلے میں کئی جوابات پیش کئے ہیں ان میں سے زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی کیونکہ فراق یوسفؑ دیگر پہلوؤں کے علاوہ یعقوبؑ کے لئے بھی ایک امتحان بھی تھا، اور ضروری تھا کہ آزمائش کا یہ دور فرمان الٰہی سے ختم ہوتا، اور اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام خبر دینے کے مجاز نہ تھے۔

اس کے علاوہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فوراً ہی اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کروا دیتے تو ممکن تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا اور ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے ایسے وحشت زدہ ہوتے کہ پھر لوٹ کر آپ کے پاس نہ آتے کیونکہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یوسفؑ ان کے گزشتہ رویہ کا انتقام لیں یعنی جب تمہارا ایسا برا ماضی ہے جو بھولنے کے قابل نہیں تو تم کس طرح توقع رکھتے ہو کہ دوبارہ تمہاری فرمائش مان لوں اور اپنے فرزند دلبند کو تمہارے سپرد کر دوں اور وہ بھی ایک دور دراز سفر اور پرائے دیس کے لئے، اس کے بعد اس نے مزید کہا: ''ہر حالت میں خدا بہترین محافظ اور ارحم الرحمین ہے''۔ [۳]

''پھر ان بھائیوں نے جب اپنا سامان کھولا تو انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کو دی تھیں سب انہیں لوٹا دی گئی ہیں اور وہ ان کے سامان میں موجود ہیں''۔ [۴] جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ان کی گفتگو پر سند قاطع ہے تو باپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ابا جان ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے، دیکھئے انہوں نے ہمارا تمام مال ومتاع ہمیں واپس کر دیا ہے''۔ [۵] کیا اس سے بڑھ کر کوئی عزت واحترام اور مہربانی ہو سکتی ہے کہ ایک غیر ملک کا سربراہ ایسے قحط اور خشک سالی میں ہمیں اناج بھی دے اور اس کی قیمت بھی واپس کر دے، وہ بھی ایسے کہ ہم سمجھ ہی نہ پائیں اور شرمندہ نہ ہوں؟ اس سے بڑھ کر ہم کیا تصور کر سکتے ہیں؟

ابا جان اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں ہم اپنے گھر والوں کے لئے اناج لے آئیں گے، اور اپنے بھائی کی حفاظت کی کوشش کریں گے۔ نیز اس کی وجہ سے ایک اونٹ کا بار بھی زیادہ لائیں گے۔ اور عزیز مصر جیسے

---

[۱] سورہ یوسف آیت63

[۲] سورہ یوسف آیت64

[۳] سورہ یوسف آیت64

[۴] سورہ یوسف آیت65

[۵] سورہ یوسف آیت65

محترم،مہربان اور سخی شخص کے لئے کہ جسے ہم نے دیکھا ہے"ایک آسان اور معمولی کام ہے"۔[1]

ان تمام امور کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لئے راضی نہ تھے لیکن دوسری طرف ان کا اصرار تھا جو واضح منطق کی بنیاد پر تھا یہ صورت حال انھیں آمادہ کرتی تھی کہ وہ ان کی تجویز قبول کرلیں آخر کار انہوں نے دیکھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مشروط طور پر بیٹے کو بھیج دیا جائے لہٰذا آپ نے ان سے اس طرح سے کہا:"میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، جب تک کہ تم ایک خدائی پیمان نہ دو اور کوئی ایسا کام نہ کرو کہ جس سے مجھے اعتماد پیدا ہوجائے کہ تم اسے واپس لے کر آؤ گے مگر یہ موت یا دوسرے عوامل کی وجہ سے یہ امر تمہارے بس میں نہ رہے"۔[2]

"وثیقہ الٰہی" سے مراد وہی قسم ہے جو خدا کے نام کے ساتھ ہے۔

بہرحال یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے باپ کی شرط قبول کرلی، اور جب انھوں نے اپنے باپ سے عہد و پیمان باندھا تو یعقوب علیہ السلام نے کہا: خدا شاہد، ناظر اور محافظ ہے اس بات پر کہ جو ہم کہتے ہیں۔[3]

ایک دروازے سے داخل نہ ہونا

آخر کار حضرت یوسفؑ کے بھائی باپ کی رضامندی کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر دوسری مرتبہ مصر جانے کو تیار ہوئے تو اس موقع پر باپ نے انہیں نصیحت کی"اس نے کہا: میرے بیٹو تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا"۔[4]

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں دوسرے شہروں کی طرح مصر کے دارالخلافہ کے گرداگرد بھی فصیل تھی اس کے بھی برج و بارے تھے اور اس کے متعدد دروازے تھے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیوں نصیحت کی کہ ان کے بیٹے ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ مختلف حصوں میں تقسیم ہوکر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں، اس کی وجہ قرآن میں مذکور نہیں ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی ایک تو بہت حسین و جمیل تھے (اگر چہ وہ یوسفؑ نہ تھے مگر یوسفؑ کے بھائی تو تھے) ان کا قد و قامت بہت اچھا تھا۔

---

[1] سورہ یوسف آیت 65

[2] سورہ یوسف آیت 66

[3] حضرت یعقوبؑ کیسے راضی ہوگئے: مندرجہ بالا واقعہ کے سلسلے میں جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ بنیامین کو ان کے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہوگئے جب کہ ان کے بھائی، یوسف علیہ السلام کے بارے میں سلوک کی وجہ سے پہلے برے کردار کے شمار ہوتے تھے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صرف یوسف کے بارے میں اپنے دل میں کینہ وحسد نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ یہی احساسات اگر چہ نسبتا خفیف ہی سہی بنیامین کے لئے بھی رکھتے تھے جیسا کہ شروع داستان میں پڑھا۔"انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہے جب کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں"۔

اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت یوسف والے حادثے کو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت یوسفؑ کے جوان بھائی بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے اور فطرتا ان کا ذہن پہلے زمانے کی نسبت پختہ ہوچکا تھا اس کے علاوہ گھر کے ماحول پر اور اپنے مضطرب وجدان پر اپنے برے ارادے کے اثرات وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے اور تجربے نے ان پر ثابت کردیا کہ یوسف کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ ان کے لئے باپ کی محبت میں اضافہ نہ ہوا بلکہ مزید بے مہری اور بے التفاتی پیدا ہوگئی۔ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو ایک زندگی کا مسئلہ ہے، قحط سالی میں ایک گھرانے کے لئے اناج مہیا کرنا ایک بہت بڑی چیز تھی اور یہ سیر و تفریح کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ انہوں نے ماضی میں حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمائش کی تھی۔ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی بات مان لی، لیکن اس شرط کے ساتھ وہ کہ آپ سے عہد و پیمان باندھیں کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو صحیح وسالم آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔

[4] سورہ یوسف آیت 67

لہٰذا ان کے باپ پریشان تھے کہ گیارہ افراد اکھٹے جن کے چہرے مہرے سے معلوم ہو کہ وہ مصر کے علاوہ کسی اور ملک سے آئے ہیں، لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح انہیں نظر بدلگ جائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس حکم کے بارے میں جو دوسری علت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے جب اونچے لمبے چوڑے چکلے مضبوط جسموں والے اکٹھے چلیں تو حاسدوں کو انہیں دیکھ کر حسد پیدا ہو اور وہ ان کے بارے میں حکومت سے کوئی شکایت کرنے لگیں اور ان کے متعلق یہ بدگمانی کریں کہ وہ فتنہ وفساد کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے باپ نے انہیں حکم دیا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں تا کہ لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

بعض مفسرین نے اس کی ایک عرفانی تفسیر بھی کی ہے وہ یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام راہنمائے راہ کے حوالے سے اپنے بیٹوں کو ایک باہم معاشرتی مسئلہ سمجھانا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ کھوئی ہوئی چیز کو صرف ایک ہی راستے سے تلاش نہ کریں بلکہ ہر دروازے سے داخل ہو کر اسے ڈھونڈیں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک مقصد تک پہنچنے کے لئے صرف ایک ہی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب آگے راستہ بند پاتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو کہ گمشدہ افراد اور چیزیں عموماً ایک ہی راستے پر جانے سے نہیں ملتیں بلکہ مختلف راستوں سے ان کی جستجو کرنا چاہیے تو عام طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

برادران یوسفؑ روانہ ہوئے اور کنعان ومصر کے درمیان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سرزمین مصر میں داخل ہو گئے۔

بھائی کو روکنے کی کوشش

آخرکار بھائی، یوسفؑ کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور باوجود اس کے ہمارے والد پہلے چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ہم نے اصرار کر کے اسے راضی کیا ہے تا کہ آپ جان لیں کہ ہم نے قول وقرار پورا کیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بڑی عزت واحترام سے ان کی پذیرائی کی، انہیں مہمان بلایا اور حکم دیا کہ دسترخوان یا طبق کے پا س دو دو افراد آئیں، انہوں نے ایسا ہی کیا اس موقع پر بنیامین جو تنہا رہ گیا تھا رونے لگا اور کہنے لگا کہ میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھا تا کیونکہ ہم پدری بھائی تھے۔ پھر حکم دیا کہ دو دو افراد کے لئے ایک ایک کمرہ سونے کے لئے تیار کیا جائے بنیامین پھر اکیلا رہ گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اسے میرے پاس بھیج دو اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے یہاں جگہ دی لیکن دیکھا کہ وہ بہت دکھی اور پریشان ہے اور ہمیشہ اپنے کھوئے ہوئے بھائی یوسف علیہ السلام کی یاد میں رہتا ہے کہ ایسے میں یوسفؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آپ نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے یہاں جگہ دی اور کہا کہ میں وہی تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں، غمگین نہ ہو اور اپنے دل کو دکھی نہ کر اور ان کے کسی کام سے پریشان نہ ہو''۔ [1]

بھائیوں کے کام کہ جو بنیامین کو دکھی اور پریشان کرتے تھے ان سے مراد ان کی وہ نامہربانیاں اور بے التفاتیاں تھیں جو وہ اس کے اور یوسفؑ کے لئے روا رکھتے تھے اور وہ سازشیں کہ جو اسے گھر والوں سے دور کرنے کے لئے انجام دیتے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی کارستانیوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ میری ترقی اور بلندی کا ذریعہ بن

---

[1] سورہ یوسف آیت 69

گئیں لہٰذا اب تم بھی اس بارے میں اپنے دل کو دکھی نہ کرو۔

اے اہل قافلہ تم چور ہو

اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین سے کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے پاس رہ جاؤ، اس نے کہا: ہاں میں تو راضی ہوں لیکن بھائی ہرگز راضی نہیں ہوں گے کیونکہ انہوں نے باپ سے قول وقرار کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تم فکر نہ کرو میں ایک منصوبہ بناتا ہوں جس سے وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔''غلات کے بار تیار ہو گئے تو حکم دیا کہ مخصوص قیمتی پیمانہ بھائی کے بار میں رکھ دیں''۔[1] (کیونکہ ہر شخص کے لئے غلے کا ایک بار دیا جاتا تھا۔

البتہ یہ کام مخفی طور پر انجام پایا اور شاید اس کا علم مامورین میں سے فقط ایک شخص کو تھا۔

جب اناج کو پیمانے سے دینے والوں نے دیکھا کہ مخصوص قیمتی پیمانے کا کہیں نام ونشان نہیں ہے حالانکہ پہلے وہ ان کے پاس موجود تھا لہٰذا جب قافلہ چلنے لگا'' تو کسی نے پکار کر کہا: اے قافلے والو: تم چور ہو''۔[2]

یوسفؑ کے بھائیوں نے جب یہ جملہ سنا تو سخت پریشان ہوئے اور وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اس کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس احترام واکرام کے بعد ان پر چوری کا الزام لگایا جائے گا لہٰذا انہوں نے ان کی طرف رخ کر کے کہا:'' تمہاری کونسی چیز چوری ہو گئی ہے''۔[3]

''انہوں نے کہا ہم سے بادشاہ کا پیمانہ گم ہو گیا ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں بدگمانی ہے''۔[4]

پیمانہ چونکہ گراں قیمت ہے اور بادشاہ کو پسند ہے لہٰذا'' وہ جس شخص کو ملے اور وہ اسے لے آئے تو اسے ایک اونٹ کا بار بطور انعام دیا جائے گا''۔[5]

پھر بات کہنے والے نے مزید تاکید کے لئے کہا:'' اور میں ذاتی طور پر اس انعام کا ضامن ہوں''۔[6]

بھائی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے اور حواس باختہ ہو گئے، وہ نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ کیا ہے، ان کی طرف رخ کر کے انھوں نے کہا:

''انھوں نے کہا: خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم یہاں اس لئے نہیں آئے ہیں کہ فتنہ وفساد کریں اور ہم کبھی بھی چور نہیں تھے''۔[7]

---

[1] سورہ یوسف آیت 70

[2] سورہ یوسف آیت 70

[3] سورہ یوسف آیت 71

[4] سورہ یوسف آیت 72

[5] سورہ یوسف آیت 72

[6] سورہ یوسف آیت 72

[7] سورہ یوسف آیت 73

یہ سن کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ''کہا: لیکن اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی سزا کیا ہوگی؟''[1]
انہوں نے جواب میں کہا: ''اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے بار میں سے بادشاہ کا پیمانہ مل جائے اسے روک لو اور اسے اس کے بدلے میں لے لو''۔[2]
''جی ہاں: ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔''[3]
اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے غلات کے بار کھولے جائیں اور ایک ایک کی جانچ پڑتال کی جائے البتہ اس بناء پر کہ ان کے اصلی منصوبے کا کسی کو پتہ نہ چلے، ''اپنے بھائی بنیامین کے بار سے پہلے دوسروں کے سامان کی پڑتال کی اور پھر وہ مخصوص پیمانہ اپنے بھائی کے بار سے برآمد کرلیا''[4]

اے بنیامین تم نے ہمیں ذلیل کردیا

پیمانہ برآمد ہوا تو تعجب سے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے گویا غم واندوہ کا پہاڑ ان کے سروں پر آ گرا اور انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب مقام پر پھنس گئے ہیں کہ جس کے چاروں طرف کے راستے بند ہو گئے ہیں ایک طرف ان کا بھائی ظاہراً ایسی چوری کا مرتکب ہوا جس سے ان کے سر ندامت سے جھک گئے اور دوسری طرف ظاہراً عزیز مصر کی نظروں میں ان کی عزت وحیثیت خطرے میں جا پڑی کہ اب آئندہ کے لئے اس کی حمایت حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ رہا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر انہوں نے سوچا کہ باپ کو کیا جواب دیں گے اور وہ کیسے یقین کرے گا کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔
بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر بھائیوں نے بنیامین کی طرف رخ کر کے کہا: اے بے خبر: تو نے ہمیں رسوا کر دیا ہے اور ہمارا منہ کالا کر دیا ہے تو نے یہ کیسا غلط کام انجام دیا ہے؟ (نہ تو نے اپنے آپ پر رحم کیا، نہ ہم پر اور نہ خاندان یعقوب علیہ السلام پر کہ جو خاندان نبوت ہے) آخر ہمیں بتا تو سہی کہ تو نے کس وقت پیمانہ اٹھایا اور اپنے بار میں رکھ لیا؟
بنیامین نے جو معاملے کی اصل اور قضیے کے باطن کو جانتا تھا ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جس نے تمہاری دی ہوئی قیمت تمہارے بار میں رکھ دی تھی لیکن بھائیوں کو اس حادثے نے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ انہیں پتہ نہیں چلا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
پھر قرآن مزید کہتا ہے: ''ہم نے اس طرح یوسفؑ کے لئے ایک تدبیر کی''۔[5] (تا کہ وہ اپنے بھائی کو دوسرے بھائیوں کی مخالفت کے بغیر روک سکیں)[6] اسی بناء پر قرآن کہتا ہے: ''یوسفؑ ملک مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے اور

---

[1] سورہ یوسف آیت 74
[2] سورہ یوسف آیت 75
[3] سورہ یوسف آیت 75
[4] سورہ یوسف آیت 76
[5] سورہ یوسف آیت 76
[6] سورہ یوسف آیت 76

اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔''[1]

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں اور کنعان کے باشندوں میں چوری کی سزا مختلف تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور احتمالاً اہل کنعان میں اس عمل کی سزا یہ تھی کہ چور کو اس چوری کے بدلے میں (ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر) غلام بنالیا جاتا۔ لیکن مصریوں میں یہ سزا رائج نہ تھی بلکہ چوروں کو دوسرے ذرائع سے مثلاً مار پیٹ سے اور قید و بند وغیرہ سے سزا دیتے تھے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ چور کو ایک سال کے لیے غلام بنا لیتے تھے۔ نیز یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ خاندان یعقوب علیہ السلام میں چوری کی مقدار کے برابر غلامی کی مدت معین کی جاتی تھی (تاکہ وہ اسی کے مطابق کام کرے)۔

یوسفؑ نے بھی چوری کی تھی

آخر کار بھائیوں نے یقین کرلیا کہ ان کے بھائی بنیامین نے ایسی قبیح اور منحوس چوری کی ہے اور اس طرح اس نے عزیز مصر کی نظروں میں ان کا سابقہ ریکارڈ سارا خراب کر دیا ہے لہٰذا اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا: ''اگر اس لڑکے نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کا بھائی یوسفؑ بھی پہلے ایسے کام کا مرتکب ہو چکا ہے''۔[2] اور یہ دونوں ایک ہی ماں اور باپ سے ہیں اور ہم جو دوسری ماں سے ہیں ہمارا حساب کتاب ان سے الگ ہے۔

اس طرح سے انہوں نے اپنے اور بنیامین کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا چاہی اور اس کا تعلق یوسفؑ سے جوڑ دیا۔

یہ بات سن کر یوسفؑ بہت دکھی اور پریشان ہوئے اور ''اسے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے اظہار نہ کیا''۔[3]

---

[1] یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

بے گناہ پر چوری کا الزام؟

کیا جائز تھا کہ ایک بے گناہ شخص پر چوری کا اتہام لگایا جائے، ایسا اتہام کہ جس کے بُرے آثار نے باقی بھائیوں کو بھی کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا؟

اس سوال کا جواب بھی خود واقعے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ خود بنیامین کی رضامندی سے انجام پایا تھا، کیونکہ حضرت یوسف نے پہلے اپنے آپ کو اس سے متعارف کروایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ منصوبہ خود اس کی حفاظت کے لئے بنایا گیا ہے، نیز اس سے بھائیوں پر بھی کوئی تہمت نہیں لگی البتہ انہیں اضطراب و پریشانی ضرور ہوئی جس میں کہ ایک اہم امتحان کی وجہ سے کوئی ہرج نہ تھا۔

2۔ چوری کی نسبت سب کی طرف کیوں دی گئی؟

کیا (انکم سارقون) ''یعنی تم چور ہو'' کہہ کر سب کی طرف چوری کی نسبت دینا جھوٹ نہ تھا اور اس جھوٹ اور تہمت کا کیا جواز تھا؟

ذیل کے تجزیے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا:

اولاً یہ معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والے کون لوگ تھے قرآن میں صرف اس قدر ہے ''قالوا''، یعنی انہوں نے کہا، ہوسکتا ہے یہ بات کہنے والے حضرت یوسف کے کچھ کارندے ہوں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مخصوص پیمانہ نہیں ہے یقین کرلیا کہ کنعان کے قافلے میں سے کسی شخص نے اسے چرا لیا ہے اور یہ معمول ہے کہ اگر کوئی چیز ایسے افراد میں چوری ہو جائے کہ جو ایک ہی گروہ کی صورت میں متشکل ہو اور اصل چور پہچانا نہ جائے تو سب کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے یعنی تم میں سے ایک نے یا تم میں سے بعض نے ایسا کیا ہے۔

ثانیاً اس بات کا اصلی نشانہ بنیامین تھا جو کہ اس نسبت پر راضی تھا کیونکہ اس منصوبے میں ظاہراً تو اس پر چوری کی تہمت لگی تھی لیکن درحقیقت وہ اس کے اپنے بھائی یوسف کے پاس رہنے کے لئے مقدمہ تھی اور یہ جو سب پر الزام آیا یہ ایک بالکل عارضی سی بات تھی جو صرف برادران یوسفؑ کے سامان کی تلاشی پر ختم ہو گیا اور جو درحقیقت مراد تھا یعنی ''بنیامین'' وہ پہچان لیا گیا۔

[2] سورہ یوسف آیت 77

[3] سورہ یوسف آیت 77

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات کہہ کرانہوں نے ایک بہت بڑا بہتان باندھا ہےلیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بس اجمالی طور پر اتنا کہا کہ ''جس کی طرف تم یہ نسبت دیتے ہوتم اس سے بدتر ہو یا میرے نزدیک مقام ومنزلت کے لحاظ سے تم بدترین لوگ ہو۔''[1]

اس کے بعد مزید کہا:''جو کچھ تم کہتے ہو خدا اس کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے''۔[2]

یہ ٹھیک ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ان بحرانی لمحوں میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے اپنے بھائی یوسفؑ پر ایک ناروا تہمت باندھی تھی۔

لیکن پھر بھی اس کام کے لئے کوئی بہانہ اور سند ہونا چاہیے جس کی بناء پر وہ یوسفؑ کی طرف ایسی نسبت دیں۔

اس سلسلے میں مفسرین کاوش وزحمت میں پڑے ہیں اور گذشتہ لوگوں کی تواریخ سے انہوں نے تین روایات نقل کی ہیں۔

پہلی یہ کہ یوسفؑ اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کے پاس رہا کرتے تھے اور انہیں یوسفؑ سے بہت زیادہ پیار تھا جب آپ بڑے ہو گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں ان کی پھوپھی سے واپس لینا چاہا تو ان کی پھوپھی نے ایک منصوبہ بنایا اور وہ یہ کہ کمر بند یا ایک خاص شال جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی جانب سے ان کے خاندان میں بطور یادگار چلی آرہی تھی یوسفؑ کی کمر سے باندھ دی اور دعویٰ کیا کہ یوسفؑ اسے چھپا کے لے جانا چاہتا تھا ایسا انہوں نے اس لئے کیا تاکہ اس کمر بند یا شال کے بدلے یوسفؑ کو اپنے پاس رکھ لیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مادری رشتہ داروں میں سے ایک کے پاس ایک بت تھا جسے یوسفؑ نے اٹھا کر توڑ دیا اور اسے سڑک پر لا پھینکا لہٰذا انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس میں تو کوئی گناہ نہیں تھا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ دسترخوان سے کچھ کھانا لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دیتے تھے لہٰذا بہانہ تراش بھائیوں نے اسے بھی چوری کا الزام دینے کے لئے سند بنا لیا حالانکہ ان میں سے کوئی چیز گناہ کے زمرے میں نہیں تھی۔

اگر ایک شخص کسی کو کوئی لباس پہنا دے اور پہننے والا نہ جانتا ہو کہ یہ کسی دوسرے کا مال ہے تو کیا اسے چوری کا الزام دینا صحیح ہے۔اسی طرح کیا کسی بت کو اٹھا کر پٹخ دینا گناہ ہے۔نیز انسان کوئی چیز اپنے باپ کے دسترخوان سے اٹھا کر مسکینوں کو دے دے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس کا باپ اس پر راضی ہے تو کیا اسے گناہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

برادران یوسفؑ کی فداکاری کیوں قبول نہ ہوئی

بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے بھائی بنیامین کو اس قانون کے مطابق عزیز مصر کے پاس رہنا پڑے گا جسے وہ خود قبول کر چکے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے باپ سے پیمان باندھا تھا کہ بنیامین کی حفاظت اور اسے واپس لانے کے لئے اپنی پوری کوشش کریں گے ایسے میں انہوں نے یوسفؑ کی طرف رخ کیا جسے ابھی تک انہوں نے پہچانا نہیں تھا اور کہا:''اے عزیز مصر:اے بزرگوار صاحب اقتدار:اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اور وہ اس کی جدائی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہم نے آپ کے اصرار پر اسے باپ سے جدا کیا اور باپ نے ہم سے تاکیدی وعدہ لیا کہ ہم ہر قیمت پر اسے واپس لائیں گے اب ہم پر احسان کیجئے اور اس کے

---

[1] سورہ یوسف آیت 77

[2] سورہ یوسف آیت 77

بدلے میں ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجئے، کیونکہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ نیکوکاروں میں سے ہیں“۔[1]

اور یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ نے ہم پر لطف وکرم اور مہر ومحبت کی ہے، مہربانی کر کے اپنی کرم نوازیوں کی تکمیل کیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس تجویز کی شدت سے نفی کی ”اور کہا: پناہ بخدا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس کے پاس سے ہمارا مال ومتاع برآمد ہوا ہے ہم اس کے علاوہ کسی شخص کو رکھ لیں“[2] کبھی تم نے سنا ہے کہ ایک منصف مزاج شخص نے کسی بے گناہ کو دوسرے کے جرم میں سزا دی ہو۔ ”اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے“۔[3] یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس گفتگو میں بھائی کی طرف چوری کی کوئی نسبت نہیں دی بلکہ کہتے ہیں کہ ”جس شخص کے پاس سے ہمیں ہمارا مال ومتاع ملا ہے“ اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہ کریں۔

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

بھائیوں نے بنیامین کی رہائی کے لئے اپنی آخری کوشش کر ڈالی لیکن انہوں نے اپنے سامنے راستے بند پائے ایک طرف تو اس کام کو کچھ اس طرح سے انجام دیا گیا تھا کہ ظاہرا بھائی کی برائت ممکن نہ تھی اور دوسری طرف عزیز مصر نے اس کی جگہ کسی اور فرد کو رکھنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا وہ مایوس ہو گئے یوں انہوں نے کنعان کی طرف لوٹ جانے اور باپ سے سارا ماجرا بیان کرنے کا ارادہ کر لیا قرآن کہتا ہے: ”جس وقت وہ عزیز مصر سے یا بھائی کی نجات سے مایوس ہو گئے، تو ایک طرف کو آئے دوسروں سے الگ ہو گئے اور سرگوشی کرنے لگے“۔[4]

بہرحال سب سے بڑے بھائی نے اس خصوصی میٹنگ میں ان سے کہا: ”کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا ہے کہ بنیامین کو ہر ممکنہ صورت میں ہم واپس لائیں گے“۔[5] ”اور تمہیں نے اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے بارے میں کوتاہی کی اور باپ کے نزدیک تمہارا گزشتہ کردار برا ہے“۔[6]

”اب جبکہ معاملہ یوں ہے تو میں اپنی جگہ سے (یا سرزمین مصر سے) نہیں جاؤں گا اور یہیں پڑاؤ ڈالوں گا، مگر یہ کہ میرا باپ مجھے اجازت دے دے یا خدا میرے متعلق کوئی فرمان صادر کرے جو کہ بہترین حاکم وفرماں روا ہے“۔[7]

پھر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو حکم دیا کہ ”تم باپ کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو: ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اور یہ جو ہم گواہی دے رہے ہیں اتنی ہی ہے جتنا ہمیں علم ہوا ہے“۔[8] بس ہم نے اتنا دیکھا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمارے بھائی کے بار سے برآمد ہوا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے چوری کی ہے، باقی رہا امر باطن تو وہ خدا جانتا ہے،” اور ہمیں غیب کی خبر نہیں“۔[9]

---

[1] سورہ یوسف آیت 78

[2] سورہ یوسف آیت 79

[3] سورہ یوسف آیت 79

[4] سورہ یوسف آیت 80

[5] سورہ یوسف آیت 80

[6] سورہ یوسف آیت 80

[7] سورہ یوسف آیت 80

[8] سورہ یوسف آیت 81

[9] سورہ یوسف آیت 81

ممکن ہے یہ احتمال بھی ہے کہ بھائیوں کا مقصد یہ ہو کہ وہ باپ سے کہیں کہ اگر ہم نے تیرے پاس گواہی دی اور عہد کیا کہ ہم بھائی کو لے جائیں گے اور واپس لے آئیں گے تو یہ اس بناء پر تھا کہ ہم اس کے باطن سے باخبر نہ تھے اور غیب سے آگاہ نہ تھے کہ اس کا انجام یہ ہوگا، پھر اس بناء پر کہ باپ سے ہر طرح کی بدگمانی دور کریں اور اسے مطمئن کریں کہ ماجرا اسی طرح ہے نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، انہوں نے کہا: ''مزید تحقیق کے لئے اس شہر سے سوال کرلیں جس میں ہم تھے، اسی طرح اس قافلہ سے پوچھ لیں''۔ [1]

بہرحال ''آپ مطمئن رہیں کہ ہم اپنی بات میں سچے ہیں اور حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہتے''۔ [2] اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیامین کی چوری کا واقعہ مصر میں مشہور ہو چکا تھا یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ کنعان سے ایک قافلہ یہاں آیا ہے اس میں سے ایک شخص بادشاہ کا پیمانہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا بادشاہ کے مامورین بروقت پہنچ گئے اور انہوں نے اس شخص کو روک لیا، شاید بھائیوں نے جو یہ کہا کہ مصر کے علاقے سے پوچھ لیں یہ اس طرف کنایہ ہو کہ یہ واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ در و دیوار کو اس کا علم ہے۔

میں وہ الطاف الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

بھائی مصر سے چل پڑے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ آئے اور پریشان و غم زدہ کنعان پہنچے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس سفر سے واپسی پر باپ نے جب گزشتہ سفر کے برعکس و اندوہ کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار خبر لائے ہیں خصوصاً جب کہ بنیامین اور سب سے بڑا بھائی ان کے ہمراہ نہ تھا جب بھائیوں نے بغیر کسی کمی بیشی کے ساری آپ بیتی کہہ دی تو یعقوب بہت حیران ہوئے اور ان کی طرف رخ کر کے کہنے لگے: ''تمہاری نفسانی خواہشات نے یہ معاملہ تمہارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اس طرح سے مزین کیا ہے''۔ [3]

اس کے بعد یعقوب اپنی جانب متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ''میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور میں اچھا صبر کروں گا کہ جو کفران سے خالی ہو۔'' [4]

''مجھے امید ہے کہ خدا ان سب کو (یوسف، بنیامین اور میرے بڑے بیٹے کو) میری طرف پلٹا دے گا''۔ [5] کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ''وہ ان سب کے دل کی داخلی کیفیات سے باخبر ہے، اس کے علاوہ، وہ حکیم بھی ہے، اور وہ کوئی کام بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں کرتا۔'' [6]

اس وقت یعقوب رنج و غم میں ڈوب گئے بنیامین کہ ان کے دل کی ڈھارس تھا واپس نہ آیا تو انہیں اپنے پیارے یوسفؑ کی یاد آ گئی انہیں خیال آیا کہ اے کاش آج وہ آبرومند، باایمان اور حسین و جمیل بیٹا ان کی آغوش میں ہوتا اور اس کی پیاری خوشبو ہر لحظہ باپ

---

[1] سورہ یوسف آیت 82
[2] سورہ یوسف آیت 82
[3] سورہ یوسف آیت 83
[4] سورہ یوسف آیت 83
[5] سورہ یوسف آیت 83
[6] سورہ یوسف آیت 83

کو ایک حیات نو بخشتی لیکن آج نہ صرف یہ کہ اس کا نام ونشان نہیں بلکہ اس کا جانشین بنیا مین بھی اس کی طرح ایک دردناک معاملے میں گرفتار ہوگیا ہے''اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے رخ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسف''۔[1]

برادران یوسفؑ شرمندہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نابینا ہوگئے

بھائی جو پہلے ہی بنیامین کے ماجرے پر باپ کے سامنے شرمندہ تھے یوسفؑ کا نام سن کر فکر میں ڈوب گئے ان کے ماتھے پر عرق ندامت کے قطرے چمکنے لگے۔''حزن وملال اتنا بڑھا کہ یعقوب کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا یہاں تک کہ ان کی آنکھیں درد وغم سے سفید اور نابینا ہوگئیں''۔[2] لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کرتے تھے کہ ضبط کریں اور اپنا غم وغصہ پی جائیں اور رضائے حق کے خلاف کوئی بات نہ کہیں''وہ باحوصلہ اور جواں مرد تھے اور انہیں اپنے غصہ پر پورا کنٹرول تھا''۔[3]

ظاہر قرآن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے لیکن جب کہ رنج وغم کئی گناہ بڑھ گیا اور آپ مسلسل گریہ وزاری کرتے رہے اور آپ کے آنسو تھمنے نہ پائے تو آپ کی بینائی ختم ہوگئی اور جیسا کہ ہم وہاں بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اختیاری چیز نہ تھی کہ جو صبر جمیل کے منافی ہو۔

بھائی کہ جو ان تمام واقعات سے بہت پریشان تھے، ایک طرف تو ان کا ضمیر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کی بناء پر انہیں عذاب دیتا اور دوسری طرف وہ بنیامین کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک نئے امتحان کی چوکھٹ پر پاتے اور تیسری طرف باپ کا اتنا غم اور دکھ ان پر بہت گراں تھا، لہٰذا انہوں نے پریشانی اور بے حوصلگی کے ساتھ باپ سے''کہا: بخدا تو اتنا یوسفؑ یوسفؑ کرتا ہے کہ بیمار ہو جائے گا اور موت کے کنارے پہنچ جائے گا یا ہلاک ہو جائے گا''۔[4] لیکن کنعان کے اس مرد بزرگ اور روشن ضمیر پیغمبر نے ان کے جواب میں کہا:''میں نے تمہارے سامنے اپنی شکایت پیش نہیں کی جو اس طرح کی باتیں کرتے ہو، میں اپنا درد وغم بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہوں اور اس کے یہاں اپنی شکایت پیش کرتا ہوں، اور اپنے خدا کی طرف سے مجھے معلوم ہے کہ جن سے غم بے خبر ہوا''۔[5]

کوشش کرو اور مایوس نہ ہو، کیونکہ مایوسی کفر کی نشانی ہے

مصر اور اطراف مصر جس میں کنعان بھی شامل تھا: میں قحط ظلم ڈھا رہا تھا۔ اناج بالکل ختم ہوگیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو بارہ اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف جانے اور غلہ حاصل کرنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ اپنی آرزوؤں کی بنیاد یوسفؑ اور ان کے بھائی بنیامین کی تلاش کو قرار دیا''اور کہا: میرے بیٹو جاؤ اور یوسفؑ اور اسکے بھائی کو تلاش کرو''۔[6]

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے چونکہ اس بارے میں تقریباً مطمئن تھے کہ یوسفؑ موجود ہی نہیں اس لئے وہ باپ کی اس نصیحت اور تاکید پر تعجب کرتے تھے، یعقوب ان کے گوش گزار کر رہے تھے:''رحمت الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہونا'' کیونکہ اس کی قدرت

---

[1] سورہ یوسف آیت84
[2] سورہ یوسف آیت84
[3] سورہ یوسف آیت84
[4] سورہ یوسف آیت85
[5] سورہ یوسف آیت86
[6] سورہ یوسف آیت87

تمام مشکلوں اور سختیوں سے مافوق ہے۔[1] ''کیونکہ صرف یہ کافر ہی ہیں کہ جو قدرت خدا سے بے خبر ہیں اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں''۔[2]

بہر حال فرزندان یعقوب نے اپنا مال و اسباب باندھا اور مصر کی طرف چل پڑے اور اب کے وہ تیسری مرتبہ داستا نو ں سے معمور اس سرزمین پر پہنچے گزشتہ سفروں کے برخلاف اس سفر میں ان کی روح کو ایک احساس ندامت کچوکے لگا رہا تھا کیونکہ مصر میں اور عزیز مصر کے نزدیک ان کا سابقہ کردار بہت برا تھا اور وہ بدنام ہو چکے تھے اور اندیشہ تھا کہ شاید بعض لوگ انہیں ''کنعان کے چور'' کے عنوان سے پہچانیں دوسری طرف ان کے پاس گندم اور دوسرے اناج کی قیمت دینے کے لئے درکار مال و متاع موجود نہیں تھا اور ساتھ ہی بھائی بنیامین کے کھو جانے اور باپ کی انتہائی پریشانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ گویا تلوار ان کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی بہت ساری مشکلات اور روح فرسا پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا تھا ایسے میں جو چیز ان کے تسکین قلب کا باعث تھی وہ صرف باپ کا آخری جملہ تھا جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کبھی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اس کے لئے ہر مشکل آساں ہے۔

اس عالم میں ''وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے اور اس وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں انہوں نے اس کی طرف رخ کیا اور کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے خاندان کو قحط، پریشانی اور مصیبت نے گھیر لیا ہے[3] اور ہمارے پاس صرف تھوڑی سی کم قیمت پونچی ہے[4] لیکن پھر بھی ہمیں تیرے کرم اور شفقت پر بھروسہ ہے اور ہمیں توقع ہے کہ تو ہمارا پیمانہ بالکل پورا کرے گا[5] اور اس معاملہ میں ہم پر احسان کرتے ہوئے بخشش کر''۔[6]

''اور اپنا اجر و ثواب ہم سے نہ لے بلکہ اپنے خدا سے لے کیونکہ خدا کریموں اور صدقہ کرنے والوں کو اجر خیر دیتا ہے''۔[7] یہ امر قابل توجہ ہے کہ برادران یوسفؑ کو باپ نے تاکید کی تھی کہ پہلے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے لئے جستجو کریں اور بعد میں اناج کا تقاضہ کریں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ انہیں یوسفؑ کے ملنے کی امید نہ تھی یا ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ بہتر ہے کہ اپنے کو اناج کے خریداروں کے طور پر پیش کریں جو کہ زیادہ طبیعی اور فطری ہے اور بھائی کی آزادی کا تقاضا ضمناً رہنے دیں تا کہ یہ چیز عزیز مصر پر زیادہ اثر انداز ہو، بعض نے کہا کہ (تصدق علینا) سے مراد وہی بھائی کی آزادی ہے ورنہ وہ اناج بغیر معاوضہ کے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسے (تصدق) قرار دیا جاتا۔

جناب یوسف علیہ السلام نے روتے ہوئے باپ کے خط کو چوما

روایات میں بھی ہے کہ بھائی باپ، کی طرف سے عزیز مصر کے نام ایک خط لے کر آئے تھے اس خط میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے عدل و انصاف کا تذکرہ کیا اپنے خاندان سے اس کی محبتوں اور شفقتوں کی تعریف کی پھر اپنا اور اپنے

---

[1] سورہ یوسف آیت87

[2] سورہ یوسف آیت87

[3] سورہ یوسف آیت87

[4] سورہ یوسف آیت88

[5] سورہ یوسف آیت88

[6] سورہ یوسف آیت88

[7] سورہ یوسف آیت88

خاندان نبوت کا تعارف کروایا اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے ضمن میں اپنے بیٹے یوسفؑ اور دوسرے بیٹے بنیامین کے کھو جانے اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا خط کے آخر میں اس سے خواہش کی گئی تھی کہ بنیامین کو آزاد کر دے اور تاکید کی تھی کہ ہمارے خاندان میں چوری وغیرہ ہرگز نہ تھی اور نہ ہوگی۔

جب بھائیوں نے باپ کا خط عزیز مصر کو دیا تو انہوں نے اسے لے کر چوما اور اپنی آنکھوں پر رکھا اور رونے لگے گریہ کا یہ عالم تھا کہ قطرات اشک ان کے پیراہن پر گرنے لگے (یہ دیکھ کر بھائی حیرت وفکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ عزیز کو ان کے باپ سے کیا لگاؤ ہے وہ سوچتے ہیں کہ ان کے باپ کے خط نے اس میں ہیجان واضطراب کیوں پیدا کر دیا ہے شاید اسی موقع پر ان کے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح اترا ہو کہ ہو نہ ہو یہی خود یوسفؑ ہو اور شاید باپ کے اسی خط کی وجہ سے یوسفؑ اس قدر بے قرار ہو گئے کہ اب مزید اپنے آپ کو عزیز مصر کے نقاب میں نہ چھپا سکے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد بھائیوں سے بھائی کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔

کیا تو وہی یوسفؑ ہے؟

اس موقع پر جبکہ دور آزمائش ختم ہو رہا تھا اور یوسفؑ بھی بہت بے تاب اور سخت پریشان نظر آرہے تھے، تعارف کے لئے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھائیوں کی طرف رخ کر کے آپ نے کہا: ''تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جاہل و نادان تھے تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا''۔[1]

حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت اور شفقت ملاحظہ کیجئے کہ اولاً تو ان کا گناہ مجمل طور پر بیان کیا اور کہا (ما فعلتم) ''جو کچھ تم نے انجام دیا'' اور ثانیاً انہیں عذرخواہی کا راستہ دکھایا کہ تمہارے یہ اعمال وافعال جہالت کی وجہ سے تھے اور اب جہالت کا زمانہ گذر گیا ہے اور اب تم عاقل اور سمجھدار ہو۔

ضمناً اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں انہوں نے صرف یوسفؑ پر ظلم نہیں ڈھایا تھا بلکہ بنیامین بھی اس دور میں ان کے شر سے محفوظ نہیں تھے اور انہوں نے اس کے لئے بھی اس زمانہ میں مشکلات پیدا کی تھیں جب بنیامین مصر میں یوسفؑ کے پاس تھے شاید ان دنوں میں انہوں نے ان کی کچھ بے انصافیاں اپنے بھائی کو بتائی ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ عزیز مصر ہم سے انتقام لینے والا ہے یوسفؑ نے اپنی گفتگو کو ایک تبسم کے ساتھ ختم کیا اس تبسم کی وجہ سے بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خوبصورت دانت پوری طرح نظر آ گئے جب انہوں نے خوب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ دانت ان کے بھائی یوسفؑ سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں، اس طرح بہت سے پہلو جمع ہو گئے ایک طرف تو انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر یوسفؑ کے بارے میں اور اس پر بھائیوں کی طرف سے کئے گئے مظالم کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنہیں سوائے ان کے اور یوسفؑ کے کوئی نہیں جانتا تھا۔

دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ یعقوب کے خط نے اسے اس قدر مضطرب کر دیا ہے جیسے اس کا یعقوب سے کوئی بہت ہی قریبی تعلق ہو، تیسری طرف وہ اس کے چہرے مہرے پر جتنا غور کرتے انہیں اپنے بھائی یوسفؑ سے بہت زیادہ مشابہت دکھائی دیتی لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یوسفؑ عزیز مصر کی مسند پر پہنچ گیا ہو وہ سوچتے کہ یوسفؑ کہاں اور یہ مقام کہاں

---

[1] سورہ یوسف آیت 89

ں؟ لہٰذا انہوں نے شک وتردد کے لہجہ میں "کیا تم خود یوسفؑ تو نہیں"۔ [1]

اس موقع بھائیوں پر بہت زیادہ حساس لمحات گذرے کیونکہ صحیح طور پہ معلوم بھی نہ تھا کہ عزیز مصران کے سوال کے جواب میں کیا کہے گا کیا سچ مچ وہ پردہ ہٹا دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا یا انہیں دیوانہ اور بےوقوف سمجھ کر خطاب کرے گا کہ انہوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی ہے گھڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں انتظار کے روح فرسا لمحے ان کے دل کو بوجھل کر رہے تھے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ چاہا کہ یہ زمانہ طویل ہو جائے اچانک انہوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا اور کہا: "ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے"۔ [2]

لیکن اس بناء پر کہ وہ خدا کی نعمت کا شکرادا کریں کہ جس نے یہ سب نعمات عطا فرمائی تھیں اور ساتھ ہی بھائیوں کو بھی ایک عظیم درس دیں انہوں نے مزید کہا: "خدا نے ہم پر احسان کیا ہے جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرے گا خدا اسے اس کا اجر وثواب دے گا کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔ [3] کسی کو معلوم نہیں کہ ان حساس لمحات میں کیا گزری اور جب دسیوں سال بعد بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہنچانا تو کیسا شور وغل بپا کیا وہ کس طرح آپس میں بغل گیر ہوئے اور کس طرح سے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھائی اپنے آپ میں شرمندہ تھے وہ یوسفؑ کے چہرے کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھ پا رہے تھے وہ اسی انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کا عظیم گناہ بخشش وعفو کے قابل ہے یا نہیں لہٰذا انہوں نے بھائی کی طرف رخ کیا اور کہا: "خدا کی قسم: اللہ نے تجھے ہم پر مقدم کیا ہے۔ [4] اور تجھے ترجیح دی ہے اور علم وحلم اور عقل وحکومت کے لحاظ سے تجھے فضیلت بخشی ہے یقیناً ہم خطا کار اور گناہ گار تھے"۔ [5]

آج رحمت کا دن ہے

لیکن یوسفؑ نہیں چاہتے تھے کہ بھائی اس طرح شرمسار رہیں خصوصاً جب کہ یہ ان کی اپنی کامیابی وکامرانی کا موقع تھا یا یہ کہ احتمالاً بھائیوں کے ذہن میں یہ بات آئے کہ یوسفؑ اس موقع پر انتقام لے گا لہٰذا فوراً یہ کہہ کر انہیں مطمئن اور پرسکون کر دیا کہ "آج تمہیں کوئی سرزنش اور توبیخ نہیں ہوگی۔" [6] تمہاری فکر آسودہ رہے اور وجدان کو راحت رہے اور گذشتہ گناہوں پر غم نہ کرو۔

اس بناء پر کہ انہیں بتایا جائے کہ انہیں نہ صرف یوسفؑ کا حق بخش دیا گیا ہے بلکہ ان کی ندامت وپشیمانی کی وجہ سے اس سلسلے میں خدائی حق بھی قابل بخشش ہے، مزید کہا: "اللہ بھی تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے"۔ [7]

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی انتہائی عظمت کی دلیل ہے کہ نہ صرف اپنا حق معاف کر دیا بلکہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ

---

[1] سورہ یوسف آیت 90

[2] سورہ یوسف آیت 90

[3] سورہ یوسف آیت 90

[4] سورہ یوسف آیت 91

[5] سورہ یوسف آیت 91

[6] سورہ یوسف آیت 92

[7] سورہ یوسف آیت 92

انہیں تھوڑی سی بھی سرزنش کی جائے، چہ جائیکہ بھائیوں کو کوئی سزا دیتے بلکہ حق الٰہی کے لحاظ سے بھی انہیں اطمینان دلایا کہ خدا غفور اور بخشنے والا ہے بلکہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس موقع پر بھائیوں کو ایک اور غم بھی ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں نابینا ہو چکا ہے اور اس کا اس طرح رہنا پورے خاندان کے لئے ایک جانکاہ رنج ہے اس کے علاوہ ان کے جرم پر ایک مسلسل دلیل ہے لہٰذا یوسفؑ نے اس عظیم مشکل کے حل کے لئے بھی فرمایا: ''میرا یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تا کہ وہ بینا ہو جائے''۔[1] ''اس کے بعد سارے خاندان کے ہمراہ میرے پاس آ جاؤ''۔[2]

یوسفؑ کی قمیص کون لے کر گیا؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: میرا شفا بخش کرتہ باپ کے پاس وہی لے جائے جو خون آلود کرتہ لے کر گیا تھا تا کہ جیسے اس نے باپ کو تکلیف پہنچائی اور پریشان کیا تھا اس مرتبہ اسے خوش وخرم کرے۔

لہٰذا یہ کام ''یہودا'' کے سپرد ہوا کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ وہ میں ہوں جو خون آلود کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر چہ حضرت یوسف علیہ السلام اس قدر مشکلات اور مصائب میں گرفتار رہے لیکن اخلاقی مسائل کی باریکیوں سے غافل نہیں رہتے تھے۔

یوسفؑ کی عظمت

اس ماجرے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ہمیشہ شرمسار رہتے تھے انھوں نے کسی کو یوسفؑ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ آپ ہر صبح وشام ہمیں اپنے دسترخوان پر بٹھاتے ہیں اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ہمیں شرم وخجالت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہم نے آپ کے ساتھ اس قدر جسارتیں کی ہیں۔

اس بناء پر کہ انہیں نہ صرف ذرہ بھر احساس شرمندگی نہ ہو بلکہ یوسفؑ کے دسترخوان پر اپنی موجودگی کو یوسفؑ کی ایک خدمت محسوس کریں، حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں بہت ہی عمدہ جواب دیا، آپ نے کہا: مصر کے لوگ اب تک مجھے ایک زرخرید غلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے: ''پاک ہے وہ ذات جس نے اس غلام کو کہ جو بیس درہم میں بیچا گیا اس مقام تک پہنچایا۔''

لیکن اب جب کہ تم لوگ آ گئے ہو اور میری زندگی کی کتاب ان کے سامنے کھل گئی ہے تو وہ سمجھنے لگے ہیں کہ میں غلام نہیں ہوں بلکہ میں خاندان نبوت سے تعلق رکھتا ہوں اور ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے ہوں اور یہ میرے لئے باعث افتخار ہے۔

آخر کار لطف الٰہی نے اپنا کام کر ڈالا

فرزندان یعقوب علیہ السلام خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، وہ خوشی خوشی یوسفؑ کا پیراہن اپنے ساتھ لے کر قافلے کے ساتھ مصر سے چل پڑے، ادھر ان بھائیوں کے لئے زندگی کے شیریں ترین لمحات تھے اُدھر شام کے علاقہ کنعان میں بوڑھے باپ کا گھر غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا، سارا گھرانہ افسردہ اور غم زدہ تھا۔

---

[1] سورہ یوسف آیت 93

[2] سورہ یوسف آیت 93

لیکن ادھر یہ قافلہ مصر سے چلا اور اُدھر اچانک یعقوب علیہ السلام کے گھر میں ایک واقعہ رونما ہوا جس نے سب کو تعجب میں ڈال دیا، یعقوب علیہ السلام کا جسم کانپ رہا تھا، انھوں نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے پکار کر کہا: ''اگر تم بد گوئی نہ کرو اور میری طرف نادانی اور جھوٹ کی نسبت نہ دو تو میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پیارے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے''۔[1]

میں محسوس کررہا ہوں کہ رنج وغم اور زحمت ومشکل کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور وصال وکامیابی کا زمانہ آنے کو ہے، خاندان یعقوب علیہ السلام اب لباس ماتم اتار دے گا اور لباس مسرت زیب تن کرے گا، لیکن میرا یہ خیال نہیں کہ تم ان باتوں پر یقین کرو گے۔

لفظ ''فصلت'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام میں یہ احساس اسی وقت پیدا ہوا جب قافلہ مصر سے چلنے لگا۔

قاعدتاً حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس اس وقت ان کے پوتے پوتیاں اور بہوئیں وغیرہ تھیں انہوں نے بڑے تعجب اور گستاخی سے اور پورے یقین سے یعقوبؑ سے کہا: ''بخدا آپ اسی پرانی گمراہی میں ہیں''۔[2]

یعنی اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوگی کہ یوسفؑ کی موت کو سالہا سال گزر گئے ہیں اور ابھی آپ کا خیال ہے کہ وہ زندہ ہے اور اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مصر کی طرف سے مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے، مصر کہاں اور شام وکنعان کہاں، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ہمیشہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے خیالات وتصورات کو حقیقت سمجھتے ہیں، آپ یہ کیسی عجیب وغریب بات کہہ رہے ہیں بہرحال آپ تو پہلے بھی اپنے بیٹوں سے کہہ چکے ہیں کہ مصر کی طرف جاؤ اور میرے یوسفؑ کو تلاش کرو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضلالت وگمراہی سے مراد عقیدہ اور نظریہ کی گمراہی نہیں ہے بلکہ یوسفؑ سے متعلق مسائل کے سمجھنے میں گمراہی مراد ہے۔

بہرکیف ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس عظیم کہن سال اور روشن ضمیر پیغمبر سے کیسا شدید اور جسارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کہا: ہمارا باپ ''ضلال مبین'' (کھلی گمراہی) میں ہے اور یہاں انہوں نے کہا: تم اپنی اسی دیرینہ گمراہی میں ہو۔

وہ پیر کنعان کے دل کی پاکیزگی اور روشنی سے بے خبر تھے ان کا خیال تھا کہ اس کا دل بھی انہی کے دل کی طرح تاریک ہے انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آئندہ کے واقعات اور دور ونزدیک کے مقامات اس کے آئینۂ دل میں منعکس ہوتے ہیں۔

قافلہ کنعان پہنچتا ہے

کئی رات دن بیت گئے یعقوب اسی طرح انتظار میں تھے ایسا پرسوز انتظار کہ جس کی گہرائی میں مسرت وشادمانی اور سکون واطمینان موجزن تھا حالانکہ ان کے پاس رہنے والوں کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یوسفؑ کا معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے معلوم نہیں یعقوب پر یہ چند دن کس طرح گزریں گے۔ آخر ایک دن آیا جب آوز آئی وہ دیکھو مصر سے کنعان کا قافلہ آیا ہے گزشتہ سفروں کے برخلاف فرزندان یعقوب شاداں وخرّم شہر میں داخل ہوئے اور بڑی تیزی سے باپ کے

---

[1] سورہ یوسف آیت 94

[2] سورہ یوسف آیت 95

گھر پہنچ گئے سب سے پہلے ''بشیر'' بوڑھے یعقوب کے پاس آیا وہی ''بشیر'' (جو وصال کی بشارت لایا تھا اور جس کے پاس یوسفؑ کا پیراہن تھا) اس نے آتے ہی پیراہن یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا۔

یعقوب کی آنکھیں تو بے نور تھیں وہ پیراہن کو دیکھ نہ سکتے تھا انہوں نے محسوس کیا کہ ایک آشنا خوشبو ان کی مشام جان میں اتر گئی ہے یہ ایک پُر کیف زریں لمحہ تھا گویا ان کے وجود کا ہر ذرہ روشن ہو گیا ہو آسمان و زمین مسکرا اٹھے ہوں ہر طرف قہقہے بکھر گئے ہوں نسیم رحمت چل اٹھی ہوا اور غم و اندوہ کا گرد و غبار لپیٹ کر لے جا رہی ہو، درو دیوار سے خوشی کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور یعقوب کی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں اور وہ ہر جگہ دیکھ رہے ہیں دنیا اپنی تمام تر زیبائیوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ان آنکھوں کے سامنے تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''جب بشارت دینے والا آیا تو اس نے وہ (پیراہن) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو اچانک وہ بینا ہو گئے''۔[1]

بھائیوں اور گرد و پیش والوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امنڈ آئے اور یعقوب نے پورے اعتماد سے کہا: ''میں نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے''[2] اس معجزے پر بھائی گہری فکر میں ڈوب گئے ایک لمحے کے لئے اپنا تاریک ماضی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، خطا، گناہ، اشتباہ اور تنگ نظری سے پُر ماضی۔

لیکن کتنی اچھی بات ہے کہ جب انسان اپنی غلطی کو سمجھ لے تو فوراً اس کی اصلاح اور تلافی کی فکر کرے فرزندان یعقوب بھی اسی فکر میں گم ہو گئے انہوں نے باپ کا دامن پکڑ لیا اور کہا: ''بابا جان خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے کیونکہ ہم گنہگار اور خطا کار تھے۔''[3]

بزرگوار اور باعظمت بوڑھا جس کا ظرف سمندر کی طرح وسیع تھا، اس نے کوئی ملامت و سرزنش کئے بغیر ان سے وعدہ کیا کہ ''میں بہت جلدی تمہارے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری توبہ قبول کر لے گا اور تمہارے گناہوں سے صرف نظر کرے گا کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔''[4]

رات اور دن گویا بڑی آہستگی سے گزر رہے تھے کیونکہ اشتیاق وصال میں ہر گھڑی ایک دن بلکہ ایک سال معلوم ہو رہی تھی مگر جو کچھ بھی تھا آخر گزر گیا مصر کی آبادی دور سے نمایاں ہوئیں مصر کے سرسبز کھیت، آسمان سے باتیں کرنے والے درخت اور خوبصورت عمارتیں دکھائی دینے لگیں، لیکن قرآن اپنی دائمی سیرت کے مطابق ان سب مقدمات کو کہ جو تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتے ہیں حذف کرتے ہوئے کہتا ہے: ''جب وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ اپنے ماں باپ سے گلے ملے۔''[5]

آخر کار یعقوب کی زندگی کا شیریں ترین لمحہ آ گیا دیدار وصال کا یہ لمحہ فراق کے کئی سالوں بعد آیا تھا خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، کہ وصال کے یہ لمحات یعقوب اور یوسفؑ پر کیسے گذرے ان شیریں لمحات میں ان دونوں کے احساسات و جذبات کیا تھے، عالم شوق میں انھوں نے کتنے آنسو بہائے اور عالم شوق میں کیا نالہ و فریاد ہوا۔

یہاں پر چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

---

[1] سورہ یوسف آیت96

[2] سورہ یوسف آیت96

[3] سورہ یوسف آیت97

[4] سورہ یوسف آیت98

[5] سورہ یوسف آیت99

1۔ یعقوب نے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو کیسے محسوس کی؟

یہ سوال بہت سے مفسرین نے اٹھایا ہے اور اس پر بحث کی ہے عام طور پر مفسرین نے اسے یعقوب یا یوسفؑ کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ قرآن نے اسے اعجاز یا غیر اعجاز ہونے کے لحاظ سے پیش نہیں کیا اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے اس کی سائنسی توجیہ معلوم کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں ''ٹیلی پیتھی'' ایک مسلمہ علمی مسئلہ ہے (اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے دور رہنے والے کے درمیان فکری ارتباط اور روحانی رابطہ ہوسکتا ہے اسے ''انتقال فکر'' کہتے ہیں) ایسے افراد جو ایک دوسرے سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں یا جو بہت زیادہ روحانی طاقت رکھتے ہیں یہ تعلق ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے شاید ہم میں سے بہت سے افراد نے اپنی روز مرہ کی زندگی میں اس کا سامنا کیا ہو کہ بعض اوقات کسی کی والدہ یا بھائی اپنے اندر بلاسبب بہت زیادہ اضطراب اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر نہیں گذرتی کہ کہ خبر پہنچتی ہے کہ اس کے بیٹے یا بھائی کو فلاں دور دراز علاقے میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا ہے۔

ماہرین اس قسم کے احساس کو ٹیلی پیتھی اور دور دراز کے علاقوں سے انتقال فکری کا عمل قرار دیتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ممکن ہے کہ یوسفؑ سے شدید محبت اور آپ کی روحانی عظمت کے سبب آپ میں وہی احساس پیدا ہوگیا جو یوسفؑ کا کرتا اٹھاتے وقت بھائیوں میں پیدا ہوا تھا۔

البتہ یہ بات بھی ہر طرح ممکن ہے کہ اس واقعہ کا تعلق انبیاء کے دائرہ علم کی وسعت سے ہو، بعض روایات میں بھی انتقال فکر کے مسئلہ کی طرف جاذب نظر اور عمدہ اشارہ کیا گیا ہے مثلاً: کسی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں بغیر کسی مصیبت یا ناگوار حادثہ کے غمگین ہوجاتا ہوں یہاں تک کہ میرے گھر والے اور میرے دوست بھی اس کے اثرات میرے چہرے پر دیکھ لیتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، خدا نے مومنین کو ایک ہی بہشتی طینت سے پیدا کیا ہے اور اس کی روح ان میں پھونکی ہے لہٰذا مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس وقت کسی ایک شہر میں ان میں سے کسی ایک بھائی کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو باقی افراد پر اس کا اثر ہوتا ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرتہ کوئی عام کرتہ نہ تھا بلکہ ایک جنّتی پیراہن تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خاندان یعقوب علیہ السلام میں یادگار کے طور پر چلا آرہا تھا اور جو شخص حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح بہشتی قوت شامہ رکھتا تھا وہ اس کی خوشبو دور سے محسوس کرلیتا تھا۔

2۔ انبیاء کے حالات میں فرق۔

یہاں پر ایک اور مشہور اعتراض سامنے آتا ہے فارسی زبان کے اشعار میں بھی یہ اعتراض بیان کیا گیا ہے، کسی نے یعقوب علیہ السلام سے کہا:

زمصری بوی پیراهن

شنیدی

چرا در جاه کنعانش نه
دیدی

یعنی آپ نے مصر سے پیراہن کی خوشبوسونگھ لی لیکن آپ کو کنعان کے کنویں میں یوسفؑ کیوں نہ دکھائی دیئے؟
کیسے ہوسکتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے اتنے دور دراز کے علاقے سے یوسفؑ کی قمیص کی خوشبوسونگھ لی جب کہ بعض نے یہ فاصلہ اسّی فرسخ لکھا ہے اور بعض نے دس دن کی مسافت بیان کی ہے لیکن اپنے علاقہ کنعان کے اندر جب کہ یوسفؑ کو اس کے بھائی کنویں میں پھینک رہے تھے اوران پر وہ واقعات گزر رہے تھے اس سے یعقوب علیہ السلام آگاہ نہ ہوئے؟
قبل اس کے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے علم غیب کی حدود کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ہرگز مشکل نہیں رہتا، امور غیب کے متعلق ان کا علم پروردگار کے ارادے اور عطا کئے ہوئے علم پر منحصر ہے جہاں خدا چاہتا ہے وہ جانتے ہیں، چاہے واقعہ کا تعلق کسی بہت دور دراز علاقے سے ہو اور جہاں وہ نہ چاہے نہیں جانتے چاہے معاملہ کسی نزدیک ترین علاقے سے مربط ہو جیسے کسی تاریک رات میں ایک قافلہ کسی بیابان سے گزر رہا ہو آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو ایک لحہ کے لئے آسمان سے بجلی چمک اٹھے اور بیابان کی تمام گیرائیاں اور گہرائیاں روشن ہوجائیں اور تمام مسافر ہر طرف سب کچھ دیکھ لیں لیکن دوسرے لحہ وہ بجلی خاموش ہوجائے اور پھر تاریکی ہر طرف چھا جائے اسی طرح سے کہ کوئی چیز نظر نہ آئے۔
شاید امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم امام کے بارے میں مروی یہ حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"جعل الله بینه وبین الامام عموداً من نور ینظر الله به الی الامام وینظر الامام به الیه. فاذا راد علم شیء نظر فی ذالك النور فعرفه"

خدا نے اپنے اور امام وپیشوائے خلق کے درمیان نور کا ایک ستون بنایا ہے اسی سے خدا امام کی طرف دیکھتا ہے اور امام بھی اسی طریق سے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتا ہے اور جب امام کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو نور کے اس ستون میں دیکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہوجاتا ہے۔
ایک شعر جو پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سعدی کے مشہور اشعار میں اسی روایات کے پیش نظر کہا گیا ہے:

بگفت احوال ما برق جهان است
گهی پیدا ودگر دم نهان است
گهی برکارم اعلا نشینم
گهی تاپشت پای خود نبینم

یعنی اس نے کہا ہمارے حالات چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں جو کبھی دکھائی دیتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے۔
کبھی ہم آسمان کی بلندیوں پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پیچھے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے تعجب کا مقام نہیں کہ ایک دن مشیت الٰہی کی بناء پر یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کے لئے اپنے قریب رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ نہ ہوں اور کسی دوسرے دن جب کہ دور آزمائش ختم ہو چکا تھا اور مشکلات کے دن

بیت چکے تھے انھوں نے مصر سے قمیص یوسفؑ کی مہک سونگی لی ہو۔

3۔ بینائی کیسے لوٹ آئی ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھ کا نور بالکل ختم نہیں ہوا تھا بلکہ ان کی آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں اور بیٹے کی ملاقات کے امکانات پیدا ہوئے تو ان میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ پہلی حالت پر واپس آگئیں، لیکن آیات کا ظہور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل نابینا ہوگئے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں سفید ہوچکی تھیں لہٰذا ان کی بینائی معجزانہ طور پر واپس ہوئی۔ قرآن کہتا ہے: (فارتد بصیرا) ۔

جناب یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر

''پھر یوسفؑ نے سب سے کہا سرزمین مصر میں قدم رکھیں کہ انشاء اللہ یہاں آپ بالکل امن وامان میں ہوں گے''[1] کیونکہ مصر یوسفؑ کی حکومت میں امن وامان کا گہوارہ بن چکا تھا۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ اپنے ماں باپ کے استقبال کے لئے شہر کے دروازے کے باہر تک آئے تھے اور شاید جملہ (ادخلو ا علی یوسف علیہ السلام) کہ جو دروازے سے باہر سے مربوط ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ یوسفؑ نے حکم دیا تھا کہ وہاں خیمے نصب کئے جائیں اور ماں باپ اور بھائیوں کی پہلے پہل وہاں پذیرائی کی جائے، جب بارگاہ یوسفؑ میں پہنچے ''تو اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا''نعمت الٰہی کی اس عظمت اور پروردگار کے لطف کی اس گہرائی اور وسعت نے بھائیوں اور ماں باپ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ سب کے سب ''اس کے سامنے سجدے میں گر گئے۔''[2]

اس موقع پر یوسفؑ نے باپ کی طرف رخ کیا ''اورعرض کیا: ابان جان: یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا''[3] کیا ایسا ہی نہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ سورج، چانداور گیارہ ستارے میرے سامنے سجدہ کررہے ہیں دیکھئے: جیسا کہ آپ نے پیشین گوئی کی تھی ''خدانے اس خواب کو واقعیت میں بدل دیا ہے''،''اور پروردگار نے مجھ پر لطف واحسان کیا ہے کہ اس نے مجھے زندان سے نکالا ہے''۔[4]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی زندگی کی مشکلات میں صرف زندان مصر کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن بھائیوں کی وجہ سے کنعان کے کنوئیں کی بات نہیں کی، اس کے بعد مزید کہا: ''خدانے مجھ پر کس قدر لطف کیا کہ آپ کو کنعان کے اس بیابان سے یہاں لے آیا جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد انگیزی کرچکا تھا۔''[5]

یہاں یوسفؑ ایک مرتبہ پھر اپنی وسعت قلبی اور عظمت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ کوتاہی کس شخص نے کی، بلکہ اس طرح سربستہ اور اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ شیطان نے اس کام میں دخل اندازی کی اور وہ فساد کا باعث بنا کیونکہ وہ نہیں چا

---

[1] سورہ یوسف آیت99

[2] سورہ یوسف آیت100

[3] سورہ یوسف آیت100

[4] سورہ یوسف آیت100

[5] سورہ یوسف آیت100

ہتے تھے کہ بھائیوں کی گزشتہ خطاؤں کا گلہ کریں، وہ جانتا ہے کہ کون حاجت مند ہیں اور کون اہل ہیں'' کیونکہ وہ علیم وحکیم ہے''۔[۱]

اس کے بعد یوسف، حقیقی مالک الملک اور دائمی ولی نعمت کی طرف رخ کرتے ہیں اور شکر اور تقاضے کے طور پر کہتے ہیں:

''پروردگار تونے ایک وسیع حکومت کا ایک حصہ مجھے مرحمت فرمایا ہے''۔''اور تونے مجھے تعبیر خواب کے علم کی تعلیم دی ہے''۔[۲] اور اسی علم نے جو ظاہراً سادہ اور عام ہے میری زندگی اور تیرے بندوں کی ایک بڑی جماعت کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کردیا ہے اور یہ علم کس قدر پر برکت ہے۔

''تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا ہے''۔[۳]

اور اسی بناء پر تمام چیزیں تیری قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں'' پروردگار دنیا وآخرت میں تو میرا ولی ناصر مدبر اور محافظ ہے''۔[۴]

''مجھے اس جہان سے مسلمان اور اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے لے جا، اور مجھے صالحین سے کردے''۔[۵]

میں تجھ سے ملک کے دوام اور اپنی مادی حکومت اور زندگی کی بقاء کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ تو سب فانی ہیں اور صرف دیکھنے میں دل انگیز ہیں بلکہ میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ میری عاقبت اور انجام کار بخیر ہو اور میں تیری راہ میں ایمان وتسلیم کے ساتھ رہوں اور تیرے لئے جان دوں اور صالحین اور تیرے باخلوص دوستوں کی صف میں قرار پاؤں میرے لئے یہ چیزیں اہم ہیں۔

باپ کو سرگزشت نہ سنانا

جس وقت یعقوب علیہ السلام یوسفؑ سے ملاقات کے لئے پہنچے تو ان سے کہا: میرے بیٹے میرا دل چاہتا ہے کہ میں پوری تفصیل جانوں کہ بھائیوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے باپ سے تقاضا کیا کہ وہ اس معاملہ کو جانے دیں لیکن یعقوب علیہ السلام نے انہیں قسم دے کر کہا کہ بیان کریں۔

یوسفؑ نے واقعات کا کچھ حصہ بیان کیا یہاں تک کہ بتایا: بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کنویں کے کنارے بٹھایا مجھے حکم دیا کہ کرتا اتاردوں تو میں نے ان سے کہا: میں تمہیں اپنے باپ یعقوب کے احترام کی قسم دیتا ہوں کہ میرے بدن سے کرتا نہ اتارو اور مجھے برہنہ نہ کرو، ان میں سے ایک کے پاس چھری تھی اس نے وہ چھری نکالی اور چلا کر کہا: کرتا اتاردے۔

یہ جملہ سنتے ہی یعقوب کی طاقت جواب دے گئی انھوں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے جب وہ ہوش میں آئے تو بیٹے سے چاہا کہ اپنی بات جاری رکھے لیکن یوسفؑ نے کہا: آپ کو ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کے خدا کی قسم مجھے اس کام سے معاف رکھیں۔

جب یعقوب علیہ السلام نے یہ جملہ سنا تو اس معاملہ سے صرف نظر کرلیا۔

---

[۱] سورہ یوسف آیت 100

[۲] سورہ یوسف آیت 101

[۳] سورہ یوسف آیت 101

[۴] سورہ یوسف آیت 101

[۵] سورہ یوسف آیت 101

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یوسفؑ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ماضی کے تلخ واقعات اپنے دل میں لائیں یا باپ کے سامنے انہیں دہرائیں اگر چہ یعقوب علیہ السلام کی جستجو کی حس انہیں مجبور کرتی تھی۔

یوسفؑ، یعقوب اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام

عظیم ترین بشارت لئے ہوئے مصر سے قافلہ کنعان پہنچا بوڑھے یعقوب بینا ہو گئے عجیب جوش وخروش تھا سالہا سال سے جو گھرانا غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا وہ خوشی اور سرور میں ڈوب گیا ان سب نعمات الٰہی پر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔

یوسفؑ کی فرمائش کے مطابق اس خاندان کو اب مصر کی طرف روانہ ہونا تھا سفر کی تیاری ہر لحاظ سے مکمل ہوگئی یعقوب ایک مرکب پر سوار ہوئے۔ جب کہ ان کے مبارک لبوں پر ذکر وشکر خدا جاری تھا اور عشق وصال نے انہیں اس طرح سے قوت وتوانائی بخشی تھی کہ گویا وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے تھے۔

بھائیوں کے گزشتہ سفر تو خوف و پریشانی سے گزرے لیکن ان کے برخلاف یہ سفر ہر قسم کے فکر واندیشہ سے خالی تھا یہاں تک کہ اگر سفر کی کوئی تکلیف تھی بھی تو اس انتظار میں پنہاں مقصد کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

وصال کعبه چناں می دواندم بشتاب
که خا رهای مغیلاں حریرمی آید

کعبہ مقصود کے وصال نے مجھے اتنا تیز دوڑایا کہ خار مغیلاں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام کی سرزمین ''مدین''

یہاں گفتگو قوم شعیب اور اہل مدین کی ہے یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے توحید کا راستہ چھوڑ دیا تھا اور شرک وبت پرستی کی سنگلاخ زمین میں سرگرداں ہو گئے تھے یہ لوگ نہ صرف بتوں کو پوجتے تھے بلکہ درہم ودینار اور اپنے مال وثروت کی بھی پرستش کرتے تھے اور اسی لئے وہ اپنے کاروبار اور بارونق تجارت کو نادرستی، کم فروشی اور غلط طریقوں سے آلودہ کرتے تھے۔

ابتداء میں فرمایا گیا ہے: ''مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا''۔[1]

مدین (بروزن ''مریم'') حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے قبیلے کی آبادی کا نام ہے یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع ہے اس کے لوگ اولاد اسماعیل میں سے تھے مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کیا کرتے تھے۔

آج کل شہر مدین کا نام ''معان'' ہے بعض جغرافیہ دانوں نے خلیج عقبہ کے درمیان سے کوہ سینا تک زندگی بسر کرنے والوں پر مدین کے نام کا اطلاق کیا ہے، توریت میں بھی لفظ ''مدیان'' آیا ہے لیکن بعض قبائل کے لئے (البتہ ایک ہی لفظ شہر اور اہل شہر پر عام طور پر استعمال ہوجاتا ہے)

---

[1] سورہ ہود آیت 84

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں لفظ ''اخاھم'' (ان کا بھائی) اس بناء پر ہے کہ اپنی قوم سے پیغمبروں کی انتہائی محبت کو بیان کیا جائے نہ صرف اس بناء پر کہ وہ افراد ان کے گروہ اور قبیلے سے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کے خیر خواہ اور ہمدرد بھائی کی طرح تھے۔

قوم شعیب کی اقتصادی برائیاں

اس پیغمبر اور ہمدرد و مہربان بھائی نے جیسا کہ تمام انبیاء کا آغاز دعوت میں طریقہ ہے، پہلے انہیں مذہب کے اساسی ترین رکن ''توحید'' کی طرف دعوت دی اور کہا: اے قوم: '' یکتا و یگانہ خدا کی پرستش کرو، کہ جس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے''۔ [۱]

اس وقت اہل مدین میں ایک اقتصادی خرابی شدید طور پر رائج تھی جس کا سرچشمہ شرک اور بت پرستی کی روح ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''خرید و فروخت کرتے وقت چیزوں کا پیمانہ اور وزن کم نہ کرو''۔ [۲]

کم فروشی کے ذریعے فساد اور برائی، لوگوں کے حقوق غصب کرنے کا فساد اور حقوق پر تجاوز کا فسانہ، معاشرتی میزان اور اعتدال کو درہم برہم کرنے کا فساد، اموال اور اشخاص پر عیب لگانے کا فساد۔ خلاصہ یہ کہ لوگوں کی حیثیت، آبرو، ناموس اور جان کے حریم پر تجاوز کرنے کا فساد۔

«لا تعثوا» ''فساد نہ کرو'' کے معنی میں ہے اس بناء پر اس کے بعد ''مفسدین'' کا ذکر زیادہ سے زیادہ تاکید کی خاطر ہے۔

قرآن مجید میں موجود آیات سے یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوتی ہے کہ توحید کا اعتقاد اور آئیڈیالوجی کا معاملہ ایک صحیح و سالم اقتصاد کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے نیز آیات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقتصادی نظام کا درہم برہم ہونا معاشرے کی وسیع تباہی اور فساد کا سرچشمہ ہے۔

آخر میں انھیں یہ گوش گزار کیا گیا ہے کہ ظلم و ستم کے ذریعے اور استعماری ہتھکنڈوں سے بڑھنے والی دولت تمہاری بے نیازی اور استغناء کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ حلال طریقے سے حاصل کیا ہوا جو سرمایہ تمہارے پاس باقی رہ جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو اگر خدا اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔ [۳]

ہٹ دھرموں کی بے بنیاد منطق

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ہٹ دھرم قوم نے اس آسمانی مصلح کی دعوت کے جواب میں کیا ردعمل ظاہر کیا۔

وہ جو بتوں کو اپنے بزرگوں کے آثار اور اپنے اصلی تمدن کی نشانی خیال کرتے تھے اور کم فروشی اور دھوکا بازی سے معاملات میں بڑے بڑے فائدے اور مفادات اٹھاتے تھے حضرت شعیب علیہ السلام کے جواب میں کہنے لگے: اے شعیب: کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں کہ جن کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے تھے اور یا اپنے اموال کے بارے میں اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو تو ایک بردبار حوصلہ مند اور سمجھدار آدمی ہے تجھ سے یہ باتیں بعید ہیں۔ [۴]

---

[۱] سورہ ہود آیت 84

[۲] سورہ ہود آیت 84

[۳] سورہ ہود آیت 86

[۴] سورہ ہود آیت 87

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب کی نماز کا ذکر کیوں کیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اس بناء پر تھا کہ حضرت شعیب زیادہ نماز پڑھتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ نماز انسان کو برے اور قبیح اعمال سے روکتی ہے لیکن وہ لوگ جو نماز اور ترک منکرات کے رابطے کو نہ سمجھ سکے انہوں نے اس بات کا تمسخر اڑایا اور کہا کہ کیا یہ ذکر و اذکار اور حرکات تجھے حکم دیتی ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے طور طریقے اور مذہبی ثقافت کو پاؤں تلے روند دیں یا اپنے اموال کے بارے میں اپنا اختیار گنوا بیٹھیں۔

اس ظالم اور ستم گر قوم نے جب

خود کو شعیبؑ کی منطقی باتوں کے مقابلے میں بے دلیل دیکھا تو اپنی برائیوں کو جاری وساری رکھنے کے لئے ان پر تہمتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

سب سے پہلے وہی پرانا لیبل جو مجرم اور ظالم لوگ ہمیشہ سے خدا کے انبیاء پر لگاتے رہے ہیں آپ پر بھی لگایا اور کہا: ''تو تو بس پاگل ہے''۔[1]

تیری گفتگو میں کوئی منطقی اور مدلل بات دکھائی نہیں دیتی تیرا خیال ہے کہ ایسی باتیں کر کے تو ہمیں اپنے مال میں آزادی عمل سے روک دے، اس کے علاوہ ''تو بھی تو صرف ہماری طرح کا ایک انسان ہے''۔[2] کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم تیری اطاعت کریں گے آخر تجھے ہم پر کون سی فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

''تیرے بارے میں ہمارا یہی خیال ہے کہ تو ایک جھوٹا شخص ہے''۔[3]

ان کی یہ گفتگو کیسی تضادات پر مبنی ہے کبھی تو انہیں ایسا جھوٹا اور مفاد پرست انسان کہتے تھے جو دعوائے نبوت کی وجہ سے ان پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کبھی انہیں مجنون کہتے تھے ان کی آخری بات یہ تھی کہ بہت اچھا ''اگر تو سچا ہے تو ہمارے سر پر آسمان سے پتھر برسا اور ہمیں اس مصیبت میں مبتلا کر دے جس کی ہمیں دھمکی دے رہا ہے تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ ہم ایسی دھمکیوں سے نہیں ڈرتے''۔[4] یہ الفاظ کہہ کر انھوں نے اپنی ڈھٹائی اور بے حیائی کی انتہا کر دی اور اپنے کفر و تکذیب کا بدترین مظاہرہ کیا۔

جناب شعیبؑ کا جواب

لیکن جنہوں نے ان کی باتوں کو حماقت پر حمل کیا تھا اور ان کی بے عقلی کی دلیل قرار دیا تھا حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا: ''اے میری قوم: (اے وہ لوگو: کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں اور جو کچھ میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں) اگر خدا نے مجھے واضح دلیل وحی اور نبوت دی ہو اور اس کے علاوہ مجھے پاکیزہ روزی اور حسب ضرورت مال دیا ہو تو کیا اس صورت میں صحیح ہے کہ میں اس کے فرمان کی مخالفت کروں یا تمہارے بارے میں کوئی غرض رکھوں اور تمہارا خیر خواہ نہ بنوں''۔[5]

اس جملے سے حضرت شعیبؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کام میں میرا صرف روحانی، انسانی اور تربیتی مقصد ہے میں ایسے حقائق کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے اور انسان ہمیشہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جسے نہیں جانتا ہے۔

اس کے بعد یہ عظیم پیغمبر مزید کہتے ہیں: ''یہ گمان نہ کرنا کہ میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں اور پھر خود اسی کی جستجو میں لگ جاؤں''۔[6]

---

[1] سورہ شعراء آیت 185

[2] سورہ شعراء آیت 185

[3] سورہ شعراء آیت 186

[4] سورہ شعراء آیت 186

[5] سورہ ہود آیت 88

[6] سورہ ہود آیت 88

تمہیں کہوں کم فروشی نہ کرو اور دھوکا بازی اور ملاوٹ نہ کرو لیکن میں خود یہ اعمال انجام دوں کہ دولت وثروت اکھٹا کرنے لگوں یا تمہیں تو بتوں کی پرستش سے منع کروں مگر خود ان کے سامنے سر تعظیم خم کروں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام پر الزام لگاتے تھے کہ خود یہ فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا وہ صراحت سے اس امر کی نفی کرتے ہیں۔

آخر میں ان سے کہتے ہیں: ''میرا صرف ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہ ہے اپنی قدرت واستطاعت کے مطابق تمہاری اور تمہارے معاشرے کی اصلاح''۔[1]

یہ وہی ہدف ہے جو تمام پیغمبروں کے پیش نظر رہا ہے، یعنی عقیدے کی اصلاح، اخلاق کی اصلاح، عمل کی اصلاح، روابط اور اجتماعی نظاموں کی اصلاح۔

''اور اس ہدف تک پہنچنے کے لئے صرف خدا سے توفیق طلب کرتا ہوں''۔[2]

مشکلات کے حل کے لئے اس کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے کوشش کرتا ہوں اور اس راہ میں سختیاں گوارا کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اس کے بعد انہیں ایک اخلاقی نکتے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی سے بغض وعداوت کی بناء پر یا تعصب اور ہٹ دھرمی سے اپنے تمام مصالح نظر انداز کر دیتا ہے اور انجام کو فراموش کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان سے فرمایا: ''اے میری قوم ایسا نہ ہو کہ میری دشمنی اور عداوت تمہیں گناہ، عصیاں اور سرکشی پر ابھارے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی بلائیں، مصیبتیں، تکلیفیں عذاب اور سزائیں جو قوم نوح، قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچیں وہ تمہیں بھی آلیں، یہاں تک کہ قوم لوط کے شہروں کا زیر وزبر ہونا اور ان پر سنگباری کا واقعہ تم سے کوئی دور نہیں ہے''۔

نہ ان کا زمانہ تم سے کوئی دور ہے اور نہ ان کے علاقے تم سے دور ہیں اور نہ ہی تمہارے اعمال اور گناہ ان لوگوں سے کچھ کم ہیں۔''مدین'' کہ جو قوم شعیب کا مرکز تھا وہ قوم لوط کے علاقے سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں شامات کے علاقوں میں تھے۔ زمانے کے لحاظ سے اگرچہ کچھ فاصلہ تھا تاہم اتنا نہیں کہ ان کی تاریخ فراموش ہو چکی ہوتی۔ باقی رہا عمل کے لحاظ سے تو اگرچہ قوم لوط کے جنسی انحرافات نمایاں تھے اور قوم شعیب کے اقتصادی انحرافات زیادہ تھے۔ اور ظاہراً بہت مختلف تھے لیکن دونوں معاشرے میں فساد پیدا کرنے، اجتماعی نظام خراب کرنے، اخلاقی فضائل کو نابود کرنے اور برائی پھیلانے میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے۔

ایک دوسرے کو دھمکیاں

یہ عظیم پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کہ انتہائی جچے تلے، بلیغ اور دلنشین کلام کی وجہ سے جن کا لقب ''خطیب الانبیاء'' ہے، ان کا کلام ان لوگوں کے لئے روحانی ومادی زندگی کی راہیں کھولنے والا تھا۔ انہوں نے بڑے صبر، حوصلے، متانت اور دلسوزی کے ساتھ ان سے تمام باتیں کیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس گمراہ قوم نے انہیں کس طرح سے جواب دیا۔

---

[1] سورہ ہود آیت 88

[2] سورہ ہود آیت 88

انہوں نے چار جملوں میں کہ جو ڈھٹائی، جہالت اور بے خبری کا مظہر تھے آپؑ کو جواب دیا: پہلے وہ کہنے لگے: ''اے شعیب علیہ السلام تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں''۔ [1]

بنیادی طور پر تیری باتوں کا کوئی سر پیر نہیں، ان میں کوئی خاص بات اور منطق ہی نہیں کہ ہم ان پر کوئی غور وفکر کریں۔ لہٰذا ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس پر ہم عمل کریں اس لیے تم اپنے آپ کو زیادہ نہ تھکاؤ اور دوسرے لوگوں کے پیچھے جاؤ۔

''دوسرا یہ کہ ہم تجھے اپنے مابین کمزور پاتے ہیں''۔ [2]

لہٰذا اگر تم یہ سوچتے ہو کہ تم اپنی بے منطق باتیں طاقت کے بل پر منوالو گے تو یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔

یہ گمان نہ کرو کہ اگر ہم تم سے پوچھ گچھ نہیں کرتے تو یہ تمہاری طاقت کے خوف سے ہے۔ اگر تیری قوم وقبیلہ کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو ہم تجھے بدترین طریقے سے قتل کر دیتے اور تجھے سنگسار کرتے۔ [3]

آخر میں انہوں نے کہا: ''تو ہمارے لیے کوئی طاقتور اور ناقابل شکست نہیں ہے''۔ [4]

اگرچہ تو اپنے قبیلے کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے لیکن جو پروگرام تیرے پیش نظر ہے اس کی وجہ سے ہماری نگاہ میں کوئی وقعت اور منزلت نہیں ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام ان باتوں کے نشتروں اور توہین آمیز رویّے سے (سیخ پا ہو کر) اٹھ کر نہیں گئے بلکہ آپؑ نے اس طرح انہیں پر منطق اور بلیغ پیرائے میں جواب دیا: ''اے قوم میرے قبیلے کے یہ چند افراد تمہارے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز ہیں۔'' [5]

تم میرے خاندان کی خاطر کہ جو تمہارے بقول چند نفر سے زیادہ نہیں ہے، مجھے آزار نہیں پہنچاتے ہو، تو کیوں خدا کے لیے تم میری باتوں کو قبول نہیں کرتے ہو۔ کیا عظمت خدا کے سامنے چند افراد کی کوئی حیثیت ہے؟

کیا تم خدا کے لئے کسی احترام کے قائل ہو'' جبکہ اسے اور اس کے فرمان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔'' [6]

آخر میں حضرت شعیب علیہ السلام کہتے ہیں: ''یہ خیال نہ کرو کہ خدا تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا اور تمہاری باتیں نہیں سنتا۔ یقین جانو کہ میرا پروردگار ان تمام اعمال پر محیط ہے جو تم انجام دیتے ہو''۔ [7]

بلیغ سخن ور وہ ہے کہ جو اپنی باتوں میں مدمقابل کی تمام تنقیدوں کا جواب دے۔ قوم شعیب علیہ السلام کے مشرکین نے چونکہ اپنی باتوں کے آخر میں ضمناً انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی اور ان کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا لہٰذا ان کی دھمکی کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنے موقف کو اس طرح سے بیان کیا:

اے میری قوم جو کچھ تمہارے بس میں ہے کر گزرو اور اس میں کوتاہی نہ کرو اور جو کچھ تم سے ہوسکتا ہے اس میں رورعایت نہ کرو۔ میں بھی اپنا کام کروں گا۔ لیکن تم جلد سمجھ جاؤ گے کہ کون رسوا کن عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اور کون جھوٹا ہے میں یا تم۔

---

[1] سورہ ہود آیت 91

[2] سورہ ہود آیت 91

[3] سورہ شعیب آیت 91

[4] سورہ ہود آیت 91

[5] سورہ ہود آیت 92

[6] سورہ ہود آیت 92

[7] سورہ ہود آیت 92

اوراب جبکہ معاملہ اس طرح ہے توتم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں، تم اپنی طاقت، تعداد، سرمائے اور اثر ورسوخ سے مجھ پر کامیابی کے انتظار میں رہو اور میں بھی اس انتظار میں ہوں کہ عنقریب دردناک عذاب الٰہی تم جیسی گمراہ قوم کے دامن گیر ہو اور تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹادے۔

مدین کے تباہ کاروں کا انجام

گزشتہ اقوام کی سرگزشت کے بارے میں قرآن مجید میں ہم نے بارہا پڑھا ہے کہ پہلے مرحلے میں انبیاء انہیں خدا کی طرف دعوت دینے کے لیے قیام کرتے تھے اور ہر طرح سے تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ دوسرے مرحلے میں جب ایک گروہ پر پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا تو انہیں عذاب الٰہی سے ڈراتے تاکہ وہ آخری افراد تسلیم حق ہو جائیں جو قبولیت کی اہلیت رکھتے ہیں اور راہ خدا کی طرف پلٹ آئیں نیز اتمام حجت ہو جائے۔

تیسرے مرحلے میں جب ان پر کوئی چیز مؤثر نہ ہوتی تو روئے زمین کی ستھرائی اور پاک سازی کر لیے سنت الٰہی کے مطابق عذاب آجاتا اور راستے کے ان کانٹوں کو دور کر دیتا۔

قوم شعیب علیہ السلام یعنی اہل مدین کا بھی آخر کار مرحلہ انجام آپہنچا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ''جب (اس گمراہ، ظالم اور ہٹ دھرم قوم کو عذاب دیئے جانے کے بارے میں) ہمارا فرمان آپہنچا تو ہم نے شعیب علیہ السلام اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت کی برکت سے نجات دی۔''[1] ''پھر آسمانی پکار اور مرگ آفریں عظیم صیحہ نے ظالموں اور ستمگروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔''[2]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ''صیحہ'' ہر قسم کی عظیم آواز اور پکار کے معنی میں ہے، قرآن نے بعض قوموں کی نابودی صیحہ آسمانی کے ذریعے بتائی ہے۔ یہ صیحہ احتمالاً صاعقہ کے ذریعے یا اس کی مانند ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم نے قوم ثمود کی داستان میں بیان کیا ہے کہ صوتی امواج بعض اوقات اس قدر قوی ہو سکتی ہیں کہ ایک گروہ کی موت کا سبب بن جائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ''اس آسمانی صیحہ کے اثر سے قوم شعیب کے لوگ اپنے گھروں میں منہ کے بل جا گرے اور مر گئے اور ان کے بے جان جسم درس عبرت بنے ہوا ایک مدت تک وہیں پڑے رہے''۔[3]

ان کی زندگی کی کتاب اس طرح بند کر دی گئی کہ ''گویا کبھی وہ اس سرزمین کے ساکن ہی نہ تھے''۔

سات روز تک شدت کی گرمی پڑی اور ہوا بالکل نہ چلی، اس کے بعد اچانک آسمان پر بادل آئے، ہوا چلی ان کو گھروں سے نکال پھینکا، گرمی کی وجہ سے بادل کے سایہ کے نیچے چلے گئے۔

اس وقت صاعقہ موت کا پیغام لے کر آئی خطرناک آواز، آگ کی بارش اور زمین میں زلزلہ آگیا، اس طرح وہ سب نابود ہو گئے۔

وہ تمام دولت وثروت کہ جس کی خاطر انہوں نے گناہ اور ظلم و ستم کیے نابود ہو گئی۔ انکی زمینیں اور زرق برق زندگی ختم ہو گئی اور ان کا شور وغوغا خاموش ہو گیا اور آخر کار جیسا کہ قوم عاد و ثمود کی داستان کے آخر میں بیان ہوا ہے فرمایا گیا ہے: دور ہو سرزمین مدین

---

[1] سورہ ہود آیت 94

[2] سورہ ہود آیت 94

[3] سورہ ہود آیت 94

لطف ورحمت پروردگار سے جیسے کہ قوم ثمود دور ہوئی۔ [1]

''واضح ہے کہ یہاں''مدین'' سے مراد اہل مدین ہیں جو رحمت خدا سے دور ہوئے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

تمام پیغمبر کی نسبت قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ زیادہ آیا ہے۔تیس سے زیادہ سورتوں میں موسیٰ علیہ السلام وفرعون اور بنی اسرائیل کے واقعہ کی طرف سو مرتبہ سے زیادہ اشارہ ہوا ہے۔

اگر ہم ان آیتوں کی الگ الگ شرح کریں اس کے بعد ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں تو بعض افراد کے اس توہم کے برخلاف کہ قرآن میں تکرار سے کام لیا گیا ہے، ہم کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں نہ صرف تکرار نہیں ہے بلکہ ہر سورہ میں جو بحث چھیڑی گئی ہے اس کی مناسبت سے اس سرگزشت کا ایک حصہ شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ضمناً یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے اس زمانے میں مملکت مصر نسبتاً وسیع مملکت تھی۔وہاں کے رہنے والوں کا تمدن بھی حضرت نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔لہٰذا حکومت فراعنہ کی مقاومت بھی زیادہ تھی۔

اسی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک اور نہضت بھی اتنی اہمیت کی حامل ہوئی کہ اس میں بہت زیادہ عبرت انگیز نکات پائے جاتے ہیں۔بنابریں اس قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور بنی اسرائیل کے حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلی طور پر اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے پانچ ادوار

1۔ پیدائش سے لے کر آغوش فرعون میں آپؑ کی پرورش تک کا زمانہ۔

2۔مصر سے آپؑ کا نکلنا اور شہر مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس کچھ وقت گزارنا۔

3۔آپؑ کی بعثت کا زمانہ اور فرعون اور اس کی حکومت والوں سے آپؑ کے متعدد تنازعے۔

4۔فرعونیوں کے چنگل سے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور وہ حوادث جو راستہ میں اور بیت المقدس پہنچنے پر رونما ہوئے۔

5۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان کشمکش کا زمانہ۔

ولادت حضرت موسیٰ علیہ السلام

حکومت فرعون نے بنی اسرئیل کے یہاں جو نومولود لڑکے ہوتے تھے انہیں قتل کرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا تھا۔یہاں تک کہ فرعون کی مقرر کردہ دائیاں بنی اسرائیل کی باردار عورتوں کی نگرانی کرتی تھیں۔

ان دائیوں میں سے ایک والدہ موسیٰ علیہ السلام کی دوست بن گئی تھی۔(شکم مادر میں موسیٰ علیہ السلام کا حمل مخفی رہا اور اس کے آثار ظاہر نہ ہوئے) جس وقت مادر موسیٰ علیہ السلام کو یہ احساس ہوا کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب ہے تو آپ نے کسی کے ذریعہ اپنی دوست دائی کو

---

[1] سورہ ہود آیت 95

بلانے بھیجا۔ جب وہ آ گئی تو اس سے کہا: میرے پیٹ میں ایک فرزند ہے، آج مجھے تمہاری دوستی اور محبت کی ضرورت ہے۔

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے تو آپ کی آنکھوں میں ایک خاص نور چمک رہا تھا، چنانچہ اسے دیکھ کر وہ دایہ کانپنے لگی اور اس کے دل کی گہرائی میں محبت کی ایک بجلی سما گئی، جس نے اس کے دل کی تمام فضاء کو روشن کر دیا۔

یہ دیکھ کر وہ دایہ، مادر موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہو کر بولی کہ میرا یہ خیال تھا کہ حکومت کے دفتر میں جا کے اس بچے کے پیدا ہونے کی خبر دوں تا کہ جلاد آئیں اور اسے قتل کر دیں اور میں اپنا انعام پالوں۔ مگر میں کیا کروں کہ میں اپنے دل میں اس نوزائیدہ بچے کی شدید محبت کا احساس کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔ اس کی اچھی طرح حفاظت کرو۔ میرا خیال ہے کہ آخر کار یہی ہمارا دشمن ہوگا۔

جناب موسیٰ علیہ السلام تنور میں

وہ دایہ مادر موسیٰ علیہ السلام کے گھر سے باہر نکلی۔ تو حکومت کے بعض جاسوسوں نے اسے دیکھ لیا۔ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ گھر میں داخل ہو جائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے اپنی ماں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا ماں یہ سن کے گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔

اس شدید پریشانی کے عالم میں جب کہ وہ بالکل حواس باختہ ہو رہی تھی اس نے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور تنور میں ڈال دیا۔ اس دوران میں حکومت کے آدمی آ گئے۔ مگر وہاں انھوں نے روشن تنور کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ انھوں نے مادر موسیٰ علیہ السلام سے تفتیش شروع کر دی۔ پوچھا۔ دایہ یہاں کیا کر رہی تھی۔؟ موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے کہا کہ وہ میری سہیلی ہے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ حکومت کے کارندے مایوس ہو کے واپس ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ہوش آیا۔ آپ نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے؟ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ناگہاں تنور کے اندر سے بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ اب ماں تنور کی طرف دوڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ خدا نے اس کے لئے آتش تنور کو ''ٹھنڈا اور سلامتی کہ جگہ'' بنا دیا ہے۔ وہی خدا جس نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کے لیے آتش نمرود کو ''برد و سلام'' بنا دیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بچے کو صحیح وسالم باہر نکال لیا۔

لیکن پھر بھی ماں محفوظ نہ تھی۔ کیونکہ حکومت کے کارندے دائیں بائیں پھرتے رہتے اور جستجو میں لگے رہتے تھے۔ کسی بڑے خطرے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک نوزائید بچے کے رونے کی آواز سن لیتے۔

اس حالت میں خدا کے ایک الہام نے ماں کے قلب کو روشن کر دیا۔ وہ الہام ایسا تھا کہ ماں کو بظاہر ایک خطرناک کام پر آمادہ کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی ماں اس ارادے سے اپنے دل میں سکون محسوس کرتی تھی۔

''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں کچھ خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور نہ غمگین ہونا کیونکہ ہم اسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اسے رسولوں میں سے قرار دیں گے''۔ [1]

اس نے کہا: ''خدا کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوا ہے۔ میں اسے ضرور انجام دوں گی''۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اس الہام کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو دریائے نیل میں ڈال دوں گی۔

---

[1] سورہ قصص آیت 7

اس نے ایک مصری بڑھئی کو تلاش کیا (وہ بڑھئی قبطی اور فرعون کی قوم میں سے تھا) اس نے اس بڑھئی سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک چھوٹا سا صندوق بنا دے۔

بڑھئی نے پوچھا: جس قسم کا صندوقچہ تم بنوانا چاہتی ہو اسے کس کام میں لاؤ گی؟

موسیٰ علیہ السلام کی ماں جو دروغ گوئی کی عادی نہ تھی اس نازک مقام پر بھی سچ بولنے سے باز نہ رہی۔ اس نے کہا: میں بنی اسرائیل کی ایک عورت ہوں۔ میرا ایک نوزائیدہ بچہ لڑکا ہے۔ میں اس بچے کو اس صندوق میں چھپانا چاہتی ہوں۔

اس قبطی بڑھئی نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ جلادوں کو یہ خبر پہنچادے گا۔ وہ تلاش کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔ مگر جب وہ انہیں یہ خبر سنانے لگا تو اس کے دل پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اس کی زبان بند ہوگئی۔ وہ صرف ہاتھوں سے اشارے کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان علامتوں سے انہیں اپنا مطلب سمجھا دے۔ حکومت کے کارندوں نے اس کی حرکات دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ شخص ہم سے مذاق کررہا ہے۔ اس لیے اسے مارا اور باہر نکال دیا۔

جیسے ہی وہ اس دفتر سے باہر نکلا اس کے ہوش وحواس یکجا ہوگئے، وہ پھر جلادوں کے پاس گیا اور اپنی حرکات سے پھر مار کھائی۔

آخر اس نے یہ سمجھا کہ اس واقعے میں ضرور کوئی الٰہی راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اس نے صندوق بنا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دے دیا۔

دریا کی موجیں گہوارے سے بہتر

غالباً صبح کا وقت تھا۔ ابھی اہل مصر محوخواب تھے۔ مشرق سے پو پھوٹ رہی تھی۔ ماں نے نوزائیدہ بچے اور صندوق کو دریائے نیل کے کنارے لائی، بچے کو آخری مرتبہ دودھ پلایا۔ پھر اسے مخصوص صندوق میں رکھا (جس میں یہ خصوصیت تھی کہ ایک چھوٹی کشتی کی طرح پانی پر تیر سکے) پھر اس صندوق کو نیل کی موجوں کے سپرد کردیا۔

نیل کی پرشور موجوں نے اس صندوق کو جلد ہی ساحل سے دور کردیا۔ ماں کنارے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ معاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے سے نکل کر موجوں کے اوپر تیر رہا ہے۔ اس وقت، اگر الطاف الٰہی اس کے دل کو سکون وقرار نہ بخشتا تو یقیناً وہ زور زور سے رونے لگتی اور پھر سارا راز فاش ہوجاتا، کسی آدمی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ان حساس لمحات میں ماں پر جو گزر رہی تھی۔ الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچ سکے مگر۔ ایک فارسی شاعرہ نے کسی حد تک اس منظر کو اپنے فصیح اور پر از جذبات اشعار میں مجسم کیا ہے۔

ترجمہ اشعار:

1۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے حکم الٰہی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔

2۔ وہ ساحل پر کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اے میرے بے گناہ ننھے بیٹے

3۔ اگر لطف الٰہی تیرے شامل حال نہ ہوتو، تو اس کشتی میں کیسے سلامت رہ سکتا ہے جس کا کوئی ناخدا نہیں ہے۔

4۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو اس وقت وحی ہوئی کہ تیری یہ کیا خام خیالی ہے ہمارا مسافر تو سوئے منزل رواں ہے۔

5۔ تو نے جب اس بچے کو دریا میں ڈالا تھا تو ہم نے اسے اسی وقت سنبھال لیا تھا۔ تو نے خدا کا ہاتھ دیکھا مگر اسے پہچانا نہیں۔

6۔اس وقت پانی کی سطح (اس کے لیے)اس کے گہوارے سے زیادہ راحت بخش ہے۔دریا کا سیلاب اس کی دایہ گیری کررہاہے اوراس کی موجیں آغوش مادر بنی ہوئی ہیں۔

7۔دیکھو! دریاؤں میں ان کے ارادہ و اختیار سے طغیانی نہیں آتی۔وہ ہمارے حکم کے مطیع ہیں وہ وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہوتا ہے۔

8۔ہم ہی سمندروں کوطوفانی ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ہم ہی سیل دریا کو روانی اورامواج بحر کوتلاطم کا فرمان بھیجتے ہیں۔

9۔ہستی کانقش ہمارے ایوان کے نقوش میں سے ایک نقش ہے جو کچھ ہے، یہ کائنات تواس کا مشتے ازخرواری نمونہ ہے۔اور خاک، پانی، ہوااور آتش ہمارے ہی اشارے سے متحرک ہیں۔

10۔بہتر یہی ہے کہ تو بچے کو ہمارے سپرد کردے اور خود واپس چلی جا۔کیونکہ تو اس سے ہم سے زیادہ محبت نہیں کرتی۔

دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت

اب دیکھنا چاہئے کہ فرعون کے محل میں کیا ہورہا تھا؟

روایات میں مذکور ہے کہ فرعون کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔وہ ایک سخت بیماری سے شدید تکلیف میں تھی۔فرعون نے اس کا بہت کچھ علاج کرایا مگر بے سود۔اس نے کاہنوں سے پوچھا۔انھوں نے کہا:''اے فرعون ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اس دریا میں سے ایک آدمی تیرے محل میں داخل ہوگا۔اگر اس کے منہ کی رال اس بیمار کے جسم پر ملی جائے گی تو اسے شفا ہوجا ئیگی''۔

چنانچہ فرعون اوراس کی ملکہ آسیہ ایسے واقعے کے انتظار میں تھے کہ ناگہاں ایک روز انہیں ایک صندوق نظر آیا جو موجوں کی سطح پر تیر رہا تھا۔فرعون نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین فوراً دیکھیں کہ یہ صندوق کیسا ہے اوراسے پانی میں سے نکال لیں۔دیکھیں کہ اس میں کیا ہے؟

نوکروں نے وہ عجیب صندوق فرعون کے سامنے لا کے رکھ دیا۔کسی کو اس کا ڈھکنا کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔مطابق مشیت الٰہی، یہ لازمی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کے لیے صندوق کا ڈھکنا فرعون ہی کے ہاتھ سے کھولا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جس وقت فرعون کی ملکہ نے اس بچے کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ ایک بجلی چمکی ہے جس نے اس کے دل کو منور کردیا ہے۔

ان دونوں بالخصوص فرعون کی ملکہ کے دل میں اس بچے کی محبت نے گھر بنالیا اور جب اس بچے کا آب دہن اس کے لیے موجب شفا ہوگیا تو یہ محبت اور بھی زیادہ ہوگئی۔

قرآن میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ:۔فرعون کے اہل خانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو نیل کی موجوں کے اوپر سے پکڑ لیا۔تا کہ وہ ان کا دشمن اوران کے لیے باعث اندوہ ہوجائے۔[1]

''یہ امر بدیہی ہے کہ فرعون کے اہل خانہ نے اس بچے کے قنداقہ (وہ کپڑا جس میں بچہ کو لپیٹتے ہیں) کو اس نیت سے دریا سے نہیں نکالا تھا کہ اپنے جانی دشمن کو اپنی گود میں پالیں، بلکہ وہ لوگ بقول ملکہ فرعون، اپنے لیے ایک نور چشم حاصل کرنا چاہتے تھے''۔

لیکن انجام کار ایسا ہی ہوا،اس معنی ومراد کی تعبیر میں لطافت یہی ہے کہ خدا اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح

[1] سورہ قصص آیت 8

اس گروہ کوجنھوں نے اپنی تمام قوتیں اور وسائل، بنی اسرائیل کی اولاد ذکور کوقتل کرنے کے لیے وقف کردیا تھا،اس خدمت پر مامور کرے کہ جس بچے کو نابود کرنے کے لیے انھوں نے یہ پروگرام بنایا تھا،اسی کو وہ اپنی جان کی طرح عزیز رکھیں اور اسی کی پرورش کریں۔

قرآن کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بچے کی بابت فرعون،اس کی ملکہ اور دیگر اہل خاندان میں باہم نزاع اور اختلاف بھی ہوا تھا، کیونکہ قرآن شریف میں یوں بیان ہے: فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کا نور ہے۔اسے قتل نہ کرو۔ممکن ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون بچے کے چہرے اور دیگر علامات سے،من جملہ ان کے اسے صندوق میں رکھنے اور دریائے نیل میں بہادینے سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کسی کا بچہ ہے۔

یہ سمجھ کرنا گہاں، بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کی بغاوت اور اس کی سلطنت کے زوال کا کابوس اس کی روح پر مسلط ہوگیا اور وہ اس امر کا خواہاں ہوا کہ اس کا وہ ظالمانہ قانون، جو بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ اطفال کے لیے جاری کیا گیا تھا اس بچے پر بھی نافذ ہو۔

فرعون کے خوشامدی درباریوں اور رشتہ داروں نے بھی اس امر میں فرعون کی تائید وحمایت کی اور کہا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ بچہ قانون سے مستثنیٰ رہے۔

لیکن فرعون کی بیوی آسیہ جس کے بطن سے کوئی لڑکا نہ تھا اور اس کا پاک دل فرعون کے درباریوں کی مانند نہ تھا،اس بچے کے لیے محبت کی کان بن گیا تھا۔چنانچہ وہ ان سب کی مخالفت پر آمادہ ہوگئی اور چونکہ اس قسم کے گھریلو اختلافات میں فتح ہمیشہ عورتوں کی ہوتی ہے،وہ بھی جیت گئی۔

اگر اس گھریلو جھگڑے پر، دختر فرعون کی شفایابی کے واقعے کا بھی اضافہ کرلیا جائے تو اس اختلاف باہمی میں آسیہ کی فتح کا امکان روشن تر ہوجاتا ہے۔

قرآن میں ایک بہت ہی پر معنی فقرہ ہے:''وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کررہے ہیں:''[2]

البتہ وہ بالکل بے خبر تھے کہ خدا کا واجب النفوذ فرمان اور اس کی شکست ناپذیر مشیت نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ یہ طفل نوزائیدہ انتہائی خطرات میں پرورش پائے۔اور کسی آدمی میں بھی ارادہ ومشیت الٰہی سے سرتابی کی جرأت اور طاقت نہیں ہے۔

اللہ کی عجیب قدرت

اس چیز کا نام قدرت نمائی نہیں ہے کہ خدا آسمان وزمین کے لشکروں کو مامور کرکے کسی پُرقوت اور ظالم قوم کو نیست و نابود کردے۔

بلکہ قدرت نمائی یہ ہے کہ ان ہی جباران مستکبر سے یہ کام لے کر وہ اپنے آپ کو خود ہی نیست ونابود کرلیں اور ان کے دل و

---

[1] سورہ قصص آیت 9

[2] سورہ قصص آیت 9

دماغ میں ایسے خیالات پیدا ہوجائیں کہ بڑے شوق سے لکڑیاں جمع کریں اوراس کی آگ میں جل مریں، اپنے لیے خود ہی قید خانہ بنائیں اوراس میں اسیر ہو کے جان دے دیں، اپنے لیے خود ہی صلیب کھڑی کریں اوراس پر چڑھ مرجائیں۔

فرعون اور اسکے زورمند اور ظالم ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ چنانچہ تمام مراحل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات اور پرورش انہی کے ہاتھوں سے ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دایہ قبطیوں میں سے تھی، صندوق موسیٰ علیہ السلام کو امواج نیل سے نکالنے اور نجات دینے والے متعلقین فرعون تھے، صندوق کا ڈھکنا کھولنے والا خود فرعون یا اس کی اہلیہ تھی، اور آخرکار فرعون شکن اور مالک غلبہ واقتدار موسیٰ علیہ السلام کے لیے امن وآرام اور پرورش کی جگہ خود فرعون کا محل قرار پایا۔

یہ ہے پروردگار عالم خدا کی قدرت۔

موسیٰ علیہ السلام پھر آغوش مادر میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے اس طرح سے جیسا کہ ہم نے پیشتر بیان کیا ہے، اپنے فرزند کو دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کردیا۔ مگر اس عمل کے بعد اس کے دل میں جذبات کا ایک شدید طوفان اٹھنے لگا، نوزائیدہ بیٹے کی یاد، جس کے سوا اس کے دل میں کچھ نہ تھا، اس کے احساسات پر غالب آگئی تھی، قریب تھا کہ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور اپنا راز فاش کردے، قریب تھا کہ چیخ مارے اور اپنے بیٹے کی جدائی میں نالے کرے۔

لیکن عنایت خداوندی اس کے شامل حال رہی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: ”موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل اپنے فرزند کی یاد کے سوا ہر چیز سے خالی ہوگیا، اگر ہم نے اس کا دل ایمان اور امید کے نور سے روشن نہ کیا ہوتا تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کردیتی۔ لیکن ہم نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ اہل ایمان میں سے رہے“۔ [1]

یہ قطعی فطری امر ہے کہ: ایک ماں جو اپنے بچے کو اس صورت حال سے اپنے پاس سے جدا کرے وہ اپنی اولاد کے سوا ہر شے کو بھول جائے گی۔ اور اس کے حواس ایسے باختہ ہوجائیں گے کہ ان خطرات کا لحاظ کیے بغیر جو اس کے اور اس کے بیٹے دونوں کے سر پر منڈلا رہے تھے فریاد کرے اور اپنے دل کا راز فاش کردے۔

لیکن وہ خدا جس نے اس ماں کے سپرد یہ اہم فریضہ کیا تھا، اسی نے اس کے دل کو ایسا حوصلہ بھی بخشا کہ وعدہ الٰہی پر اس کا ایمان ثابت رہے اور اسے یہ یقین رہے کہ اس کا بچہ خدا کے ہاتھ میں ہے آخرکار وہ پھر اسی کے پاس آجائے گا اور پیغمبر بنے گا۔

اس لطف خداوندی کے طفیل ماں کے دل کا سکون لوٹ آیا مگر اسے آرزو رہی کہ وہ اپنے فرزند کے حال سے باخبر رہے ”اس لئے اس نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ جا تو دیکھتی رہ کہ اس پر کیا گزرتی ہے“۔ [2]

موسیٰ علیہ السلام کی بہن ماں کا حکم بجالائی اور اتنے فاصلہ سے جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا دیکھتی رہی۔ اس نے دور سے دیکھا کہ فرعون کے عمال اس کے بھائی کے صندوق کو پانی میں سے نکال رہے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں سے نکال کر گود میں لے رہے ہیں۔

”مگر وہ لوگ اس بہن کی اس کیفیت حال سے بے خبر تھے“۔ [3]

---

[1] سورہ قصص آیت 10

[2] سورہ قصص آیت 11

[3] سورہ قصص آیت 11

بہر حال ارادہ الٰہی یہ تھا کہ یہ طفل نوزاد جلد اپنی ماں کے پاس واپس جائے اور اس کے دل کو قرار آئے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے تمام دودھ پلانے والی عورتوں کو اس پر حرام کر دیا تھا''۔ [1]

یہ طبعی ہے کہ شیر خوار نوزاد چند گھنٹے گزرتے ہی بھوک سے رونے لگتا ہے اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ دریں حال لازم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی تلاش کی جاتی۔ خصوصاً جبکہ ملکہ مصر اس بچے سے نہایت دل بستگی رکھتی تھی اور اسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھتی تھی۔

محل کے تمام خدام حرکت میں آ گئے اور در بدر کسی دودھ پلانے والی کو تلاش کرنے لگے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ کسی کا دودھ پیتا ہی نہ تھا۔

ممکن ہے کہ وہ بچہ ان عورتوں کی صورت ہی سے ڈرتا ہو اور ان کے دودھ کا مزہ (جس سے وہ آشنا نہ تھا) اسے اس کا ذائقہ ناگوار اور تلخ محسوس ہوتا ہو۔ اس بچے کا طور کچھ اس طرح کا تھا گویا کہ ان (دودھ پلانے والی) عورتوں کی گود سے اچھل کے دور جا گرے دراصل یہ خدا کی طرف سے ''تحریم تکوینی'' تھی کہ اس نے تمام عورتوں کو اس پر حرام کر دیا تھا۔

بچہ لحظہ بہ لحظہ زیادہ بھوکا اور زیادہ بیتاب ہوتا جاتا تھا۔ بار بار رو رہا تھا اور اس کی آواز سے فرعون کے محل میں شور ہو رہا تھا۔ اور ملکہ کا دل لرز رہا تھا۔

خدمت پر مامور لوگوں نے اپنی تلاش کو تیز تر کر دیا۔ ناگہاں قریب ہی انہیں ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ وہ ان سے یہ کہتی ہے: میں ایک ایسے خاندان کو جانتی ہوں جو اس بچے کی کفالت کر سکتا ہے۔ وہ لوگ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔

''کیا تم لوگ یہ پسند کرو گے کہ میں تمہیں وہاں لے چلوں''؟ [2]

میں بنی اسرائیل میں سے ایک عورت کو جانتی ہوں جس کی چھاتیوں میں دودھ ہے اور اس کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا ایک بچہ تھا وہ اسے کھو چکی ہے۔ وہ ضرور اس بچے کو جو محل میں پیدا ہوا ہے، دودھ پلانے پر آمادہ ہو جائے گی۔

وہ تلاش کرنے والے خدام یہ سن کر خوش ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو فرعون کے محل میں لے گئے۔ اس بچے نے جونہی اپنی ماں کی خوشبو سونگھی اس کا دودھ پینے لگا۔ اور اپنی ماں کا روحانی رس چوس کر اس میں جان تازہ آ گئی۔ اسکی آنکھوں میں خوشی کا نور چمکنے لگا۔

اس وقت وہ خدام جو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے تھے۔ بہت ہی زیادہ خوش و خرم تھے۔ فرعون کی بیوی بھی اس وقت اپنی خوشی کو نہ چھپا سکی۔ ممکن ہے اس وقت لوگوں نے کہا ہو کہ تو کہاں چلی گئی تھی۔ ہم تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔ تجھ پر اور تیرے شیر مشکل کشا پر آفرین ہے۔

صرف تیرا ہی دودھ کیوں پیا

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ماں کا دودھ پینے لگے، فرعون کے وزیر ہامان نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ تو ہی اسکی ماں ہے۔ بچے نے ان تمام عورتوں میں سے صرف تیرا ہی دودھ کیوں قبول کر لیا؟

---

[1] سورہ قصص آیت 12

[2] سورہ قصص آیت 12

ماں نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایسی عورت ہوں جس کے دودھ میں سے خوشبو آتی ہے۔ میرا دودھ نہایت شیریں ہے۔ اب تک جو بچہ بھی مجھے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی میرا دودھ پینے لگتا ہے۔

حاضرین دربار نے اس قول کی صداقت کو تسلیم کرلیا اور ہر ایک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو گراں بہا ہدیے اور تحفے دیے۔

ایک حدیث جو امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے اس میں منقول ہے کہ: ''تین دن سے زیادہ کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ خدا نے بچے کو اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا''۔

بعض اہل دانش کا قول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ ''تحریم تکوینی'' (یعنی دوسری عورتوں کا حرام کیا جانا) اس سبب سے تھا کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا فرستادہ پیغمبر ایسا دودھ پیئے جو حرام سے آلودہ ہو اور ایسا مال کھا کے بنا ہو جو چوری، ناجائز ذرائع، رشوت اور حق الناس کو غصب کر کے حاصل کیا گیا ہو۔

خدا کی مشیت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی صالحہ ماں کے پاک دودھ سے غذا حاصل کریں۔ تاکہ وہ اہل دنیا کے شر کے خلاف ڈٹ جائیں اور اہل شر و فساد سے نبرد آزمائی کر سکیں۔

''ہم نے اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں روشن ہوجائیں اور اس کے دل میں غم و اندوہ باقی نہ رہے اور وہ یہ جان لے کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ اگرچہ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے''۔ [1]

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: کیا وابستگان فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پورے طور سے ماں کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ اسے گھر لے جائے اور دودھ پلایا کرے اور دوران رضاعت روزانہ یا کبھی کبھی بچے کو محل میں لایا کرے تاکہ ملکہ مصر اسے دیکھ لیا کرے یا یہ کہ بچہ محل ہی میں رہتا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں معین اوقات میں آ کر اسے دودھ پلا جاتی تھی؟

مذکورہ بالا دونوں احتمالات کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ لیکن احتمال اول زیادہ قرین قیاس ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ: آیا عرصہ شیر خوارگی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں چلے گئے یا ان کا تعلق اپنی ماں اور خاندان کے ساتھ باقی رہا اور محل سے وہاں آتے جاتے رہے؟

اس مسئلے کے متعلق بعض صاحبان نے یہ کہا ہے کہ شیر خوارگی کے بعد آپ کی ماں نے انہیں فرعون اور اس کی بیوی آسیہ کے سپرد کر دیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان دونوں کے پاس پرورش پاتے رہے۔

اس ضمن میں راویوں نے فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طفلانہ (مگر بامعنی) باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اس مقام پر ہم ان کو بعذر طول کلام کے پیش نظر قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن فرعون کا یہ جملہ کہ اس نے بعثت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کہا: ''کیا ہم نے تجھے بچپن میں پرورش نہیں کیا اور کیا تو برسوں تک ہمارے درمیان نہیں رہا''۔ [2]

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام چند سال تک فرعون کے محل میں رہتے تھے۔

علی ابن ابراھیم کی تفسیر سے استفادہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تا زمانہ بلوغ فرعون کے محل میں نہایت احترام کے ساتھ رہے۔ مگر ان کی توحید کے بارے میں واضح باتیں فرعون کو سخت ناگوار ہوتی تھیں۔

---

[1] سورہ قصص آیت 1

[2] سورہ شعراء آیت 18

یہاں تک کہ اس نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خطرے کو بھانپ گئے اور بھاگ کر شہر میں آ گئے۔ یہاں وہ اس واقعے سے دوچار ہوئے کہ دو آدمی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک قبطی اور ایک سبطی تھا۔[1]

موسیٰ علیہ السلام مظلوموں کے مددگار کے طور پر

اب ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشیب وفراز سے بھر پور زندگی کے تیسرے دور کو ملاحظہ کرتے ہیں۔

اس دور میں ان کے وہ واقعات ہیں جو انہیں دوران بلوغ اور مصر سے مدین کو سفر کرنے سے پہلے پیش آئے اور یہ وہ اسباب ہیں جو ان کی ہجرت کا باعث ہوئے۔

''بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب تمام اہل شہر غافل تھے''۔[2]

یہ واضح نہیں ہے کہ یہ کونسا شہر تھا۔لیکن احتمال قوی یہ ہے کہ یہ مصر کا پایہ تخت تھا۔بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس مخالفت کی وجہ سے جو ان میں فوعون اور اس کے وزراء میں تھی اور بڑھتی جا رہی تھی،مصر کے پایہ تخت سے نکال دیا گیا تھا۔مگر جب لوگ غفلت میں تھے۔موسیٰ علیہ السلام کو موقع مل گیا اور وہ شہر میں آ گئے۔

اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل سے نکل کر شہر میں آئے ہوں کیونکہ عام طور پر فرعونیوں کے محلات شہر کے ایک کنارے پر ایسی جگہ بنائے جاتے تھے جہاں سے وہ شہر کی طرف آمد ورفت کے راستوں کی نگرانی کر سکیں۔

شہر کے لوگ اپنے مشاغل معمول سے فارغ ہو چکے تھے اور کوئی بھی شہر کی حالت کی طرف متوجہ نہ تھا۔مگر یہ کہ وہ وقت کونسا تھا؟بعض کا خیال ہے کہ ''ابتدائے شب''تھی،جب کہ لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو جاتے ہیں،ایسے میں کچھ تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔کچھ تفریح اور رات کو بیٹھ کے باتیں کرنے لگتے ہیں۔

بہر کیف حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں آئے اور وہاں ایک ماجرے سے دوچار ہوئے دیکھا:''دو آدمی آپس میں بھڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ان میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طرف دار اور ان کا پیرو تھا اور دوسرا ان کا دشمن تھا''۔[3]

کلمہ ''شیعتہ''اس امر کا غماز ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل میں اسی زمانے سے مراسم ہو گئے تھے اور کچھ لوگ ان کے پیرو بھی تھے احتمال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مقلدین اور شیعوں کی روح کو فرعون کی جابرانہ حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے بطور ایک مرکزی طاقت کے تیار کر رہے تھے۔

جس وقت بنی اسرائیل کے اس آدمی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا:''تو ان سے اپنے،دشمن کے مقابلے میں امداد چاہی''۔[4]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گئے تا کہ اسے اس ظالم دشمن کے ہاتھ سے نجات دلائیں بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ قبطی فرعون کا ایک باورچی تھا اور چاہتا تھا کہ اس بنی اسرائیل کو بیکار میں پکڑ کے اس سے لکڑیاں اٹھوائے''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی کے سینے پر ایک مکا مارا وہ ایک ہی مکے میں مر گیا اور زمین پر گر پڑا''۔[5]

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

[2] سورہ قصص آیت 18

[3] سورہ قصص آیت 15

[4] سورہ قصص آیت 15

[5] سورہ قصص آیت 15

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس فرعونی کو جان سے مار دینے کا ارادہ نہ تھا قرآن سے بھی یہ خوب واضح ہوجاتا ہے ایسا اس لئے نہ تھا کہ وہ لوگ مستحق قتل نہ تھے بلکہ انہیں ان نتائج کا خیال تھا جو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو پیش آسکتے تھے۔

لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً کہا: ''کہ یہ کام شیطان نے کرایا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا دشمن اور واضح گمراہ کرنے والا ہے''۔[1]

اس واقعے کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ بنی اسرئیلی کا گریبان اس فرعونی کے ہاتھ سے چھڑادیں ہر چند کہ وابستگان فرعون اس سے زیادہ سخت سلوک کے مستحق تھے لیکن ان حالات میں ایسا کام کربیٹھنا قرین مصلحت نہ تھا اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی عمل کے نتیجے میں پھر مصر میں نہ ٹھہر سکے اور مدین چلے گئے۔

پھر قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے اس نے کہا: ''پروردگارا میں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو مجھے معاف کردے، اور خدا نے اسے بخش دیا کیونکہ وہ غفور ورحیم ہے''۔[2]

یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معاملے میں کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ حقیقت میں ان سے ترک اولیٰ سرزد ہوا کیونکہ انہیں ایسی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہئے تھی جس کے نتیجے میں وہ زحمت میں مبتلا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی ترک اولیٰ کے لئے خدا سے طلب عفو کیا اور خدا نے بھی انہیں اپنے لطف وعنایت سے بہرہ مند کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''خداوندا تیرے اس احسان کے شکرانے میں کہ تو نے میرے قصور کو معاف کردیا اور دشمنوں کے پنجے میں گرفتار نہ کیا اور ان تمام نعمتوں کے شکریہ میں جو مجھے ابتداء سے اب تک مرحمت کرتا رہا، میں عہد کرتا ہوں کہ ہرگز مجرموں کی مدد نہ کروں گا اور ظالموں کا طرف دار نہ ہوں گا''۔[3]

بلکہ ہمیشہ مظلومین اور ستم دیدہ لوگوں کا مددگار رہوں گا۔[4]

مفسرین نے، اس قبطی اور بنی اسرائیل کی باہمی نزاع اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مرد قبطی کے مارے جانے کے بارے میں بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی مخفیانہ مدین کی طرف روانگی

فرعونیوں میں سے ایک آدمی کے قتل کی خبر شہر میں بڑی تیزی سے پھیل گئی قرائن سے شاید لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ اس کا قائل ایک بنی اسرائیل ہے اور شاید اس سلسلے میں لوگ موسیٰ علیہ السلام کا نام بھی لیتے تھے۔

البتہ یہ قتل کوئی معمولی بات نہ تھی اسے انقلاب کی ایک چنگاری یا اس کا مقدمہ شمار کیا جاتا تھا اور درحقیقت یہ معاملہ کوئی اہم اور بحث طلب تھا ہی نہیں کیونکہ ستم پسند وابستگان فرعون نہایت بے رحم اور مفسد تھے انہوں نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کے سر قلم کیے اور بنی اسرائیل پر کسی قسم کا ظلم کرنے سے بھی دریغ نہ کیا اس جہت سے یہ لوگ اس قابل نہ تھے کہ بنی اسرائیل کے لئے ان کا قتل

---

[1] سورہ قصص آیت 15

[2] سورہ قصص آیت 15

[3] سورہ قصص آیت 17

[4] کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کام مقام عصمت کے خلاف نہیں ہے؟

احترام انسانیت کے خلاف ہو۔

البتہ مفسرین کے لئے جس چیز نے دشواریاں پیدا کی ہیں وہ اس واقعے کی وہ مختلف تعبیرات ہیں جو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی ہیں چنانچہ وہ ایک جگہ تو یہ کہتے ہیں:

"ھذا من عمل الشیطان"

''یہ شیطانی عمل ہے''۔

اور دوسری جگہ یہ فرمایا:

"رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی"

''خدایا میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تو مجھے معاف فرمادے''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی یہ دونوں تعبیرات اس مسلمہ حقیقت سے کیونکر مطابقت رکھتی ہیں کہ:

''عصمت انبیاء کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء ماقبل بعثت اور مابعد عطائے رسالت ہر دو حالات میں معصوم ہوتے ہیں''۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عمل کی جو توضیح ہم نے آیات فوق کی روشنی میں پیش کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترک اولیٰ سے زیادہ نہ تھا انھوں نے اس عمل سے اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کرلیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی کا قتل ایسی بات نہ تھی کہ وابستگان فرعون اسے آسانی سے برداشت کر لیتے۔

نیز ہم جانتے ہیں کہ ''ترک اولیٰ'' کے معنی ایسا کام کرنا ہے جو بذات خود حرام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''عمل احسن'' ترک ہوگیا بغیر اس کے کہ کوئی عمل خلاف حکم الٰہی سرزد ہوا ہو؟

حکومت کی مشینری اسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر چھوڑنے والی نہ تھی کہ بنی اسرائیل کے غلام اپنے آقاؤں کی جان لینے کا ارادہ کرنے لگیں۔

لہٰذا ہم قرآن میں یہ پڑھتے ہیں کہ ''اس واقعے کے بعد موسیٰ علیہ السلام شہر میں ڈر رہے تھے اور ہر لحظہ انہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا اور وہ نئی خبروں کی جستجو میں تھے''۔[1]

ناگہاں انہیں ایک معاملہ پیش آیا آپ نے دیکھا کہ وہی بنی اسرائیلی جس نے گزشتہ روز ان سے مدد طلب کی تھی انہیں پھر پکار رہا تھا اور مدد طلب کر رہا تھا (وہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا تھا)۔

''لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر ایک جاہل اور گمراہ شخص ہے''۔[2]

تو ہر روز کسی نہ کسی سے جھگڑ پڑتا ہے اور اپنے لئے مصیبت پیدا کر لیتا ہے اور ایسے کام شروع کر دیتا ہے جن کا ابھی موقع ہی نہیں تھا کل جو کچھ گزری ہے میں تو ابھی اس کے عواقب کا انتظار کر رہا ہوں اور تو نے وہی کام ازسرنو شروع کر دیا ہے۔

بہرحال وہ ایک مظلوم تھا جو ایک ظالم کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا (خواہ ابتدا میں اس سے کچھ قصور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو) اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ اس کی مدد کریں اور اسے اس قبطی کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں لیکن جیسے ہی حضرت

---

[1] سورہ قصص آیت 15

[2] سورہ قصص آیت 16

موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ اس قبطی آدمی کو (جو ان دونوں کا دشمن تھا) پکڑ کر اس بنی اسرائیل سے جدا کریں وہ قبطی چلایا، اس نے کہا: ''اے موسیٰ! کیا تو مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا''۔[1] ''تیری حرکات سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تو زمین پر ایک ظالم بن کر رہے گا اور یہ نہیں چاہتا کہ مصلحین میں سے ہو''۔[2]

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے محل اور اس کے باہر ہر دو جگہ اپنے مصلحانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان کے فرعون سے اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے اسی لئے تو اس قبطی آدمی نے یہ کہا:

یہ کیسی اصلاح طلبی ہے کہ تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کرتا ہے؟

حالانکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارادہ ہوتا کہ اس ظالم کو بھی قتل کر دیں تو یہ بھی راہ اصلاح میں ایک قدم ہوتا۔

بہر کیف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ احساس ہوا کہ گزشتہ روز کا واقعہ طشت از بام ہو گیا ہے اور اس خوف سے کہ اور زیادہ مشکلات پیدا نہ ہوں، انھوں نے اس معاملے میں دخل نہ دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سزائے موت

اس واقعے کی فرعون اور اس کے اہل دربار کو اطلاع پہنچ گئی انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عمل کے مکرر سرزد ہونے کو اپنی شان سلطنت کے لئے ایک تہدید سمجھا۔ وہ باہم مشورے کے لئے جمع ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

(جہاں فرعون اور اس کے اہل خانہ رہتے تھے) وہاں سے ایک شخص تیزی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں مطلع کیا کہ آپ کو قتل کرنے کا مشورہ ہو رہا ہے، آپ فوراً شہر سے نکل جائیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔[3]

یہ آدمی بظاہر وہی تھا جو بعد میں ''مومن آل فرعون'' کے نام سے مشہور ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس کا نام حزقیل تھا وہ فرعون کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا اور ان لوگوں سے اس کے ایسے قریبی روابط تھے کہ ایسے مشوروں میں شریک ہوتا تھا۔

اسے فرعون کے جرائم اور اس کی کرتوتوں سے بڑا دکھ ہوتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کوئی شخص اس کے خلاف بغاوت کرے اور وہ اس کار خیر میں شریک ہو جائے۔

بظاہر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ آس لگائے ہوئے تھا اور ان کی پیشانی میں من جانب اللہ ایک انقلابی ہستی کی علامات دیکھ رہا تھا اسی وجہ سے جیسے ہی اسے یہ احساس ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خطرے میں ہیں، نہایت سرعت سے ان کے پاس پہنچا اور انہیں خطرے سے بچا لیا۔

ہم بعد میں دیکھیں گے کہ وہ شخص صرف اسی واقعے میں نہیں، بلکہ دیگر خطرناک مواقع پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بااعتماد اور ہمدرد ثابت ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خبر کو قطعی درست سمجھا اور اس ایماندار آدمی کی خیر خواہی کو بہ نگاہ قدر دیکھا اور اس کی نصیحت کے مطابق شہر سے نکل گئے۔ ''اس وقت آپ خوف زدہ تھے اور ہر گھڑی انہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا''۔[4]

---

[1] سورہ قصص آیت 19

[2] سورہ قصص آیت 19

[3] سورہ قصص آیت 19

[4] سورہ قصص آیت 21

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت خضوع قلب کے ساتھ متوجہ الی اللہ ہو کر اس بلا کو ٹالنے کے لئے اس کے لطف و کرم کی درخواست کی: ''اے میرے پروردگار: تو مجھے اس ظالم قوم سے رہائی بخش''۔[1]

میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور بے رحم ہیں میں تو مظلوموں کی مدافعت کر رہا تھا اور ظالموں سے میرا کچھ تعلق نہ تھا اور جس طرح سے میں نے اپنی توانائی کے مطابق مظلوموں سے ظالموں کے شر کو دور کیا ہے تو بھی اے خدائے بزرگ ظالموں کے شر کو مجھ سے دور رکھ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ شہر مدین کو چلے جائیں یہ شہر شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں تھا اور قلمرو مصر اور فراعنہ کی حکومت میں شامل نہ تھا۔

مدین کہاں تھا؟

''مدین'' ایک شہر کا نام تھا جس میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کا قبیلہ رہتا تھا یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں تھا (یعنی حجاز کے شمال اور شامات کے جنوب میں) وہاں کے باشندے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے وہ مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے آج کل اس شہر کا نام معان ہے۔[2]

نقشے کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا مصر سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام چند روز میں وہاں پہنچ گئے۔

ملک اردن کے جغرافیائی نقشہ میں، جنوب غربی شہروں میں سے ایک شہر ''معان'' نام کا ملتا ہے، جس کا محل وقوع ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ہے۔

لیکن وہ جوان جو محل کے اندر ناز و نعم میں پلا تھا ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جیسا کہ سفر اسے کبھی زندگی بھر پیش نہ آیا تھا۔

اس کے پاس نہ زاد راہ تھا، نہ توشہ سفر، نہ کوئی سواری، نہ رفیق راہ اور نہ کوئی راستہ بتانے والا، ہر دم یہ خطرہ لاحق تھا۔

کہ حکومت کے اہلکار اس تک پہنچ جائیں اور پکڑ کے قتل کر دیں اس حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کیا حال ہوگا۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ سختی اور شدت کے دنوں کو پیچھے چھوڑ دیں اور قصر فرعون انہیں جس جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔

اسے توڑ کر باہر نکل آئیں اور وہ کمزور اور ستم دیدہ لوگوں کے پاس رہیں ان کے درد و غم کا بہ شدت احساس کریں اور مستکبرین کے خلاف ان کی منفعت کے لئے بحکم الٰہی قیام فرمائیں۔

بعض اہل تحقیق نے اس شہر کی وجہ تسمیہ بھی لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک بیٹا جس کا نام ''مدین'' تھا اس شہر میں رہتا تھا۔

اس طویل، بے زاد و راہ اور بے رفیق و رہنما سفر میں ایک عظیم سرمایہ ان کے پاس تھا اور وہ تھا ایمان اور توکل بر خدا۔

---

[1] سورہ قصص آیت 21

[2] بعض لوگ کلمہ ''مدین'' کا اطلاق اس قوم پر کرتے ہیں جو خلیج عقبہ سے کوہ سینا تک سکونت پذیر تھی توریت میں بھی اس قوم کو ''مدیان'' کہا گیا ہے۔

''لہٰذا جب وہ مدین کی طرف چلے تو کہا: خدا سے امید ہے کہ وہ مجھے راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا''۔[1]

ایک نیک عمل نے موسیٰ علیہ السلام پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے

اس مقام پر ہم اس سرگزشت کے پانچوں حصے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ موقع یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر مدین میں پہنچ گئے ہیں۔

یہ جوان پاکباز انسان کئی روز تک تنہا چلتا رہا یہ راستہ وہ تھا جو نہ کبھی اس نے دیکھا تھا نہ اسے طے کیا تھا بعض لوگوں کے قول کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام مجبور تھے کہ پابرہنہ راستہ طے کریں، بیان کیا گیا ہے کہ مسلسل آٹھ روز تک چلتے رہے یہاں تک کہ چلتے چلتے ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔

جب بھوک لگتی تھی تو جنگل کی گھاس اور درختوں کے پتے کھا لیتے تھے ان تمام مشکلات اور زحمات میں صرف ایک خیال سے ان کے دل کو راحت رہتی تھی کہ انہیں افق میں شہر مدین کا منظر نظر آنے لگا ان کے دل میں آسودگی کی ایک لہر اٹھنے لگی وہ شہر کے قریب پہنچے انہوں نے لوگوں کا ایک انبوہ دیکھا وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ لوگ چرواہے ہیں کہ جو کنویں کے پاس اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے آئے ہیں۔

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کنویں کے قریب آئے تو انھوں نے وہاں بہت سے آمیوں کو دیکھا جو کنویں سے پانی بھر کے اپنے چوپایوں کو پلا رہے تھے، انھوں نے اس کنویں کے پاس دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بھیڑوں کو لئے کھڑی تھیں مگر کنویں کے قریب نہیں آتی تھیں''۔[2]

ان باعفت لڑکیوں کی حالت قابل رحم تھی جو ایک گوشے میں کھڑی تھیں اور کوئی آدمی بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تھا چرواہے صرف اپنی بھیڑوں کی فکر میں تھے اور کسی اور کو موقع نہیں دیتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لڑکیوں کی یہ حالت دیکھی تو ان کے نزدیک آئے اور پوچھا: ''تم یہاں کیسے کھڑی ہو''۔[3]

تم آگے کیوں نہیں بڑھتیں اور اپنی بھیڑوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ حق کشی، ظلم و ستم، بے عدالتی اور مظلوموں کے حقوق کی عدم پاسداری جو انھوں نے شہر مدین میں دیکھی، قابل برداشت نہ تھی۔

مظلوموں کو ظالم سے بچانا ان کی فطرت تھی اسی وجہ سے انھوں نے فرعون کے محل اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور وطن سے بے وطن ہو گئے تھے وہ اپنی اس روش حیات کو ترک نہیں کر سکتے تھے اور ظلم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے

لڑکیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جواب میں کہا: ''ہم اس وقت تک اپنی بھیڑوں کو پانی نہیں پلا سکتے، جب تک تمام چرواہے اپنے حیوانات کو پانی پلا کر نکل نہ جائیں''۔[4]

ان لڑکیوں نے اس بات کی وضاحت کے لئے کہ ان باعفت لڑکیوں کے باپ نے انہیں تنہا اس کام کے لئے کیوں بھیج دیا

---

[1] سورہ قصص آیت 22

[2] سورہ قصص آیت 23

[3] سورہ قصص آیت 23

[4] سورہ قصص آیت 24

ہے یہ بھی اضافہ کیا کہ ہمارا باپ نہایت ضعیف العمر ہے۔

نہ تو اس میں اتنی طاقت ہے کہ بھیڑوں کو پانی پلا سکے اور نہ ہمارا کوئی بھائی ہے جو یہ کام کرلے اس خیال سے کہ کسی پر بار نہ ہوں ہم خود ہی یہ کام کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ باتیں سن کر بہت کوفت ہوئی اور دل میں کہا کہ یہ کیسے بے انصاف لوگ ہیں کہ انہیں صرف اپنی فکر ہے اور کسی مظلوم کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔

''وہ آگے آئے، بھاری ڈول اٹھایا اور اسے کنوئیں میں ڈالا، کہتے ہیں کہ وہ ڈول اتنا بڑا تھا کہ چند آدمی مل کر اسے کھینچ سکتے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوی بازوؤں سے اسے اکیلے ہی کھینچ لیا اور ان دونوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا''۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کنویں کے قریب آئے اور لوگوں کو ایک طرف کیا تو ان سے کہا: ''تم کیسے لوگ ہو کہ اپنے سوا کسی اور کی پرواہ ہی نہیں کرتے''۔

یہ سن کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور ڈول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کر کے بولے:

''لیجئے، بسم اللہ، اگر آپ پانی کھینچ سکتے ہیں، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنہا چھوڑ دیا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت اگرچہ تھکے ہوئے تھے، اور انہیں بھوک لگ رہی تھی مگر قوت ایمانی ان کی مددگار رہوئی، جس نے ان کی جسمانی قوت میں اضافہ کر دیا اور کنویں سے ایک ہی ڈول کھینچ کر ان دنوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا''۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سائے میں آبیٹھے اور بارگاہ ایزدی میں عرض کرنے لگے: ''خداوندا تو مجھے جو بھی خیر اور نیکی بخشے، میں اس کا محتاج ہوں''۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام (اس وقت) تھکے ہوئے اور بھوکے تھے اس شہر میں اجنبی اور تنہا تھے اور ان کے لیے کوئی سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی مگر پھر بھی وہ بے قرار نہ تھے آپ کا نفس ایسا مطمئن تھا کہ دعا کے وقت بھی یہ نہیں کہا کہ ''خدایا تو میرے لیے ایسا یا ویسا کر'' بلکہ یہ کہا کہ: ''تو جو خیر بھی مجھے بخشے میں اس کا محتاج ہوں''۔

یعنی صرف اپنی احتیاج اور نیاز کو عرض کرتے ہیں اور باقی امور الطاف خداوندی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

لیکن دیکھو کہ کار خیر کیا قدرت نمائی کرتا ہے اور اس میں کتنی عجیب برکات ہیں صرف ''لوجہ اللہ'' ایک قدم اٹھانے اور ایک نا آشنا مظلوم کی حمایت میں کنویں سے پانی کے ایک ڈول کھینچنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ایک نیا باب کھل گیا اور یہ عمل خیر ان کے لیے برکات مادی اور روحانی دنیا بطور تحفہ لایا اور وہ ناپید انعمت (جس کے حصول کے لئے انہیں برسوں کوشش کرنا پڑتی) اللہ نے انہیں بخش دی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے خوش نصیبی کا دور اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک نہایت حیا سے قدم اٹھاتی ہوئی آرہی ہے اس کی وضع سے ظاہر تھا کہ اسکو ایک جوان سے باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے وہ لڑکی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب آئی اور صرف ایک جملہ کہا: ''میرے والد صاحب آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ نے ہماری بکریوں کے لئے کنویں سے جو پانی کھینچا تھا، اس کا معاوضہ دیں''۔[3]

---

[1] سورہ قصص آیت 24

[2] سورہ قصص آیت 24

[3] سورہ قصص آیت 25

یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں امید کی بجلی چمکی گویا انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کے لئے ایک عظیم خوش نصیبی کے اسباب فراہم ہورہے ہیں وہ ایک بزرگ انسان سے ملیں گے وہ ایک ایسا حق شناس انسان معلوم ہوتا ہے جو یہ بات پسند نہیں کرتا کہ انسان کی کسی زحمت کا، یہاں تک کہ پانی کے ایک ڈول کھینچنے کا بھی معاوضہ نہ دے یہ ضرور کوئی ملکوتی اورالٰہی انسان ہوگا یا اللہ یہ کیسا عجیب اور نادر موقع ہے؟

بیشک وہ پیر مرد حضرت شعیب علیہ السلام پیغمبر تھے انہوں نے برسوں تک اس شہر کے لوگوں کو ''رجوع الی اللہ'' کی دعوت دی تھی وہ حق پرستی اور حق شناسی کا نمونہ تھے۔

جب انہیں کل واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے تہیہ کرلیا کہ اس اجنبی جوان کو اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب شعیب علیہ السلام کے گھر میں

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ سے حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

بعض روایات کے مطابق وہ لڑکی رہنمائی کے لئے ان کے آگے آگے چل رہی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے چل رہے تھے اس وقت تیز ہوا سے اس لڑکی کا لباس اڑ رہا تھا اور ممکن تھا کہ ہوا کی تیزی لباس کو اس کے جسم سے اٹھا دے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پاکیزہ طبیعت اس منظر کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لڑکی سے کہا: میں آگے آگے چلتا ہوں، تم راستہ بتاتے رہنا۔

جب جناب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر پہنچ گئے ایسا گھر جس سے نور نبوت ساطع تھا اور اس کے ہر گوشے سے روحانیت نمایاں تھی انھوں نے دیکھا کہ ایک پیر مرد، جس کے بال سفید ہیں ایک گوشے میں بیٹھا ہے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوش آمدید کہا اور پوچھا: ''تم کون ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟ کیا مشغلہ ہے؟ اس شہر میں کیا کرتے ہو؟ اور آنے کا مقصد کیا ہے؟ تنہا کیوں ہو؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے اور انہیں اپنی سرگزشت سنائی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا مت ڈرو، تمہیں ظالموں کے گروہ سے نجات مل گئی ہے۔''[1]

ہماری سرزمین ان کی حدود سلطنت سے باہر ہے یہاں ان کا کوئی اختیار نہیں چلتا اپنے دل میں ذرہ بھر پریشانی کو جگہ نہ دینا تم امن وامان سے پہنچ گئے ہو مسافرت اور تنہائی کا بھی غم نہ کرو یہ تمام مشکلات خدا کے کرم سے دور ہوجائیں گی۔حضرت موسی علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ انہیں ایک عالی مرتبہ استاد مل گیا ہے، جس کے وجود سے روحانیت، تقویٰ، معرفت اور زلال عظیم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور یہ استاد ان کی تشنگی تحصیل علم ومعرفت کو سیراب کرسکتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی یہ سمجھ لیا کہ انہیں ایک لائق اور مستعد شاگرد مل گیا ہے، جسے وہ اپنے علم ودانش اور زندگی بھر کے تجربات سے فیض یاب کرسکتے ہیں

یہ مسلم ہے کہ ایک شاگرد کو ایک بزرگ اور قابل استاد پاکر جتنی مسرت ہوتی ہے استاد کو بھی ایک لائق شاگرد پا کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے داماد بن گئے

---

[1] سورہ قصص آیت 25

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے چھٹے دور کا ذکر شروع ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب شعیب علیہ السلام کے گھر آ گئے یہ ایک سادہ سا دیہاتی مکان تھا، مکان صاف ستھرا تھا اور روحانیت سے معمور تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب شعیب علیہ السلام کو اپنی سرگزشت سنائی تو ان کی ایک لڑکی نے ایک مختصر مگر پرمعنی عبارت میں اپنے والد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھیڑوں کی حفاظت کے لئے ملازم رکھ لیں وہ الفاظ یہ تھے:

''اے بابا: آپ اس جوان کو ملازم رکھ لیں کیونکہ ایک بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھ سکتے ہیں وہ ایسا ہونا چاہئے جو قوی اور امین ہو اور اس نے اپنی طاقت اور نیک خصلت دونوں کا امتحان دے دیا ہے''۔[1]

جس لڑکی نے ایک پیغمبر کے زیر سایہ تربیت پائی ہو اسے ایسی ہی مؤدبانہ اور سوچی سمجھی بات کہنی چاہئے نیز چاہئے کہ مختصر الفاظ اور تھوڑی سی عبارت میں اپنا مطلب ادا کر دے۔

اس لڑکی کو کیسے معلوم تھا کہ یہ جوان طاقتور بھی ہے اور نیک خصلت بھی کیونکہ اس نے پہلی بار کنویں پر ہی اسے دیکھا تھا اور اس کی گزشتہ زندگی کے حالات سے وہ بے خبر تھی؟

اس سوال کا جواب واضح ہے اس لڑکی نے اس جوان کی قوت کو تو اسی وقت سمجھ لیا تھا جب اس نے ان مظلوم لڑکیوں کا حق دلانے کے لئے چرواہوں کو کنویں سے ایک طرف ہٹایا تھا اور اس بھاری ڈول کو اکیلے ہی کنویں سے کھینچ لیا تھا اور اس کی امانت اور نیک چلنی اس وقت معلوم ہو گئی تھی کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر کی راہ میں اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک جوان لڑکی اس کے آگے آگے چلے کیونکہ ممکن تھا کہ تیز ہوا سے اس کا لباس جسم سے ہٹ جائے۔

علاوہ بریں اس نوجوان نے اپنی جو سرگزشت سنائی تھی اس کے ضمن میں قبطیوں سے لڑائی کے ذکر میں اس کی قوت کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس امانت و دیانت کی یہ شہادت کافی تھی کہ اس نے ظالموں کی ہم نوائی نہ کی اور ان کی ستم رانی پر اظہار رضامندی نہ کیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کی تجویز کو قبول کر لیا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف رخ کر کے یوں کہا: ''میرا ارادہ ہے کہ اپنی ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کر دوں، اس شرط کے ساتھ کہ تو آٹھ سال تک میری خدمت کرے''۔[2]

اس کے بعد یہ اضافہ کیا: ''اگر تو آٹھ سال کی بجائے یہ خدمت دس سال کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا مگر تجھ پر واجب نہیں ہے''۔[3]

بہر حال میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سے کوئی مشکل کام لوں انشاء اللہ تم جلد دیکھو گے کہ میں صالحین میں سے ہوں، اپنے عہد و پیمان میں وفادار ہوں تیرے ساتھ ہرگز سخت گیری نہ کروں گا اور تیرے ساتھ خیر اور نیکی کا سلوک کروں گا۔[4]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تجویز اور شرط سے موافقت کرتے ہوئے اور عقد کو قبول کرتے ہوئے کہا: ''میرے اور آپ کے درمیان یہ عہد ہے''۔ البتہ ''ان دو مدتوں میں سے (آٹھ سال یا دس سال) جس مدت تک بھی خدمت کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی

[1] سورہ قصص آیت 26
[2] سورہ قصص آیت 27
[3] سورہ قصص آیت 27
[4] سورہ قصص آیت 27

اور میں اس کے انتخاب میں آزاد ہوں''۔[1]

عہد کو پختہ اور خدا کے نام سے طلب مدد کے لئے یہ اضافہ کیا: ''جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا اس پر شاہد ہے''۔[2]

اور اس آسانی سے موسیٰ علیہ السلام داماد شعیب علیہ السلام بن گئے حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کا نام ''صفورہ'' (یا صفوراً) اور ''لیا'' بتایا جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شادی ''صفورہ'' سے ہوئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بہترین ایام

کوئی آدمی بھی حقیقتاً یہ نہیں جانتا کہ ان دس سال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا گزری لیکن بلا شک یہ دس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بہترین سال تھے یہ سال دلچسپ، شیریں اور آرام بخش تھے نیز یہ دس سال ایک منصب عظیم کی ذمہ داری کے لئے تربیت اور تیاری کے تھے۔

درحقیقت اس کی ضرورت بھی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام دس سال کا عرصہ عالم مسافرت اور ایک بزرگ پیغمبر کی صحبت میں بسر کریں اور چرواہے کا کام کریں تاکہ ان کے دل ودماغ سے محلوں کی ناز پروردہ زندگی کا اثر بالکل محو ہو جائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنا عرصہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا تاکہ ان کی تکالیف اور مشکلات سے آگاہ ہو جائے اور ساکنان محلول کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسرار آفرینش میں غور کرنے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھی ایک طویل وقت کی ضرورت تھی اس مقصد کے لئے بیابان مدین اور خانہ شعیب سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک اولوالعزم پیغمبر کی بعثت کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ یہ مقام کسی کو نہایت آسانی سے نصیب ہو جائے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داری ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم تھی اس لئے کہ: روئے زمین کے ظالم ترین لوگوں سے مقابلہ کرنا، ایک کثیر الافراد قوم کی مدت اسیری کو ختم کرنا اور ان کے اندر سے ایام اسیری میں پیدا ہو جانے والے نقائص کو محو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی مخلصانہ خدمات کی قدرشناسی کے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ بھیڑوں کے جو بچے ایک خاص علامت کے ساتھ پیدا ہوں گے، وہ موسیٰ علیہ السلام کو دیدیں گے، اتفاقاً مدت موعود کے آخری سال میں جبکہ موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سے رخصت ہو کر مصر کو جانا چاہتے تھے تو تمام یا زیادہ تر بچے اسی علامت کے پیدا ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی انہیں بڑی محبت سے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا۔

یہ امر بدیہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ساری زندگی چرواہے بنے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے تھے ہر چند ان کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس رہنا بہت ہی غنیمت تھا مگر وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ اپنی اس قوم کی مدد کے لئے جائیں جو غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور جہالت نادانی اور بے خبری میں غرق ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا یہ فرض بھی سمجھتے تھے کہ مصر میں جو ظلم کا بازار گرم ہے اسے سرد کریں، طاغوتوں کو ذلیل کریں اور توفیق

---

[1] سورہ قصص آیت 28

[2] سورہ قصص آیت 28

الٰہی سے مظلوموں کو عزت بخشیں ان کے قلب میں یہی احساس تھا جو انہیں مصر جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔

آخر کار انھوں نے اپنے اہل خانہ، سامان و اسباب اور اپنی بھیڑوں کو ساتھ لیا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی زوجہ کے علاوہ ان کا لڑکا یا کوئی اور اولاد بھی تھی، اسلامی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے توریت کے ''سفر خروج'' میں بھی ذکر مفصل موجود ہے علاوہ ازیں اس وقت ان کی زوجہ امید سے تھی۔

وحی کی تابش اول

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کو جا رہے تھے تو راستہ بھول گئے یا غالباً شام کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جانے کے خوف سے بوجہ احتیاط رائج راستے کو چھوڑ کے سفر کر رہے تھے۔

بہر کیف قرآن شریف میں یہ بیان اس طور سے ہے کہ: ''جب موسیٰ علیہ السلام اپنی مدت کو ختم کر چکے اور اپنے خاندان کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے تو انہیں طور کی جانب سے شعلہ آتش نظر آیا''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل خاندان سے کہا: ''تم یہیں ٹھہرو! مجھے آگ نظر آئی ہے میں جاتا ہوں شاید تمہارے لئے وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا آگ کا ایک انگارا لے آؤں تا کہ تم اس سے گرم ہو جاؤ''۔ [۱]

''خبر لاؤں'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور ''گرم ہو جاؤ'' یہ اشارہ کر رہا ہے کہ سرد اور تکلیف دہ رات تھی۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجہ کی حالت کا کوئی ذکر نہیں ہے مگر تفاسیر اور روایات میں مذکور ہے کہ وہ امید سے تھیں اور انہیں دردِ زہ ہو رہا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام پریشان تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت آگ کی تلاش میں نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ آگ تو ہے مگر معمول جیسی آگ نہیں ہے، بلکہ حرارت اور سوزش سے خالی ہے وہ نور اور تابندگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس منظر سے نہایت حیران تھے کہ ناگہاں اس بلند و پُر برکت سرزمین میں وادی کے داھنی جانب سے ایک درخت میں سے آواز آئی: ''اے موسیٰ میں اللہ رب العالمین ہوں''۔ [۲]

اس میں شک نہیں کہ یہ خدا کے اختیار میں ہے کہ جس چیز میں چاہے قوت کلام پیدا کر دے یہاں اللہ نے درخت میں یہ استعداد پیدا کر دی کیونکہ اللہ موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کرنا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام گوشت پوست کے انسان تھے، کان رکھتے تھے اور سننے کے لئے انہیں امواج صوت کی ضرورت تھی البتہ انبیاء علیہم السلام پر اکثر یہ حالت بھی گزری ہے کہ وہ بطور الہام درونی پیغام الٰہی کو حاصل کرتے رہے ہیں، اسی طرح کبھی انہیں خواب میں بھی ہدایت ہوتی رہی ہے مگر کبھی وہ وحی کو بصورت صدا بھی سنتے رہے ہیں، بہر کیف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو آواز سنی اس سے ہم ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ خدا جسم رکھتا ہے۔

اے موسیٰ جوتی اتار دو

موسیٰ علیہ السلام جب آگ کے پاس گئے اور غور کیا تو دیکھا کہ درخت کی سبز شاخوں میں آگ چمک رہی ہے اور لحظہ بہ لحظہ اس کی

---

[۱] سورہ قصص آیت 29

[۲] سورہ قصص آیت 30

تابش اور درخشندگی بڑھتی جاتی ہے جوعصا ان کے ہاتھ میں تھا اس کے سہارے جھکے تا کہ اس میں سے تھوڑی سی آگ لے لیں تو آگ موسیٰ علیہ السلام کی طرف بڑھی موسیٰ علیہ السلام ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے اس وقت حالت یہ تھی کہ کبھی موسیٰ علیہ السلام آگ کی طرف بڑھتے تھے اور کبھی آگ ان کی طرف، اسی کشمکش میں ناگہاں ایک صدا بلند ہوئی، اور انہیں وحی کی بشارت دی گئی۔

اس طرح نا قابل انکار قرائن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوگیا کہ یہ آواز خدا ہی کی ہے، کسی غیر کی نہیں ہے۔

''میں تیرا پروردگار ہوں، اپنے جوتے اتار دے کیونکہ تو مقدس سرزمین ''طویٰ'' میں ہے''۔[1]

موسیٰ علیہ السلام کو اس مقدس سرزمین کے احترام کا حکم دیا گیا کہ اپنے پاؤں سے جوتے اتار دے اور اس وادی میں نہایت عجز وانکساری کے ساتھ قدم رکھے حق کو سنے اور فرمان رسالت حاصل کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نے یہ آواز کہ ''میں تیرا پروردگار ہوں'' سنی تو حیران رہ گئے اور ایک نا قابل بیان پر کیف حالت ان پر طاری ہوگئی، یہ کون ہے؟ جو مجھ سے باتیں کررہا ہے؟ یہ میرا پروردگار ہے، کہ جس نے لفظ ''ربك'' کے ساتھ مجھے افتخار بخشا ہے تا کہ یہ میرے لئے اس بات کی نشاندہی کرے کہ میں نے آغاز بچپن سے لے کر اب تک اس کی آغوش رحمت میں پرورش پائی ہے اور ایک عظیم رسالت کے لئے تیار کیا گیا ہوں۔''

حکم ملا کہ پاؤں سے اپنا جوتا اتار دو، کیونکہ تو نے مقدس سرزمین میں قدم رکھا ہے وہ سرزمین کہ جس میں نور الٰہی جلوہ گر ہے، وہاں خدا کا پیغام سننا ہے، اور رسالت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے، لہٰذا انتہائی خضوع اور انکساری کے ساتھ اس سرزمین میں قدم رکھو، یہ ہے دلیل پاؤں سے جوتا اتارنے کی۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اس واقعہ سے متعلق ایک عمدہ مطلب نقل ہوا ہے، آپ فرماتے ہیں: جن چیزوں کی تمہیں امید نہیں ہے ان کی ان چیزوں سے بھی زیادہ امید رکھو کہ جن کی تمہیں امید ہے کیونکہ موسیٰ بن عمران ایک چنگاری لینے کے لئے گئے تھے لیکن عہدہ نبوت ورسالت کے ساتھ واپس پلٹے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی امید رکھتا ہے مگر وہ اسے حاصل نہیں ہوتی لیکن بہت سی اہم ترین چیزیں جن کی اسے کوئی امید نہیں ہوتی لطف پروردگار سے اسے مل جاتی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا

اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو اپنے خدا کے ساتھ ربط ثابت کرنے کے لئے معجزے کی ضرورت ہے، ورنہ ہر شخص پیغمبری کا دعویٰ کرسکتا ہے اس بناء پر سچے انبیاء علیہم السلام کا جھوٹوں سے امتیاز معجزے کے علاوہ نہیں ہوسکتا، یہ معجزہ خود پیغمبر کی دعوت کے مطالب اور آسمانی کتاب کے اندر بھی ہوسکتا ہے اور حسی اور جسمانی قسم کے معجزات اور دوسرے امور میں بھی ہوسکتے ہیں علاوہ ازیں معجزہ خود پیغمبر کی روح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اسے قوت قلب، قدرت ایمان اور استقامت بخشتا ہے۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمان نبوت ملنے کے بعد اس کی سند بھی ملنی چاہئے، لہٰذا اسی پُرخطر رات میں جناب موسیٰ علیہ السلام نے دو عظیم معجزے خدا سے حاصل کئے۔

قرآن اس ماجرے کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''خدا نے موسیٰ ؑ سے سوال کیا: اے موسیٰ یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا

[1] سورہ طٰہٰ آیت 12

ہے''؟۔[1]

اس سادہ سے سوال، میں لطف ومحبت کی چاشنی تھی،فطرتاً موسیٰ علیہ السلام، کی روح میں اس وقت طوفانی لہریں موجزن تھیں ایسے میں یہ سوال اطمینان قلب کے لئےبھی تھااورایک عظیم حقیقت کو بیان کرنے کی تمہید بھی تھا۔''موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا: یہ لکڑی میرا عصا ہے''۔[2]

اور چونکہ محبوب نے ان کے سامنے پہلی مرتبہ یوں اپنا دروازہ کھولا تھا لہٰذا وہ اپنے محبوب سے باتیں جاری رکھنا اورانہیں طول دینا چاہتے تھےاوراس وجہ سے بھی کہ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرا صرف یہ کہنا کہ یہ میرا عصا ہے، کافی نہ ہو بلکہ اس سوال کا مقصد اس عصا کے آثار وفوائد کو بیان کرنا مقصود ہو، لہٰذا مزید کہا: ''میں اس پر ٹیک لگا تا ہوں، اور اس سے اپنی بھیڑوں کے لئے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں،اس کےعلاوہ اس سے دوسرے کام بھی لیتا ہوں''۔[3]

البتہ یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ عصا سے کون کون سے کام لیتے ہیں کبھی اس سے موذی جانوروں اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک دفاعی،ہتھیار کےطور پر کام لیتے ہیں کبھی اس کے ذریعے بیابان میں سائبان بنالیتے ہیں،کبھی اس کے ساتھ برتن باندھ کر گہری نہر سے پانی نکالتے ہیں۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک گہرے تعجب میں تھے کہ اس عظیم بارگاہ سے یہ کس قسم کا سوال ہےاورمیرے پاس اس کا کیا جواب ہے، پہلے جوفرمان دیئے گئے تھے وہ کیا تھے،اور یہ پرسش کس لئے ہے؟

موسیٰ سے کہا گیا کہ: اپنے عصا کوزمین پرڈال دو' چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو پھینک دیا اب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عصا سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کررہا ہے یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ مڑ کےبھی نہ دیکھا''۔[4]

جس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عصالیا تھا تا کہ تھکن کے وقت اس کا سہارا لے لیا کریں،اوربھیڑوں کے لئے اس سے پتے جھاڑلیا کریں،انہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ قدرت خدا سے اس میں یہ خاصیت بھی چھپی ہوئی ہوگی اور یہ بھیڑوں کو چرانے کی لاٹھی ظالموں کےمحل کو ہلادے گی۔

موجودات عالم کا یہی حال ہے کہ وہ بعض اوقات ہماری نظر میں بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں مگران میں بڑی بڑی استعداد چھپی ہوتی ہے جوکسی وقت خدا کےحکم سے ظاہر ہوتی ہے۔

اب موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ آواز سنی جوان سے کہہ رہی تھی: ''واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے''۔[5]

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ درگاہ رب العزت میں مطلق امن وامان ہےاورکسی قسم کےخوف وخطر کا مقام نہیں ہے۔

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت17

[2] سورہ طٰہٰ آیت18

[3] سورہ طٰہٰ آیت18

[4] سورہ قصص آیت31

[5] سورہ قصص آیت31

البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں ''ثعبان مبین''(واضح اژدھا) بھی کہا گیا ہے۔(اعراف107 شعراء32)

انذار و بشارت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات عطا کئے گئے ان میں سے پہلا معجزہ خوف کی علامت پر مشتمل تھا اس کے بعد موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اب ایک دوسرا معجزہ حاصل کرو جو نور و امید کی علامت ہو گا اور یہ دونوں معجزہ گویا ''انذار اور بشارت'' تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ ''اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور باہر نکالو موسیٰ علیہ السلام نے جب گریبان میں سے ہاتھ باہر نکالا تو وہ سفید تھا اور چمک رہا تھا اور اس میں کوئی عیب اور نقص نہ تھا''۔[۱]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں یہ سفیدی اور چمک کسی بیماری (مثلا ''برص یا کوئی اس جیسی چیز) کی وجہ سے نہ تھی بلکہ یہ نور الٰہی تھا جو بالکل ایک نئی قسم کا تھا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سنسان کوہسار اور اس تاریک رات میں یہ دو خارق العادۃ ہم نے قبل ازیں کہا ہے کہ اس سانپ کے لئے جو یہ دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ممکن ہے اس کی دو مختلف حالتوں کے لئے ہوں کہ ابتدا میں وہ چھوٹا سا ہو اور پھر ایک بڑا اژدھا بن گیا ہو اس مقام پر یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ موسیٰ نے جب وادی طور میں اسے پہلی بار دیکھا تو چھوٹا سا سانپ تھا، رفتہ رفتہ وہ بڑا ہو گیا۔

اور خلاف معمول چیزیں دیکھیں تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا، چنانچہ اس لئے کہ ان کا اطمینان قلب واپس آجائے انہیں حکم دیا گیا کہ ''اپنے سینے پر اپنا ہاتھ پھیریں تا کہ دل کو راحت ہو جائے''۔[۲]

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے پھر وہی صدا سنی جو کہہ رہی تھی: ''خدا کی طرف سے تجھے یہ دو دلیلیں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لئے دی جاری ہیں کیونکہ وہ سب لوگ فاسق تھے اور ہیں''۔[۳]

جی ہاں یہ لوگ خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں اور سرکشی کی انتہا تک جا پہنچے ہیں تمہارا فرض ہے کہ انہیں نصیحت کرو اور راہ راست کی تبلیغ کرو اور اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

کامیابی کے اسباب کی درخواست

موسیٰ علیہ السلام اس قسم کی سنگین ماموریت پر نہ صرف گھبرائے نہیں، بلکہ معمولی سی تخفیف کے لئے بھی خدا سے درخواست نہ کی، اور کھلے دل سے اس کا استقبال کیا، زیادہ سے زیادہ اس ماموریت کے سلسلے میں کامیابی کے وسائل کی خدا سے درخواست کی اور چونکہ کامیابی کا پلا اور ذریعہ، عظیم روح، فکر بلند اور عقل توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں سینہ کی کشادگی وشرح صدر ہے لہٰذا ''عرض کیا میرے پروردگار میرا سینہ کشادہ کردے''۔[۴]

ہاں، ایک رہبر انقلاب کا سب سے اولین سرمایہ، کشادہ دلی، فراوان حوصلہ، استقامت و بردباری اور مشکلات کے بوجھ کو اٹھانا ہے۔

---

[۱] سورہ قصص آیت 31

[۲] سورہ قصص آیت 32

[۳] سورہ قصص آیت 32

[۴] سورہ طٰہٰ آیت 23

اور چونکہ اس راستے میں بے شمار مشکلات ہیں، جو خدا کے لطف و کرم کے بغیر حل نہیں ہوتیں، لہٰذا خدا سے دوسرا سوال یہ کیا کہ میرے کاموں کو مجھ پر آسان کردے اور مشکلات کو راستے سے ہٹا دے آپ نے عرض کیا: ''میرے کام کو آسان کردے''۔[1]

اس کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام نے زیادہ سے زیادہ قوت بیان کا تقاضا کیا کہنے لگے: ''میری زبان کی گرہ کھول دے''۔[2]

یہ ٹھیک ہے کہ شرح صدر کا ہونا بہت اہم بات ہے، لیکن یہ سرمایہ اسی صورت میں کام دے سکتا ہے جب اس کو ظاہر کرنے کی قدرت بھی کامل طور پر موجود ہو، اسی بناء پر جناب موسیٰ علیہ السلام نے شرح صدر اور رکاوٹوں کے دور ہونے کی درخواستوں کے بعد یہ تقاضا کیا کہ خدا ان کی زبان کی گرہ کھول دے۔

اور خصوصیت کے ساتھ اس کی علت یہ بیان کی: ''تا کہ وہ میری باتوں کو سمجھیں''۔[3]

یہ جملہ حقیقت میں پہلی بات کی تفسیر کر رہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ زبان کی گرہ کے کھلنے سے مراد یہ نہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بچپنے میں جل جانے کی وجہ سے کوئی لکنت آ گئی تھی (جیسا کہ بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے) بلکہ اس سے گفتگو میں ایسی رکاوٹ ہے جو سننے والے کے لئے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے یعنی میں ایسی فصیح و بلیغ اور ذہن میں بیٹھ جانے والی گفتگو کروں کہ ہر سننے والا میرا مقصد اچھی طرح سے سمجھ لے۔

میرا بھائی میرا ناصر و مددگار

بہر حال ایک کامیاب رہبر و رہنما وہ ہوتا ہے کہ جو سعی، فکر اور قدرت روح کے علاوہ وہ ایسی فصیح و بلیغ گفتگو کر سکے کہ جو ہر قسم کے ابہام اور نارسائی سے پاک ہو۔

نیز اس بار سنگین کے لئے۔ یعنی رسالت الٰہی، رہبری بشر اور طاغوتوں اور جابروں کے ساتھ مقابلے کے لئے یار و مددگار کی ضرورت ہے اور یہ کام تنہا انجام دینا ممکن نہیں ہے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار سے جو چوتھی درخواست کی:

''خداوندا میرے لئے میرے خاندان میں سے ایک وزیر اور مددگار قرار دے''۔[4]

البتہ یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تقاضا کر رہے ہیں کہ یہ وزیر ان ہی کے خاندان سے ہو، اس کی دلیل واضح ہے چونکہ اس کے بارے میں معرفت اور شناخت بھی زیادہ ہوگی اور اس کی ہمدردیاں بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی کتنی اچھی بات ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کو اپنا شریک کار بنائے کہ جو روحانی اور جسمانی رشتوں کے حوالے سے اس سے مربوط ہو۔

اس کے بعد خصوصی التماس کے بعد خصوصی طور پر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا: ''یہ ذمہ داری میرے بھائی ہارون کے سپرد کردے''۔[5]

ہارون بعض مفسرین کے قول کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور ان سے تین سال بڑے تھے بلند

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 27

[2] سورہ طٰہٰ آیت 27

[3] سورہ طٰہٰ آیت 28

[4] سورہ طٰہٰ آیت 29

[5] سورہ طٰہٰ آیت 31

قامت فصیح البیان اور اعلیٰ علمی قابلیت کے مالک تھے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے تین سال پہلے رحلت فرمائی۔ [۱]

اور وہ نور اور باطنی روشنی کے بھی حامل تھے، اور حق و باطل میں خوب تمیز بھی رکھتے تھے۔ [۲]

آخری بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسے پیغمبر تھے جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے موسیٰ علیہ السلام کو بخشا تھا۔ [۳]

وہ اس بھاری ذمہ داری کی انجام دہی میں اپنے بھائی موسیٰ علیہ السلام کے دوش بدوش مصروف کار رہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس اندھیری رات میں، اس وادی مقدس کے اندر، جب خدا سے فرمان رسالت کے ملنے کے وقت یہ تقاضا کیا، تو وہ اس وقت دس سال سے بھی زیادہ اپنے وطن سے دور گزار کر آ رہے تھے، لیکن اصولی طور پر اس عرصہ میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ ان کا رابطہ کامل طور پر منقطع نہ ہوا سی لئے اس صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کے بارے میں بات کر رہے ہیں، اور خدا کی درگاہ سے اس عظیم مشن میں اس کی شرکت کے لئے تقاضا کر رہے ہیں۔

اس کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام ہارون کو وزارت و معاونت پر متعین کرنے کے لئے اپنے مقصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''خداوندا میری پشت اس کے ذریعے مضبوط کر دے''۔ [۴]

اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ تقاضا کرتے ہیں: ''اسے میرے کام میں شریک کر دے۔'' [۵]

وہ مرتبہ رسالت میں بھی شریک ہو اور اس عظیم کام کو روبہ عمل لانے میں بھی شریک رہیں، البتہ حضرت ہارون ہر حال میں تمام پروگراموں میں جناب موسیٰ علیہ السلام کے پیرو تھے اور موسیٰ علیہ السلام ان کے امام و پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے۔

آخر میں اپنی تمام درخواستوں کا نتیجہ اس طرح بیان کرتے ہیں: ''تاکہ ہم تیری بہت بہت تسبیح کریں اور تجھے بہت بہت یاد کریں، کیونکہ تو ہمیشہ ہی ہمارے حالات سے آگاہ رہا ہے۔'' [۶]

تو ہماری ضروریات و حاجات کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس راستہ کی مشکلات سے ہر کسی کی نسبت زیادہ آگاہ ہے، ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں اپنے فرمان کی اطاعت کی قدرت عطا فرما دے اور ہمارے فرائض، ذمہ داریوں اور فرائض انجام دینے کے لئے ہمیں توفیق اور کامیابی عطا فرما۔

چونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام کا اپنے مخلصانہ تقاضوں میں سوائے زیادہ سے زیادہ اور کامل ترین خدمت کے اور کچھ مقصد نہیں تھا لہٰذا خداوند عالم نے ان کے تقاضوں کو اسی وقت قبول کر لیا، ''اس نے کہا: اے موسیٰ تمہاری درخواستیں قبول ہیں۔'' [۷]

حقیقت میں ان حساس اور تقدیر ساز لمحات میں چونکہ موسیٰ علیہ السلام پہلی مرتبہ خدائے عظیم کی بساط مہمانی پر قدم رکھ رہے تھے، لہٰذا جس جس چیز کی انہیں ضرورت تھی ان کا خدا سے اکٹھا ہی تقاضا کر لیا، اور اس نے بھی مہمان کا انتہائی احترام کیا، اور اس کی تمام درخواستوں اور تقاضوں کو ایک مختصر سے جملے میں حیات بخش ندا کے ساتھ قبول کر لیا اور اس میں کسی قسم کی قید و شرط عائد نہ کی اور

---

[۱] جیسا کہ سورہ مومنون کی آیہ 45 میں بیان ہوا ہے: (ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۵﴾)

[۲] جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیہ 48 میں بیان ہوا ہے: (وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَضِیَآءً)

[۳] وَوَهَبۡنَا لَهٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ نَبِیًّا ﴿۵۳﴾ (سورہ مریم)

[۴] سورہ طٰہٰ آیت 31

[۵] سورہ طٰہٰ آیت 32

[۶] سورہ طٰہٰ آیت 33 تا 35

[۷] سورہ طٰہٰ آیت 36

موسیٰ علیہ السلام کا نام مکرر لا کر، ہر قسم کے ابہام کو دور کرتے ہوئے اس کی تکمیل کر دی، یہ بات کس قدر شوق انگیز اور افتخار آفرین ہے کہ بندے کا نام مولا کی زبان پر بار بار آئے۔

فرعون سے معرک آرا مقابلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا پہلا مرحلہ ختم ہوا جس میں بتایا گیا ہے کہ انہیں وحی اور رسالت ملی اور انھوں نے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وسائل کے حصول کی درخواست کی۔

اس کے ساتھ ہی زیر نظر دوسرے مرحلے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یعنی فرعون کے پاس جانا اور اس کے ساتھ گفتگو کرنا چنانچہ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اسے یہاں پر بیان کیا جارہا ہے۔

سب سے پہلے مقدمے کے طور پر فرمایا گیا ہے: اب جبکہ تمام حالات سازگار ہیں تو تم فرعون کے پاس جاؤ'' اور اس سے کہو کہ ہم عالمین کے پروردگار کے رسول ہیں''۔[۱]

اور اپنی رسالت کا ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیجئے اور کہیئے'' کہ ہمیں حکم ملا ہے کہ تجھ سے مطالبہ کریں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے''۔[۲]

وہ مصر میں گئے اور اپنے بھائی ہارون کو مطلع کیا اور وہ رسالت جس کے لیے آپؑ مبعوث تھے، اس کا پیغام اسے پہنچایا۔ پھر یہ دونوں بھائی فرعون سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ آخر بڑی مشکل سے اس کے پاس پہنچ سکے۔ اس وقت فرعون کے وزراء اور مخصوص لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو خدا کا پیغام سنایا۔

اس مقام پر فرعون نے زبان کھولی اور شیطنت پر مبنی چند ایک جچے تلے جملے کہے جس سے ان کی رسالت کی تکذیب کرنا مقصود تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: '' آیا بچپن میں ہم نے تجھے اپنے دامن محبت میں پروان نہیں چڑھایا''۔[۳]

ہم نے تجھے دریائے نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی خشمگین موجوں سے نجات دلائی وگرنہ تیری زندگی خطرے میں تھی۔ تیرے لیے دائیوں کو بلایا اور ہم نے اولاد بنی اسرائیل کے قتل کر دینے کا جو قانون مقرر کر رکھا تھا اس سے تجھے معاف کر دیا اور امن وسکون اور ناز ونعمت میں تجھے پروان چڑھایا۔

اور اس کے بعد بھی'' تو نے اپنی زندگی کے کئی سال ہم میں گزارے''۔[۴]

پھر وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے: تو نے وہ اہم کام کیا ہے۔ (فرعون کے حامی ایک قبطی کو قتل کیا ہے)۔[۵]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا کام کرنے کے بعد تم کیونکر رسول بن سکتے ہو؟

---

[۱] سورہ شعراء آیت 16

[۲] سورہ شعراء آیت 17

[۳] سورہ شعراء آیت 18

[۴] سورہ شعراء آیت 18

[۵] سورہ شعراء آیت 19

ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے ''تو ہماری نعمتوں سے انکار کر رہا ہے''۔[۱]

تو کئی سالوں تک ہمارے دستر خوان پر پلتا رہا ہے، ہمارا نمک کھانے کے بعد نمک حلالی کا حق اس طرح ادا کر رہا ہے؟ اس قدر کفران نعمت کے بعد تو کس منہ سے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے؟

در حقیقت وہ بزعم خود اس طرح کی منطق سے ان کی کردار کشی کر کے موسیٰ علیہ السلام کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔

جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی شیطنت آمیز باتیں سن کر اس کے تینوں اعتراضات کے جواب دینا شروع کیے۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے فرعون کے دوسرے اعتراض کا سب سے پہلے جواب دیا (یا پہلے اعتراض کو بالکل جواب کے لائق ہی نہیں سمجھا کیونکہ کسی کا کسی کی پرورش کرنا اس بات کی دلیل نہیں بن جاتا کہ اگر وہ گمراہ ہو تو اسے راہ راست کی بھی ہدایت نہ کی جائے)۔

بہر حال جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں نے یہ کام اس وقت انجام دیا جب کہ میں بے خبر لوگوں میں سے تھا''۔[۲]

یعنی میں نے اسے جو مکا مارا تھا وہ اسے جان سے مار دینے کی غرض نہیں بلکہ مظلوم کی حمایت کے طور پر تھا، میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس طرح اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

پھر موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اس حادثہ کی وجہ سے جب میں نے تم سے خوف کیا تو تمہارے پاس سے بھاگ گیا اور میرے پروردگار نے مجھے دانش عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا''۔[۳]

پھر موسیٰ علیہ السلام اس احسان کا جواب دیتے ہیں جو فرعون نے بچپن اور لڑکپن میں پرورش کی صورت میں ان پر کیا تھا دوٹوک انداز میں اعتراض کی صورت میں فرماتے ہیں: ''تو کیا جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے یہی ہے کہ تو بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لے''۔[۴]

یہ ٹھیک ہے کہ حوادث زمانہ نے مجھے تیرے محل تک پہنچا دیا اور مجھے مجبوراً تمہارے گھر میں پرورش پانا پڑی اور اس میں بھی خدا کی قدرت نمائی کارفرما تھی لیکن ذرا یہ تو سوچو کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کے گھر میں اور ماں کی آغوش میں تربیت نہیں پائی؟ آخر کس لیے؟

کیا تو نے بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رکھا؟ یہاں تک کہ تو نے اپنے خود ساختہ قوانین کے تحت ان کے لڑکوں کو قتل کر دیا اور ان کی لڑکیوں کو کنیز بنایا۔

تیرے بے حد وحساب مظالم اس بات کا سبب بن گئے کہ میری ماں اپنے نومولود بچے کی جان بچانے کی غرض سے مجھے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دے اور پھر منشائے ایزدی یہی تھا کہ میری چھوٹی سی کشتی تمہارے محل کے نزدیک لنگر ڈال دے۔ ہاں تو یہ تمہارے بے اندازہ مظالم ہی تھے جن کی وجہ سے مجھے تمہارا مرہون منت ہونا پڑا اور جنھوں نے مجھے اپنے باپ کے مقدس اور پاکیزہ گھر سے محروم کر کے تمہارے آلودہ محل تک پہنچا دیا۔

دیوانگی کی تہمت

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوٹوک اور قاطع جواب دے دیا جس سے وہ لاجواب اور عاجز ہو گیا تو اس نے کلام کا رخ بدلا

[۱] سورہ شعراء آیت 19

[۲] سورہ شعراء آیت 20

[۳] سورہ شعراء آیت 21

[۴] سورہ شعراء آیت 22

اور موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ کہا تھا ''میں رب العالمین کا رسول ہوں'' تو اس نے اسی بات کو اپنے سوال کا محور بنایا اور کہا یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟[1]

بہت بعید ہے کہ فرعون نے واقعاً یہ بات مطلب کے لئے کی ہو بلکہ زیادہ تر یہی لگتا ہے کہ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا تھا اور تحقیر کے طور پر یہ بات کہی تھی۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیدار اور سمجھ دار افراد کی طرح اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ گفتگو کو سنجیدگی پر محمول کریں اور سنجیدہ ہو کر اس کا جواب دیں اور چونکہ ذات پروردگار عالم انسانی افکار کی دسترس سے باہر ہے لہٰذا انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس کے آثار کے ذریعے استدلال قائم کریں لہٰذا انھوں نے آیات آفاقی کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا: ''(خدا) آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین کا راستہ اختیار کرو''۔[2]

اتنے وسیع و عریض اور باعظمت آسمان و زمین اور کائنات کی رنگ برنگی مخلوق جس کے سامنے تو اور تیرے چاہنے اور ماننے والے ایک ذرہ ناچیز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے، میرے پروردگار کی آفرینش ہے اور ان اشیاء کا خالق و مدبر اور ناظم ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ تیرے جیسی کمزور اور ناچیز سی مخلوق۔

لیکن عظیم آسمانی معلم کے اس قدر محکم بیان اور پختہ گفتگو کے بعد بھی فرعون خواب غفلت سے بیدار نہ ہوا اس نے اپنے ٹھٹھے مذاق اور استہزاء کو جاری رکھا اور مغرور مستکبرین کے پرانے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے ''اپنے اطراف میں بیٹھنے والوں کی طرف منہ کر کے کہا: کیا سن نہیں رہے ہو (کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے)''۔[3]

معلوم ہے کہ فرعون کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں اسی قماش کے لوگ تو ہیں۔ صاحبان زور اور زر ہیں یا پھر ظالم اور جابر کے معاون۔

وہاں پر فرعون کے اطراف میں پانچ سو آدمی موجود تھے، جن کا شمار فرعون کے خواص میں ہوتا تھا۔

اس طرح کی گفتگو سے فرعون یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی منطقی اور دلنشین گفتگو اس گروہ کے تاریک دلوں میں ذرہ بھر بھی اثر نہ کرے اور لوگوں کو یہ باور کروائے کہ انکی باتیں بے ڈھنگی اور نا قابل فہم ہیں۔

مگر جناب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی منطقی اور نپی تلی گفتگو کو بغیر کسی خوف و خطر کے جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے''۔[4]

درحقیقت بات یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو آفاقی آیات کے حوالے سے استدلال کیا اب یہاں پر ''آیات انفس'' اور خود انسان کے اپنے وجود میں تخلیق خالق کے اسرار اور انسانی روح اور جسم میں خداوند عالم کی ربوبیت کے آثار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تاکہ وہ عاقبت نا اندیش مغرور کم از کم اپنے بارے میں تو کچھ سوچ سکیں خود کو اور پھر اپنے خدا کو پہچان سکیں۔

لیکن فرعون اپنی ہٹ دھرمی سے پھر بھی باز نہ آیا، اب استہزاء اور مسخرہ پن سے چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو

---

[1] سورہ شعراء آیت 23

[2] سورہ شعراء آیت 24

[3] سورہ شعراء آیت 25

[4] سورہ شعراء آیت 26

جنون اور دیوانگی کا الزام دیتا ہے چنانچہ اس نے کہا: ''جو پیغمبر تمہاری طرف آیا ہے بالکل دیوانہ ہے''۔ [۱]

وہی تہمت جو تاریخ کے ظالم اور جابر لوگ خدا کے بھیجے ہوئے مصلحین پر لگاتے رہتے تھے۔

یہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہ مغرور فریبی اس حد تک بھی روادار نہ تھا کہ کہے ''ہمارا رسول'' اور ''ہماری طرف بھیجا ہوا'' بلکہ کہتا ہے ''تمہارا پیغمبر'' اور ''تمہاری طرف بھیجا ہوا'' کیونکہ ''تمہارا پیغمبر'' میں طنز اور استہزاء پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس میں غرور اور تکبر کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ میں اس بات سے بالاتر ہوں کہ کوئی پیغمبر مجھے دعوت دینے کے لئے آئے اور موسیٰ علیہ السلام پر جنون کی تہمت لگانے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے جاندار دلائل کو حاضرین کے اذہان میں بے اثر بنایا جائے۔

لیکن یہ ناروا تہمت موسیٰ علیہ السلام کے بلند حوصلوں کو پست نہیں کرسکی اور انھوں نے تخلیقات عالم میں آثار الٰہی اور آفاق و انفس کے حوالے سے اپنے دلائل کو برابر جاری رکھا اور کہا: ''وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم عقل و شعور سے کام لو''۔ [۲]

اگر تمہارے پاس مصر نامی محدود سے علاقے میں چھوٹی سی ظاہری حکومت ہے تو کیا ہوا؟ میرے پروردگار کی حقیقی حکومت تو مشرق و مغرب اور اس کے تمام درمیانی علاقے پر محیط ہے اور اس کے آثار ہر جگہ موجودات عالم کی پیشانی پر چمک رہے ہیں اصولی طور پر خود مشرق و مغرب میں آفتاب کا طلوع و غروب اور کائنات عالم پر حاکم نظام شمسی ہی اس کی عظمت کی نشانیاں ہیں، لیکن عیب خود تمہارے اندر ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ تمہارے اندر سوچنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ [۳]

درحقیقت یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام علیہ اسلام نے اپنی طرف جنون کی نسبت کا بڑے اچھے انداز میں جواب دیا ہے۔

دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دیوانہ میں نہیں ہوں بلکہ دیوانہ اور بے عقل وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کے ان تمام آثار اور نشانات کو نہیں دیکھتا۔

عالم وجود کے ہر در و دیوار پر ذات پروردگار کے اس قدر عجیب و غریب نقوش موجود ہیں پھر بھی جو شخص ذات پروردگار کے بارے میں نہ سوچے اسے خود نقش دیوار ہو جانا چاہئے۔

ان طاقتور دلائل نے فرعون کو سخت بوکھلا دیا، اب اس نے اسی حربے کا سہارا لیا جس کا سہارا ہر بے منطق اور طاقتور لیتا ہے اور جب وہ دلائل سے عاجز ہو جاتا ہے تو اسے آزمانے کی کوشش کرتا ہے۔

''فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو تمہیں قیدیوں میں شامل کردوں گا''۔ [۴] میں تمہاری اور کوئی بات نہیں سننا چاہتا میں تو صرف ایک ہی عظیم الہ اور معبود کو جانتا ہوں اور وہ میں خود ہوں اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کہتا ہے تو بس سمجھ لے کہ اس کی سزا یا تو موت ہے یا عمر قید جس میں زندگی ہی ختم ہو جائے۔

درحقیقت فرعون چاہتا تھا کہ اس قسم کی تیز و تند گفتگو کر کے موسیٰ علیہ السلام کو ہراساں کرے تا کہ وہ ڈر کر چپ ہو جائیں کیونکہ اگر بحث جاری رہے گی تو لوگ اس سے بیدار ہوں گے اور ظالم و جابر لوگوں کے لئے عوام کی بیداری اور شعور سے بڑھ کر کوئی اور چیز خطر

---

[۱] سورہ شعراء آیت 27

[۲] سورہ شعراء آیت 28

[۳] سورہ شعراء آیت 28

[۴] سورہ شعراء آیت 29

ناک نہیں ہوتی۔

تمہارا ملک خطرے میں ہے

گزشتہ صفحات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے منطق اور استدلال کی رو سے فرعون پر کیونکر اپنی فوقیت اور برتری کا سکہ منوالیا اور حاضرین پر ثابت کر دیا کہ ان کا خدائی دین کس قدر عقلی و منطقی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ فرعون کے خدائی دعوے کس قدر پوچ اور عقل وخرد سے عاری ہیں کبھی تو وہ استہزاء کرتا ہے، کبھی جنون اور دیوانگی کی تہمت لگا تا ہے اور آخر کار طاقت کے نشے میں آ کر قید و بند اور موت کی دھمکی دیتا ہے۔

اس موقع پر گفتگو کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے اب جناب موسیٰ کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا جس سے فرعون کی ناتوانی ظاہر ہو جائے۔

موسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی طاقت کے سہارے کی ضرورت تھی ایسی خدائی طاقت جس کے معجزانہ انداز ہوں، چنانچہ آپ فرعون کی طرف منہ کر کے فرماتے ہیں: ''آیا اگر میں اپنی رسالت کے لئے واضح نشانی لے آؤں پھر بھی تو مجھے زندان میں ڈالے گا''۔[1]

اس موقع پر فرعون سخت مخمصے میں پڑ گیا، کیونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے ایک نہایت ہی اہم اور عجیب وغریب منصوبے کی طرف اشارہ کر کے حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی اگر فرعون ان کی باتوں کو ان سنی کر کے ٹال دیتا تو سب حاضرین اس پر اعتراض کرتے اور کہتے کہ موسیٰ کو وہ کام کرنے کی اجازت دی جائے اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو معلوم ہو جائے گا اور اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکے گا اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو بھی اس کی شیخی آشکار ہو جائے گی بہرحال موسیٰ علیہ السلام کے اس دعوے کو آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا آخر کار فرعون نے مجبور ہو کر کہا ''اگر سچ کہتے ہو تو اسے لے آؤ''[2]

''اسی دوران میں موسیٰ علیہ السلام نے جو عصا ہاتھ میں لیا ہوا تھا زمین پر پھینک دیا اور وہ (خدا کے حکم سے) بہت بڑا اور واضح سانپ بن گیا''۔[3]

''پھر اپنا ہاتھ آستین میں لے گئے اور باہر نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید اور چمک دار بن چکا تھا''۔[4]

درحقیقت یہ دو عظیم معجزے تھے ایک خوف کا مظہر تھا تو دوسرا امید کا مظہر، پہلے میں انذار کا پہلو تھا تو دوسرے میں بشارت کا، ایک خدائی عذاب کی علامت تھی تو دوسرا نور اور رحمت کی نشانی، کیونکہ معجزے کو پیغمبر خدا کی دعوت کے مطابق ہونا چاہئے۔

فرعون نے جب صورت حال دیکھی تو سخت بوکھلا گیا اور وحشت کی گہری کھائی میں جا گرا، لیکن اپنے شیطانی اقتدار کو بچانے کے لئے جو موسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے ساتھ متزلزل ہو چکا تھا اس نے ان معجزات کی توجیہ کرنا شروع کر دی تا کہ اس طرح سے اطراف میں بیٹھنے والوں کے عقائد محفوظ اور ان کے حوصلے بلند کر سکے اس نے پہلے تو اپنے حواری سرداروں سے کہا: ''یہ شخص ماہر اور سمجھ دار جادوگر ہے''۔[5]

---

[1] سورہ شعراء آیت 31

[2] سورہ شعراء آیت 31

[3] سورہ شعراء آیت 32

[4] سورہ شعراء آیت 33

[5] سورہ شعراء آیت 34

جس شخص کو تھوڑی دیر پہلے تک دیوانہ کہہ رہا تھا اب اسے ''علیم'' کے نام سے یاد کر رہا ہے، ظالم اور جابر لوگوں کا طریقہ کار ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی محفل میں کئی روپ تبدیل کر لیتے ہیں اور اپنی انا کی تسکین کے لئے نت نئے حیلے تراشتے رہتے ہیں۔

اس نے سوچا چونکہ اس زمانے میں جادو کا دور دورہ ہے لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر جادو کا لیبل لگا دیا جائے تاکہ لوگ اس کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں۔

پھر اس نے لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے کہا: ''وہ اپنے جادو کے ذریعے تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے، تم لوگ اس بارے میں کیا سوچ رہے ہو اور کیا حکم دیتے ہو''۔[1]

یہ وہی فرعون ہے جو کچھ دیر پہلے تک تمام سرزمین مصر کو اپنی ملکیت سمجھ رہا تھا ''کیا سرزمین مصر پر میری حکومت اور مالکیت نہیں ہے؟'' اب جبکہ اسے اپنا راج سنگھاسن ڈوبتا نظر آ رہا ہے تو اپنی حکومت مطلقہ کو مکمل طور پر فراموش کر کے اسے عوامی ملکیت کے طور پر یاد کر کے کہتا ہے ''تمہارا ملک خطرات میں گھر چکا ہے اسے بچانے کی سوچو''۔ وہی فرعون جو ایک لحظہ قبل کسی کی بات سننے پر تیار نہیں تھا بلکہ ایک مطلق العنان آمر کی حیثیت سے تخت حکومت پر براجمان تھا اب اس حد تک عاجز اور درماندہ ہو چکا ہے کہ اپنے اطرافیوں سے درخواست کر رہا ہے کہ تمہارا کیا حکم ہے نہایت ہی عاجز اور کمزور ہو کر التجا کر رہا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درباری باہمی طور پر مشورہ کرنے میں لگ گئے وہ اس قدر حواس باختہ ہو چکے تھے کہ سوچنے کی طاقت بھی ان سے سلب ہو گئی تھی ہر کوئی دوسرے کی طرف منہ کر کے کہتا: ''تمہاری کیا رائے ہے؟''[2]

بہرحال کافی صلاح مشورے کے بعد درباریوں نے فرعون سے کہا: ''موسیٰ اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور اس بارے میں جلدی نہ کرو اور تمام شہروں میں ہرکارے روانہ کر دو، تاکہ ہر ماہر اور منجھے ہوئے جادوگر کو تمہارے پاس لے آئیں''۔[3]

دراصل فرعون کے درباری یا تو غفلت کا شکار ہو گئے یا موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کی تہمت کو جان بوجھ کر قبول کر لیا اور موسیٰ کو ''ساحر'' (جادوگر) سمجھ کر پروگرام مرتب کیا کہ ساحر کے مقابلے میں ''سحار'' یعنی ماہر اور منجھے ہوئے جادوگروں کو بلایا جائے چنانچہ انھوں نے کہا: ''خوش قسمتی سے ہمارے وسیع و عریض ملک (مصر) میں فن جادو کے بہت سے ماہر استاد موجود ہیں اگر موسیٰ ساحر ہے تو ہم اس کے مقابلے میں سحار لا کھڑا کریں گے اور فن سحر کے ایسے ایسے ماہرین کو لے آئیں گے جو ایک لمحہ میں موسیٰ کا بھرم کھول کر رکھ دیں گے''۔

ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے

فرعون کے درباریوں کی تجویز کے بعد مصر کے مختلف شہروں کی طرف ملازمین روانہ کر دیئے گئے اور انھوں نے ہر جگہ پر ماہر جادوگروں کی تلاش شروع کر دی ''آخر کار ایک مقررہ دن کی میعاد کے مطابق جادوگروں کی ایک جماعت اکٹھا کر لی گئی''[4]

دوسرے لفظوں میں انھوں نے جادوگروں کو اس روز کے لئے پہلے ہی سے تیار کر لیا تاکہ ایک مقرر دن مقابلے کے لئے پہنچ

---

[1] سورہ شعراء آیت 35
[2] سورہ اعراف آیت 110
[3] سورہ شعراء 35 تا 36
[4] سورہ شعراء آیت 38

جائیں۔

''یوم معلوم'' سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ سورہ اعراف کی آیات سے معلوم ہوتا ہے مصریوں کی کسی مشہور عید کا دن تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے مقابلے کے لئے مقرر کیا تھا اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس دن لوگوں کو فرصت ہوگی اور وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں گے کیونکہ انہیں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آیات خداوندی کی طاقت اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کی کمزوری اور پستی پوری دنیا پر آشکار ہو جائے ''اور زیادہ سے زیادہ لوگوں سے کہا گیا کہ آیا تم بھی اس میدان میں اکٹھے ہو گے؟[1]

اس طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے کارندے اس سلسلے میں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کام کر رہے تھے انہیں معلوم تھا کہ لوگوں کو زبردستی میدان میں لانے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ اس کا منفی ردعمل ہو، کیونکہ ہر شخص فطری طور پر زبردستی کو قبول نہیں کرتا لہٰذا انھوں نے کہا اگر تمہارا جی چاہے تو اس اجتماع میں شرکت کرو اس طرح سے بہت سے لوگ اس اجتماع میں شریک ہوئے۔

لوگوں کو بتایا گیا'' مقصد یہ ہے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے کہ جن کی کامیابی ہمارے خداؤں کی کامیابی ہے تو ہم ان کی پیروی کریں گے''[2] اور میدان کو اس قدر گرم کر دیں گے کہ ہمارے خداؤں کا دشمن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میدان چھوڑ جائے گا۔

واضح ہے کہ تماشائیوں کا زیادہ سے زیادہ اجتماع جو مقابلے کے ایک فریق کے ہمنوا بھی ہوں ایک طرف تو ان کی دلچسپی کا سبب ہوگا اور ان کے حوصلے بلند ہوں گے اور ساتھ ہی وہ کامیابی کے لئے زبردست کوشش بھی کریں گے اور کامیابی کے موقع پر ایسا شور مچائیں گے کہ حریف ہمیشہ کے لئے گوشۂ گمنامی میں چلا جائے گا اور اپنی عددی کثرت کی وجہ سے مقابلے کے آغاز میں فریق مخالف کے دل میں خوف وہراس اور رعب ووحشت بھی پیدا کر سکیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون کے کارندے کوشش کر رہے تھے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں موسیٰ علیہ السلام بھی ایسے کثیر اجتماع کی خدا سے دعا کر رہے تھے تاکہ اپنا مدعا اور مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔

یہ سب کچھ ایک طرف، ادھر جب جادوگر فرعون کے پاس پہنچے اور اسے مشکل میں پھنسا ہوا دیکھا تو موقع مناسب سمجھتے ہوئے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور بھاری انعام وصول کرنے کی غرض سے اس سے کہا:''اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لئے کوئی اہم صلہ بھی ہوگا؟''[3]

فرعون جو بری طرح پھنس چکا تھا اور اپنے لئے کوئی راہ نہیں پاتا تھا انہیں زیادہ سے زیادہ مراعات اور اعزاز دینے پر تیار ہو گیا اس نے فوراً کہا:''ہاں ہاں جو کچھ تم چاہتے ہو میں دوں گا اس کے علاوہ اس صورت میں تم میرے مقربین بھی بن جاؤ گے''۔[4]

درحقیقت فرعون نے ان سے کہا: تم کیا چاہتے ہو؟ مال ہے یا عہدہ: میں یہ دونوں تمہیں دوں گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول اور زمانے میں فرعون کا قرب کس حد تک اہم تھا کہ وہ ایک عظیم انعام کے طور پر اس کی پیش کش کر رہا تھا درحقیقت اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے مطلوب کے زیادہ نزدیک ہو۔

---

[1] سورہ شعراء آیت 39

[2] سورہ شعراء آیت 40

[3] سورہ شعراء آیت 41

[4] سورہ شعراء آیت 42

جادوگروں کا عجیب وغریب منظر

جب جادوگروں نے فرعون کے ساتھ اپنی بات پکی کر لی اور اس نے بھی انعام، اجرت اور اپنی بارگاہ کے مقرب ہونے کا وعدہ کر کے انہیں خوش کر دیا اور وہ بھی مطمئن ہو گئے تو اپنے فن کے مظاہرے اور اس کے اسباب کی فراہمی کے لئے تگ ودو کرنی شروع کر دی، فرصت کے ان لمحات میں انھوں نے بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں اکٹھی کر لیں اور بظاہر ان کے اندر کوکھلا کر کے ان میں ایسا کوئی کیمیکل مواد (پارہ وغیرہ کی مانند) بھر دیا جس سے وہ سورج کی تپش میں ہلکی ہو کر بھاگنے لگتی۔

آخر کار وعدے کا دن پہنچ گیا اور لوگوں کا کثیر مجمع میدان میں جمع ہو گیا تا کہ وہ اس تاریخی مقابلے کو دیکھ سکیں، فرعون اور اس کے درباری، جادوگر اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام سب میدان میں پہنچ گئے۔

لیکن حسب معمول قرآن مجید اس بحث کو خذف کر کے اصل بات کو بیان کرتا ہے۔

یہاں پر بھی اس تاریخ ساز منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: ''موسیٰ نے جادوگروں کی طرف منہ کر کے کہا: جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو اور جو کچھ تمہارے پاس ہے میدان میں لے آؤ''۔[۱]

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس وقت کی جب جادوگروں نے ان سے کہا: ''آپ پیش قدم ہو کر اپنی چیز ڈالیں گے یا ہم؟''[۲]

موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیش کش درحقیقت انہیں اپنی کامیابی پر یقین کی وجہ سے تھی اور اس بات کی مظہر تھی کہ فرعون کے زبردست حامیوں اور دشمن کے انبوہ کثیر سے وہ ذرہ برابر بھی خائف نہیں، چنانچہ یہ پیش کش کر کے آپ نے جادوگروں پر سب سے پہلا کامیاب وار کیا جس سے جادوگروں کو بھی معلوم ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام ایک خاص نفسیاتی سکون سے بہرہ مند ہیں اور وہ کسی ذات خاص سے لو لگائے ہوئے ہیں کہ جو ان کا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔

جادوگر تو غرور ونخوت کے سمندر میں غرق تھے انھوں نے اپنی انتہائی کوششیں اس کام کے لئے صرف کر دی تھیں اور انھیں اپنی کامیابی کا بھی یقین تھا ''لہٰذا انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور کہا فرعون کی عزت کی قسم ہم یقیناً کامیاب ہیں''۔[۳]

جی ہاں: انھوں نے دوسرے تمام چاپلوسیوں خوشامدیوں کی مانند فرعون کے نام سے شروع کیا اور اس کے کھوکھلے اقتدار کا سہارا لیا۔

جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر کہتا ہے: ''اس موقع پر انھوں نے جب رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ چھوٹے بڑے سانپوں کی طرح زمین پر حرکت کرنے لگیں''۔[۴]

انھوں نے اپنے جادو کے ذرائع میں سے لاٹھیوں کا انتخاب کیا ہوا تھا تا کہ وہ بزعم خود موسیٰ کی عصا کی برابری کر سکیں اور مزید برتری کے لئے رسیوں کو بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔

---

[۱] سورہ شعراء آیت 43

[۲] سورہ اعراف آیت 115

[۳] سورہ شعراء آیت 44

[۴] سورہ طٰہٰ آیت 66

اسی دوران میں حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فرعون اور اس کے درباریوں کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اٹھیں اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے یہ منظر دیکھ کر ان کے اندر وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ جھوم رہے تھے۔ چنانچہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان ساحروں کی تعداد کئی ہزار تھی نیز ان کے وسائل سحر بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے چونکہ اس زمانے میں مصر میں سحر و ساحری کا کافی زور تھا اس بنا پر اس بات پر کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

خصوصاً جیسا کہ قرآن [1] کہتا ہے کہ: وہ منظر اتنا عظیم و وحشت ناک تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کی وجہ سے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔

اگرچہ نہج البلاغہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کا خوف لاحق ہو گیا تھا کہ ان جادوگروں کو دیکھ کر لوگ اس قدر متاثر نہ ہو جائیں کہ ان کو حق کی طرف متوجہ کرنا دشوار ہو جائے بہرصورت یہ تمام باتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ اس وقت ایک عظیم معرکہ درپیش تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بفضل الٰہی سر کرنا تھا۔

جادوگروں کے دل میں ایمان کی چمک لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کیفیت کو زیادہ دیر نہیں پنپنے دیا وہ آگے بڑھے اور اپنے عصا کو زمین پر دے مارا تو وہ اچانک ایک اژدھے کی شکل میں بتدیل ہو کر جادوگروں کے ان کرشموں کو جلدی نگلنے لگا اور انہیں ایک ایک کر کے کھا گیا۔ [2]

کیا عصا کا اژدھا بن جانا ممکن ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصا کا اژدھا بن جانا ایک بیّن معجزہ ہے جس کی توجیہ مادی اصول سے نہیں کی جا سکتی، بلکہ ایک خدا پرست شخص کو اس سے کوئی تعجب بھی نہ ہوگا کیونکہ وہ خدا کو قادر مطلق اور سارے عالم کے قوانین کو ارادہ الٰہی کے تابع سمجھتا ہے لہٰذا اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا حیوان کی صورت اختیار کر لے کیونکہ ایک مافوق طبیعت قدرت کے زیر اثر ایسا ہونا عین ممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس جہان طبیعت میں تمام حیوانات کی خلقت خاک سے ہوئی ہے نیز لکڑی و نباتات کی خلقت بھی خاک سے ہوئی ہے لیکن مٹی سے ایک بڑا سانپ بننے کے لئے عادتاً شاید کروڑوں سال کی مدت درکار ہے، لیکن اعجاز کے ذریعے یہ طولانی مدت اس قدر کوتاہ ہو گئی کہ وہ تمام انقلابات ایک لحظہ میں طے ہو گئے جن کی بنا پر مٹی سے سانپ بنتا ہے، جس کی وجہ سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جو قوانین طبیعت کے زیر اثر ایک طولانی مدت میں سانپ بنتا، چند لحظوں میں یہ شکل اختیار کر گیا۔

اس مقام پر کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو تمام معجزات انبیاء کی طبیعی اور مادی توجیہات کرتے ہیں جس سے ان کے اعجازی پہلوؤں کی نفی ہوتی ہے، اور ان کی یہ سعی ہوتی ہے کہ تمام معجزات کو معمول کے مسائل کی شکل میں ظاہر کریں، ہرچند وہ کتب آسمانی کی نص اور الفاظ صریحہ کے خلاف ہو، ایسے لوگوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ اپنی پوزیشن اچھی طرح سے واضح کریں۔ کیا وہ واقعاً خدا کی عظیم قدرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے قوانین طبیعت پر حاکم مانتے ہیں کہ نہیں؟ اگر وہ خدا کو قادر و توانا نہیں سمجھتے تو ان سے انبیاء کے حالات اور ان کے معجزات کی بات کرنا بالکل بے کار ہے اور اگر وہ خدا کو قادر جانتے ہیں تو پھر ذرا تامل کریں کہ ان تکلف آمیز توجیہوں

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 67

[2] سورہ طٰہٰ آیت 66

کی کیا ضرورت ہے جو سراسر آیات قرآنی کے خلاف ہیں (اگر چہ زیر بحث آیت میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی مفسر نے جس کا طریقہ تفسیر کیسا ہی مختلف کیوں نہ ہو اس آیت کی مادی توجیہ کی ہو، تا ہم جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ایک قاعدہ کلی کے طور پر تھا۔

اس موقع پر لوگوں پر یکدم سکوت طاری ہوگیا حاضرین پر سناٹا چھا گیا، تعجب کی وجہ سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے آنکھیں پتھرا گئی گویا ان میں جان ہی نہیں رہی لیکن بہت جلد تعجب کے بجائے وحشت ناک چیخ و پکار شروع ہوگئی، کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے کچھ لوگ نتیجے کے انتظار میں رک گئے اور کچھ لوگ بے مقصد نعرے لگا رہے تھے لیکن جادوگروں کے منہ تعجب کی وجہ سے کھلے ہوئے تھے۔

اس مرحلے پر سب کچھ تبدیل ہوگیا جو جادوگر اس وقت تک شیطانی رستے پر گامزن، فرعون کے ہم رکاب اور موسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے یک دم اپنے آپے میں آگئے اور کیونکہ جادو کے ہر قسم کے ٹونے ٹوٹکے اور مہارت اور فن سے واقف تھے اس لئے انہیں یقین آگیا کہ ایسا کام ہرگز جادو نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ خدا کا ایک عظیم معجزہ ہے "لٰہذا اچانک وہ سارے کے سارے سجدے میں گر پڑے"۔ [1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں پر "القی" کا استعمال کیا ہے جس کا معنی ہے گرادیئے گئے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ بے اختیار زمین پر سجدے میں جا پڑے۔

اس عمل کے ساتھ ساتھ جوان کے ایمان کی روشن دلیل تھا؛ انھوں نے زبان سے بھی کہا: "ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لے آئے"۔ [2]

اور ہر قسم کا ابہام و شک دور کرنے کے لئے انھوں نے ایک اور جملے کا بھی اضافہ کیا تاکہ فرعون کے لئے کسی قسم کی تاویل باقی نہ رہے، انھوں نے کہا: "موسیٰ اور ہارون کے رب پر"۔ [3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصا زمین پر مارنے اور ساحرین کے ساتھ گفتگو کرنے کا کام اگر چہ موسیٰ علیہ السلام نے انجام دیا لیکن ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ ساتھ ان کی حمایت اور مدد کر رہے تھے۔

یہ عجیب و غریب تبدیلی جادوگروں کے دل میں پیدا ہوگئی اور انھوں نے ایک مختصر سے عرصے میں مطلق تاریکی سے نکل کر روشنی اور نور میں قدم رکھ دیا اور جن جن مفادات کا فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا ان سب کو ٹھکرا دیا، یہ بات تو آسان تھی، انھوں نے اس اقدام سے اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا، یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کے پاس علم و دانش تھا جس کے باعث وہ حق اور باطل میں تمیز کرنے میں کامیاب ہوگئے اور حق کا دامن تھام لیا۔

کیا میری اجازت کے بغیر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے؟

اس موقع پر اس طرف تو فرعون کے اوسان خطا ہو چکے تھے اور دوسرے اسے اپنا اقتدار بلکہ اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا خاص طور پر وہ جانتا تھا کہ جادوگروں کا ایمان لانا حاضرین کے دلوں پر کس قدر مؤثر ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کافی سارے لوگ جادوگروں کی دیکھا دیکھی سجدے میں گر جائیں، لٰہذا اس نے بزعم خود ایک نئی اسکیم نکالی اور جادوگروں کی طرف منہ کرکے

---

[1] سورہ شعراء آیت 46

[2] سورہ شعراء آیت 47

[3] سورہ شعراء آیت 48

کہا: ''تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو''۔ [1]

چونکہ وہ سالہا سال سے تخت استبداد پر براجمان چلا آ رہا تھا لہٰذا اسے قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ لوگ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام دیں گے بلکہ اسے تو یہ توقع تھی کہ لوگوں کے قلب و عقل اور اختیار اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، جب تک وہ اجازت نہ دے وہ نہ تو کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ فیصلہ کر سکتے ہیں، جابر حکمرانوں کے طریقے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

لیکن اس نے اسی بات کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دو جملے اور بھی کہے تا کہ اپنے زعم باطل میں اپنی حیثیت اور شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ہی عوام کے بیدار شدہ افکار کے آگے بند باندھ سکے اور انہیں دوبارہ خواب غفلت میں سلا دے۔

اس نے سب سے پہلے جادوگروں سے کہا: ''تمہاری موسیٰ سے یہ پہلے سے لگی بندھی سازش ہے، بلکہ مصری عوام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ ہے اس نے کہا کہ وہ تمہارا بزرگ اور استاد ہے جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم سب نے جادوگری کی تعلیم اسی سے حاصل کی ہے۔'' [2]

تم نے پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے تحت یہ ڈرامہ رچایا ہے تا کہ مصر کی عظیم قوم کو گمراہ کر کے اس پر اپنی حکومت چلاؤ اور اس ملک کے اصلی مالکوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دو اور ان کی جگہ غلاموں اور کنیزوں کو ٹھہراؤ۔

لیکن میں تمہیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی سازش میں کامیاب ہو جاؤ، میں اس سازش کو پنپنے سے پہلے ہی ناکام کر دوں گا ''تم بہت جلد جان لو گے کہ تمہیں ایسی سزا دوں گا جس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں گے تمہارے ہاتھ اور پاؤں کو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کاٹ ڈالوں گا (دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں) اور تم سب کو (کسی استثناء کے بغیر) سولی پر لٹکا دوں گا''۔ [3]

یعنی صرف یہی نہیں کہ تم سب کو قتل کر دوں گا بلکہ ایسا قتل کروں گا کہ جس میں دکھ، درد، تکلیف اور شکنجہ بھی ہو گا اور وہ بھی سرعام کھجور کے بلند درختوں پر کیونکہ ہاتھ پاؤں کے مخالف سمت کے کاٹنے سے احتمالاً انسان کی دیر سے موت واقع ہوتی ہے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔

ہمیں اپنے محبوب کی طرف پلٹا دے

لیکن فرعون یہاں پر سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا کیونکہ کچھ دیر قبل کے جادوگر اور اس وقت کے مومن افراد نور ایمان سے اس قدر منور ہو چکے تھے اور خدائی عشق کی آگ ان کے دل میں اس قدر بھڑک چکی تھی کہ انھوں نے فرعون کی دھمکیوں کو ہرگز ہرگز کوئی وقعت نہ دی بلکہ بھرے مجمع میں اسے دوٹوک جواب دے کر اس کے تمام شیطانی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

انھوں نے کہا: ''کوئی بڑی بات نہیں اس سے ہمیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو، ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے''۔ [4]

اس کام سے نہ صرف یہ کہ تم ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکو گے بلکہ ہمیں اپنے حقیقی معشوق اور معبود تک بھی پہنچا دو گے، تمہاری یہ

---

[1] سورہ شعراء آیت 49

[2] سورہ شعراء آیت 49

[3] سورہ شعراء آیت 49

[4] سورہ شعراء آیت 49

دھمکیاں ہمارے لئے اس وقت مؤثر تھیں جب ہم نے خود کو نہیں پہچانا تھا، اپنے خدا سے نا آشنا تھے اور راہ حق کو بھلا کے زندگی کے بیابان میں سرگردان تھے لیکن آج ہم نے اپنی گمشدہ گراں بہا چیز کو پالیا ہے جو کرنا چاہو کرلو۔

انھوں نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ہم ماضی میں گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اور اس میدان میں بھی اللہ کے سچے رسول جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے میں پیش پیش تھے اور حق کے ساتھ لڑنے میں ہم پیش قدم تھے لیکن ''ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں''۔[1]

ہم آج کسی چیز سے نہیں گھبراتے، نہ تو تمہاری دھمکیوں سے اور نہ ہی بلند و بالا کھجور کے درختوں کے تنوں پر سولی پر لٹک جانے کے بعد ہاتھ پاؤں مارنے سے۔

اگر ہمیں خوف ہے تو اپنے گزشتہ گناہوں کا اور امید ہے کہ وہ بھی ایمان کے سائے اور حق تعالیٰ کی مہربانی سے معاف ہوجائیں گے۔

یہ کیسی طاقت ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نگاہوں میں حقیر ہوجاتی ہے اور وہ سخت سے سخت شکنجوں سے بھی نہیں گھبراتا اور اپنی جان دے دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ یقیناً یہ ایمانی طاقت ہوتی ہے۔

یہ عشق کے روشن و درخشاں چراغ کا شعلہ ہوتا ہے جو شہادت کے شربت کو انسان کے حلق میں شہد سے بھی زیادہ شیریں بنادیتا ہے اور محبوب کے وصال کو انسان کا ارفع و اعلیٰ مقصد بنادیتا ہے۔

بہر حال یہ منظر فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لئے بہت ہی مہنگا ثابت ہوا ہر چند کہ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا اور تازہ ایمان لانے والے جادوگروں کو شہید کر دیا لیکن عوام کے جو جذبات موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اور فرعون کے خلاف بھڑک اٹھے تھے وہ انہیں نہ صرف دبا نہ سکا بلکہ اور بھی برانگیختہ کر دیا۔

اب جگہ جگہ اس خدائی پیغمبر کے تذکرے ہونے لگے اور ہر جگہ ان باایمان شہداء کے چرچے تھے، بہت سے لوگ اس وجہ سے ایمان لے آئے۔ جن میں فرعون کے کچھ نزدیکی لوگ بھی تھے حتیٰ کہ خود اس کی زوجہ ان ایمان لانے والوں میں شامل ہوگئی۔

فرعون کی زوجہ ایمان لے آئی

فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور باپ کا نام مزاحم تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نور ایمان سے روشن ہوگئیں، وہ اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جا سکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہوئی تو اس نے اسے بارہا سمجھایا اور منع کیا اور یہ اصرار کیا کہ موسیٰ کے دین سے دستبردار ہوجائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔

آخر کار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ جکڑ کر اسے سورج کی جلتی ہوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دعا یہ تھی:

---

[1] سورہ شعراء آیت 51

''پروردگارا میرے لئے جنت میں اپنے جوار رحمت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے عمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے''۔

خدا نے بھی اس پاکباز اور فدا کار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریم سلام اللہ علیہا جیسی دنیا کی بہترین خاتون جناب مریم سلام اللہ علیہا کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''اہل جنت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں۔ خویلد کی بیٹی خدیجہ سلام اللہ علیہا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ علیہا السلام اور عمران کی بیٹی مریم سلام اللہ علیہا اور مزاحم کی بیٹی آسیہ علیہا السلام جو فرعون کی بیوی تھی''۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اسے خدا کے جوار رحمت میں گھر کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کے جو اسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل و امکانات کو جو ملکہ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ و اختیار میں ہیں، موسیٰ علیہ السلام جیسے چرواہے پر ایمان لا کر ہاتھ سے نہ دے۔ جواب دیتی ہے:

اور ''نجی من فرعون و عمله'' کے جملہ کے ساتھ خود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

اور ''نجی من القوم الظالمین'' کے جملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے۔

مسلمہ طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال و جبروت موجود نہیں تھا۔ اسی طرح فرعون جیسے جابر و ظالم کے شکنجوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔ لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اے خدا جنت میں اور اپنے جوار میں اس کے لئے ایک گھر بنا دے جس کا جنت میں ہونا تو جنبہ جسمانی ہے اور خدا کے جوار رحمت میں ہونا جنبہ روحانی ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبارت میں جمع کر دیا ہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم

ایک طرف موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے درمیان باہمی نزاع، اور دوسری طرف فرعون اور اس کے ہم نواؤں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کافی حد تک بڑھ گیا اور اس دوران میں بہت سے واقعات رونما ہو چکے، جنہیں قرآن نے اس مقام پر ذکر نہیں کیا بلکہ ایک خاص مقصد کو جسے ہم بعد میں بیان کریں گے پیش نظر رکھ کر ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ حالات بہت خراب ہو گئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام علیہ السلام کی انقلابی تحریک کو دبانے بلکہ ختم کرنے کے لئے ان کے قتل کی ٹھان لی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کے مشیروں اور درباریوں نے اس کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

''فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو تا کہ میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو بلائے تا کہ وہ اسے اس سے نجات دے''۔

[1]

اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس کے اکثر یا کم از کم کچھ مشیر موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مخالف تھے وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ موسیٰ کے کام معجزانہ اور غیر معمولی ہیں لہٰذا ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے بددعا کردے تو اس کا خدا ہم پر عذاب نازل کردے لیکن کبر وغرور کے نشے میں مست فرعون کہنے لگا: میں تو اسے ضرور قتل کروں گا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

یہ بات تو معلوم نہیں ہے کہ فرعون کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے کس بناء پر اسے موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رکھا البتہ یہاں پر چند ایک احتمال ضرور ہیں اور ہوسکتا ہے وہ سب کے سب صحیح ہوں۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ ممکن ہے خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوجائے۔

دوسرا احتمال ان کی نظر میں یہ ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے مارے جانے کے بعد حالات یکسر دگرگوں ہوجائیں گے کیونکہ وہ ایک شہید کا مقام پالیں گے اور انہیں ہیرو کا درجہ مل جائے گا اس طرح سے ان کا دین بہت سے مومن، ہمنوا، طرفدار اور ہمدرد پیدا کرلے گا۔

خلاصہ کلام انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ بذات خود موسیٰ ان کے لئے ایک عظیم خطرہ ہیں لیکن اگر ان حالات میں انہیں قتل کردیا جائے تو یہ حادثہ ایک تحریک میں بدل جائے گا جس پر کنٹرول کرنا بھی مشکل ہوجائے گا اور اس سے جان چھڑانی مشکل تر ہوجائے گی۔

فرعون کے کچھ درباری ایسے بھی تھے جو قلبی طور پر فرعون سے راضی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام زندہ رہیں اور فرعون کی تمام تر توجہ انہی کی طرف مبذول رہے، اس طرح سے وہ چار دن آرام کے ساتھ بسر کرلیں اور فرعون کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر ناجائز مفاد اٹھاتے رہیں کیونکہ یہ ایک پرانا طریقہ کار ہے کہ بادشاہوں کے درباری اس بات کی فکر میں رہتے ہیں کہ ہمیشہ ان کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول رہے تاکہ وہ آسودہ خاطر ہوکر اپنے ناجائز مفادات کی تکمیل میں لگے رہیں۔ اسی لئے تو بعض اوقات وہ بیرونی دشمن کو بھی بھڑکاتے ہیں تاکہ بادشاہ کی فارغ البالی کے شر سے محفوظ رہیں۔

کہیں موسیٰ تمہارا مذہب نہ بدل دے

بہرحال فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کے منصوبے کی توجیہہ کرتے ہوئے اپنے درباریوں کے سامنے اس کی دو دلیلیں بیان کیں۔ ایک کا تعلق دینی اور روحانی پہلو سے تھا اور دوسری کا دنیاوی اور مادی سے، وہ کہنے لگا: مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ تمہارے دین کو تبدیل کردے گا اور تمہارے باپ دادا کے دین کو دگرگوں کردے گا، یا یہ کہ زمین میں فساد اور خرابی برباد کردے گا۔ [2]

اگر میں خاموشی اختیار کرلوں تو موسیٰ بہت جلد مصر والوں میں اتر جائے گا اور بت پرستی کا ''مقدس دین'' جو تمہاری قومیت اور مفادات کا محافظ ہے ختم ہوجائے گا اور اس کی جگہ توحید پرستی کا دین لے لے گا جو یقیناً تمہارے سو فیصد خلاف ہوگا۔

اگر میں آج خاموش ہوجاؤں اور کچھ عرصہ بعد موسیٰ سے مقابلہ کرنے کے لئے اقدام کروں تو اس دوران میں وہ اپنے بہت سے دوست اور ہمدرد پیدا کرلے گا جس کی وجہ سے زبردست لڑائی چھڑ جائے گی جو ملکی سطح پر خونریزی، گڑبڑ اور بے چینی کا سبب بن

---

[1] سورہ مومن آیت 26

[2] سورہ مومن آیت 26

جائے گی اسی لئے مصلحت اسی میں ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس گفتگو سے موسیٰ علیہ السلام نے کس ردعمل کا اظہار کیا جو اس مجلس میں تشریف فرما بھی تھے، قرآن کہتا ہے: موسیٰ نے کہا: ''میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر سے پناہ مانگتا ہوں جو روز حساب پر ایمان نہیں لاتا''۔[1]

موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں بڑے سکون قلب اور اطمینان خاطر سے کیں جوان کے قوی ایمان اور ذات کردگار پر کامل بھروسے کی دلیل ہیں اور اس طرح سے ثابت کر دیا کہ اس کی اس دھمکی سے وہ ذرہ بھر بھی نہیں گھبرائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں مندرجہ ذیل دو صفات پائی جائیں وہ نہایت ہی خطرناک افراد ہیں ایک ''تکبر'' اور دوسرے ''قیامت پر ایمان نہ رکھنا'' اور اس قسم کے افراد سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے۔

آیا کسی کو خدا کی طرف بلانے پر بھی قتل کرتے ہیں؟

یہاں سے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی تاریخ کا ایک اور اہم کردار شروع ہوتا ہے اور وہ ہے ''مؤمن آل فرعون'' جو فرعون کے رشتہ داروں میں سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید قبول کر چکا تھا، لیکن اپنے اس ایمان کو ظاہر نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو خاص طریقے سے موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کا پابند سمجھتا تھا جب اس نے دیکھا کہ فرعون کے غیظ وغضب سے موسیٰ علیہ السلام کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مردانہ وار آگے بڑھا اور اپنی دل نشین اور مؤثر گفتگو سے قتل کی اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''آل فرعون میں سے ایک شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا''

کہا: ''کیا کسی شخص کو صرف اس بناء پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟''[2]

''حالانکہ وہ تمہارے ربّ کی طرف سے معجزات اور واضح دلائل اپنے ساتھ لایا ہے۔''[3]

آیا تم اس کے عصا اور ید بیضاء جیسے معجزات کا انکار کر سکتے ہو؟ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اس کے جادوگروں پر غالب آ جانے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ یہاں تک کہ جادوگروں نے اس کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہماری پرواہ تک نہ کی اور نہ ہی ہماری دھمکیوں کو خاطر میں لائے اور موسیٰ کے خدا پر ایمان لا کر اپنا سر اس کے آگے جھکا دیا، ذرا سچ بتاؤ ایسے شخص کو جادوگر کہا جا سکتا ہے،؟ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، جلد بازی سے کام نہ لو اور اپنے اس کام کے انجام کو بھی اچھی طرح سوچ لو تا کہ بعد میں پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ان سب سے قطع نظر یہ دو حال سے خالی نہیں ''اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹ اس کا خود ہی دامن گیر ہوگا اور اگر سچا ہے تو کم از کم جس عذاب سے تمہیں ڈرایا گیا ہے وہ کچھ نہ کچھ تو تمہارے پاس پہنچ ہی جائے گا''۔[4]

یعنی اگر وہ جھوٹا ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، آخر کار ایک نہ ایک دن اس کا پول کھل جائے گا اور وہ اپنے جھوٹ کی سزا پالے گا لیکن یہ امکان بھی تو ہے کہ شاید وہ سچا ہو اور خدا کی جانب سے بھیجا گیا ہو تو پھر ایسی صورت میں اس کے کئے ہوئے وعدے کسی نہ کسی صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہیں گے لہٰذا اس کا قتل کرنا عقل وخرد سے کوسوں دور ہے۔

---

[1] سورہ مومن آیت 27

[2] سورہ مومن آیت 28

[3] سورہ مومن آیت 28

[4] سورہ مومن آیت 28

اس سے یہ نتیجہ نکلا، ''اللہ تعالیٰ مسرف اور جھوٹے کی ہدایت نہیں فرماتا''۔[1]

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تجاوز واسراف ودروغ کو اختیار کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی ہدایت حاصل نہ کرتے اور اگر تم بھی ایسے ہی ہو گئے تو اس کی ہدایت سے محروم ہو جاؤ گے۔

مومن آل فرعون نے اس پر ہی اکتفاء نہیں کی بلکہ اپنی گفتگو کو جاری رکھا، دوستی اور خیر خواہی کے انداز میں ان سے یوں گویا ہوا: اے میری قوم آج مصر کی طویل وعریض سرزمین پر تمہاری حکومت ہے اور تم ہر لحاظ سے غالب اور کامیاب ہو، اس قدر بے انداز نعمتوں کا کفران نہ کرو، اگر خدائی عذاب ہم تک پہنچ گیا تو پھر ہماری کون مدد کرے گا''۔[2]

ظاہراً اس کی یہ باتیں ''فرعون کے ساتھیوں'' کے لئے غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئیں انہیں نرم بھی بنا دیا اور ان کے غصے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

لیکن یہاں پر فرعون نے خاموشی مناسب نہ سمجھی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: بات وہی ہے جو میں نے کہہ دی ہے۔''جس چیز کا میں معتقد ہوں اسی کا تمہیں بھی حکم دیتا ہوں میں اس بات کا معتقد ہوں کہ ہر حالت میں موسیٰ کو قتل کر دینا چاہئے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے اور میں تو صرف تمہیں صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہوں''۔[3]

میں تمہیں خبردار کرتا ہوں

اس دور میں مصر کے لوگ ایک حد تک متمدن اور پڑھے لکھے تھے انہوں نے قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی گزشتہ اقوام کے بارے میں مؤرخین کی باتیں بھی سن رکھی تھیں اتفاق سے ان اقوام کے علاقوں کا اس علاقے سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا یہ لوگ ان کے دردناک انجام سے بھی کم وبیش واقفیت رکھتے تھے۔

لہٰذا مومن آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کی اس نے دیکھا کہ فرعون کو زبردست اصرار ہے کہ وہ موسیٰ کے قتل سے باز نہیں آئے گا، اس مرد مومن نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ہارنی چاہئے تھی لہٰذا اب کہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اس سرکش قوم کو گزشتہ اقوام کی تاریخ اور انجام کی طرف متوجہ کرے شاید اس طرح سے یہ لوگ بیدار ہوں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں قرآن کے مطابق اس نے اپنی بات یوں شروع کی اس باایمان شخص نے کہا: ''اے میری قوم، مجھے تمہارے بارے میں گزشتہ اقوام کے عذاب کے دن کی طرح کا خوف ہے۔''[4]

پھر اس بات کی تشریح کرتے ہوئے کہا: ''میں قوم نوح علیہ السلام، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والوں کی سی بری عادت سے ڈرتا ہوں''۔[5]

ان قوموں کی عادت شرک، کفر اور طغیان وسرکشی تھی اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ کچھ تو تباہ کن طوفانوں کی نذر ہو گئیں، کچھ وحشت ناک جھگڑوں کی وجہ سے برباد ہوئیں، کچھ کو آسمانی بجلی نے جلا کر راکھ کر دیا اور کچھ زلزلوں کی بھینٹ چڑھ کر صفحہ

---

[1] سورہ مومن آیت 28

[2] سورہ مومن آیت 29

[3] سورہ مومن آیت 29

[4] سورہ مومن آیت 31

[5] سورہ مومن آیت 31

ہستی سے مٹ گئیں۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ کفر اور طغیان پر اصرار کی وجہ سے تم بھی مذکورہ عظیم بلاؤں میں سے کسی ایک کا شکار ہو سکتے ہو؟ لہٰذا مجھے کہنے دو کہ مجھے تمہارے بارے میں بھی اس قسم کے خطرناک مستقبل کا اندیشہ ہے۔

آیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تمہارے کردار و افعال ان سے مختلف ہیں؟ آخر ان لوگوں کا کیا قصور تھا کہ وہ اس طرح کے بھیانک مستقبل سے دوچار ہوئے کیا اس کے سوا کچھ اور تھا کہ انھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی دعوت کے خلاف قیام کیا، ان کی تکذیب کی بلکہ انہیں قتل کر ڈالا۔

لیکن یاد رکھو جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوگی خود تمہارے کئے کی سزا ہوگی کیونکہ ”خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔“[1]

پھر کہتا ہے: ”اے میری قوم میں تمہارے لئے اس دن سے ڈرتا ہوں جس دن لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے لیکن کوئی مدد نہیں کرے گا“۔[2]

ان بیانات کے ذریعے مومن آل فرعون نے جو کچھ کرنا تھا کر دکھایا اس نے فرعون کو جناب موسیٰ کے قتل کی تجویز بلکہ فیصلے کے بارے میں ڈانوا ڈول کر دیا یا کم از کم اسے ملتوی کر وادیا اسی التواء سے قتل کا خطرہ ٹل گیا اور یہ تھا اس ہوشیار، زیرک اور شجاع مرد خدا کا فریضہ جو اس نے کما حقہ ادا کر دیا جیسا کہ بعد کی گفتگو سے معلوم ہوگا کہ اس سے اس کی جان کے بھی خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

آخری بات

پانچویں اور آخری مرحلے پر مومن آل فرعون نے تمام حجاب الٹ دیئے اور اس سے زیادہ اپنے ایمان کو نہ چھپا سکا، وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا اور فرعون والوں نے بھی، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے بارے میں بڑا خطرناک فیصلہ کیا۔ خداوند عالم نے بھی اپنے اس مومن اور مجاہد بندے کو تنہا نہیں چھوڑا جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے: ”خدا نے بھی اسے ان کی ناپاک چالوں اور سازشوں سے بچا لیا“۔[3]

اس کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ فرعونیوں نے اس کے بارے میں مختلف سازشیں اور منصوبے تیار کر رکھے تھے۔

لیکن وہ منصوبے کیا تھے؟ قرآن نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی، ظاہر ہے کہ مختلف قسم کی سزائیں اذیتیں اور آخر کار قتل اور سزائے موت ہو سکتی ہے لیکن خداوند عالم کے لطف و کرم نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔

چنانچہ بعض تفسیروں میں ہے کہ وہ ایک مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا اور اس نے بنی اسرائیل کے ہمراہ دریائے نیل کو عبور کیا، نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کے قتل کا منصوبہ بن چکا تو اس نے اپنے آپ کو ایک پہاڑ میں چھپا لیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ دونوں روایات آپس میں مختلف نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے وہ شہر سے مخفی ہو گیا ہو اور پھر بنی اسرائیل سے جا ملا ہو۔

موسیٰ کے خدا کی خبر لاتا ہوں

اگرچہ مومن آل فرعون کی باتوں نے فرعون کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے تو باز آ گیا لیکن پھر بھی غرور

---

[1] سورہ مومن آیت 31

[2] سورہ مومن آیت 32

[3] سورہ مومن آیت 45

کی چوٹی سے نیچے نہ اترا اور اپنی شیطنت سے بھی باز نہ آیا اور نہ ہی حق بات قبول کرنے پر آمادہ ہوا کیونکہ فرعون کے پاس اس بات کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ ہی لیاقت لہٰذا اپنے شیطنت آمیز اعمال کو جاری رکھتے ہوئے اس نے ایک نئے کام کی تجویز پیش کی اور وہ ہے آسمانوں پر چڑھنے کے لئے ایک بلند و بالا برج کی تعمیر تاکہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کی خبر لے آئے۔

فرعون نے کہا: اے ہامان: میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کرو تاکہ میں اسباب و ذرائع تک پہنچ سکوں ایسے اسباب و ذرائع جو مجھے آسمانوں تک لے جاسکیں تاکہ میں موسیٰ کے خدا سے باخبر ہوسکوں ہر چند کہ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔

جی ہاں! اس قسم کے برے اعمال فرعون کی نظر میں مزین کردیئے گئے تھے اور انھوں نے اسے راہ حق سے روک دیا تھا، لیکن فرعون کی سازش اور چالوں کا انجام نقصان اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔[1]

سب سے پہلی چیز جو یہاں پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر اس کام سے فرعون کا مقصد کیا تھا؟ آیا وہ واقعاً اس حد تک احمق تھا کہ گمان کرنے لگا کہ موسیٰ کا خدا آسمان میں ہے؟ بالفرض اگر آسمان میں ہو بھی تو آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑوں کے ہوتے ہوئے اس عمارت کے بنانے کی کیا ضرورت تھی جو پہاڑوں کی اونچائی کے سامنے بالکل ناچیز تھی؟ اور کیا اس طرح سے وہ آسمان تک پہنچ بھی سکتا تھا؟

یہ بات تو بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ فرعون مغرور اور متکبر ہونے کے باوجود سمجھ دار اور سیاستداں شخص تو ضرور تھا جس کی وجہ سے اس نے ایک عظیم ملت کو اپنی زنجیروں میں جکڑا تھا اور بڑے زوردار طریقے سے اس پر حکومت کرتا رہا لہٰذا اس قسم کے افراد کی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت شیطانی حرکات وسکنات کی آئینہ دار ہوتی ہیں لہٰذا سب سے پہلے اس کے اس شیطانی منصوبے کا تجزیہ وتحلیل کرنا چاہئے کہ آخر ایسی عمارت کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے ان چند مقاصد کے پیش نظر ایسا اقدام کیا:

1۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کی فکر کو مصروف رکھے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور بنی اسرائیل کے قیام کے مسئلہ سے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے اس نے یہ منصوبہ تیار کیا، بعض مفسرین کے بقول یہ عمارت ایک نہایت ہی وسیع وعریض زمین میں کھڑی کی گئی جس پر پچاس ہزار مزدور کام کرنے لگے اس تعمیری منصوبے نے دوسرے تمام مسائل کو بھلا دیا جوں جوں عمارت بلند ہوتی جاتی تھی توں توں لوگوں کی توجہ اس کی طرف زیادہ مبذول ہوتی تھی ہر جگہ اور ہر محفل میں نئی خبر کے عنوان سے اس کے چرچے تھے اس نے وقتی طور پر جادوگروں پر موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کو جو کہ فرعون اور فرعونیوں کے پیکر پر ایک کاری ضرب تھی لوگوں کے ذہنوں سے فراموش کردیا۔

2۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح سے زحمت کش اور مزدور طبقے کی جزوی مادی اور اقتصادی امداد کرے اور عارضی طور پر ہی سہی بیکار لوگوں کے لئے کام مہیا کرے تاکہ تھوڑا سا اس کے مظالم کو فراموش کردیں اور اس کے خزانے کی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ احتیاج محسوس ہو۔

3۔ پروگرام یہ تھا کہ جب عمارت پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، تو وہ اس پر چڑھ کر آسمان کی طرف نگاہ کرے اور شاید چلہ کمان میں رکھ کر تیر چلائے اور وہ واپس لوٹ آئے تو لوگوں کو احمق بنانے کے لئے کہے کہ موسیٰ کا خدا جو کچھ بھی تھا آج اس کا خاتمہ ہوگیا ہے اب ہر شخص بالکل مطمئن ہوکر اپنے اپنے کام میں مصروف ہوجائے۔

---

[1] سورہ مومن آیت 37

وگرنہ فرعون کے لئے تو صاف ظاہر تھا کہ اس کی عمارت جتنی بھی بلند ہو چند سو میٹر سے زیادہ تو اونچی نہیں جا سکتی تھی جبکہ آسمان اس سے کئی گنا بلند اور اونچے تھے، پھر یہ کہ اگر بلند ترین مقام پر بھی کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو اس کا منظر بغیر کسی کمی بیشی کے ویسے ہی نظر آتا ہے جیسے سطح زمین سے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فرعون نے یہ بات کر کے درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے سے ایک قسم کی پسپائی اختیار کی جبکہ اس نے کہا کہ میں موسیٰ کے خدا کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا ہوں "فاطلع الی الہ موسیٰ" اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ "ہر چند کہ میں اسے جھوٹا گمان کرتا ہوں" اس طرح سے وہ یقین کی منزل سے ہٹ کر شک اور گمان کے مرحلے تک نیچے آ جاتا ہے۔

اس مسئلے میں مفسرین کے ایک گروہ نے (مثلاً فخر رازی اور آلوسی نے) یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آیا: فرعون نے اپنا مجوزہ بلند مینار تعمیر کرایا تھا یا نہیں؟

ان مفسرین کا ذہن اس طرف اس لئے منتقل ہوا کہ مینار کی تعمیر کا کام کسی طرح بھی عاقلانہ نہ تھا کیا اس عہد کے لوگ کبھی بلند پہاڑوں پر نہیں چڑھے تھے؟ اور انھوں نے آسمان کے منظر کو ویسا ہی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ زمین سے نظر آتا ہے؟ کیا انسان کا بنایا ہوا مینار پہاڑ سے زیادہ اونچا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی احمق بھی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسے مینار پر چڑھ کر آسمان کو چھوا جا سکتا ہے؟

لیکن وہ مفسرین جنہوں نے یہ اشکالات پیدا کئے ہیں ان کی توجہ ان نکات کی طرف نہیں گئی کہ اول تو ملک مصر کوہستانی نہیں دوم یہ کہ انہوں نے اس عہد کے لوگوں کی سادہ لوحی کو فراموش کر دیا کہ ان سیدھے سادھے لوگوں کو ایسے ہی مسائل سے غافل کیا جا سکتا تھا یہاں تک کہ خود ہمارے زمانے جسے عصر علم ودانش کہا جاتا ہے، لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے کیسے کیسے مکر وفریب اور حیلہ سازیاں کی جاتی ہیں۔

پچاس ہزار معمار برج بناتے ہیں

بہر کیف۔ بعض تواریخ کے بیان کے مطابق، ہامان نے حکم دیا کہ ایسا محل اور برج بنانے کے لئے زمین کا ایک وسیع قطعہ انتخاب کریں اور اس کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار معمار اور مزدور روانہ کر دے اور اس عمارت کے واسطے میٹریل فراہم کرنے کے لئے ہزاروں آدمی مقرر کئے گئے اس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور اس مقصد کے لئے کثیر رقم خرچ کی یہاں تک کہ تمام ملک مصر میں اس عظیم برج کی تعمیر کی شہرت ہو گئی۔

یہ عمارت جس قدر بھی بلند سے بلند تر، ہوتی جاتی تھی لوگ اتنے ہی زیادہ اسے دیکھنے آتے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھئے فرعون یہ عمارت بنا کر کیا کرتا ہے؟

یہ عمارت اتنی بلند ہو گئی کہ اس سے دور دور تک اطراف وجوانب کا میدان نظر آنے لگا بعض مؤرّخین نے لکھا ہے کہ معماروں نے اس کی سیڑھیاں ایسی بنائی تھیں کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اس پر چڑھ سکتا تھا۔

میں نے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو مار ڈالا جب وہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچ گئی اور اسے مزید بلند کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تو ایک روز فرعون پوری شان وشوکت سے وہاں آیا اور بذات خود برج پر چڑھ گیا جب وہ برج کی چوٹی پر پہنچا اور آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو اسے آسمان ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ زمین سے دیکھا کرتا تھا اس منظر میں ذرا بھی تغیر وتبدیلی نہ تھی۔

مشہور یہ ہے کہ اس نے مینار پر چڑھ کے کمان میں تیر جوڑا اور آسمان کی طرف پھینکا یا تو وہ تیر کسی پرندے کے لگا یا پہلے

سے کوئی سازش کی گئی تھی کہ تیر خون آلود واپس آیا تب فرعون وہاں سے نیچے اتر آیا اور لوگوں سے کہا: جاؤ، مطمئن رہو اور کسی قسم کی فکر نہ کرو میں نے موسیٰ کے خدا کو مار ڈالا ہے۔

یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سادہ لوحوں اور اندھی تقلید کرنے والوں کے ایک گروہ نے اور ان لوگوں نے جن کی آنکھیں اور کان حکومت وقت کے پروپیگنڈے سے بند ہو گئے تھے، فرعون کے اس قول کا یقین کر لیا ہوگا اور ہر جگہ اس خبر کو عام کیا ہوگا اور مصر کی رعایا کو غافل رکھنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا۔

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمارت دیر تک قائم نہیں رہی (اور اسے رہنا بھی نہ چاہئے تھا) تباہ ہو گئی بہت سے لوگ اس کے نیچے دب کے مر گئے اس سلسلے میں اہل قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن ان کی صحت کی تحقیق نہ ہو سکی اس لئے انہیں قلم زد کر دیا گیا ہے۔

بیدار کرنے والی سزائیں

ایک کلی قانون تمام پیغمبروں کے لئے یہ تھا کہ جب ان کو لوگوں کی مخالفت کا سامنا ہوا اور وہ کسی طرح سے راہ راست پر نہ آئیں تو خدا ان کو بیدار کرنے کے لئے مشکلات و مصائب میں گرفتار کرتا تھا تاکہ وہ اپنے میں نیازمندی اور محتاجی کا احساس کریں، اور ان کی فطرت توحید جو آرام و آسائش کی وجہ سے غفلت کے پردوں میں چلی گئی ہے دوبارہ ابھر آئے اور ان کو اپنی ضعف و ناتوانی کا اندازہ ہو اور اس قادر و توانا ہستی کی جانب متوجہ ہوں جو ہر نعمت و نقمت کا سرچشمہ ہے۔

قرآن میں اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے: ہم نے آل فرعون کو قحط، خشک سالی اور ثمرات کی کمی میں مبتلا کیا کہ شاید متوجہ اور بیدار ہو جائیں۔[1]

باوجودیکہ قحط سالی نے فرعونیوں کو گھیر لیا تھا لیکن مذکورہ بالا بیان میں صرف فرعون کے مخصوصین کا ذکر کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بیدار ہو گئے تو سب لوگ بیدار ہو جائیں گے کیونکہ تمام لوگوں کی نبض انہی کے ہاتھوں میں ہے یہ چاہیں تو بقیہ افراد کو گمراہ کریں یا ہدایت کریں۔

اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ خشک سالی اہل مصر کے لئے ایک بلائے عظیم شمار ہوتی تھی کیونکہ مصر پورے طور سے ایک زرعی مملکت تھی اس بناء پر اگر زراعت نہ ہو تو اس کا اثر ملک کے تمام افراد پر پڑتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فرعون اور اس کے افراد چونکہ ان زمینوں کے مالک اعلیٰ تھے اس لئے فی الحقیقت وہ سب سے زیادہ اس سے متاثر ہوئے تھے۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خشک سالی کئی سال تک باقی رہی کیونکہ "سنین" جمع کا صیغہ ہے۔

لیکن آل فرعون، بجائے اس کے کہ ان الٰہی تنبیہوں سے نصیحت لیتے اور خواب خرگوش سے بیدار ہوتے انہوں نے اس سے سوء استفادہ کیا اور ان حوادث کی من مانی تفسیر کی، جب حالات ان کے منشا کے مطابق ہوتے تھے تو وہ راحت و آرام میں ہوتے تھے اور کہتے کہ یہ حالات ہماری نیکی و لیاقت کی وجہ سے ہیں: "فی الحقیقت ہم اس کے اہل و لائق ہیں"۔

لیکن جس وقت وہ مشکل و مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو اس کو فوراً موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے سر باندھ دیتے تھے" اور کہتے تھے کہ یہ ان کی بدقدمی کی وجہ سے ہوا ہے۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 130

لیکن قرآن کریم ان کے جواب میں کہتا ہے: ''ان کی بدبختیوں اور تکلیفوں کا سرچشمہ خدا کی طرف سے ہے خدا نے یہ چاہا ہے کہ اس طرح ان کو ان کے اعمال بد کی وجہ سے سزا دے لیکن ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے''۔[1]

مختلف اور پیہم بلاؤں کا نزول

قرآن میں ان بیدار کنندہ دروس کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے جو خدا نے قوم فرعون کو دیئے جب مرحلہ اول یعنی قحط، خشک سالی اور مالی نقصانات نے ان کو بیدار نہ کیا تو دوسرے مرحلہ کی نوبت پہنچی جو پہلے مرحلہ سے شدید تر تھا اس مرتبہ خدا نے ان کو پے در پے ایسی بلاؤں میں جکڑا جو ان کو اچھی طرح سے کچلنے والی تھیں مگر افسوس ان کی اب بھی آنکھیں نہ کھلیں۔

پہلے ان بلاؤں کے نزول کے مقدمہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں اپنے عناد کو بدستور باقی رکھا اور ''کہا کہ تم ہر چند ہمارے لئے نشانیاں لاؤ اور ان کے ذریعے ہم پر اپنا جادو کرو ہم کسی طرح بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے''۔[2]

لفظ ''آیت'' شاید انہوں نے از راہ تمسخر استعمال کیا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے معجزات کو آیات الٰہی قرار دیا تھا لیکن انہوں نے سحر قرار دیا۔

آیات کا لہجہ اور دیگر قرائن اس بات کے مظہر ہیں کہ فرعون کے پروپیگنڈوں کا محکمہ جو اپنے زمانے کے لحاظ سے ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ہر طرف سے حرکت میں آ گیا تھا اس کے نتیجے میں تمام لوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا اور وہ یہ کہ اے موسیٰ تم تو ایک زبردست جادوگر ہو، کیونکہ موسیٰ کی بات کو رد کرنے کا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا جس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں وہ گھر بنانا چاہتے تھے۔

لیکن چونکہ خدا کسی قوم پر اس وقت تک اپنا آخری عذاب نازل نہیں کرتا جب تک کہ اس پر خوب اچھی طرح سے اتمام حجت نہ کر لے اس لئے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے پہلے طرح طرح کی بلائیں ان پر نازل کیں کہ شاید ان کو ہوش آ جائے۔[3]

''پہلے ہم نے ان پر طوفان بھیجا''

اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ''اس کے بعد ہم نے ان کی زراعتوں اور درختوں پر ٹڈیوں کو مسلط کر دیا۔''

روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ نے ان پر ٹڈیاں اس کثرت سے بھیجیں کہ انھوں نے درختوں کے شاخ و برگ کا بالکل صفایا کر دیا، حتیٰ کہ ان کے بدنوں تک کو وہ اتنا آزار پہنچاتی تھیں کہ وہ تکلیف سے چیختے چلاتے تھے۔

جب بھی ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتے تھے کہ وہ خدا سے کہہ کر اس بلا کو ہٹوا دیں طوفان اور ٹڈیوں کے موقع پر بھی انھوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے یہی خواہش کی، جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قبول کر لیا اور یہ دونوں بلائیں برطرف ہو گئیں، لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی ضد پر اتر آئے جس کے نتیجے میں تیسری بلا ''قمّل'' کی ان پر نازل ہوئی۔

''قمّل'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان گفتگو ہوئی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی نباتی آفت تھی جو زراعت کو کھا جاتی تھی۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 131

[2] سورہ اعراف آیت 132

[3] سورہ اعراف کی آیت 133 میں ان بلاؤں کا نام لیا گیا ہے

جب یہ آفت بھی ختم ہوئی اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ،تو اللہ نے مینڈک کی نسل کو اس قدر فروغ دیا کہ مینڈک ایک نئی بلا کی صورت میں ان کی زندگی میں اخل ہو گئے۔

جدھر دیکھتے تھے ہر طرف چھوٹے بڑے مینڈک نظر آتے تھے یہاں تک کہ گھروں کے اندر، کمروں میں، بچھونوں میں، دسترخوان پر کھانے کے برتنوں میں مینڈک ہی مینڈک تھے،جس کی وجہ سے ان کی زندگی حرام ہو گئی تھی ،لیکن پھر بھی انھوں نے حق کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا اور ایمان نہ لائے۔اس وقت اللہ نے ان پر خون مسلط کیا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ خون سے مراد ''مرض نکسیر'' ہے جو ایک وبا کی صورت میں ان میں پھیل گیا،لیکن بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ دریائے نیل لہو رنگ ہو گیا اتنا کہ اس کا پانی مصرف کے لائق نہ رہا۔

آخر میں قرآن فرماتا ہے:''ان معجزوں اور کھلی نشانیوں کو جو موسیٰ کی حقانیت پر دلالت کرتی تھیں،ہم نے ان کو دکھلایا لیکن انھوں نے ان کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ایک مجرم اور گناہگار قوم تھے۔''[1]

بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلا ایک ایک سال کے لئے آتی تھی یعنی ایک سال طوفان وسیلاب، دوسرے سال ٹڈیوں کے دَل، تیسرے سال نباتاتی آفت، اسی طرح آخر تک،لیکن دیگر روایات میں ہے کہ ایک آفت سے دوسری آفت تک ایک مہینہ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا، بہر کیف اس میں شک نہیں کہ ان آفتوں کے درمیان فاصلہ موجود تھا(جیسا کہ قرآن نے لفظ ''مفصلات'' سے تعبیر کیا ہے) تا کہ ان کو تفکر کے لئے کافی موقع مل جائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ بلائیں صرف فرعون اور فرعون والوں کے دامن گیر ہوتی تھیں، بنی اسرائیل اس سے محفوظ تھے، بے شک یہ اعجاز ہی تھا،لیکن اگر نکتہ ذیل پر نظر کی جائے تو ان میں سے بعض کی علمی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مصر جیسی سرسبز وشاداب اور خوبصورت سلطنت جو دریائے نیل کے کناروں پر آباد تھی اس کے بہترین حصے وہ تھے جو دریا سے قریب تھے وہاں پانی بھی فراوان تھا اور زراعت بھی خوب ہوتی تھی، تجارتی کشتیاں وغیرہ بھی دستیاب تھیں، یہ خطے فرعون والوں اور قبطیوں کے قبضے میں تھے جہاں انھوں نے اپنے قصر وباغات بنا رکھے تھے اس کے برخلاف اسرائیلوں کو دور دراز کے خشک اور کم آب علاقے دیئے گئے تھے جہاں وہ زندگی کے یہ سخت دن گذارتے تھے کیونکہ ان کی حیثیت غلاموں جیسی تھی۔

بنابرایں یہ ایک طبیعی امر ہے کہ جب سیلاب اور طوفان آیا تو اس کے نتیجے میں وہ آبادیاں زیادہ متاثر ہوئیں جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھیں، اسی طرح مینڈک بھی پانی سے پیدا ہوتے ہیں جو قبطیوں کے گھروں کے آس پاس بڑی مقدار میں موجود تھے، یہی حال خون کا ہے کیونکہ دریائے نیل کا پانی خون ہو گیا تھا، ٹڈیاں اور زرعی آفتیں بھی باغات، کھیتوں اور سرسبز علاقوں پر حملہ کرتی ہیں، لہٰذا ان عذابوں سے زیادہ تر نقصان قبطیوں ہی کا ہوتا تھا۔

جو کچھ قرآن میں ذکر ہوا ہے اس کا ذکر موجودہ توریت میں بھی ملتا ہے،لیکن کسی حد تک فرق کے ساتھ۔[2]

بار بار کی عہد شکنیاں

قرآن میں فرعونیوں کے اس ردعمل کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے پروردگار عالم کی عبرت انگیز اور بیدار کنندہ بلاؤں کے

---

[1] سورہ اعراف آیت 133

[2] ملاحظہ ہو سفر خروج فصل ہفتم تا دہم توریت

نزول کے بعد ظاہر کیا، ان تمام قرآنی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت وہ بلا کے چنگل میں گرفتار ہوجاتے تھے، جیسا کہ عام طور سے تباہ کاروں کا دستور ہے، وقتی طور پر خواب غفلت سے بیدار ہوجاتے تھے اور فریاد وزاری کرنے لگتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے تھے کہ خدا سے ان کی نجات کے لئے دعا کریں۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے لئے دعا کرتے تھے اور وہ بلا ان کے سروں سے ٹل جاتی تھی، مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جونہی وہ بلا سر سے ٹلتی تھی تو وہ تمام چیزوں کو بھول جاتے تھے اور وہ اپنی پہلی نا فرمانی اور سرکشی کی حالت پر پلٹ جاتے تھے۔

جس وقت ان پر بلا مسلط ہوتی تھی تو کہتے تھے: ''اے موسیٰ ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کرو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اسے پورا کرے اور تمہاری دعا ہمارے حق میں قبول کرے، اگر تم یہ بلا ہم سے دور کردو تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم خود بھی تم پر ضرور ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی یقیناً تمہارے ہمراہ روانہ کردیں گے''۔[۱]

اس کے بعد ان کی پیمان شکنی کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت ہم ان پر سے بلاؤں کو تعین شدہ مدت کے بعد ہٹا دیتے تھے تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے تھے''۔[۲]

نہ خود ہی ایمان لاتے تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو اسیری سے آزاد کرتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کا یک مدت معین کرتے تھے کہ فلاں وقت یہ بلا برطرف ہوجائے گی تا کہ ان پر اچھی طرح کھل جائے کہ یہ بلا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی وجہ سے تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق ایک طرف ان کے مختلف معجزات دوسری طرف مصر کے لوگوں پر نازل ہونیوالی بلائیں جو موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے ٹل جاتی تھیں تیسری طرف، ان سب اسباب نے مجموعی طور پر اس ماحول پر گہرے اثرات ڈالے اور فرعون کے بارے میں لوگوں کے افکار کو ڈانواں ڈول کردیا اور انہیں پورے مذہبی اور معاشرتی نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔

اس موقع پر فرعون نے دھوکہ دہی کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کا اثر مصری لوگوں کے ذہن سے ختم کرنے کی کوشش کی اور پست اقدار کا سہارا لیا جو اس ماحول پر حکم فرما تھا، انہیں اقدار کے ذریعہ اپنا اور موسیٰ علیہ السلام کا موازنہ شروع کردیا تا کہ اس طرح لوگوں پر اپنی برتری کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے، جیسا کہ قرآن پاک کہتا ہے:

''اور فرعون نے اپنے لوگوں کو پکار کر کہا: اے میری قوم آیا مصر کی وسیع وعریض سرزمین پر میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ عظیم دریا میرے حکم سے نہیں بہہ رہے ہیں اور میرے محلوں، کھیتوں اور باغوں سے نہیں گزر رہے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''[۳]

لیکن موسیٰ علیہ السلام کے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں، ایک لاٹھی اور ایک اونی لباس اور بس، تو کیا اس کی شخصیت بڑی ہوگی یا میری؟ آیا وہ سچ بات کہتا ہے یا میں؟ اپنی آنکھیں کھولو اور بات اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح فرعون نے مصنوعی اقدار کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، بالکل ویسے ہی جیسے عصر جاہلیت کے بت پرستوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مال ومقام کو صحیح

---

[۱] اعراف آیت134

[۲] سورہ اعراف آیت135

[۳] سورہ زخرف آیت51

انسانی اقدار سمجھ رکھا تھا۔

لفظ "نادیٰ" (پکار کر کہا) سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے اپنی مملکت کے مشاہیر کی ایک عظیم محفل جمائی اور بلند آواز کے ساتھ ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملے ادا کیے، یا حکم دیا کہ اس کی اس آواز کو ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے پورے ملک میں بیان کیا جائے۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ فرعون نے کہا: "میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور صاف طور پر بات بھی نہیں کر سکتا"۔[1]

اس طرح سے اس نے اپنے لئے دو بڑے اعزازات (حکومت مصر اور نیل کی مملکت) اور موسیٰ علیہ السلام کے دو کمزور پہلو (فقر اور لکنت زبان) بیان کر دیئے۔

حالانکہ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت نہ تھی۔ کیونکہ خدا نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا تھا اور زبان کی لکنت کو دور کر دیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے مبعوث ہوتے ہی خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ "خداوندا میری زبان کی گرہیں کھول دے"۔[2] اور یقیناً ان کی دعا قبول ہوئی اور قرآن بھی اس بات پر گواہ ہے۔ بے پناہ دولت، فاخرہ لباس اور چکا چوند کرتے محلات، مظلوم طبقے پر ظلم و ستم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا مالک نہ ہونا صرف عیب کی بات ہی نہیں بلکہ باعث صد افتخار شرافت اور عزت کا سبب بھی ہے۔

"مھین" (پست) کی تعبیر سے ممکن ہے اس دور کے اجتماعی طبقات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس دور میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کا معاشرہ کے بلند طبقوں میں شمار ہوتا تھا اور محنت کشوں اور کم آمدنی والے لوگوں کا پست طبقے میں، یا پھر ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور فرعون کی قبطی قوم اپنے آپ کو سردار اور آقا سمجھتی تھی۔ پھر فرعون دو اور بہانوں کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: "اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے اور اس کے لئے مددگار کیوں نہیں مقرر کئے تاکہ وہ اس کی تصدیق کریں؟" اگر خدا نے اسے رسول بنایا ہے تو اسے (دوسرے لوگوں کی طرح) طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے گئے اور اس کے لئے مددگار کیوں نہیں مقرر کئے گئے۔

کہتے ہیں کہ فرعونی قوم کا عقیدہ تھا کہ روساء اور سربراہوں کو ہمیشہ طلائی کنگنوں اور سونے کے ہاروں سے مزین ہونا چاہئے اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس قسم کے زیورات نہیں تھے بلکہ ان زیورات کے بجائے وہ چرواہوں والا موٹا سا اونی کرتا زیب تن کئے ہوئے تھے، لہٰذا ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا اور یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انسانی شخصیت کے پرکھنے کا معیار سونا، چاندی اور دوسرے زیورات کو سمجھتے ہیں۔

جناب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے اونی لباس

اس بارے میں ایک نہایت عمدہ بیان آیا ہے، امام علی بن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں: موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی (ہارون) کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے دونوں کے بدن پر اونی لباس اور ہاتھوں میں عصا تھا اس حالت میں انھوں نے شرط پیش کی کہ اگر فرمان الٰہی کے سامنے جھک جائے تو اس کی حکومت اور ملک باقی اور اقتدار قائم و برقرار رہے گا لیکن فرعون نے حاضرین سے کہا: تمہیں ان کی

---

[1] سورہ زخرف آیت 52

[2] سورہ طٰہٰ آیت 27

باتوں پر تعجب نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ شرط لگا رہے ہیں کہ میرے ملک کی بقا اور میری عزت کا دوام ان کی مرضی کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ فقر و تنگدستی ان کی حالت اور صورت سے ٹپک رہی ہے (اگر یہ سچ کہتے ہیں تو) خود انہیں طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے گئے۔

دوسرا بہانہ وہی مشہور بہانہ ہے جو بہت سی گمراہ اور سرکش امتیں انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے پیش کیا کرتی تھیں، کبھی تو کہتی تھیں کہ "وہ انسان کیوں ہے اور فرشتہ کیوں نہیں؟ اور کبھی کہتی تھی کہ اگر وہ انسان ہے تو پھر کم از کم اس کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟"

حالانکہ انسانوں کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں کو روح انسانی کا حامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان کی ضرورتوں، مشکلوں اور مسائل کو محسوس کر سکیں اور انہیں ان کا جواب دے سکیں اور عملی لحاظ سے ان کے لئے نمونہ اور اسوہ قرار پا سکیں۔

چوتھا مرحلہ انقلاب کی تیاری

حضرت موسیٰ علیہ السلام میدان مقابلہ میں فرعون پر غالب آ گئے اور سرخرو اور سرفراز ہو کر میدان سے باہر آئے اگرچہ فرعون اور اس کے تمام درباری ان پر ایمان نہ لائے لیکن اس کے چند اہم نتائج ضرور برآمد ہوئے، جن میں سے ہر ایک اہم کامیابی شمار ہوتا ہے۔

1۔ بنی اسرائیل کا اپنے رہبر اور پیشوا پر عقیدہ مزید پختہ ہو گیا اور انہیں مزید تقویت مل گئی چنانچہ ایک دل اور ایک جان ہو کر ان کے گرد جمع ہو گئے کیونکہ انھوں نے سالہا سال کی بدبختی اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اپنے اندر کسی آسمانی پیغمبر کو دیکھا تھا جو کہ ان کی ہدایت کا بھی ضامن تھا اور ان کے انقلاب، آزادی اور کامیابی کا بھی رہبر تھا۔

2۔ موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں اور قبطیوں تک کے درمیان ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ کچھ لوگ ان کی طرف مائل ہو گئے اور جو مائل نہیں ہوئے تھے وہ کم از کم ان کی مخالفت سے ضرور گھبراتے تھے اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی صدائے دعوت تمام مصر میں گونجنے لگی۔

3۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فرعون عوامی افکار اور اپنی جان کو لاحق خطرے سے بچاؤ کے لئے اپنے اندر ایسے شخص کے ساتھ مقابلے کی طاقت کھو چکا تھا جس کے ہاتھ میں اس قسم کا عصا اور منہ میں اس طرح کی گویا زبان تھی۔

مجموعی طور پر یہ امور موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس حد تک زمین ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوئے کہ مصریوں کے اندر ان کے پاؤں جم گئے اور انھوں نے کھل کر اپنا تبلیغی فریضہ انجام دیا اور اتمام حجت کی۔

قرآن میں فرعونیوں کے خلاف بنی اسرائیل کے قیام اور انقلاب کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے: "ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ سرزمین مصر میں اپنی قوم کے لئے گھروں کا انتخاب کرو"۔[1]

"اور خصوصیت کے ساتھ ان گھروں کو ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے بناؤ"۔[2]

پھر روحانی طور پر اپنی خودسازی اور اصلاح کرو "اور نماز قائم کرو" "اس طرح سے اپنے نفس کو پاک اور قوی کرو[3] اور اس لئے کہ خوف اور وحشت کے آثار ان کے دل سے نکل جائیں اور وہ روحانی و انقلابی قوت پالیں "مومنین کو بشارت

---

[1] سورہ یونس آیت 87

[2] سورہ یونس آیت 87

[3] سورہ یونس آیت 87

دو'' کامیابی اور خدا کے لطف و رحمت کی بشارت۔[1]

زیر بحث آیات کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل منتشر، شکست خوردہ، وابستہ، طفیلی، آلودہ اور خوف زدہ گروہ کی شکل میں تھے، نہ ان کے پاس گھر تھے نہ کوئی مرکز تھا، نہ ان کے پاس معنوی اصلاح کا کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی ان میں اس قدر شجاعت، عزم اور حوصلہ تھا جو شکست دینے والے انقلاب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے خصوصاً روحانی حوالے سے چند امور پر مشتمل پروگرام شروع کریں۔

1۔ مکان تعمیر کریں اور اپنے مکانات فرعونیوں سے الگ بنائیں۔ اس میں متعدد فائدے تھے۔

ایک یہ کہ سرزمین مصر میں ان کے مکانات ہوں گے تو وہ اس کا دفاع زیادہ لگاؤ سے کریں گے۔

دوسرا یہ کہ قبطیوں کے گھروں میں طفیلی زندگی گزارنے کے بجائے وہ اپنی ایک مستقل زندگی شروع کر سکیں گے۔

تیسرا یہ کہ انکے معاملات اور تدابیر کے راز دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔

2۔ اپنے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور قریب قریب بنائیں، بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے یہ ایک مؤثر کام تھا اس طرح سے وہ اجتماعی مسائل پر مل کر غور و فکر کر سکتے تھے اور مذہبی مراسم کے حوالے سے جمع ہو کر اپنی آزادی کے لئے ضروری پروگرام بنا سکتے تھے۔

3۔ عبادت کی طرف متوجہ ہوں، خصوصاً نماز کی طرف کہ جو انسان کو بندوں کی بندگی سے جدا کرتی ہے اور اس کا تعلق تمام قدرتوں کے خالق سے قائم کر دیتی ہے۔ اس کے دل اور روح کو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتی ہے اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا احساس زندہ کرتی ہے اور قدرت پروردگار کا سہارا لے کر انسانی جسم میں ایک تازہ روح پھونک دیتی ہے۔

4۔ ایک رہبر کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روحوں میں موجود طویل غلامی اور ذلت کے دور کا خوف و وحشت نکال باہر پھینکیں اور حتمی فتح و نصرت، کامیابی اور پروردگار کے لطف و کرم کی بشارت دے کر مومنین کے ارادے کو مضبوط کریں اور ان میں شہامت و شجاعت کی پرورش کریں۔

اس روش کو کئی سال گزر گئے اور اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے منطقی دلائل کے ساتھ ساتھ انہیں کئی معجزے بھی دکھائے۔

ہم نے انہیں باہر نکال دیا

جب موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں پر اتمام حجت کر چکے اور مومنین و منکرین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا چنانچہ قرآن نے اس کی اس طرح منظر کشی کی۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے باہر) نکال کر لے جاؤ، کیونکہ وہ تمہارا پیچھا کرنے والے ہیں''۔[2]

---

[1] سورہ یونس آیت 87

[2] سورہ شعراء آیت 52

موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور دشمن کی نگاہوں سے بچ کر بنی اسرائیل کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بعد کوچ کا حکم دیا اور حکم خدا کے مطابق رات کو خصوصی طور پر منتخب کیا تا کہ یہ منصوبہ صحیح صورت میں تکمیل کو پہنچے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد کی روانگی ایسی چیز نہیں تھی جو زیادہ دیر تک چھپی رہ جاتی۔ جاسوسوں نے جلد ہی اس کی رپورٹ فرعون کو دے دی اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''فرعون نے اپنے کارندے مختلف شہروں میں روانہ کر دیئے تا کہ فوج جمع کریں''۔[1]

البتہ اس زمانے کے حالات کے مطابق فرعون کا پیغام تمام شہروں میں پہنچانے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی لیکن نزدیک کے شہروں میں یہ اطلاع بہت جلد پہنچ گئی اور پہلے سے تیار شدہ لشکر فوراً حرکت میں آ گئے اور مقدمۃ الجیش اور حملہ آور لشکر کی تشکیل کی گئی اور دوسرے لشکر بھی آہستہ آہستہ ان سے آ ملتے رہے۔

ساتھ ہی لوگوں کے حوصلے بلند رکھنے اور نفسیاتی اثر قائم رکھنے کے لئے اس نے حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ''وہ تو ایک چھوٹا سا گروہ ہے''۔[2] (تعداد کے لحاظ سے بھی کم اور طاقت کے لحاظ سے بھی کم)۔

لہٰذا اس چھوٹے سے کمزور گروہ کے مقابلے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ طاقت اور قوت ہمارے پاس زیادہ ہے لہٰذا فتح بھی ہماری ہی ہو گی۔

فرعون نے یہ بھی کہا: ''آخر ہم کس حد تک برداشت کریں اور کب تک ان سرکش غلاموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے رہیں؟ انھوں نے تو ہمیں غصہ دلایا ہے''۔[3]

آخر کل مصر کے کھیتوں کی کون آبپاشی کرے گا؟ ہمارے گھر کون بنائے گا؟ اس وسیع و عریض مملکت کا کون لوگ بوجھ اٹھائیں گے؟ اور ہماری نوکری کون کرے گا؟

اس کے علاوہ ''ہمیں ان لوگوں کی سازشوں سے خطرہ ہے (خواہ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور چلے جائیں) اور ہم ان سے مقابلہ کے لئے مکمل طور پر آمادہ اور اچھی طرح ہوشیار ہیں''۔[4]

3۔ پھر قرآن پاک فرعونیوں کے انجام کا ذکر کرتا ہے اور اجمالی طور پر ان کی حکومت کے زوال اور بنی اسرائیل کے اقتدار کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''ہم نے انہیں سرسبز باغات اور پانی سے لبریز چشموں سے باہر نکال دیا''۔[5] خزانوں، خوبصورت محلات اور آرام و آسائش کے مقامات سے بھی نکال دیا۔

ہاں ہاں ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقت کے یہ سب کچھ دے دیا اور انہیں فرعون والوں کا وارث بنا دیا۔[6]

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون والوں کا وارث بنایا۔ اسی تعبیر کی بناء پر بعض مفسرین کی

---

[1] سورہ شعراء آیت 53
[2] سورہ شعراء آیت 54
[3] سورہ شعراء آیت 55
[4] سورہ شعراء آیت 56
[5] سورہ شعراء آیت 57 تا 59
[6] سورہ شعراء آیت 59۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے؟

یہ رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے افراد مصر کی طرف واپس لوٹ آئے اور زمام حکومت واقتدار اپنے قبضے میں لے کر مدتوں وہاں حکومت کرتے رہے۔

آیات بالا کا ظاہری مفہوم بھی اسی تفسیر سے مناسبت رکھتا ہے۔

جبکہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد مقدس سرزمینوں کی طرف چلے گئے البتہ کچھ عرصے کے بعد مصر واپس آ گئے اور وہاں پر اپنی حکومت تشکیل دی۔

تفسیر کے اسی حصے کے ساتھ موجودہ توریت کی فصول بھی مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل دو حصوں میں بٹ گئے۔ایک گروہ مصر میں رہ گیا اور وہیں پر حکومت کی اور ایک گروہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرزمین مقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مصر کی وسیع وعریض سرزمین پر حکومت کی۔

لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ انقلابی پیغمبر تھے لہٰذا یہ بات بالکل بعید نظر آتی ہے کہ وہ ایسی سرزمین کو کلی طور پر خیر باد کہہ کر چلے جائیں جس کی حکومت مکمل طور پر انہیں کے قبضہ اور اختیار میں آ چکی ہو اور وہ وہاں کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کئے بغیر بیابانوں کی طرف چل دیں خصوصاً جب کہ لاکھوں بنی اسرائیلی عرصہ دراز سے وہاں پر مقیم بھی تھے اور وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔

فرعونیوں کا دردناک انجام

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کا آخری حصہ پیش کیا گیا ہے کہ فرعون اور فرعون والے کیونکر غرق ہوئے اور بنی اسرائیل نے کس طرح نجات پائی؟ جیسا کہ ہم گزشتہ میں پڑھ چکے ہیں کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو مصر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تاکہ وہ بڑی تعداد میں لشکر اور افرادی قوت جمع کر سکیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور مفسرین کی تصریح کے مطابق فرعون نے چھ لاکھ کا لشکر مقدمۃ الجیش کی صورت میں بھیج دیا اور خود دس لاکھ کے لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ساری رات بڑی تیزی کے ساتھ چلتے رہے اور طلوع آفتاب کے ساتھ ہی انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو پا لیا، چنانچہ اس سلسلے کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرعونیوں نے ان کا تعاقب کیا اور طلوع آفتاب کے وقت انہیں پا لیا۔

''جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے اب تو ہم فرعون والوں کے نرغے میں آ گئے ہیں اور بچ نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی''۔[1]

ہمارے سامنے دریا اور اس کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں ہیں، ہمارے پیچھے خونخوار مسلح لشکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے لشکر بھی ایسے لوگوں کا ہے جو ہم سے سخت ناراض اور غصے سے بھرے ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی خونخواری کا ثبوت ایک طویل عرصے تک ہمارے معصوم بچوں کو قتل کر کے دیا ہے اور خود فرعون بھی بہت بڑا مغرور، ظالم اور خونخوار شخص ہے لہٰذا وہ فوراً ہمارا محاصرہ کر کے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے یا قیدی بنا کر تشدد کے ذریعے ہمیں واپس لے جائیں گے قرائن سے بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔

---

[1] سورہ شعراء آیت 61

بنابرایں یہ کیفیت دو حال سے خالی نہیں یا تو تمام بنی اسرائیلی مصر میں واپس لوٹ آئے اور حکومت تشکیل دی، یا کچھ لوگ جناب موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق وہیں رہ گئے تھے اور حکومت چلاتے رہے اس کے علاوہ فرعون اور فرعون والوں کے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دینے کا اور کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا۔

اپنے عصا کو دریا پر مار دو

اس مقام پر بنی اسرائیل پر کرب و بےچینی کی حالت طاری ہوگئی اور ان کا ایک ایک لمحہ کرب واضطراب میں گزرنے لگا یہ لمحات ان کے لئے زبردست تلخ تھے شاید بہت سے لوگوں کا ایمان بھی متزلزل ہو چکا تھا اور بڑی حد تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔

لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام حسب سابق نہایت ہی مطمئن اور پرسکون تھے انہیں یقین تھا کہ بنی اسرائیل کی نجات اور سرکش فرعونیوں کی تباہی کے بارے میں خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور وعدہ یقینی ہے۔

لہٰذا انھوں نے مکمل اطمینان اور بھرپور اعتماد کے ساتھ بنی اسرائیل کی وحشت زدہ قوم کی طرف منہ کر کے کہا: ''ایسی کوئی بات نہیں وہ ہم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ بہت جلدی مجھے ہدایت کرے گا''۔ [1]

اسی موقع پر شاید بعض لوگوں نے موسیٰ کی باتوں کو سن تو لیا لیکن انہیں پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسی طرح زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں تھے کہ خدا کا آخری حکم صادر ہوا، قرآن کہتا ہے: ''ہم نے فوراً موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو''۔ [2]

وہی عصا جو ایک دن تو ڈرانے کی علامت تھا اور آج رحمت اور نجات کی نشانی۔

موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل حکم کی اور عصا فوراً دریا پر دے مارا تو اچانک ایک عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آیا جس سے بنی اسرائیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ناگہانی طور پر دریا پھٹ گیا، پانی کے کئی ٹکڑے بن گئے اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا اور ان کے درمیان میں راستے بن گئے۔ [3]

بہرحال جس کا فرمان ہر چیز پر جاری اور نافذ ہے اگر پانی میں طغیانی آتی ہے تو اس کے حکم سے اور اگر طوفانوں میں حرکت آتی ہے تو اس کے امر سے، وہ خدا کہ:

نقش هستی نقشی از ایوان او ست
آب و باد و خاك سر گردان او ست

اسی نے دریا کی موجوں کو حکم دیا امواج دریا نے اس حکم کو فوراً قبول کیا ایک دوسرے پر جمع ہوگئیں اور ان کے درمیان کئی راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے ہر گروہ نے ایک ایک راستہ اختیار کر لیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے، اس قدر واضح اور آشکار معجزہ دیکھنے کے باوجود تکبر اور غرور کی

---

[1] سورہ شعراء آیت 62

[2] سورہ شعراء آیت 63

[3] سورہ شعراء آیت 63

سواری سے نہیں اترے، انھوں نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا تعاقب جاری رکھا اور اپنے آخری انجام کی طرف آگے بڑھتے رہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ''اور وہاں پر دوسرے لوگوں کو بھی ہم نے نزدیک کردیا''۔

اس طرح فرعونی لشکر دریائی راستوں پر چل پڑے اور وہ لوگ اپنے ان پرانے غلاموں کے پیچھے دوڑتے رہے جنھوں نے اب اس غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات ہیں اور ابھی عذاب کا حکم جاری ہونے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''ہم نے موسیٰ اور ان تمام لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ تھے۔'' [۱]

ٹھیک اس وقت جبکہ بنی اسرائیل کا آخری فرد دریا سے نکل رہا تھا اور فرعونی لشکر کا آخری فرد اس میں داخل ہو رہا تھا ہم نے پانی کو حکم دیا کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ ا، اچانک موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور فرعون اور اس کے لشکر کو گھاس پھونس اور تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا۔

قرآن نے ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ یہ ماجرا یوں بیان کیا ہے: ''پھر ہم نے دوسروں کو غرق کردیا۔'' [۲]

اے فرعون تیرا بدن لوگوں کے لئے عبرتناک ہوگا

بہر کیف یہ معاملہ چل رہا تھا یہاں تک کہ فرعون غرقاب ہونے لگا اور وہ عظیم دریائے نیل کی موجوں میں تنکے کی طرح غوطے کھانے لگا تو اس وقت غرور وتکبر اور جہالت وبے خبری کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے اور فطری نور توحید چمکنے لگا وہ پکار اٹھا: ''میں ایمان لے آیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں''۔ [۳]

کہنے لگا کہ نہ صرف میں اپنے دل سے ایمان لایا ہوں ''بلکہ عملی طور پر بھی ایسے توانا پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں''۔ [۴]

درحقیقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئیاں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئیں اور فرعون اس عظیم پیغمبر کی گفتگو کی صداقت سے آگاہ ہوا اور اس کی قدرت نمائی کا مشاہدہ کیا تو اس نے مجبوراً اظہار ایمان کیا، اسے امید تھی کہ جیسے ''بنی اسرائیل کے خدا'' نے انہیں کوہ پیکر موجوں سے نجات بخشی ہے اسے بھی نجات دے گا، لہٰذا وہ کہنے لگا میں اسی بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ایمان جو نزول بلا اور موت کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ظاہر کیا جائے، درحقیقت ایک قسم کا اضطراری ایمان ہے، جس کا اظہار سب مجرم اور گناہگار کرتے ہیں، ایسے ایمان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی، اور نہ یہ حسن نیت اور صدق گفتار کی دلیل ہوسکتا ہے۔

اسی بنا پر خداوند عالم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''تو اب ایمان لایا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی اور طغیان کرنے والوں، مفسدین فی الارض اور تباہ کاروں کی صف میں تھا'' [۵]

---

[۱] سورہ شعراء آیت 65

[۲] سورہ شعراء آیت 66

[۳] سورہ یونس آیت 90

[۴] سورہ یونس آیت 90

[۵] سورہ یونس آیت 90

''لیکن آج ہم تیرے بدن کو موجوں سے بچالیں گے تاکہ تو آنے والوں کے لئے درس عبرت ہو، برسر اقتدار مستکبرین کے لئے، تمام ظالموں اور مفسدوں کے لئے اور مستضعف گروہوں کے لئے بھی''۔

''بدن'' سے مراد یہاں کیا ہے؟

اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے ان میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد فرعون کا بے جان جسم ہے کیونکہ اس ماحول کے لوگوں کے ذہن میں فرعون کی اس قدر عظمت تھی کہ اگر اس کے بدن کو پانی سے باہر نہ اچھالا جاتا تو بہت سے لوگ یقین ہی نہ کرتے کہ اس کا غرق ہونا بھی ممکن ہے اور ہوسکتا تھا کہ اس ماجرے کے بعد فرعون کی زندگی کے بارے میں افسانے تراش لئے جاتے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ لغت میں لفظ ''بدن'' جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ''جسد عظیم'' کے معنی میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خوشحال لوگوں کی طرح کہ جنکی بڑی زرق برق افسانوی زندگی تھی وہ بڑا سخت اور چاک وچوبند تھا مگر بعض دوسرے افراد نے کہا ہے کہ ''بدن'' کا ایک معنی ''زرہ'' بھی ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے فرعون کو اس زریں زرہ سمیت پانی سے باہر نکالا کہ جو اس کے بدن پر تھی تاکہ اس کے ذریعے پہچانا جائے اور کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے

اب بھی مصر اور برطانیہ کے عجائب گھروں میں فرعونیوں کے مومیائی بدن موجود ہیں کیا ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر فرعون کا بدن بھی ہے کہ جسے بعد میں حفاظت کے لئے مومیا لیا گیا ہو یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی صحیح دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی گذرگاہ

قرآن مجید میں بارہا اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کو ''بحر'' عبور کروایا اور چند مقامات پر ''یم'' کا لفظ بھی آیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر ''یم''، ''بحر'' اور ''یم'' سے کیا مراد ہے آیا یہ نیل (NILE RIYER) جیسے وسیع وعریض دریا کی طرف اشارہ ہے کہ سرزمین مصر کی تمام آبادی جس سے سیراب ہوتی تھی یا بحیرہ احمر یعنی بحر قلزم (RID SEA) کی طرف اشارہ ہے۔

موجودہ توریت اور بعض مفسرین کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیرہ احمر کی طرف اشارہ ہے لیکن ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نیل کا عظیم ووسیع دریا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت سازی کی فرمائش

قرآن میں بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ایک اور اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ واقعہ فرعونیوں پر ان کی فتحیابی کے بعد ہوا، اس واقعہ سے بت پرستی کی جانب ان کی توجہ ظاہر ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے جھگڑے سے نکل چکے تو ایک اور داخلی مصیبت شروع ہوگئی جو بنی اسرائیل کے جاہل، سرکش اور فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے بدر جہا سخت اور سنگین تر تھی اور ہر داخلی کشمکش کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے بنی اسرائیل کو دریا (نیل) کے اس پار لگا دیا:''

لیکن ''انہوں نے راستے میں ایک قوم کو دیکھا جو اپنے بتوں کے گرد خضوع اور انکساری کے ساتھ اکٹھا تھے''۔[1] امت

---

[1] سورہ اعراف آیت 138

موسیٰ علیہ السلام کے جاہل افراد یہ منظر دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور "وہ کہنے لگے: اے موسیٰ ہمارے واسطے بھی بالکل ویسا ہی معبود بنادو جیسا معبود ان لوگوں کا ہے"۔[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس جاہلانہ اور احمقانہ فرمائش سے بہت ناراض ہوئے، آپ نے ان لوگوں سے کہا: "تم لوگ جاہل و بے خبر قوم ہو"۔[2]

بنی اسرائیل میں ناشکر گزار افراد کی کثرت تھی، باوجودیکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اتنے معجزے دیکھے، قدرت کے اتنے انعامات ان پر ہوئے، ان کا دشمن فرعون نابود ہوا ابھی کچھ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا، وہ غرق کر دیا گیا اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے لیکن انہوں نے ان تمام باتوں کو یکسر بھلا دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت سازی کا سوال کر بیٹھے۔

ایک یہودی کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جواب

نہج البلاغہ میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے مسلمانوں پر اعتراض کیا:

"ابھی تمہارے نبی دفن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم لوگوں نے اختلاف کر دیا"۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

ہم نے ان فرامین واقوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو پیغمبر سے ہم تک پہنچے ہیں، پیغمبر یا ان کی نبوت سے متعلق ہم نے کوئی اختلاف نہیں کیا (چہ جائیکہ الوہیت کے متعلق ہم نے کوئی بات کہی ہو) لیکن تم (یہودی) ابھی تمہارے پیر دریا کے پانی سے خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ تم نے اپنے نبی (حضرت موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کہہ دیا کہ ہمارے لئے ایک ایسا ہی معبود بنادو جس طرح کہ ان کے متعدد معبود ہیں، اور اس نبی نے تمہارے جواب میں تم سے کہا تھا کہ تم ایک ایسا گروہ ہو جو جہل کے دریا میں غوطہ زن ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بات کی تکمیل کے لئے بنی اسرائیل سے کہا: "اس بت پرست گروہ کو جو تم دیکھ رہے ہو ان کا انجام ہلاکت ہے اور ان کا ہر کام باطل و بے بنیاد ہے"۔[3]

اس کے بعد مزید تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: "آیا خدائے برحق کے علاوہ تمہارے لئے کوئی دوسرا معبود بنالوں، وہی خدا جس نے اہل جہان (ہمعصر لوگوں) پر تم کو فضیلت دی"۔[4]

اس کے بعد خداوند کریم اپنی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی تاکہ اس عظیم نعمت کا تصور کر کے ان میں شکر گزاراری کا جذبہ بیدار ہو اور انہیں یہ احساس ہو کہ پرستش اور سجدے کا مستحق صرف خدائے یکتا و یگانہ ہے، اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ جو بت بے نفع اور بے ضرر ہیں ان کے سامنے سر تعظیم جھکایا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تمہیں فرعون کے گروہ کے شر سے نجات دیدی، وہ لوگ تم کو مسلسل عذاب دیتے چلے آرہے تھے"۔[5]

اس کے بعد اس عذاب وایزارسانی کی تفصیل یوں بیان فرماتا ہے: "وہ تمہارے بیٹوں کو توقتل کر دیتے تھے اور تمہاری

---

[1] سورہ اعراف آیت 138

[2] سورہ اعراف آیت 138

[3] سورہ اعراف آیت 139

[4] سورہ اعراف آیت 140

[5] سورہ اعراف آیت 141

عورتوں لڑکیوں کو (خدمت اور کنیزی کے لئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے''۔ [1]

بنی اسرائیل سرزمین مقدس کی طرف

قرآن میں اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے ورود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے۔ داخل ہو جاؤ، اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو، فدا کاری سے منہ نہ موڑو اور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے''۔ [2]

ارض مقدسہ سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے، بعض بیت المقدس کہتے ہیں کچھ اردن یا فلسطین کا نام لیتے ہیں اور بعض سرزمین طور سمجھتے ہیں، لیکن بعید نہیں کہ اس سے مراد منطقہ شامات ہو، جس میں تمام مذکورہ علاقے شامل ہیں۔

کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سارا علاقہ انبیاء الٰہی کا گہوارہ، عظیم ادیان کے ظہور کی زمین اور طول تاریخ میں توحید، خدا پرستی اور تعلیمات انبیاء کی نشر و اشاعت کا مرکز رہا ہے۔

لہٰذا اسے سرزمین مقدس کہا گیا ہے اگرچہ بعض اوقات خاص بیت المقدس کو بھی ارض مقدس کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور، بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انہیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: ''آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے جب تک وہ اسے خالی کر کے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمین مقدس میں داخل ہوں گے''۔ [3]

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا اثر چھوڑا تھا لفظ ''لن'' جودائمی طور پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمین مقدس کی آزادی کے لئے مقابلے سے کس قدر خوف زدہ تھے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل سعی وکوشش کرتے، جہاد و قربانی کے جذبے سے کام اور سرزمین مقدس پر قبضہ کر لیتے اگر فرض کریں کہ سنت الٰہی کے برخلاف بغیر کسی اقدام کے ان کے تمام دشمن معجزانہ طور پر نابود ہو جاتے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے وہ وسیع علاقے کے وارث بن جاتے تو اس کا نظام چلانے اور اس کی حفاظت میں بھی ناکام رہتے بغیر زحمت سے حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت سے انہیں کیا سروکار ہو سکتا تھا نہ وہ اس کے لئے تیار ہوتے اور نہ اہل۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے آیت میں قوم جبار سے مراد قوم ''عمالقہ'' ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے یہاں تک کہ ان کی بلند قامت کے بارے میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے اس سلسلے میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئیں جن کے لئے کوئی عملی دلیل نہیں ہے۔ [4]

---

[1] سورہ اعراف آیت 141

[2] سورہ مائدہ آیت 21

[3] سورہ مائدہ آیت 22

[4] خصوصاً ''عوج'' کے بارے میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں، دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں انہیں عام طور پر ''اسرائیلیات'' کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ خود موجودہ توریت کے متن میں ایسے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ”اس وقت اہل ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوف خدا تھا اور اس بنا پر انہیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت و شجاعت بھی تھی، وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے: تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے“۔

لیکن ہر صورت میں تمہیں روح ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہئے اور خدا پر بھروسہ کرو تا کہ اس مقصد کو پالو۔[1]

اس بارے میں کہ یہ دو آدمی کون تھے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ ”یوشع بن نون“ اور ”کالب بن یوفنا“ (”یفنہ“ بھی لکھتے ہیں) تھے جو بنی اسرائیل کے نقیبوں میں سے تھے۔

جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بھی خبر کرنا

بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف و کمزوری جو ان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی، کے باعث انھوں نے صراحت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ”جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، تم اور تمہارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا ہم یہیں بیٹھے ہیں“۔[2]

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے ساتھ جسارت کی انتہا کر دی تھی، کیونکہ پہلے تو انھوں نے لفظ ”لن“ اور ”ابداً“ استعمال کر کے اپنی صریح مخالفت کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ تم اور تمہارا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے وعدوں کی، تحقیر کی یہاں تک کہ خدا کے ان دو بندوں کی تجویز کی بھی پرواہ نہیں کی اور شاید انہیں تو کوئی مختصر سا جواب تک نہیں دیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ موجودہ توریت سفر اعداد باب 14 میں بھی اس داستان کے بعض اہم حصے موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور ان سے علیحدگی کے لئے یوں تقاضا کیا: ”پروردگار میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے: خدایا ہمارے اور اس فاسق و سرکش گروہ میں جدائی ڈال دے“۔[3]

بنی اسرائیل بیابان میں سرگرداں

آخرکار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان برے اعمال کے انجام سے دوچار ہوئے خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی: ”یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالامال ہے“۔[4]

علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انہیں اس بیابان میں سرگرداں رہنا ہوگا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے:

---

[1] سورہ مائدہ آیت 23

[2] سورہ مائدہ آیت 24

[3] سورہ مائدہ آیت 25

[4] سورہ مائدہ آیت 26

''اس قوم کے سر پر جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے،ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا''۔[1]

آخری جملہ شاید اس لئے ہو کہ جب بنی اسرائیل کے لئے یہ فرمان صادر ہوا کہ وہ چالیس سال تک سزا کے طور پر بیابان میں سرگرداں رہیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جذبہ مہربانی پیدا ہوا ہو اور شاید انھوں نے درگاہ خداوندی میں ان کے لئے عفو ودر گذر کی درخواست بھی کی ہو جیسا کہ موجودہ توریت میں بھی ہے۔

لیکن انہیں فوراً جواب دیا گیا کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں نہ کہ عفو ودرگذر کے،کیونکہ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ فاسق اور سرکش لوگ تھے اور جو ایسے ہوں ان کے لئے یہ انجام حتمی ہے۔

توجہ رہے کہ ان کے لئے چالیس سال کی یہ محرومیت انتقامی جذبے سے نہ تھی (جیسا کہ خدا کی طرف سے کوئی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ یا اصلاح کے لئے ہوتی ہے اور یا عمل کا نتیجہ) درحقیقت اس کا ایک فلسفہ تھا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک فرعونی استعمار کی ضربیں جھیل چکے تھے،اس عرصے میں حقارت آمیز رسومات،اپنے مقام کی عدم شناخت اور احساسات ذلت کا شکار ہو چکے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم رہبر کی سرپرستی میں اس تھوڑے سے عرصے میں اپنی روح کو ان خامیوں سے پاک نہیں کر سکے تھے اور وہ ایک ہی جست میں افتخار،قدرت اور سربلندی کی نئی زندگی کے لئے تیار نہیں ہو پائے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مقدس سرزمین کے حصول کے لئے جہاد آزادی کا جو حکم دیا تھا اس پر عمل نہ کرنے کے لئے انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایک طویل مدت وسیع بیابانوں میں سرگرداں رہیں اور اس طرح ان کی ناتواں اور غلامانہ ذہنیت کی حامل موجودہ کمزور نسل آہستہ آہستہ ختم ہو جائے اور نئی نسل حریت وآزادی کے ماحول میں اور خدائی تعلیمات کی آغوش میں پروان چڑھے تاکہ وہ اس قسم کے جہاد کے لئے اقدام کر سکے اور اس طرح سے اس سرزمین پر حق کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

بنی اسرائیل کا ایک گروہ پشیمان ہوا

بنی اسرارئیل کا ایک گروہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا۔انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا۔خدا نے دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں سے نوازا جن میں سے بعض کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''ہم نے تمہارے سر پر بادل سے سایہ کیا''۔[2] سرخط وہ مسافر جو صبح سے غروب تک سورج کی گرمی میں بیابان میں چلتا ہے وہ ایک لطیف سائے سے کیسی راحت پائے گا (وہ سایہ جو بادل کا ہو جس سے انسان کے لئے نہ تو فضا محدود ہوتی ہو اور نہ جو ہوا چلنے سے مانع ہو)۔

صحیح ہے کہ بادل کے سایہ فگن ٹکڑوں کا احتمال ہمیشہ بیابان میں ہوتا ہے لیکن قرآن واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ بنی اسرئیل کے ساتھ ایسا عام حالات کی طرح نہ تھا بلکہ وہ لطف خدا سے اکثر اس عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

دوسری طرف اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں چالیس سال کی طویل مدت سرگرداں رہنے والوں کے لئے غذا کی کافی ووافی ضرورت تھی،اس مشکل کو بھی خداوند عالم نے ان کے لئے حل کر دیا،جیسا کہ اشاد ہوتا ہے: ہم نے ''من وسلویٰ'' جو لذیذ اور

---

[1] سورہ مائدہ آیت 26

[2] سورہ ءبقرہ آیت 57

طاقت بخش غذا ہے تم پر نازل کیا۔

ان پاکیزہ غذاؤں سے جو تمہیں روزی کے طور پر دی گئی ہیں کھاؤ (اور حکم خدا کی نافرمانی نہ کرو اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔)

لیکن وہ پھر بھی شکر گزاری کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے (تاہم) ''انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کیا ہے''۔[1]

منّ وسلویٰ کیا ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا:

''کھمبی کی قسم کی ایک چیز تھی جو اس زمین میں اُگتی تھی''۔ پس معلوم ہوا کہ ''منّ'' ایک ''قارچ'' تھی جو اس علاقہ میں پیدا ہوتی تھی۔[2]

ایک احتمال اور بھی ہے کہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے زمانے میں خدا کے لطف وکرم سے جو نفع بخش بارشیں برستی تھیں ان کے نتیجے میں درختوں سے کوئی خاص قسم کی گوند اور شیرہ نکلتا تھا اور بنی اسرائیل اس سے مستفید ہوتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ ''منّ'' سے مراد وہ تمام نعمتیں جو خدا نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں اور ''سلویٰ'' وہ تمام عطیات ہیں جو ان کی راحت وآرام اور اطمینان کا سبب تھے۔

''سلویٰ'' اگرچہ بعض مفسرین نے اسے شہد کے ہم معنی لیا ہے لیکن دوسرے تقریباً سب مفسرین نے اسے پرندے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یہ پرندہ اطراف اور مختلف علاقوں سے کثرت سے اس علاقے میں آتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے گوشت سے استفادہ کرتے تھے۔ عہدین پر لکھی گئی تفسیر میں بھی اس نظریہ کی تائید دکھائی دیتی ہے۔[3]

البتہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے دنوں میں ان پر خدا کا یہ خاص لطف وکرم تھا کہ یہ پرندہ وہاں کثرت سے ہوتا تھا تاکہ وہ اس سے استفادہ کرسکیں۔ ورنہ تو عام حالات میں اس طرح کی نعمت کا وجود مشکل تھا۔

بعض دیگر حضرات کے نزدیک ''منّ'' ایک قسم کا طبیعی شہد ہے اور بنی اسرائیل اس بیابان میں طویل مدت تک چلتے پھرتے رہنے سے شہد کے مخزنوں تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ ''بیابان تیہ'' کے کناروں پر پہاڑ اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں کافی طبیعی شہد نظر آجاتا تھا۔

عہدین (توریت اور انجیل) پر لکھی گئی تفسیر سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے کہ مقدس سرزمین قسم قسم کے پھولوں اور شگوفوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی لئے شہد کی مکھیوں کے جتھے ہمیشہ پتھروں کے سوراخوں، درختوں کی شاخوں اور لوگوں کے

---

[1] سورہء بقرہ آیت 57

[2] توریت میں ہے کہ ''منّ'' دھنیے کے دانوں جیسی کوئی چیز ہے جو رات کو اس سرزمین پر آگرتی تھی، بنی اسرائیل اسے اکٹھا کر کے پیس لیتے اور اس سے روٹی پکاتے تھے جس کا ذائقہ روغنی روٹی جیسا ہوتا تھا۔

[3] اس میں لکھا ہے معلوم ہونا چاہیے کہ بہت بڑی تعداد میں سلویٰ افریقہ سے چل کے شمال کو جاتے ہیں۔ ''جزیرہ کاپری'' میں ایک فصل میں 16 ہزار کی تعداد میں ان کا شکار کیا گیا۔ یہ پرندہ بحیرہ قلزم کے راستے سے آتا ہے۔ خلیج عقبہ اور رسویز کو عبور کرتا ہے۔ ہفتے کو جزیرہ سینا میں داخل ہوتا ہے اور راستے میں اس قدر تکان وتکلیف جھیلنے کی وجہ سے آسانی سے ہاتھ سے پکڑا جا سکتا ہے اور جب پرواز کرتا ہے تو زمین کے قریب ہوتا ہے۔ اس حصے کے متعلق (توریت کے) سفر خروج اور سفر اعداد میں گفتگو ہوئی ہے۔

گھروں پر جا بیٹھتے ہیں اس طرح سے بہت فقیر و مسکین لوگ بھی شہد کھا سکتے تھے۔

اس تحریر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ سلویٰ سے مراد وہی پر گوشت پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ اور اس کے ہم وزن ہوتا ہے اور یہ پرندہ اس سرزمین میں مشہور ہے۔

بیابانوں میں چشمہ ابلنا

بنی اسرائیل پر کی گئی ایک اور نعمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: ''یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے (اس خشک اور جلانے والے بیابان میں جس وقت بنی اسرائیل پانی کی وجہ سے سخت تنگی میں مبتلا تھے) پانی کی درخواست کی''۔[1] تو خدا نے اس درخواست کو قبول کیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنا عصا مخصوص پتھر پر مارو اس سے اچانک پانی نکلنے لگا اور پانی کے بارہ چشمے زور و شور سے جاری ہو گئے۔[2] بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے عین مطابق جب یہ چشمے جاری ہوئے تو ایک چشمہ ایک قبیلے کی طرف جھک جاتا تھا جس پر بنی اسرائیل کے لوگوں''اور قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے چشمے کو پہچان لیا''۔[3]

یہ پتھر کس قسم کا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح اس پر عصا مارتے تھے اور پانی اس میں سے کیسے جاری ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن جو کچھ اس بارے میں کہتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک کوہستانی علاقے کے ایک حصے میں واقع تھا جو اس بیابان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورہ اعراف آیہ 160 کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابتداء میں اس پتھر سے تھوڑا تھوڑا پانی نکلا، بعد میں زیادہ ہو گیا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ ان کے جانور جو ان کے ساتھ تھے اور وہ کھیتی جو انہوں نے احتمالاً اس بیابان کے ایک حصے میں تیار کی تھی سب اس سے سیراب ہو گئے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوہستانی علاقے میں پتھر کے ایک حصے سے پانی جاری ہوا البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ سب معجزے سے رونما ہوا۔[4]

''خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: قوم کے آگے آگے رہو اور اسرائیل کے بعض بزرگوں کو ساتھ لے لو اور وہ عصا جسے نہر پر مارا تھا ہاتھ میں لے کر روانہ ہو جاؤ۔ میں وہاں تمہارے سامنے کوہ حوریب پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور اسے پتھر پر مارو، اس سے پانی جاری ہو جائے گا، تاکہ قوم پی لے اور موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے مشائخ اور بزرگوں کے سامنے ایسا ہی کیا''۔

بہر حال ایک طرف خداوند عالم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا اور دوسری طرف انہیں فراوان پانی عطا کیا اور ان سے فرمایا: ''خدا کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ پیو لیکن زمین میں خرابی اور فساد نہ کرو''۔[5]

گویا انہیں متوجہ کیا گیا ہے کہ کم از کم ان عظیم نعمتوں کی شکرگزاری کے طور پر ضدی پن، ستمگری، انبیاء کی ایذا رسانی اور بہانہ بازی ترک کر دو۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت 60

[2] سورہ بقرہ آیت 60

[3] سورہ بقرہ آیت 60

[4] توریت کی سترھویں فصل میں سفر خروج کے ذیل میں بھی یوں لکھا ہے۔

[5] سورہ بقرہ آیت 60

مختلف کھانوں کی تمنا

ان نعمات فراوان کی تفصیل کے بعد جن سے خدا نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا۔قرآن میں ان عظیم نعمتوں پر ان کے کفران اور ناشکر گزاری کی حالت کو منعکس کیا گیا ہے۔اس میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔شاید تاریخ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہ ملے گی کہ کچھ لوگوں پر اس طرح سے الطاف الٰہی ہو لیکن انہوں نے اس طرح سے اس کے مقابلے میں ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے:

''یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم سے ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی غذا پر قناعت کرلیں، (من وسلویٰ کتنی ہی لذیذ غذا ہو، ہم مختلف قسم کی غذا چاہتے ہیں''۔[۱]

''لہٰذا خدا سے خواہش کرو کہ وہ زمین سے جو کچھ اگایا کرتا ہے ہمارے لئے بھی اگائے سبزیوں میں سے، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز''۔[۲]

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ''کیا تم بہتر کے بجائے پست تر غذا پسند کرتے ہو''۔[۳]

''جب معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر اس بیابان سے نکلو اور کسی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرو کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ وہاں ہے''۔[۴]

یعنی تم لوگ اس وقت اس بیابان میں خودسازی اور امتحان کی منزل میں ہو، یہاں مختلف کھانے نہیں مل سکتے، جاؤ شہر میں جاؤ تاکہ یہ چیزیں تمہیں مل جائیں، لیکن یہ خودسازی کا پروگرام وہاں نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا نے ان کی پیشانی پر ذلت وفقر کی مہر لگادی اور وہ دوبارہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔

یہ اس لئے ہوا کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے۔یہ سب اس لئے تھا کہ وہ گناہ، سرکشی اور تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے۔[۵]

عظیم وعدہ گاہ

قرآن میں بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور منظر بیان کیا گیا ہے۔ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم سے جھگڑنا پڑا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خدا کے مقام وعدہ پر جانا، وحی کے ذریعے احکام توریت لینا، خدا سے باتیں کرنا، کچھ بزرگان بنی اسرائیل کو میعادگاہ میں ان واقعات کے مشاہدہ کے لئے لانا، اس بات کا اظہار ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (پورے ایک مہینہ) کا وعدہ کیا، اس کے بعد مزید دس راتیں بڑھا کر اس

---

[۱] سورہ بقرہ آیت 61

[۲] سورہ بقرہ آیت 61

[۳] سورہ بقرہ آیت 61

[۴] سورہ بقرہ آیت 61

[۵] سورہ بقرہ آیت 61

وعدہ کی تکمیل کی، چنانچہ موسیٰ سے خدا کا وعدہ چالیس راتوں میں پورا ہوا''۔[1]

اس کے بعد اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری قوم میں تم میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو اور کبھی مفسدوں کی پیروی نہ کرنا''۔[2]

مفسرین کے درمیان اس تفریق کے بارے میں بحث ہے، لیکن جو بات بیشتر قرین قیاس ہے،

دیدار پرودگار کی خواہش

قرآن میں بنی اسرائیل کی زندگی کے بعض دیگر مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے اصرار کے ساتھ یہ خواہش کی کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

اہل بیت علیہم السلام کے بھی موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ میعاد اگر چہ واقع میں چالیس راتوں کا تھا لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کرنے کے لئے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کی دعوت دی پھر اس کے بعد اس کی تجدید کر دی تا کہ منافقین مومنین سے الگ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ گاہ الٰہی کی طرف گئے تو انہوں نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کی غیبت تیس روز سے زیادہ طولانی نہ ہو گی لیکن جب خدا نے اس پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا تو بنی اسرائیل نے کہا: موسیٰ علیہ السلام نے اپنا وعدہ توڑ دیا اس کے نتیجہ میں انہوں نے وہ کام کئے جو ہم جانتے ہیں (یعنی گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے)۔

رہا یہ سوال کہ یہ چالیس روز یا چالیس راتیں، اسلامی مہینوں میں سے کونسا زمانہ تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے لے کر ذی الحجہ کی دس تاریخ تک تھی۔ قرآن میں چالیس راتوں کا ذکر ہے نہ کہ چالیس دنوں کا۔ تو شاید اس وجہ سے ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب سے جو مناجاتیں تھیں وہ زیادہ تر رات ہی کے وقت ہوا کرتی تھیں۔

اس کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا کہ قوم کی اصلاح کی کوشش کرنا اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا، جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام ایک نبی برحق اور معصوم تھے وہ بھلا مفسدوں کی پیروی کیوں کرنے لگے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ درحقیقت اس بات کی تاکید کے لئے تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم میں اپنے مقام کی اہمیت کا احساس رہے اور شاید اس طرح سے خود بنی اسرائیل کو بھی اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی غیبت میں حضرت ہارون علیہ السلام کی رہنمائی کا اچھی طرح اثر لیں اور ان کا کہنا مانیں اور ان کے اوامر و نواہی (احکامات) کو اپنے لئے سخت نہ سمجھیں، اس سے اپنی تحقیر خیال نہ کریں اور انکے سامنے اس طرح مطیع و فرمانبردار رہیں جس طرح وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمانبردار تھے۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 142

[2] سورہ اعراف آیت 143

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے ہی سے چالیس راتوں کا وعدہ کیوں نہ کیا بلکہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا اس کے بعد دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنے ہمراہ پروردگار کی میعادگاہ کی طرف لے گئے، وہاں پہنچ کر ان لوگوں کی درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کیا۔ خدا کی طرف سے اس کا ایسا جواب ملا جس سے بنی اسرائیل کے لئے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہوگئی۔

ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت موسیٰ ہماری میعادگاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے باتیں کیں تو انہوں نے کہا: اے پروردگار خود کو مجھے دکھلا دے تا کہ میں تجھے دیکھ لوں''۔[1]

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے فوراً خدا کی طرف سے یہ جواب سنا: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔

لیکن پہاڑ کی جانب نظر کرو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تب مجھے دیکھ سکو گے۔

جس وقت خدا نے پہاڑ پر جلوہ کیا تو اسے فنا کر دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ ہولناک منظر دیکھا تو ایسا اضطراب لاحق ہوا کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور جب ہوش میں آئے تو خدا کی بارگاہ میں عرض کی پروردگارا تو منزہ ہے، میں تیری طرف پلٹتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا ہوں مومنین میں سے۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رویت کی خواہش کیوں کی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ذات خداوندی قابل دید نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے، نہ اس کے لئے کوئی مکان و جہت ہے اس کے باوجود انہوں نے ایسی خواہش کیسے کر دی جو فی الحقیقت ایک عام انسان کی شان کے لئے بھی مناسب نہیں ہے؟

سب سے واضح جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خواہش دراصل اپنی قوم کی طرف سے کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل کے جہلاء کے ایک گروہ کا یہ اصرار تھا کہ وہ خدا کو کھلم کھلا دیکھیں گے تب ایمان لائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے یہ حکم ملا کہ وہ اس درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کریں تا کہ سب اس کا جواب سن لیں، کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام سے جو حدیث مروی ہے وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔[3]

---

[1] سورہ اعراف آیت 143

[2] سورہ اعراف آیت 143

[3] حضرت موسی علیہ السلام نے کس چیز سے توبہ کی؟ اس بارے میں جو سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جب حضرت موسی علیہ السلام ہوش میں آئے تو انہوں نے کیوں کہا: ''میں توبہ کرتا ہوں'' حالانکہ انہوں نے کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اگر انہوں نے یہ درخواست اپنی امت کی طرف سے کی تھی تو اس میں ان کا کیا قصور تھا، اللہ کی اجازت سے انہوں نے یہ درخواست خدا کے سامنے پیش کی اور اگر اپنے لئے شہود باطنی کی تمنا کی تھی تو یہ بھی خدا کے حکم کی مخالفت نہ تھی، لہٰذا توبہ کس بات کی تھی؟ دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے:

اول: یہ کہ حضرت موسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی نمائندگی کے طور پر خدا سے یہ سوال کیا تھا، اس کے بعد جب خدا کی طرف سے سخت جواب ملا جس میں اس سوال کی غلطی کو بتلایا گیا تھا تو حضرت موسی علیہ السلام نے توبہ بھی انہیں کی طرف سے کی تھی۔

دوم: یہ کہ حضرت موسی علیہ السلام کو اگرچہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی درخواست کو پیش کریں لیکن جس وقت پروردگار کی تجلی کا واقعہ رونما ہوا اور حقیقت آشکار ہوگئی تو حضرت موسی علیہ السلام کی یہ ماموریت ختم ہو چکی تھی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چاہئے یہ پہلی حالت (یعنی قبل از ماموریت) کی طرف پلٹ جائیں اور اپنے ایمان کا اظہار کریں تا کہ کسی کے لئے جائے شبہ باقی نہ رہے، لہٰذا اس حالت کا اظہار موسی علیہ السلام نے اپنی توبہ اور اس جملہ ''انی تبت الیك وانا اول المو منین'' سے کیا۔

الواح توریت

آخرکار اس عظیم میعادگاہ میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنی شریعت کے قوانین نازل فرمائے۔ پہلے ان سے فرمایا: ''اے موسیٰ میں نے تمہیں لوگوں پر منتخب کیا ہے، اور تم کو اپنی رسالتیں دی ہیں، اور تم کو اپنے ساتھ گفتگو کا شرف عطا کیا ہے''۔ [۱]

اب جبکہ ایسا ہے تو ''جو میں نے تم کو حکم دیا ہے اسے لے لو اور ہمارے اس عطیہ پر شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ''۔ [۲]

اس کے بعد اضافہ کیا گیا ہے کہ ہم نے جو الواح موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھیں ان پر ہر موضوع کے بارے میں کافی نصیحتیں تھیں اور ضرورت کے مسائل کی شرح اور بیان تھا۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ''بڑی توجہ اور قوت ارادی کے ساتھ ان فرامین کو اختیار کرو''[۳] اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان میں جو بہترین ہیں انہیں اختیار کریں۔

اور انہیں خبردار کر دو کہ ان فرامین کی مخالفت اور ان کی اطاعت سے فرار کرنے کا نتیجہ دردناک ہے اور اس کا انجام دوزخ ہے اور ''میں جلد ہی فاسقوں کی جگہ تمہیں دکھلا دوں گا''[۴]

یہودیوں میں گوسالہ پرستی کا آغاز

قرآن میں افسوس ناک اور تعجب خیز واقعات میں سے ایک واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کی طرف جانے کے بعد بنی اسرائیل میں رونما ہوا۔ وہ واقعہ ان لوگوں کی گوسالہ پرستی ہے۔ جو ایک شخص بنام ''سامری'' نے زیور و آلات بنی اسرائیل کے ذریعے شروع کیا۔

سامری کو چونکہ اس بات کا احساس تھا کہ قوم موسیٰ علیہ السلام عرصہ دراز محرومی اور مظلومی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس وجہ سے اس میں مادہ پرستی پائی جاتی تھی اور حب زر کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی ان کی یہی صفت ہے لہٰذا اس نے یہ چالاکی کی کہ وہ

---

[۱] سورہ اعراف آیت 144

[۲] سورہ اعراف آیت 144

[۳] سورہ اعراف آیت 145

[۴] سورہ اعراف آیت 145

یہاں پر دو چیزوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

1۔ الواح کس چیز کی بنی ہوئی تھیں: اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ خداوند کریم نے حضرت موسی علیہ السلام پر جو الواح نازل کی تھیں ان میں توریت کی شریعت اور قوانین لکھے ہوئے تھے، ایسا نہ تھا کہ یہ لوحیں حضرت موسی علیہ السلام کے ہاتھ میں تھیں اور اس میں فرامین منعکس ہو گئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لوحیں کیسی تھیں؟ کس چیز کی بنی ہوئی تھیں؟ قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے صرف کلمہ ''الواح'' سربستہ طور پر آیا ہے۔ جو دراصل ''لاح یلوح'' کے مادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں۔ چونکہ صفحہ کے ایک طرف لکھنے سے حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور مطلب آشکار ہو جاتے ہیں، اس لئے صفحہ کو جس پر کچھ لکھا جائے ''لوح'' کہتے ہیں۔ لیکن روایات و اقوال مفسرین میں ان الواح کی کیفیت کے بارے میں اور ان کی جنس کے بارے میں گوناگوں احتمالات ذکر کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی یقینی نہیں ہے اس لئے ان کے ذکر سے ہم اعراض کرتے ہیں۔

2۔ کلام کیسے ہوا: قرآن کریم کی مختلف آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے حضرت موسی علیہ السلام سے کلام کیا، خدا کا موسی علیہ السلام سے کلام کرنا اس طرح تھا کہ اس نے صوتی امواج کو فضا میں یا کسی جسم میں پیدا کر دیا تھا۔ کبھی یہ امواج صوتی ''شجرہ وادی ایمن'' سے ظاہر ہوتی تھیں اور کبھی ''کوہ طور'' سے حضرت موسی علیہ السلام کے کان میں پہنچتی تھیں۔ جن لوگوں نے صرف الفاظ پر نظر کی ہے اور اس پر غور نہیں کیا کہ یہ الفاظ کہاں سے نکل سکتے ہیں انہوں نے یہ خیال کیا کہ خدا کا کلام کرنا اس کے تجسم کی دلیل ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔

مجسمہ سونے کا بنایا کہ اس طرح ان کی توجہ زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مبذول کرا سکے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس محروم وفقیر ملت کے پاس اس روز اتنی مقدار میں زر وزیور کہاں سے آ گیا کہ اس سے یہ مجسمہ تیار ہو گیا؟ اس کا جواب روایات میں اس طرح ملتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے ایک تہوار کے موقع پر فرعونیوں سے زیورات مستعار لئے تھے یہ اسوقت کی بات ہے جس کے بعد ان کی غرقابی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ زیورات ان عورتوں کے پاس باقی رہ گئے تھے۔

اتنا ضرور ہے کہ یہ حادثہ مثل دیگر اجتماعی حوادث کے بغیر کسی آمادگی اور مقدمہ کے وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ اس میں متعدد اسباب کارفرما تھے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

بنی اسرائیل عرصہ دراز سے اہل مصر کی بت پرستی دیکھتے آ رہے تھے۔

جب دریائے نیل کو عبور کیا تو انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بت کی پرستش کرتی تھی۔ جیسا کہ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ میں بھی اس کا ذکر گزرا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی طرح کا بت بنانے کی فرمائش کی جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سخت سرزنش کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کا پہلے تیس راتوں کا ہونا اس کے بعد چالیس راتوں کا ہوجانا اس سے بعض منافقوں کو یہ موقع ملا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کی افواہ پھیلا دیں۔

قوم موسیٰ علیہ السلام میں بہت سے افراد کا جہل و نادانی سے متصف ہونا اس کے مقابلے میں سامری کی مکاری و مہارت کیونکہ اس نے بڑی ہوشیاری سے بت پرستی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا، بہرحال ان تمام باتوں نے اکٹھا ہو کر اس بات کے اسباب پیدا کئے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت بت پرستی کو قبول کرے اور ''گوسالہ'' کے چاروں طرف اس کے ماننے والے ہنگامہ برپا کردیں۔

دو دن میں چھ لاکھ گوسالہ پرست بن گئے

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ انحرافی تبدیلیاں صرف گنتی کے چند دنوں کے اندر واقع ہوگئیں جب موسیٰ علیہ السلام کو میعادگاہ کی طرف گئے ہوئے 35 دن گزر گئے تو سامری نے اپنا کام شروع کردیا اور بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام زیورات جو انہوں نے فرعونیوں سے عاریتاً لئے تھے اور ان کے غرق ہوجانے کے بعد وہ انہیں کے پاس رہ گئے تھے انہیں جمع کریں چھتیسویں، سنتیسویں اور اڑتیسویں دن انہیں ایک کٹھائی میں ڈالا اور پگھلا کر اس سے گوسالہ کا مجسمہ بنادیا اور انتالیسویں دن انہیں اس کی پرستش کی دعوت دی اور ایک بہت بڑی تعداد (کچھ روایات کی بناء پر چھ لاکھ افراد) نے اسے قبول کرلیا اور ایک روز بعد یعنی چالیس روز گزرنے پر موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے۔

قرآن اس طرح فرماتا ہے: ''قوم موسیٰ نے موسیٰ کے میقات کی طرف جانے کے بعد اپنے زیورات وآلات سے ایک گوسالہ بنایا جو ایک بے جان جسد تھا جس میں سے گائے کی آواز آتی تھی''۔ [1]

''اسے انہوں نے اپنے واسطے انتخاب کیا''

---

[1] سورہ اعراف آیت 148

اگر چہ یہ عمل سامری سے سرزد ہوا تھا۔[1]

لیکن اس کی نسبت قوم موسیٰ کی طرف دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کام میں سامری کی مدد کی تھی اور وہ اس کے شریک جرم تھے اس کے علاوہ ان لوگوں کی بڑی تعداد اس کے فعل پر راضی تھی۔

قرآنی گفتگو کا ظاہر یہ ہے کہ تمام قوم موسیٰ اس گوسالہ پرستی میں شریک تھی لیکن اگر دوسری آیت پر نظر کی جائے جس میں آیا ہے کہ:

''قوم موسیٰ میں ایک امت تھی جو لوگوں کو حق کی ہدایت کرتی تھی اور اسی کی طرف متوجہ تھی''۔[2]

اس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے مراد تمام امت موسیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی اکثریت اس گوسالہ پرستی کی تابع ہو گئی تھی، جیسا کہ آئندہ آنے والا ہے کہ وہ اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام مع اپنے ساتھیوں کے ان کے مقالے میں ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے

گوسالہ پرستوں کے خلاف شدید ردعمل

یہاں پر قرآن میں اس کشمکش اور نزاع کا ماجرا بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور گوسالہ پرستوں کے درمیان واقع ہوئی جب وہ میعادگاہ سے واپس ہوئے جس کی طرف گذشتہ میں صرف اشارہ کیا گیا تھا یہاں پر تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ردعمل کو بیان کیا گیا ہے جو اس گروہ کے بیدار کرنے کے لئے ان سے ظاہر ہوا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت موسیٰ غضبناک و رنجیدہ اپنی قوم کی طرف پلٹے اور گوسالہ پرستی کا نفرت انگیز منظر دیکھا تو ان سے کہا کہ تم لوگ میرے بعد برے جانشین نکلے تم نے میرا آئین ضائع کر دیا''۔[3]

یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میعادگاہ پروردگار سے پلٹتے وقت قبل اس کے کہ بنی اسرائیل سے ملتے، غضبناک اور اندوہ گین تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے میعادگاہ میں انہیں اس کی خبر دے دی تھی۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: میں نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کی آزمائش کی لیکن وہ اس آزمائش میں پوری نہ اتری اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ''آیا تم نے اپنے پروردگار کے فرمان کے بارے میں جلدی کی''۔[4]

تم نے خدا کے اس فرمان، کہ اس نے میعاد کا وقت تیس شب سے چالیس شب کر دیا، جلدی کی اور جلد فیصلہ کر دیا، میرے نہ آنے کو میرے مرنے یا وعدہ خلافی کی دلیل سمجھ لیا، حالانکہ لازم تھا کہ تھوڑا صبر سے کام لیتے، چند روز اور انتظار کر لیتے تا کہ حقیقت واضح ہو جاتی۔

اس وقت جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی زندگی کے ان طوفانی و بحرانی لمحات سے گزر رہے تھے، سر سے پیر تک غصہ اور افسوس کی شدت سے بھڑک رہے تھے، ایک عظیم اندوہ نے ان کے وجود پر سایہ ڈال دیا تھا اور انہیں بنی اسرائیل کے مستقبل کے

---

[1] جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیات میں آیا ہے

[2] سورہ اعراف آیت 159

[3] سورہ اعراف آیت 150

[4] سورہ اعراف آیت 150

بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی، کیونکہ تخریب اور تباہ کاری آسانی سے ہوجاتی ہے کبھی صرف ایک انسان کے ذریعے بہت بڑی خرابی اور تباہی واقع ہوجاتی ہے لیکن اصلاح اور تعمیر میں دیر لگتی ہے۔

خاص طور پر جب کسی نادان متعصب اور ہٹ دھرم قوم کے درمیان کوئی غلط ساز بجادیا جائے تو اس کے بعد اس کے برے اثرات کا زائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بے نظیر غصہ

اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ کرنا چاہئے تھا اور ایک شدید ردّعمل ظاہر کرنا چاہئے تھا تاکہ بنی اسرائیل کے فاسد افکار کی بنیاد گرا کر اس منحرف قوم میں انقلاب برپا کردیں، ورنہ تو اس قوم کو پلٹانا مشکل تھا۔

قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ شدید ردّعمل بیان کیا ہے جو اس طوفانی و بحرانی منظر کو دیکھنے کے بعد ان سے ظاہر ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے بے اختیارنہ طور پر اپنے ہاتھ سے توریت کی الواح کو زمین پر ڈال دیا اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کے سر اور داڑھی کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے علاوہ ہارون علیہ السلام کو بڑی شدت سے سرزنش کی اور باآواز بلند چیخ کر پکارے:

''کیا تم نے بنی اسرائیل کے عقائد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور میرے فرمان کی مخالفت کی؟''[2]

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ردّعمل ایک طرف تو ان کی اس واردات قلبی، بے قراری اور شدید ناراضی کی حکایت کرتا ہے تاکہ بنی اسرائیل کی عقل میں ایک حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے اس عمل کی قباحت کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

بنا برایں اگرچہ بالفرض الواح توریت کا پھینک دینا قابل اعتراض معلوم ہوتا ہو، اور بھائی کی شدید سرزنش نادرست ہو لیکن اگر حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شدید اور پر ہیجانی ردّعمل کا اظہار نہ کرتے تو ہرگز بنی اسرائیل اپنی غلطی کی سنگینی اور اہمیت کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے، ممکن تھا کہ اس بت پرستی کے آثار بدان کے ذہنوں میں باقی رہ جاتے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف غلط نہ تھا بلکہ امر لازم تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ تاریخ بنی اسرائیل میں کبھی اس قدر ناراض نہ ہوئے تھے کیونکہ ان کے سامنے بدترین منظر تھا یعنی بنی اسرائیل خدا پرستی کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی اختیار کرچکے تھے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ تمام زحمتیں جو انہوں نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کی تھیں سب برباد ہورہی تھیں۔

لہٰذا ایسے موقع پر الواح کا ہاتھوں سے گرجانا اور بھائی سے سخت مواخذہ کرنا ایک طبعی امر تھا۔

اے میری ماں کے بیٹے میں بے گناہ ہوں

اس شدید ردّعمل اور غیظ وغضب کے اظہار نے بنی اسرائیل پر بہت زیادہ تربیتی اثر مرتب کیا اور منظر کو بالکل پلٹ دیا جبکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نرم زبان استعمال کرتے تو شاید اس کا تھوڑا سا اثر بھی مرتب نہ ہوتا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت کو برانگیختہ کرنے کے لئے اور اپنی بے گناہی بیان کرنے کے

---

[1] سورہ اعراف آیت 150

[2] سورہ اعراف آیت 150

لئے کہا:

''اے میرے ماں جائے: اس نادان امت کے باعث ہم اس قدر قلیل ہو گئے کہ نزدیک تھا کہ مجھے قتل کردیں لہٰذا میں بالکل بے گناہ ہوں لہٰذا آپ کوئی ایسا کام نہ کریں کہ دشمن ہنسی اڑائیں اور مجھے اس ستم گر امت کی صف میں قرار نہ دیں''۔[1]

قرآن میں جو''ابن ام'' کی تعبیر آئی ہے جس کے معنی (اے میری ماں کے بیٹے، کے ہیں) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں ایک والدین کی اولاد تھے یہ اس لئے تھا کہ حضرت ہارون چاہتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جذبہ محبت بیدار کریں بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ تدبیر کارآمد ہوئی اور بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے توبہ کی خواہش کا اظہار کیا۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آتش غضب کم ہوئی اور وہ درگاہ خداوندی کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کی:

''پروردگارا مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت بے پایاں میں داخل کردے، تو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے''۔[2]

اپنے لئے اور اپنے بھائی کے لئے بخشش طلب کرنا اس بنا پر نہیں تھا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا بلکہ یہ پروردگار کی بارگاہ میں ایک طرح کا خضوع وخشوع تھا اور اس کی طرف بازگشت تھی اور بت پرستوں کے اعمال زشت سے اظہار تنفر تھا۔[3]

جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''گوسالہ'' کو نہ تو بنی اسرائیل نے بنایا تھا نہ حضرت ہارون علیہ السلام نے، بلکہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص سامری نے یہ حرکت کی تھی، جس پر حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ان کے معاون تھے خاموش نہ بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کی، انہوں نے اتنی کوشش کی کہ نزدیک تھا کہ لوگ انہیں قتل کردیتے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ توریت میں گوسالہ سازی اور بت پرستی کی طرف دعوت کو حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف نسبت دی گئی ہے، چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل 32 میں یہ عبارت ملتی ہے:

''جس وقت قوم موسیٰ نے دیکھا کہ موسیٰ کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا اٹھو اور ہمارے لئے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ یہ شخص موسیٰ جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری، ہارون نے ان سے کہا: طلائی بندے (گوشوارے) جو تمہاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انہیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کرکے ہارون کے پاس لائی، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیا اور کندہ کرنے کے ایک آلہ کے ذریعے تصویر بنائی اور اس سے ایک گوسالہ کا مجسمہ ڈھالا اور کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں سرزمین مصر سے باہر لایا ہے''۔

اسی کے ذیل میں ان مراسم کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت ہارون نے اس بت کے سامنے قربانی کرنے کے بارے میں بیان کئے تھے۔

جو کچھ سطور بالا میں بیان ہوا یہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی داستان کا ایک حصہ ہے جو توریت میں مذکور ہے اس کی عبارت بعینہ نقل کی گئی ہے حالانکہ خود توریت نے حضرت ہارون کے مقام بلند کو متعدد فصول میں بیان کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے

---

[1] سورہ اعراف آیت 151

[2] سورہ اعراف آیت 150

[3] قرآن اور موجودہ توریت کا ایک موازنہ

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات حضرت ہارون علیہ السلام کے ذریعے ظاہر ہوئے تھے (فصل 8 از سفر خروج توریت) اور ہارون علیہ السلام کا حضرت موسی علیہ السلام کے ایک رسول کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے۔

طلائی گوسالہ سے کس طرح آواز پیدا ہوئی؟

سامری جو کہ ایک صاحب فن انسان تھا اس نے اپنی معلومات سے کام لے کر طلائی گوسالہ کے سینے میں کچھ مخصوص نل (PIPE) اس طرح مخفی کر دیئے جن کے اندر سے دباؤ کی وجہ سے جب ہوا نکلتی تھی تو گائے کی آواز آتی تھی۔

کچھ کا خیال ہے کہ گوسالہ کا منہ اس طرح کا پیچیدہ بنایا گیا تھا کہ جب اسے ہوا کے رخ پر رکھا جاتا تھا تو اس کے منہ سے یہ آواز نکلتی تھی۔

قرآن میں پڑھتے ہیں کہ جناب موسیٰ نے سامری سے باز پرس شروع کی اور کہا: ''یہ کیا کام تھا کہ جو تو نے انجام دیا ہے اور اے سامری: تجھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا۔

اس نے جواب میں کہا: ''میں کچھ ایسے مطالب سے آگاہ ہوا کہ جو انہوں نے نہیں دیکھے اور وہ اس سے آگاہ نہیں ہوئے''۔

بہر کیف حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین برحق تھے اور ان کی شریعت کے سب سے بڑے عالم وعارف تھے توریت ان کے لئے مقام بلند کی قائل ہے اب ذرا ان خرافات کو بھی دیکھ لیجئے کہ انہیں ایک بت ساز ہی نہیں بلکہ ایک مؤسس بت پرستی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے بلکہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے مقولہ کے مطابق ان کی جانب سے ایک غلط عذر پیش کیا کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ یہ قوم بدی کی طرف مائل تھی اس لئے میں نے بھی اسے اس راہ پر لگا دیا جبکہ قرآن ان دونوں بلند پایہ پیغمبروں کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے پاک وصاف سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں قرآن تاریخ انبیاء ومرسلین کی پاکی وتقدس کا مظہر ہے جبکہ موجودہ توریت کی تاریخ انبیاء ومرسلین کی ساحت قدس کے متعلق انواع واقسام کی خرافات سے بھری ہوئی ہے ہمارے عقیدہ کے مطابق حقانیت واصالت قرآن اور موجودہ توریت وانجیل کی تحریف کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں انبیاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کا موازنہ کر لیا جائے اس سے اپنے آپ پتہ چل جائیگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

''میں نے ایک چیز خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آثار میں سے لی اور پھر میں نے اسے دور پھینک دیا اور میرے نفس نے اس بات کو اسی طرح مجھے خوش نما کر کے دکھایا''[1]

اس بارے میں کہ اس گفتگو سے سامری کی کیا مراد تھی، مفسرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں: پہلی یہ کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کے لشکر کے دریائے نیل کے پاس آنے کے موقع پر میں نے جبرائیل کو ایک سواری پر سوار دیکھا کہ وہ لشکر کو دریا کے خشک شدہ راستوں پر ورود کے لئے تشویق دینے کی خاطر ان کے آگے آگے چل رہا تھا میں نے کچھ مٹی ان کے پاؤں کے نیچے سے یا ان کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے اٹھالی اور اسے سنبھال کر رکھا اور اسے سونے کے بچھڑے کے اندر ڈالا اور یہ صدا اسی کی برکت سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ میں ابتدا میں خدا کے اس رسول (موسیٰ) کے کچھ آثار پر ایمان لے آیا اس کے بعد مجھے اس میں کچھ

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 96

شک اور تردد ہوا لہٰذا میں نے اسے دور پھینک دیا اور بت پرستی کے دین کی طرف مائل ہو گیا اور یہ میری نظر میں زیادہ پسندیدہ اور زیبا ہے۔

سامری کی سزا

یہ بات صاف طور پر واضح اور روشن ہے کہ موسیٰ کے سوال کے جواب میں سامری کی بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مجرم ہونے کا فرمان اسی عدالت میں صادر کر دیا اور اسے اس گوسالہ پرستی کے بارے میں تین حکم دیئے۔

پہلا حکم یہ کہ اس سے کہا ''تو لوگوں کے درمیان سے نکل جا اور کسی کے ساتھ میل ملاپ نہ کر اور تیری باقی زندگی میں تیرا حصہ صرف اتنا ہے کہ جو شخص بھی تیرے قریب آئے گا تو اس سے کہے گا: مجھ سے مس نہ ہو''۔ [1]

اس طرح ایک قاطع اور دوٹوک فرمان کے ذریعے سامری کو معاشرے سے باہر نکال پھینکا اور اسے مطلق گوشہ نشینی میں ڈال دیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''مجھ سے مس نہ ہو'' کا جملہ شریعت موسیٰ علیہ السلام کے ایک فوجداری قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جو بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے صادر ہوتا تھا وہ شخص ایک ایسے موجود کی حیثیت سے کہ جو پلید و نجس و ناپاک ہو، قرار پا جاتا تھا کوئی اس سے میل ملاپ نہ کرے اور نہ اسے یہ حق ہوتا تھا وہ کسی سے میل ملاپ رکھے۔

سامری اس واقعے کے بعد مجبور ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل اور ان کے شہر و دیار سے باہر نکل جائے اور بیابانوں میں جا رہے اور یہ اس جاہ طلب انسان کی سزا ہے کہ جو اپنی بدعتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ بڑے بڑے گروہوں کو منحرف کر کے اپنے گرد جمع کرے، اسے ناکام ہی ہونا چاہئے یہاں تک کہ ایک بھی شخص اس سے میل ملاپ نہ رکھے اور اس قسم کے انسان کے لئے یہ مکمل بائیکاٹ موت اور قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ ایک پلید اور آلودہ وجود کی صورت میں ہر جگہ سے راندہ اور دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ سامری کا بڑا جرم ثابت ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بارے میں نفرین کی اور خدا نے اسے ایک پر اسرار بیماری میں مبتلا کر دیا کہ جب تک وہ زندہ رہا کوئی شخص اسے چھو نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی اسے چھو لیتا تو وہ بھی بیماری میں گرفتار ہو جاتا۔ یا یہ کہ سامری ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں جو ہر شخص سے وسواس شدید اور وحشت کی صورت میں تھی؛ گرفتار ہو گیا، اس طرح سے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا وہ چلاتا کہ ''مجھے مت چھونا''۔ سامری کے لئے دوسری سزا یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قیامت میں ہونے والے عذاب کی بھی خبر دی اور کہا: ''تیرے آگے ایک وعدہ گاہ ہے، خدائی دردناک عذاب کا وعدہ کہ جس سے ہرگز نہیں بچ سکے گا''۔ [2]

تیسرا کام یہ تھا کہ جو موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا: ''اپنے اس معبود کو کہ جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا تھا ذرا دیکھ اور نگاہ کر ہم

---

[1] سورہ طٰہ آیت 97

[2] سورہ طٰہ آیت 97

اس کو جلا رہے ہیں اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بکھیر دیں گے'' (تا کہ ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائے)۔[۱]

گناہ عظیم اور کم نظیر توبہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس شدید ردعمل نے اپنا اثر دکھایا اور جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی تھی اور ان کی تعداد اکثریت میں تھی وہ اپنے کام سے پشیمان ہوئے ان کی شاید مذکورہ پشیمانی کافی تھی، قرآن نے یہ اضافہ کیا ہے: باقی رہتا ہے یہ سوال کہ اس ''غضب اور ذلت'' سے کیا مراد ہے؟ قرآن نے اس امر کی کوئی توضیح نہیں کی ہے صرف سربستہ کہہ کر بات آگے بڑھا دی ہے۔

لیکن ممکن ہے اس سے ان بدبختیوں اور پریشانیوں کی جانب اشارہ مقصود ہو جو اس ماجرے کے بعد اور بیت المقدس میں ان کی حکومت سے پہلے انہیں پیش آئیں۔

یا اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہو جو اس گناہ کے بعد انہیں دیا گیا کہ وہ بطور پاداش ایک دوسرے کو قتل کریں۔

قرآن اس کے بعد اس گناہ سے توبہ کے سلسلے میں کہتا ہے: ''اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم تم نے بچھڑے کو منتخب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب جو ایسا ہو گیا ہے تو توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹ آؤ''۔

''تمہاری توبہ اس طرح ہونی چاہئے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو۔ یہ کام تمہارے لئے تمہارے خالق کی بارگاہ میں بہتر ہے۔ اس ماجرے کے بعد خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی جو توّاب ورحیم ہے''۔[۲]

اس میں شک نہیں کہ سامری کے بچھڑے کی پرستش وعبادت کوئی معمولی بات نہ تھی وہ قوم جو خدا کی یہ تمام آیات دیکھ چکی تھی اور اپنے عظیم پیغمبر کے معجزات کا مشاہدہ کر چکی تھی ان سب کو بھول کر پیغمبر کی ایک مختصر سی غیبت میں اصل توحید اور آئین خداوندی کو پورے طور پر پاؤں تلے روندے اور بت پرست ہو جائے۔

اب اگر یہ بات ان کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے جڑ سے نہ نکالی جاتی تو خطرناک حالت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور ہر موقعے کے بعد اور خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد ممکن تھا ان کی دعوت کی تمام آیات ختم کر دی جاتیں اور اس عظیم قوم کی تقدیر مکمل طور پر خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

اکٹھا قتل

یہاں شدت عمل سے کام لیا گیا اور صرف پشیمانی اور زبان سے اظہار توبہ پر ہرگز قناعت نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی

---

[۱] سورہ طٰہٰ آیت 97

سامری کون ہے؟ اصل لفظ ''سامری'' عبرانی زبان میں ''شمری'' ہے اور چونکہ یہ معمول ہے کہ جب عبرانی زبان کے الفاظ عربی زبان میں آتے ہیں تو ''شین'' کا لفظ ''سین'' سے بدل جاتا ہے، جیسا کہ ''موشی''، ''موسیٰ'' سے اور ''یشوع''، ''یسوع'' سے تبدیل ہو جاتا ہے اس بناء پر سامری بھی ''شمرون'' کی طرف منسوب تھا اور ''شمرون''، ''یشاکر'' کا بیٹا تھا، جو یعقوب کی چوتھی نسل ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عیسائیوں کا قرآن پر یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے کہ قرآن نے ایک ایسے شخص کو کہ جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں رہتا تھا اور وہ گوسالہ پرستی کا سرپرست بنا تھا، شہر سامرہ سے منسوب ''سامری'' کے طور پر متعارف کرایا ہے، جب کہ شہر سامرہ اس زمانے میں بالکل موجود ہی نہیں تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ''سامری''، شمرون کی طرف منسوب ہے نہ کہ سامرہ شہر کی طرف۔

بہر حال سامری ایک خودخواہ اور منحرف شخص ہونے کے باوجود بڑا ہوشیار تھا وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ بنی اسرائیل کے ضعف کے نکات اور کمزوری کے پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہوئے اس قسم کا عظیم فتنہ کھڑا کرنے پر قادر ہو گیا کہ جو ایک قطعی اکثریت کے بت پرستی کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے اپنی اس خودخواہی اور فتنہ انگیزی کی سزا بھی اسی دنیا میں دیکھ لی۔

[۲] سورہ بقرہ آیت 54

طرف سے ایسا سخت حکم صادر ہوا جس کی مثال تمام انبیاء کی طویل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہ یہ کہ توبہ اور توحید کی طرف بازگشت کے سلسلے میں گناہگاروں کے کثیر گروہ کے لئے اکٹھا قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فرمان بھی ایک خاص طریقے سے جاری ہونا چاہئے تھا اور وہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خود تلواریں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کو قتل کریں کہ ایک اس کا اپنا مارا جانا عذاب ہے اور دوسرا دوستوں اور شناساؤں کا قتل کرنا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ایک تاریک رات میں وہ تمام لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی غسل کریں کفن پہن لیں اور صفیں باندھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائیں۔

ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ یہ توبہ کیوں اتنی سختی سے انجام پذیر ہوئی کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا ان کی توبہ کو بغیر اس خونریزی کے قبول کر لیتا۔

اس سوال کا جواب گذشتہ گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اصل توحید سے انحراف اور بت پرستی کی طرف جھکاؤ کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا کہ اتنی آسانی سے درگذر کر دیا جاتا اور وہ بھی ان واضح معجزات اور خدا کی بڑی بڑی نعمتوں کے مشاہدے کے بعد۔ درحقیقت ادیان آسمانی کے تمام اصولوں کو توحید اور یگانہ پرستی میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس اصل کا متزلزل ہونا دین کی تمام بنیادوں کے خاتمے کے برابر ہے اگر گاؤ پرستی کے مسئلے کو آسان سمجھ لیا جاتا تو شاید آنے والے لوگوں کے لئے سنت بن جاتا۔

خصوصاً بنی اسرائیل کے لئے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ضدی اور بہانہ باز لوگ تھے۔ لہٰذا چاہئے تھا کہ ان کی ایسی گوشمالی کی جائے کہ اس کی چبھن تمام صدیوں اور زمانوں تک باقی رہ جائے اور اس کے بعد کوئی شخص بت پرستی کی فکر میں نہ پڑے۔

خدا کی آیات کو مضبوطی سے پکڑ لو

عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی، ابن زید کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں: جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس آئے اور اپنے ساتھ توریت لائے تو اپنی قوم کو بتایا کہ میں آسمانی کتاب لے کر آیا ہوں جو دینی احکام اور حلال وحرام پر مشتمل ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے عملی پروگرام قرار دیا ہے۔ اسے لے کر اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس بہانے سے کہ یہ ان کے لئے مشکل احکام ہیں، یہودی نافرمانی اور سرکشی پر تل گئے۔ خدا نے بھی فرشتوں کو مامور کیا کہ وہ کوہ طور کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیں، اسی اثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں خبر دی کہ عہد و پیمان باندھ لو، احکام خدا پر عمل کرو، سرکشی و بغاوت سے توبہ کرو تو تم سے یہ عذاب ٹل جائے گا ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس پر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ توریت کو قبول کیا اور خدا کے حضور میں سجدہ کیا۔ جب کہ ہر لحظہ وہ کوہ طور کے اپنے سروں پر گرنے کے منتظر تھے لیکن بالآخر ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوہ طور کے بنی اسرائیل کے سروں پر مسلط ہونے کی کیفیت کے سلسلے میں مفسرین کی ایک جماعت کا اعتقاد ہے کہ حکم خدا سے کوہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور سائبان کی طرح ان کے سروں پر مسلط ہو گیا۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ میں سخت قسم کا زلزلہ آیا، پہاڑ اس طرح لرزنے اور حرکت کرنے لگا کہ کسی بھی وقت وہ ان کے سروں پر آ گرے گا لیکن خدا کے لطف و کرم سے زلزلہ رک گیا اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہو گیا۔

یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا زلزلے اور شدید بجلی کے زیر اثر اپنی جگہ سے اکھڑ کر ان کے سروں کے اوپر سے بحکم خدا اس طرح گزرا ہو کہ چند لحظے انہوں نے اسے اپنے سروں پر دیکھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ وہ ان پر گرنا چاہتا ہے لیکن یہ عذاب ان سے ٹل گیا اور وہ ٹکڑا کہیں دور جا گرا۔[۱]

آیئے واقعہ کی تفصیل قرآن میں پڑھتے ہیں کہ: ''اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا اور تمہیں کہا کہ، جو کچھ (آیات واحکام میں) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھاموا ور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) شاید اس طرح تم پرہیز گار ہو جاؤ''۔[۲]

''اس کے بعد پھر تم نے روگردانی کی اور اگر تم پر خدا کا فضل ورحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے''۔[۳]

اس عہد و پیمان میں یہ چیزیں شامل تھیں: پروردگار کی توحید پر ایمان رکھنا، ماں باپ، عزیز واقارب، یتیم اور حاجت مندو ں سے نیکی کرنا اور خونریزی سے پرہیز کرنا۔ یہ کلی طور پر ان صحیح عقائد اور خدائی پروگراموں کے بارے میں عہد و پیمان تھا جن کا توریت میں ذکر کیا گیا تھا۔

کوہ طور

کوہ طور سے مراد یہاں اسم جنس ہے یا یہ مخصوص پہاڑ ہے۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ طور اسی مشہور پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

لیکن بعض کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ طور لغوی معنی کے لحاظ سے مطلق پہاڑ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورہ اعراف کی آیہ 171 میں ''جبل'' سے تعبیر کیا گیا ہے:

توریت کیا ہے

توریت عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے ''شریعت'' اور ''قانون''۔ یہ لفظ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران پر نازل ہونے والی کتاب کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات عہد عتیق کی کتب کے مجموعے کے لئے اور کبھی کبھی توریت کے پانچوں اسفار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں کی کتب کے مجموعے کو عہد عتیق کہتے ہیں۔ اس میں توریت اور چند دیگر کتب شامل ہیں۔

توریت کے پانچ حصے ہیں: جنہیں سفر پیدائش، سفر خروج، سفر لاویان، سفر اعداد اور سفر تثنیہ کہتے ہیں۔ اس کے موضوعات یہ ہیں:

---

[۱] کیا اس عہد و پیمان میں جبر کا پہلو ہے: اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ ان کے سروں پر پہاڑ کا مسلط ہونا ڈرانے دھمکانے کے طور پر تھا نہ کہ جبر واضطرار کے طور پر ورنہ جبری عہد و پیمان کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ سرکش اور باغی افراد کو تہدید وسزا کے ذریعے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ یہ تہدید اور سختی جو وقتی طور پر ہے ان کے غرور کو توڑ دے گی۔ انہیں صحیح غور وفکر پر ابھارے گی اور اس راستے پر چلتے چلتے وہ اپنے ارادہ واختیار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔ بہر حال یہ پیمان زیادہ تر عملی پہلوؤں سے مربوط تھا ورنہ عقائد کو تو جبر واکراہ سے نہیں بدلا جا سکتا۔

[۲] سورہ بقرہ آیت 63

[۳] سورہ بقرہ آیت 63

(1) کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی خلقت۔

(2) حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران، گذشتہ انبیاء اور بنی اسرائیل کے حالات وغیرہ۔

(3) اس دین کے احکام کی تشریح۔

عہد عتیق کی دیگر کتابیں دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے مؤرخین کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران کے بعد کے نبیوں، حکمرانوں اور قوموں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

یہ بات بغیر کہے واضح ہے کہ توریت کے پانچوں اسفار سے اگر صرف نظر کرلیا جائے تو دیگر کتب میں سے کوئی کتاب بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب زبور جسے وہ ''مزامیر'' کہتے ہیں، حضرت داود علیہ السلام کے مناجات اور پند و نصائح کی تشریح ہے۔

رہی بات توریت کے پانچوں سفروں کی تو ان میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی آسمانی کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ تاریخی کتاب ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، ان کے دفن کی کیفیت اور ان کی وفات کے بعد کے کچھ حالات مذکور ہیں۔

خصوصاً سفر تثنیہ کے آخری حصے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی وفات سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ان کتب میں بہت سی خرافات اور ناروا باتیں انبیاء و مرسلین سے منسوب کردی گئی ہیں۔ بعض بچگانہ باتیں بھی ہیں جو ان کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر گواہ ہیں نیز بعض تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اصلی توریت غائب ہوگئی اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران علیہ السلام کے پیروکاروں نے یہ کتابیں تحریر کیں۔

حضرت خضر علیہ السلام

ابی بن کعب نے ابن عباس کی وساطت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے: ''ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے خطاب کررہے تھے۔ کسی نے آپؑ سے پوچھا روئے زمین پر سب سے زیادہ علم کون رکھتا ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کے عالم ہونے کا علم نہیں۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے کہ جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ اس قت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے انہیں ان سے ملاقات کی راہ بتائی''۔

یہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ تھی کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود اپنے آپ کو افضل ترین نہ سمجھیں۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کہ جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے ان کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ

---

[1] لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ایک اولوالعزم صاحب رسالت وشریعت شخص کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم نہیں ہونا چاہئے؟ اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اپنی ماموریت کی قلمرو میں نظام تشریع میں اسے سب سے بڑا عالم ہونا چاہئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح تھے لیکن ان کی ماموریت کی قلمرو ان کے عالم دوست کی قلمرو سے الگ تھی۔ ان کے عالم دوست کی ماموریت کا تعلق عالم بشریت سے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عالم ایسے اسرار سے آگاہ تھے کہ جو دعوت نبوت کی بنیاد نہ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کہ جو اپنے ماحول کے آگاہ ترین اور عالم ترین فرد تھے، بعض پہلوؤں سے ان کا علم بھی محدود تھا لہٰذا وہ استاد کی تلاش میں نکلے تا کہ اس سے درس لیں، استاد نے بھی ایسے درس دیئے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے عجیب تر ہے۔ اس داستان میں بہت سے اہم نکات پوشیدہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جناب خضر علیہ السلام کی تلاش میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی نہایت اہم چیز کی تلاش تھی۔ وہ اس کی جستجو میں دربدر پھر رہے تھے۔ وہ عزم بالجزم اور پختہ ارادے سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ارادہ کئے ہوئے تھے کہ جب تک اپنا مقصود نہ پالیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس کی تلاش پر مامور تھے اس کا آپؑ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے آپؑ کی زندگی کا نیا باب کھول دیا۔ جی ہاں وہ ایک مرد عالم و دانشمند کی جستجو میں تھے۔ ایسا عالم کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے سے بھی حجاب ہٹا سکتا تھا اور انہیں نئے حقائق سے روشناس کرواسکتا تھا اور ان کے لئے علوم و دانش کے تازہ باب کھول سکتا تھا۔

ایک حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ، حضرت خضر علیہما السلام سے زیادہ عالم تھے یعنی علم شریعت میں۔

شاید اس سوال کا جواب نہ پانے کی وجہ سے اور نسیان سے مربوط سوال کا جواب نہ پانے کے سبب بعض نے ان آیات میں جن موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اسے موسیٰ بن عمران تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔

ایک حدیث کہ جو حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس سے بھی یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا دائرہ کار اور قلمرو ایک دوسرے سے مختلف تھی اور ہر ایک دوسرے سے اپنے کام میں زیادہ عالم تھا۔

ہم اس سلسلے میں جلد پڑھیں گے کہ اس عالم بزرگ کی جگہ معلوم کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک نشانی تھی اور وہ اس نشانی کے مطابق ہی چل رہے تھے۔

قرآن کہتا ہے: ''وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے دوست اور ساتھی جوان سے کہا کہ میں تو کوشش جاری رکھوں گا جب تک ''مجمع البحرین'' تک نہ پہنچ جاؤں، اگرچہ مجھے یہ سفر لمبی مدت تک جاری رکھنا پڑے''۔ [1]

مجمع البحرین کا مطلب ہے دو دریاؤں کا سنگم۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ ''بحرین'' سے یہاں کون سے دو دریا ہیں۔ اس سلسلے میں تین مشہور نظریئے یں:

1۔ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے ملنے کی جگہ۔ ہم جانتے ہیں کہ بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک حصہ شمال مشرق کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور دوسرا شمال مغرب کی طرف پہلے حصے کو خلیج عقبہ کہتے ہیں اور دوسرے کو خلیج سویز اور یہ دونوں خلیجیں جنوب میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں اور پھر بحیرہ احمر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

2۔ اس سے بحر ہند اور بحیرہ احمر کے ملنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو باب المندب پر جا ملتے ہیں۔

3۔ یہ بحیرہ روم اور بحر اطلس کے سنگم کی طرف اشارہ ہے کہ جو شہر طنجہ کے پاس جبل الطارق کا تنگ دہانہ ہے۔

تیسری تفسیر تو بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے جبل الطارق کا فاصلہ اتنا زیادہ

---

[1] سورہ کہف آیت 60

ہے کہ اس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام راستے سے وہاں جاتے تو کئی ماہ لگ جاتے۔

دوسری تفسیر میں جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا فاصلہ اگر چہ نسبتاً کم بنتا ہے لیکن اپنی حد تک وہ بھی زیادہ ہے کیونکہ شام سے جنوبی یمن میں فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔

پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے یعنی شام سے خلیج عقبہ تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا اگر چہ مقصد تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ سفر کے لئے بھی تیار تھے۔

عرصہ دراز تک جناب خضر علیہ السلام کی تلاش

بعض لوگوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے، کہ انھوں نے کہا: ''میں اس وقت تک کوشش کروں گا جب تک اپنا مقصد حاصل نہ کرلوں'' کے بارے میں کہا ہے: کہ لفظ ''حقب''، ''عرصہ دراز'' کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی **80** سال سے تفسیر کی ہے۔ اس لفظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ مجھے جس کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ کے رہوں گا چاہے اس مقصد کے لئے مجھے سالہا سال تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

''بہر حال جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر جا پہنچے تو ایک مچھلی کہ جو ان کے پاس تھی اسے بھول گئے''۔ [۱]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ''مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلتی بنی''۔ [۲]

یہ مچھلی جو ظاہراً ان کے پاس غذا کے طور پر تھی۔ کیا بھونی ہوئی تھی اور اسے نمک لگا ہوا تھا یا یہ تازہ مچھلی تھی کہ جو معجزانہ طور پر زندہ ہو کر اچھل کر پانی میں جا کر تیرنے لگی۔

اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض کتب تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں آب حیات کا چشمہ تھا۔ اس کے کچھ قطرات مچھلی پر پڑ گئے جس سے مچھلی زندہ ہوگئی۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ مچھلی ابھی پوری طرح مری نہ تھی کیونکہ بعض مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پانی سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک نیم جاں صورت میں رہتی ہیں اور اس مدت میں پانی میں گر جائیں تو ان کی معمول کی زندگی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

آخر کار موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہی دو دریاؤں کے سنگم سے آگے نکل گئے تو لمبے سفر کے باعث انہیں خستگی کا احساس ہوا اور بھوک بھی ستانے لگی۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آیا کہ غذا تو ہم ہمراہ لائے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا: ہمارا کھانا لایئے اس سفر نے تو بہت تھکا دیا ہے۔ [۳]

اس وقت ''ان کے ہمسفر نے انہیں خبر دی کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی تھی (اور آرام کیا تھا) تو مجھے مچھلی کے بارے میں بتانا یاد نہ تھا اور شیطان ہی تھا جس نے یہ بات مجھے بھلا دی تھی۔ ہوا یہ کہ مچھلی نے بڑے حیران کن طریقے سے دریا کی راہ لی اور پانی میں چلتی بنی''۔ [۴]

---

[۱] سورہ کہف آیت 61

[۲] سورہ کہف آیت 61

[۳] سورہ کہف آیت 62

[۴] سورہ کہف آیت 63

یہ معاملہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس عالم بزرگ کو تلاش کرنے کے لئے نشانی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''یہی تو ہمیں چاہئے تھا اور یہی چیز تو ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے''۔[1]

''اور اس وقت وہ تلاش کرتے ہوئے اسی راہ کی طرف پلٹے''۔[2]

عظیم استاد کی زیارت

قرآن اس داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: جس وقت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمسفر دوست ''مجمع البحرین'' اور پتھر کے پاس پلٹ کر آئے تو ''اچانک ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے بہت سے علم ودانش سے نوازا تھا''۔[3]

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑے ادب سے اس عالم بزرگ کی خدمت میں عرض کیا: ''کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تا کہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعث رشد وصلاح ہے، مجھے بھی تعلیم دیں''۔[4] لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس عالم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے''۔[5] ساتھ ہی اس کی وجہ اور دلیل بھی بیان کر دی اور کہا: ''تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کے اسرار سے تم آگاہی نہیں رکھتے''؟[6] جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ عالم، اسرار و حوادث کے باطنی علوم پر دسترس رکھتا تھا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ باطن پر مامور تھے اور نہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔

ایسے مواقع پر ایسا بہت ہوتا ہے کہ حوادث کے ظاہر سے ان کا باطن مختلف ہوتا ہے، بعض اوقات کسی واقعے کا ظاہر احمقانہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے جبکہ باطن میں بہت مقدس منطقی اور سوچا سمجھا ہوتا ہے ایسے مواقع پر جو شخص ظاہر کو دیکھتا ہے وہ اس پر صبر نہیں کر پاتا اور اس پر اعتراض کرتا ہے یا مخالفت کرنے لگتا ہے۔

لیکن وہ استاد کہ جو اسراروں سے آگاہ ہے اور معاملے کے باطن پر نظر رکھتا ہے وہ بڑے اطمینان اور ٹھنڈے دل سے کام جاری رکھتا ہے اور اعتراض اور واویلا پر کان نہیں دھرتا بلکہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے تا کہ حقیقت امر بیان کرے جبکہ شاگرد بے تاب رہتا ہے لیکن جب اسرار اس پر کھل جاتے ہیں تو اسے پوری طرح سکون وقرار آجاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بات سن کر پریشان ہوئے، انہیں خوف تھا کہ اس عالم بزرگ کا فیض ان سے منقطع نہ ہو لہٰذا انہوں نے وعدہ کیا کہ تمام امور پر صبر کریں گے اور کہا انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔[7]

---

[1] سورہ کہف آیت 64

[2] سورہ کہف آیت 64

[3] سورہ کہف آیت 65

[4] سورہ کہف آیت 66

[5] سورہ کہف آیت 67

[6] سورہ کہف آیت 68

[7] سورہ کہف آیت 69

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر انتہائی ادب واحترام اور خدا کی مرضی پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

آپ نے اس عالم سے یہ نہیں کہا کہ میں صابر ہوں بلکہ کہتے ہیں: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ لیکن چونکہ ایسے واقعات پر صبر کرنا کہ جو ظاہراً ناپسندیدہ ہوں اور انسان جن کے اسرار سے آگاہ نہ ہو کوئی آسان کام نہیں اس لئے اس عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبردار کرتے ہوئے پھر عہد لیا" اور کہا اچھا اگر تم میرے پیچھے پیچھے آنا چاہتے ہو تو دیکھو خاموش رہنا اور کسی معاملے پر سوال نہ کرنا جب تک کہ مناسب موقع پر میں خود تم سے بیان نہ کردوں"۔ [۱]

جناب موسیٰ علیہ السلام نے پھر دوبارہ وعدہ کیا اور استاد کے ساتھ ہولئے۔

خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام؟

"موسیٰ علیہ السلام اس عالم ربانی کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک کشتی تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے"۔ [۲]

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اب قرآن تثنیہ کی ضمیر استعمال کرنے لگا ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس عالم بزرگوار کی طرف۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمسفر یوشع علیہ السلام کی ماموریت اس مقام پر ختم ہوگئی تھی اور وہ یہاں سے پلٹ گئے تھے یا پھر یہ ہے کہ وہ موجود تو تھے لیکن اس معاملے سے ان کا تعلق نہیں تھا لہٰذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

"بہرحال وہ دونوں کشتی پر سوار ہو گئے تو اس عالم نے کشتی میں سوراخ کر دیا"۔ [۳]

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک طرف تو اللہ کے عظیم نبی بھی تھے، لہٰذا انہیں لوگوں کی جان و مال کا محافظ بھی ہونا چاہئے تھا او رانہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہتے تھا اور دوسری طرف ان کا انسانی ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس قسم کے غلط کام پر خاموشی اختیار کریں لہٰذا حضرت خضر کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ایک طرف رکھا اور اس کام پر اعتراض کر دیا اور کہا: "کیا آپ نے اہل کشتی کو غرق کرنے کے لئے اس میں سوراخ کر دیا ہے واقعاً آپ نے کس قدر برا کام انجام دیا ہے"۔ [۴]

واقعاً یہ کام کتنا حیرت انگیز ہے کہ کسی کشتی میں بہت سے مسافر سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیا جائے؟

بعض روایات میں ہے کہ اہل کشتی جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سوارخ کو کسی چیز کے ذریعے سے پر کر دیا لیکن اب وہ کشتی صحیح نہیں رہ گئی تھی۔

اس وقت اس عالم نے بڑی متانت کے ساتھ موسیٰ پر نگاہ ڈالی اور کہا: "میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کرسکو گے"۔ [۵]

اس واقعے کی اہمیت کے پیش نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت اگرچہ فطری تھی تاہم وہ پشیمان ہوئے انہیں اپنا معاہدہ یاد آیا

---

[۱] سورہ کہف آیت 70

[۲] سورہ کہف آیت 71

[۳] سورہ کہف آیت 71

[۴] سورہ کہف آیت 71

[۵] سورہ صف آیت 72

لہٰذا معذرت آمیز لہجے میں استاد سے ''کہا اس بھول پر مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے اور اس کام پر مجھ پر سخت گیری نہ کیجئے''۔[1]

کیوں اس بچے کو قتل کر رہے ہو؟

ان کا دریائی سفر ختم ہو گیا وہ کشتی سے اتر آئے ''سفر جاری تھا اثنائے راہ میں انہیں ایک بچہ ملا لیکن اس عالم نے کسی تمہید کے بغیر ہی اس بچے کو قتل کر دیا''۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر نہ رہا گیا یہ نہایت وحشت ناک منظر تھا بلا جواز اور بے وجہ ایک بے گناہ بچے کا قتل، ایسی چیز نہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش رہ سکتے آپ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے غم واندوہ اور غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے پھر اپنے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اب کی شدید تر اور واضح تر اعتراض کیا یہ واقعہ بھی پہلے واقعے کی نسبت زیادہ وحشت ناک تھا وہ کہنے لگے: ''کیا آپ نے ایک بے گناہ اور پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، واقعاً آپ نے کیسا برا کام انجام دیا ہے۔''[3] اس عالم بزرگوار نے پھر اپنے خاص اطمینان اور نرم لہجے میں وہی جملہ دہرایا: ''کہا: میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے''۔[4]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عہد یاد آ گیا انہیں بہت احساس شرمندگی ہو رہا تھا کیونکہ دو مرتبہ یہ پیمان ٹوٹ چکا تھا چاہے بھول کر ہی ایسا ہوا ہو انہیں خیال آ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے استاد کی بات صحیح ہو کہ انہوں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ابتدا میں ان کے کام موسیٰ کے لئے ناقابل برداشت ہوں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پھر عذر خواہی کے لہجے میں کہا کہ اس دفعہ بھی مجھ سے صرف نظر کیجئے اور میری بھول چوک کو نظر انداز کر دیجئے اور ''اگر اس کے بعد میں آپ کے کاموں کے بارے میں وضاحت کا تقاضا کروں (اور آپ پر اعتراض کروں) تو پھر بے شک مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اس صورت میں آپ میری استادی سے معذور ہوں گے''۔[5]

یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انصاف پسندی، بلند نظری اور اعلیٰ ظرفی کی حکایت کرتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک حقیقت کے سامنے سر جھکا دینے والے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں تین بار کی آزمائش سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کی ماموریت الگ الگ ہے اور اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] سورہ صف آیت 73

[2] سورہ صف آیت 74

[3] سورہ کہف آیت 74

[4] سورہ کہف آیت 75

لفظ ''غلام'' جوان نورس کے معنی میں ہے وہ حد بلوغ کو پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔

جس نوجوان کو اس عالم نے قتل کیا تھا وہ حد بلوغ کو پہنچا ہوا تھا یا نہیں اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے ''نفسا زکیۃ'' (پاک اور بے گناہ انسان) کی تعبیر کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ وہ بالغ تھا کیونکہ قصاص صرف بالغ سے لیا جا سکتا ہے۔ البتہ آیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

[5] سورہ کہف آیت 76

اپنے کام کی مزدوری لے لو

اس گفتگو اور نئے معاہدے کے بعد ''موسیٰ علیہ السلام اپنے استاد کے ساتھ چل پڑے، چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچے انہوں نے اس بستی والوں سے کھانا مانگا لیکن بستی والوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا''[1]

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کوئی ایسے افراد نہ تھے کہ اس بستی کے لوگوں پر بوجھ بننا چاہتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا زادو توشہ راستے میں کہیں دے بیٹھے تھے یا پھر ختم ہو گیا تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ بستی والوں کے مہمان ہو جائیں (یہ احتمال بھی ہے کہ اس عالم نے جان بوجھ کر لوگوں سے ایسا کہا ہو تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور درس دیا جا سکے)۔[2]

بہر حال مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ شہر کونسا تھا اور کہاں واقع تھا ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ شہر ''انطاکیہ'' تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں ''ایلہ'' شہر مراد ہے کہ جو آج کل ''ایلات'' نام کی مشہور بندرگاہ ہے اور بحیرہ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ اس سے ''ناصرہ'' شہر مراد ہے کہ جو فلسطین کے شمال میں واقع ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔

مرحوم طبرسی نے اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جو آخری احتمال کی تائید کرتی ہے۔

مجمع البحرین کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد ''خلیج عقبہ'' اور ''خلیج سویز'' کا سنگم ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہر ناصرہ اور بندرگاہ ایلہ اس جگہ سے انطاکیہ کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔

بہر صورت جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے استاد کے ساتھ اس شہر میں پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بہت بخیل اور کم ظرف لوگ تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شہر والوں کے بارے میں ایک حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وہ کمینے اور کم ظرف لوگ تھے''۔

قرآن کہتا ہے: ''اس کے باوجود انہوں نے اس شہر میں ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس عالم نے اس کی مرمت شروع کر دی اور اسے کھڑا کر دیا''[3] اور اس کو ویرانی سے بچا لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت تھکے ہوئے تھے انہیں بھوک بھی ستا رہی تھی، کوفت الگ تھی وہ محسوس کر رہے تھے اس آبادی کے ناسمجھ لوگوں نے ان کی اور ان کے استاد کی ہتک کی ہے دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے، اس بے احترامی کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام اس گرتی ہوئی دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے جیسے ان کے سلوک کی مزدوری دے رہے ہوں وہ سوچ رہے تھے کہ کم از کم استاد یہ کام اجرت لے کر ہی کرتے تا کہ کھانا تو فراہم ہو جاتا۔

لہٰذا وہ اپنے معاہدے کو پھر بھول گئے انہوں نے پھر اعتراض کیا لیکن اب لہجہ پہلے کی نسبت ملائم اور نرم تھا'' کہنے لگے: اس

---

[1] سورہ کہف آیت 77

[2] اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ''قریۃ'' قرآن کی زبان میں ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور ہر قسم کے شہر اور آبادی کے معنی میں آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت سے شہر مراد ہے کیونکہ چند آیات کے بعد اس کے لئے لفظ ''المدینۃ'' (یعنی شہر) آیا ہے۔

[3] سورہ کہف آیت 77

کام کی کچھ اجرت ہی لے لیتے''۔ [1]

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سوچ رہے تھے کہ یہ عدل تو نہیں کہ انسان ان لوگوں سے ایثار کا سلوک کرے کہ جو اس قدر فرومایہ اور کم ظرف ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نیکی اچھی چیز ہے مگر جب محل پر ہو، یہ ٹھیک ہے کہ برائی کے جواب میں نیکی کرنا مردان خدا کا طریقہ ہے لیکن وہاں کہ جہاں بروں کے لئے برائی کی تشویق کا باعث نہ ہو۔

فراق دوست، زندگی کے سخت ترین ایام

اس موقع پر اس عالم بزرگوار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آخری بات کہی کیونکہ گزشتہ تمام واقعات کی بناء پر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ ان کے کاموں کو برداشت نہیں کر سکتے لہٰذا فرمایا: ''لو اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے جلد میں تمہیں ان امور کے اسرار سے آگاہ کروں گا کہ جن پر تم صبر نہ کر سکے''۔ [2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ گزشتہ واقعے میں یہی بات وہ خود تجویز کر چکے تھے یعنی خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ ان کا نباہ نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی جدائی کی خبر موسیٰ کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگی ایسے استاد سے جدائی کہ جس کا سینہ مخزن اسرار ہو، جس کی ہمراہی باعث برکت ہو اور جس کی ہر بات ایک درس ہو، جس کا طرز عمل الہام بخش ہو، جس کی پیشانی سے نور خدا ضوفشاں ہو اور جس کا دل علم الٰہی کا گنجینہ ہو ایسے رہبر سے جدائی باعث رنج و غم تھی لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو موسیٰ کو بہر حال قبول کرنا تھی۔

مشہور مفسر ''ابوالفتوح رازی'' کہتے ہیں کہ ایک روایت منقول ہے:

لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: آپ کی زندگی میں سب سے بڑی مشکل کونسی تھی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں نے بہت سختیاں جھیلی ہیں (فرعون کے دور کی سختیاں اور پھر بنی اسرائیل کے دور کی مشکلات کی طرف اشارہ ہے) لیکن کسی مشکل اور رنج نے میرے دل کو اتنا رنجور نہیں کیا جتنا حضرت خضر علیہ السلام سے جدائی کی خبر نے۔

ان واقعات کا راز

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا جدا ہونا طے پا گیا تو ضروری تھا کہ یہ الٰہی استاد اپنے ان کاموں کے اسرار ظاہر کرے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنھیں گوارا نہیں کر پائے تھے درحقیقت ان سے ہمراہی کا فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہی تھا کہ وہ ان تین عجیب واقعات کا راز سمجھ لیں اور یہی راز بہت سے مسائل کی تفہیم کے لئے کلید بن سکتا تھا اور مختلف سوالوں کا جواب اس میں پنہاں تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی والے واقعے سے بات شروع کی اور کہنے لگے: ''ہاں، تو وہ کشتی والی بات یہ تھی کہ وہ چند غریب ومسکین افراد کی ملکیت تھی وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے میں نے سوچا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے ہے اور وہ ہر صحیح سالم کشتی کو زبردستی ہتھیا لیتا ہے''۔ [3]

---

[1] سورہ کہف آیت 77

[2] سورہ کہف آیت 78

[3] سورہ کہف آیت 79

گو یا کشتی میں سوارخ کرنا ظاہراً تو برا لگتا تھا لیکن اس کام میں ایک اہم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ تھا کشتی کے غریب مالکوں کو ایک غاصب بادشاہ کے ظلم سے بچانا کیونکہ اس کے نزدیک عیب دار کشتیاں اس کے کام کی نہ تھیں اور ایسی کشتیوں پر وہ قبضہ نہیں جما تا تھا خلاصہ یہ کہ یہ کام چند مسکینوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے تھا اور اسے انجام پانا ہی چاہئے تھا۔

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام لڑکے کے قتل کے مسئلے کی طرف آتے ہیں کہتے ہیں: ''رہا وہ لڑکا، تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے ہمیں یہ بات اچھی نہ لگی کہ وہ اپنے ماں باپ کو راہ ایمان سے بھٹکا دے اور سرکشی و کفر پر ابھارے۔''[1]

بہر حال اس عالم نے اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے ماں باپ کو آئندہ جو ناگوار واقعات پیش آنے والے تھے انہیں اس قتل کی دلیل قرار دیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ''ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کے بدلے زیادہ پاک اور زیادہ پر محبت اولاد عطا فرمائے۔''[2]

آخری اور تیسرے کام یعنی دیوار بنانے کے واقعے کا جواب ہے، اس عالم نے اس واقعے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا: رہی دیوار کی بات۔ تو وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا اور ان کا باپ ایک نیک اور صالح شخص تھا، تیرا پروردگار چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، یہ تو تیرے رب کی طرف سے رحمت تھے۔

اور ان کے نیک ماں باپ کی وجہ سے میں مامور تھا کہ اس دیوار کو تعمیر کروں کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور خزانہ ظاہر ہو کر خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔[3]

لہٰذا انہوں نے کہا: اور میں نے یہ کام خود سے نہیں کئے بلکہ اللہ کے حکم تحت انجام دیئے۔[4]

جی ہاں: یہ تھے ان کاموں کے راز کہ جن پر صبر کی تم میں تاب نہیں تھی۔[5]

خضر کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی؟

یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس نے بزرگ علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے تین واقعات کہ جو اس عالم کے ہاتھوں انجام پائے ان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کیونکہ وہ باطن امر سے آگاہ نہ تھے لیکن بعد میں استاد نے وضاحت کی تو مطمئن ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعاً کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر نقص پیدا کیا جا سکتا ہے، کہ غاصب اسے لے نہ جائے۔

اور کیا کسی لڑکے کو اس کام پر سزا دی جا سکتی ہے جو وہ آئندہ میں انجام دے گا؟۔

اور کیا ضروری ہے کہ کسی کے مال کی حفاظت کے لئے ہم مفت زحمت برداشت کریں؟

ان سوالات کے جواب میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں: پہلا یہ کہ ان امور کو ہم فقہی احکام اور شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھیں۔ بعض مفسرین نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 80

[2] سورہ کہف آیت 81

[3] سورہ کہف آیت 82

[4] سورہ کہف آیت 82

[5] سورہ کہف آیت 82

انہوں نے پہلے واقعے کو اہم اور اہم تر قوانین پر سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مسلم ہے کہ ساری کشتی اور پوری کشتی کی حفاظت اہم کام تھا جبکہ جزوی نقص سے حفاظت زیادہ اہم نہیں تھا دوسرے لفظوں میں حضرت خضر علیہ السلام نے کم نقصان کے ذریعے زیادہ نقصان کو روکا، فقہی زبان میں ''افسد کو فاسد سے دفع کیا'' خصوصاً جبکہ یہ بات ان کے پیش نظر تھی کہ کشتی والوں کی باطن رضا مندی انہیں حاصل ہے کیونکہ اگر وہ اصل صورت حال سے آگاہ ہوجاتے تو اس کام پر راضی ہوجاتے (فقہی تعبیر کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام کو اس مسئلے میں ''اذن فحوی'' حاصل تھا)۔

اس لڑکے کے بارے میں مفسرین کا اصرار ہے کہ یقیناً وہ بالغ تھا اور وہ مرتد یا فاسد تھا لہٰذا وہ اپنے موجودہ اعمال کی وجہ سے جائز القتل تھا اور یہ جو حضرت خضر اپنے اقدام کے لئے اس کے آئندہ جرائم کو دلیل بناتے ہیں تو وہ اس بناء پر ہے کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مجرم نہ صرف یہ کہ اس وقت اس کام میں مبتلا ہے بلکہ آئندہ بھی اس سے بڑھ کر جرائم کا مرتکب ہوگا لہٰذا اس کا قتل قوانین شریعت کے مطابق تھا اور وہ اپنے افعال اور خود کردہ گناہوں کی وجہ سے جائز القتل تھا۔

رہا تیسرا واقعہ تو کوئی شخص کسی پر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ تم دوسرے کے لئے کیوں ایثار کرتے ہو اور اس کے اموال کو بچانے کے لئے کیوں بیگار اٹھاتے ہو، ہوسکتا ہے یہ ایثار واجب نہ ہو لیکن مسلم ہے کہ یہ اچھا کام ہے اور لائق تحسین ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ بعض مواقع پر سرحد وجوب تک پہنچ جائے مثلاً کسی یتیم بچے کا بہت سا مال ضائع ہو رہا ہو اور تھوڑی سی زحمت کر کے اسے بچایا جاسکے تو بعید نہیں ہے کہ ایسے موقع پر یہ کام واجب ہو۔

دوسرا راستہ اس بنیاد پر ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات اگرچہ خزانے اور دیوار کے بارے میں لائق اطمینان ہوں لیکن جو جوان مارا گیا اس کے بارے میں مذکورہ وضاحتیں ظاہر قرآنی گفتگو سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس کے قتل کا قصد ظاہراً اس کے آئندہ کا عمل قرار دیا گیا ہے نہ کہ موجودہ عمل۔ کشتی کے بارے میں بھی مذکورہ وضاحت کسی حد تک قابل بحث ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے اور وہ یہ ہے: اسی جہان میں ہمیں دو نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے ایک نظام تکوین ہے اور دوسرا نظام تشریع یہ دونوں نظام اگرچہ کلی اصول میں تو ہم آہنگ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جزئیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثلا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش خوف، اموال وثمرات کے نقصان، اپنی اور عزیزوں کی موت اور قتل کے ذریعے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون شخص ان حوادث ومصائب پر صبر وشکیبائی اختیار کرتا ہے۔

تو کیا کوئی فقیہ بلکہ کوئی پیغمبر ایسا کرسکتا ہے۔ یعنی اموال ونفوس، ثمرات اور امن کو ختم کر کے لوگوں کو آزمائے؟

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں اور صالح بندوں کو خبردار کرنے اور انہیں تنبیہ کرنے کے لئے کسی ترک اولیٰ پر بڑی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصیبت میں گرفتار ہوئے اس بات پر کہ انہوں نے بعض مساکین کی طرف کم توجہ دی یا حضرت یونس کو ایک معمولی ترک اولیٰ پر مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا تو کیا کوئی حق رکھتا ہے کہ کسی کو سزا کے طور پر ایسا کرے یا یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کسی انسان کی ناشکری کی وجہ سے اس سے کوئی نعمت چھین لیتا ہے مثلاً کوئی شخص مال ملنے پر شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مال دریا میں غرق ہوجاتا ہے یا صحت پر شکر ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس سے صحت لے لیتا ہے تو کیا فقہی اور شرعی قوانین کی رو سے کوئی ایسا کرسکتا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے کسی کا مال ضائع کردے اور اس کی مثالیں مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ جہان آفرینش خصوصا خلقت انسان اس احسن نظام پر استوار ہے کہ اللہ نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لئے کچھ تکوینی قوانین بنائے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں حالانکہ قانون شریعت کے لحاظ سے ہم ان قوانین پر عمل نہیں

کر سکتے۔

مثلاً کسی انسان کی انگلی ڈاکٹر اس لئے کاٹ سکتا ہے کہ زہر اس کے دل کی طرف سرایت نہ کر جائے لیکن کیا کوئی شخص کسی انسان میں صبر پیدا کرنے کے لئے یا کفران نعمت کی وجہ سے اس کی انگلی کاٹ سکتا ہے؟ (جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نظام احسن کے مطابق ہے)

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہم دو نظام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں نظاموں پر حاکم ہے تو کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اللہ ایک گروہ کو نظام تشریعی کو عملی شکل دینے پر مامور کرے اور فرشتوں کے ایک گروہ یا بعض انسانوں کو (مثلاً حضرت خضر کو) نظام تکوین کو عملی شکل دینے پر مامور کرے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین کے لحاظ سے کوئی مانع نہیں کہ وہ کسی نابالغ بچے کو بھی کسی حادثے میں مبتلا کر دے اور اس میں اس کی جان چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا وجود مستقبل کے لئے بہت بڑے خطرات کا باعث ہو، نیز کوئی مانع نہیں کہ اللہ مجھے آج کسی سخت بیماری میں مبتلا کر دے، اس طرح سے کہ میں گھر سے باہر نہ نکل سکوں کیونکہ وہ چاہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس عالم میں مامورین کا ایک گروہ باطن پر مامور ہے اور ایک گروہ ظاہر پر مامور ہے جو باطن پر مامور ہیں ان کے لئے اپنے اصول وضوابط اور پروگرام ہیں اور جو ظاہر پر مامور ہیں ان کے لئے اپنے خاص اصول وضوابط ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں پروگراموں کا اصلی اور کلی مقصد انسان کو کمال کی طرف لے جانا ہے اس لحاظ سے دونوں ہم آہنگ ہیں، شک نہیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی میں بھی کوئی خود سری سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقی مالک وحاکم کی طرف سے مجاز ہو لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا اور کہا:

میں نے یہ کام حکم الٰہی کے مطابق اور اسی کے ضابطے اور طریقہ کے مطابق انجام دیئے ہیں اس طرح ان اقدامات میں جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر کے کاموں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے تو یہ اسی بناء پر تھا کہ ان کی ماموریت اور ذمہ داری کا طریقہ جناب خضر علیہ السلام کی ذمہ داری کے راستے سے الگ تھا لہٰذا جب انہوں نے حضرت خضر کا کام ظاہراً شرعی قوانین کے خلاف دیکھا تو اس پر اعتراض کیا لیکن خضر نے ٹھنڈے دل سے اپنا کام جاری رکھا اور چونکہ یہ دو عظیم خدائی رہبر مختلف ذمہ داریوں کی بناء پر ہمیشہ کے لئے اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا حضرت خضر انے کہا:

''یہ اب میرے اور تمہارے جدا ہونے کا مرحلہ آ گیا ہے''۔

حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں لیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوست اور استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی اور جسے ہم نے اپنے علم سے نوازا''۔ اس تعارف میں ان کے مقام عبودیت کا تذکرہ ہے اور ان کے خاص علم کو واضح کیا گیا ہے لہٰذا ہم نے بھی عالم کے طور پر ان کا زیادہ ذکر کیا ہے۔

لیکن متعدد روایات میں اس عالم کا نام ''خضر'' بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی نام ''بلیا ابن ملکان'' تھا اور ''خضر'' ان کا لقب تھا کیونکہ وہ جہاں کہیں قدم رکھتے ان کے قدموں کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس عالم کا نام''الیاس'' ہے یہی سے یہ تصور پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے''الیاس''اور''خضر''ایک ہی شخص کے دونام ہوں لیکن مشہورومعروف مفسرین اورراویوں نے پہلی بات ہی بیان کی ہے۔

واضح ہے کہ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ اس شخص کا نام کیا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک عالم ربانی تھے اور پروردگار کی خاص رحمت ان کے شامل حال تھی۔وہ باطن اور نظام تکوینی پر مامور تھے اور کچھ اسرار سے آگاہ تھے اور ایک لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام بن عمران کے معلم تھے اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی لحاظ سے ان پر مقدم تھے۔

یہ کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں۔اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔اصول کافی جلد اول میں متعدد روایات ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ''ذوالقرنین''اور''آصیف ابن برخیا'' کی طرح ایک عالم تھے۔

جبکہ کچھ اور روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل تھے اور زیر نظر روایات میں بھی بعض تعبیرات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔کیونکہ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں:

''میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا''۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:''ہم چاہتے تھے کہ ایسا ہو''۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی عمر کے حامل تھے۔

خود ساختہ افسانے

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی داستان کی بنیاد وہی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے منسلک کر کے بہت سے افسانے گھڑ لئے گئے ہیں۔ان افسانوں کو اس داستان کے ساتھ خلط ملط کرنے سے اصل داستان کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔جاننا چاہئے کہ یہ کوئی پہلی داستان نہیں ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے اور بہت سی سچی داستانوں کے ساتھ یہی حال کیا گیا ہے۔

لہٰذا حقیقت تک رسائی کے لئے قرآن کو بنیاد قرار دیا جانا چاہئے جس میں یہ داستان بیان ہوئی ہے۔یہاں تک کہ احادیث کو بھی اسی صورت میں قبول کیا جاسکتا ہے جب وہ قرآن کے موافق ہوں۔اگر کوئی حدیث اس کے برخلاف ہو تو یقیناً وہ قابل قبول نہیں ہے اور خوش قسمتی سے معتبر احادیث میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

علم موسیٰ علیہ السلام وخضر علیہ السلام علم خدا کے مقابلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''جس وقت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے ملے تو ایک پرندہ ان کے سامنے ظاہر ہوا۔اس نے پانی کا ایک قطرہ اپنی چونچ میں لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خضر علیہ السلام نے کہا:

جانتے ہو کہ پرندہ کیا کہتا ہے: گیارہویں صدی عیسوی میں مدون ہوئی ہیں،ان میں ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ داستان سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔اگر چہ اس داستان کے ہیرو''الیاس''اور''یوشع بن لاوی''ہیں کہ جو تیسری صدی عیسوی کے''تلموذ'' کے مفسرین میں سے تھے۔یہ داستان اور کئی پہلوؤں سے بھی موسیٰ علیہ السلام وخضر علیہ السلام سے مختلف ہے۔

مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ ج7 ص171 پر رجوع کریں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا کہتا ہے؟

خضر علیہ السلام کہنے لگے: کہتا ہے: ”تیرا علم اور موسیٰ کا علم، خدا کے علم کے مقابلے میں اس قطرے کی طرح ہے جو میں نے پانی سے چونچ میں لیا ہے“۔

وہ خزانہ کیا تھا؟

اس داستان کے بارے میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ خزانہ آخر کیا تھا جسے موسیٰ علیہ السلام کے عالم دوست پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور آخر اس باایمان شخص یعنی یتیموں کے باپ نے یہ خزانہ کیوں چھپا دیا تھا؟

بعض نے کہا ہے کہ وہ خزانہ مادی پہلو کی بجائے زیادہ معنوی پہلو رکھتا تھا۔ بہت سی شیعہ سنی روایات کے مطابق وہ ایک تختی تھی جس پر حکمت آمیز کلمات نقش تھے۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت آمیز کلمات کیا تھے۔

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یہ سونے چاندی کا خزانہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک تختی تھی جس پر چار جملے ثبت تھے۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جو موت پر یقین رکھتا ہے وہ (بے ہودہ) نہیں ہنستا۔

اور جسے اللہ کی طرف سے حساب کا یقین ہے (اور اسے جوابدہی کی فکر ہے) وہ خوش نہیں رہتا۔

اور جسے تقدیر الٰہی کا یقین ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

اور بنی اسرائیل کی نافرمانی اصحاب سبت، سنیچر کی چھٹی

بنی اسرائیل کا ایک گروہ جو ایک سمندر (بظاہر بحیرہ احمر جو فلسطین کے پاس ہے) کے کنارے شہر ”ایلہ“ (جسے آج کل ”ایلات“ کہتے ہیں) میں رہتے تھے، ان کی آزمائش کے لئے اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار نہ کریں، سارے دنوں میں شکار کریں صرف ایک دن تعطیل کر دیا کریں لیکن ان لوگوں نے اس حکم کی صریحاً مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے جس کی تفصیل قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ”جو یہودی تمہارے زمانہ میں موجود ہیں ان سے اس شہر کے ماجرے کے متعلق سوال کرو جو سمندر کے کنارے آباد تھا“۔ اور انہیں وہ زمانہ یاد دلاؤ جبکہ وہ ہفتہ کے روز قانون الٰہی کی مخالفت کرتے تھے۔“ [1]

کیونکہ ہفتہ کے روز ان کی تعطیل کا دن تھا جس میں ان کو یہ حکم ملا تھا کہ اس روز وہ اپنا کاروبار ترک کر دیں اور عبادت خدا میں مشغول ہوں لیکن انہوں نے اس حکم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس کے بعد قرآن کریم اس جملے کی جو اجمالی طور پر پہلے گزر چکا ہے اس طرح شرح کرتا ہے کہ یاد کرو: ”جب ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر ظاہر ہوتی تھیں اور دوسرے دنوں میں وہ کم دکھلائی دیتی تھیں“۔ [2]

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ سمندر کے کنارے زندگی بسر کرتے تھے ان کی خوراک اور آمدنی کا بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار ہوتا ہے، اور چونکہ ہفتہ کے روز مسلسل تعطیل ان کے درمیان رائج تھی، لہٰذا اس روز مچھلیاں امن محسوس کرتی تھیں اور وہ گروہ در گروہ پانی کی

---

[1] سورہ اعراف آیت 162

[2] سورہ اعراف آیت 162

سطح پر ظاہر ہوتی تھیں لیکن دوسرے دنوں میں چونکہ ان کا شکار کیا جاتا تھا اس لئے وہ گہرے پانی میں بھاگ جاتی تھیں۔ بہر حال یہ کیفیت چاہے کسی فطری امر کے نتیجہ میں ہو یا کوئی خلاف معمول الٰہی بات ہو اس سے ان لوگوں کی آزمائش مطلوب تھی جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے:

''ہم نے اس طرح ان لوگوں کی آزمائش کی اس چیز کے ذریعے جس کی وہ مخالفت کرتے تھے''۔[1]

جس وقت بنی اسرائیل اس بڑی آزمائش سے دوچار ہوئے جو ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ تین گروہوں میں بٹ گئے:

اول: جن کی اکثریت تھی، وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فرمان الٰہی کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

دوم: جو حسب معمولی ایک چھوٹی اقلیت پر مشتمل تھا وہ گروہ اول کے مقابلے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرعی ذمہ داری ادا کرتا تھا۔

سوم: یہ وہ لوگ تھے جو ساکت اور غیر جانبدار تھے۔ یہ نہ تو گنہگاروں کے ساتھ تھے اور نہ انہیں گناہوں سے منع کرتے تھے۔

قرآن میں اس گروہ نے دوسرے گروہ سے جو گفتگو کی ہے اسے نقل کیا گیا ہے۔

اس وقت کو یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم ان لوگوں کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو جنہیں آخر کار خدا ہلاک کرنے والا ہے یا دردناک عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔

انہوں نے جواب میں کہا: ہم اس لئے برائی سے منع کرتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو ادا کردیں اور وہ اس بارے ہیں ہم سے کوئی باز پرس نہ کرے۔

علاوہ ازیں شاید ان کے دلوں میں ہماری باتوں کا کوئی اثر بھی ہوجائے اور وہ طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھالیں۔[2]

''آخر کار دنیا پرستی نے ان پر غلبہ کیا۔ اور انہوں نے خدا کے فرمان کو فراموش کردیا۔ اس وقت ہم نے ان لوگوں کو جو لوگوں کو گناہ سے منع کرتے تھے، نجات دی، لیکن گناہگاروں کو ان کے گناہ کے سبب سخت عذاب میں مبتلا کردیا''۔[3]

اس کے بعد انہیں سزا دیئے جانے کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: ''انہوں نے اس بات کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ (لہٰذا) ہم نے ان سے کہا دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں ہوجاؤ''۔[4]

بنی اسرائیل نے کس طرح گناہ کیا تھا؟

اس امر میں کہ بنی اسرائیل نے کس وقت قانون شکنی کی، مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایک حیلہ اختیار کیا، انہوں نے سمندر کے کنارے، بہت سے حوض بنا لئے تھے اور انہیں نہروں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا تھا۔ ہفتہ کے روز ان حوضوں کے راستے کھول دیتے تھے پانی کے ساتھ مچھلیاں ان حوضوں کے اندر آجاتی تھیں، غروب کے وقت جب

---

[1] سورہ اعراف آیت 163

[2] سورہ اعراف آیت 164

[3] سورہ اعراف آیت 165

[4] سورہ اعراف آیت 166

واپس جانا چاہتی تھیں تو واپسی کا راستہ بند کر دیتے تھے، جب اتوار کا دن ہوتا تھا تو پھر ان کا شکار کر لیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم نے ہفتہ کے روز شکار تھوڑی کیا ہے بلکہ ہم نے تو صرف انہیں حوضوں میں محصور کر لیا تھا اصل شکار تو اتوار کے روز ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ وہ لوگ ہفتہ کے روز مچھلی پکڑنے کے کانٹوں کو دریا میں ڈال دیتے تھے اس کے بعد جب اس میں مچھلیاں پھنس جاتی تھیں تو دوسرے روز انہیں نکال لیتے تھے اور اس حیلہ سے ان کا شکار کرتے تھے۔

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بغیر کسی حیلہ کے بروز شنبہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شکار میں مشغول ہوتے تھے۔

ممکن ہے کہ یہ تمام روایات صحیح ہوں اس طرح کہ ابتداء میں حوضوں یا قلابوں کے ذریعے حیلے سے شکار کرتے ہوں، جب اس طرح سے ان کی نظر میں گناہ کی اہمیت کم ہوگئی ہو تو پھر انہوں نے اعلانیہ گناہ کرنا شروع کر دیا ہو اور ہفتہ کے دن کی حرمت کو ضائع کر کے مچھلی کی تجارت سے مالدار ہوگئے ہوں۔ [1]

بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نامعلوم طور پر قتل ہو جاتا ہے۔ اس کے قاتل کا کسی طرح پتا نہیں چلتا۔

تاریخ اور تفاسیر سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا سبب مال تھا یا شادی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک ثروت مند شخص تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اس دولت کا وارث اس کے چچازاد بھائی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ دولت مند کافی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے چچازاد بھائی نے بہت انتظار کیا کہ وہ دنیا سے چلا جائے تا کہ اس کا وارث بن سکے لیکن اس کا انتظار بے نتیجہ رہا لہٰذا اس نے اسے ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ بالآخر اسے تنہائی میں پا کر قتل کر دیا اور اس کی لاش سڑک پر رکھ دی اور گریہ وزاری کرنے لگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں مقدمہ پیش کیا کہ بعض لوگوں نے میرے چچازاد بھائی کو قتل کر دیا ہے۔

بنا بریں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کلمہ ''مسخ'' کا جو ظاہری مفہوم ہے اسی کو مانا جائے جو قرآن میں آیا ہے نیز دیگر

---

[1] آیا یہ مسخ جسمانی تھا یا روحانی؟

''مسخ'' یا دوسرے لفظوں میں ''انسانی شکل کا کسی حیوان کی شکل میں تبدیل ہو جانا'' مسلمہ طور پر ایک خلاف معمول اور خلاف طبیعت بات ہے اگر چہ میوٹیشن (mutation) بعض حیوانات کا دوسرے حیوانات کی شکل اختیار کر لینا نادر طور پر دیکھا گیا ہے اور سائنس میں تکامل حیات کی بنیاد بھی اس بات پر رکھی گئی ہے، لیکن میوٹیشن (mutation) جہاں دیکھا گیا ہے وہ بہت نادر الموقع موارد ہیں، وہ بھی حیوانات کی جزوی صفات میں پایا جاتا ہے نہ کہ ان کی کلی صفات میں، بلکہ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ میوٹیشن (mutation) کی وجہ سے ایک حیوان اپنی نوع مثلاً بندر سے بکری بن گیا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی حیوان کی خصوصیات دگرگوں ہو جائیں، پھر یہ کہ یہ تبدیلی اس کی نسل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ جو حیوان پیدا ہو گیا ہے اس کی شکل یک بیک بدل گئی ہو، بنا بریں کسی انسان یا حیوان کی شکل کا بدل کر دوسری نوع اختیار کر لینا ایک خلاف معمول بات ہے۔

ہم نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو طبیعت اور عادت کے برخلاف واقع ہوتے ہیں جو کبھی تو پیغمبروں کے معجزوں کی صورت میں اور کبھی بعض خارق العادت کاموں کی صورت میں بعض انسانوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

چاہے وہ انسان پیغمبر نہ بھی ہوں (ایسے افعال میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے) لہٰذا جب خارق العادت امور اور معجزات کے وقوع کو قبول کر لیا جائے تو مسخ ہو جانا یا ایک انسان کا دوسرے انسان کی صورت اختیار کر لینا کوئی خلاف عقل بات نہیں ہے۔

اس طرح کا خارق العادت واقعہ رونما ہونا نہ تو قانون علل واسباب میں کوئی مستثنیٰ ہے اور نہ ہی عقل وخرد کے برخلاف بلکہ اس میں صرف ایک ''عادی'' وطبیعی کلیہ کی شکست ہے جس کی نظیر ہم نے بعض استثنائی انسانوں میں بارہا دیکھی ہے۔

مفسرین نے بھی زیادہ تر یہی معنی مراد لئے ہیں۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ قتل کا سبب یہ تھا کہ اپنے چچا زاد بھائی کو قتل کرنے والے نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس نے یہ درخواست رد کردی اور لڑکی کو بنی اسرائیل کے ایک نیک اور پاکباز جوان سے بیاہ دیا۔شکست خوردہ چچا زاد بھائی نے لڑکی کے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا اور چھپ کر اسے قتل کر دیا۔

بنی اسرائیل کے قبائل کے درمیان جھگڑا اور نزاع شروع ہوجاتا ہے۔ان میں سے ہر ایک دوسرے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے اور اپنے کو بری الذمہ قرار دیتا ہے۔

جھگڑا ختم کرنے کے لئے مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ آپ سے اس موقع پر مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس کا حل چاہتے ہیں۔

چونکہ عام اور معروف طریقوں سے اس قضیہ کا فیصلہ ممکن نہ تھا اور دوسری طرف اس کشمکش کے جاری رہنے سے ممکن تھا بنی اسرائیل میں ایک عظیم فتنہ کھڑا ہوجاتا۔

لہٰذا جیسا کہ آپ ان آنے والی ابحاث میں پڑھیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام پروردگار سے مدد لے کر اعجاز کے راستے اس مشکل کو کیونکر حل کرتے ہیں۔

قرآن نے فرمایا: ''یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا (قاتل کو تلاش کرنے کے لئے) پہلی گائے (جو تمہیں مل جائے اس) کو ذبح کرو''۔[۱]

اور اس ذبح شدہ گائے کا ایک حصہ اس مقتول کے جسم پر لگاؤ جس کا قاتل معلوم نہیں ہے تاکہ وہ زندہ ہوجائے اور اپنے قاتل کو بتائے۔

انہوں نے بطور تعجب کہا: ''کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو''۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں کہا: ''میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں''۔[۲]

یعنی استہزاء اور تمسخر کرنا نادان افراد اور جاہل افراد کا کام ہے۔اور خدا کا رسول یقیناً ایسا نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اعتراضات

اسکے بعد انہیں اطمینان ہوگیا کہ استہزاء مذاق نہیں بلکہ سنجیدہ گفتگو ہے تو ''کہنے لگے: اب اگر ایسا ہی ہے تو اپنے پروردگار سے کہیئے ہمارے لئے مشخص و معین کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو''؟[۳]

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

''خدا فرماتا ہے ایسی گائے ہو جو نہ بہت بوڑھی ہو کہ بے کار ہو چکی ہو اور نہ ہی جوان بلکہ ان کے درمیان ہو''۔[۴]

اس مقصد سے کہ وہ اس سے زیادہ اس مسئلے کو طول نہ دیں اور بہانہ تراشی سے حکم خدا میں تاخیر نہ کریں اپنے کلام کے آخر

---

[۱] سورہ بقرہ آیت 67

[۲] سورہ بقرہ آیت 67

[۳] سورہ بقرہ آیت 68

[۴] سورہ بقرہ آیت 68

میں مزید کہا: ''جو تمہیں حکم دیا گیا ہے۔
(جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو''۔[1]
لیکن انہوں نے پھر بھی زیادہ باتیں بنانے اور ڈھٹائی دکھانے سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور کہنے لگے:
''اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو''۔[2]
موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا: وہ گائے ساری کی ساری زرد رنگ کی ہو جس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا لگے۔
خلاصہ یہ کہ وہ گائے مکمل طور پر خوش رنگ اور چمکیلی ہو۔ ایسی دیدہ زیب کہ دیکھنے والوں کو تعجب میں ڈال دے۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس پر بھی اکتفاء نہ کیا اور اسی طرح ہر مرتبہ بہانہ جوئی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور مشکل میں ڈالتے گئے۔
پھر کہنے لگے: ''اپنے پروردگار سے کہیئے کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ گائے (کام کرنے کے لحاظ سے) کیسی ہونی چاہئے کیونکہ یہ گائے ہمارے لئے مبہم ہوگئی ہے''۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر سے کہا: ''خدا فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہو جو اتنی سدھائی ہوئی نہ ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے، ہر عیب سے پاک ہو، حتیٰ کہ اس میں کسی قسم کا دوسرا رنگ نہ ہو''۔
اب کہ بہانہ سازی کے لئے ان کے پاس کوئی سوال باقی نہ تھا جتنے سوالات وہ کر سکتے تھے۔ سب ختم ہو گئے تو کہنے لگے: ''اب تو نے حق بات کہی ہے''۔ ''پھر جس طرح ہو سکا انہوں نے وہ گائے مہیا کی اور اسے ذبح کیا لیکن دراصل وہ یہ کام کرنا نہیں چاہتے تھے''۔
''پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارو''۔ (تاکہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے)[3]
بنی اسرائیل نے ان خصوصیات کی گائے تلاش کی اور اس کو ذبح کیا اور اس کا خون مقتول کے جسم پر لگایا تو وہ زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل (جو اس کا چچا زاد بھائی تھا) کی شناخت کرادی۔

باپ سے نیکی کا صلہ

اس قسم کی گائے اس علاقے میں ایک ہی تھی، بنی اسرائیل نے اسے بہت مہنگے داموں خریدا تھا کہتے ہیں اس گائے کا مالک ایک انتہائی نیک آدمی تھا جو اپنے باپ کا بہت احترام کرتا تھا۔
ایک دن جب اس کا باپ سویا ہوا تھا اسے ایک نہایت نفع بخش معاملہ درپیش آیا، صندوق کی چابی اس کے باپ کے پاس تھی لیکن اس خیال سے کہ تکلیف اور بے آرامی نہ ہو اس نے اسے بیدار نہ کیا لہٰذا اس معاملے سے صرف نظر کر لیا۔
بعض مفسرین کے نزدیک بیچنے والا ایک جنس ستر ہزار میں اس شرط پر بیچنے کو تیار تھا کہ قیمت فوراً ادا کی جائے اور قیمت کی ادائیگی اس بات پر موقوف تھی کہ خریدنے کے لئے اپنے باپ کو بیدار کر کے صندوقوں کو چابیاں اس سے حاصل کرے، وہ ستر ہزار میں خریدنے کو تیار تھا لیکن کہتا تھا کہ قیمت باپ کے بیدار ہونے پر ہی دوں گا، خلاصہ یہ کہ سودا نہ ہو سکا، خداوند عالم نے اس نقصان اور کمی

[1] سورہ بقرہ آیت 68
[2] سورہ بقرہ آیت 69
[3] سورہ بقرہ آیت 69 تا 73

کو اس طرح پورا کیا کہ اس جوان کے لئے گائے کی فروخت کا یہ نفع بخش موقع فراہم کیا، بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ باپ بیدار ہوا تو اسے واقعہ سے آگاہی ہوئی، اس نیکی کی وجہ سے اس نے وہ گائے اپنے بیٹے کو بخش دی اس طرح اسے وہ بے پناہ نفع میسر ہوا۔

بنی اسرائیل کا مغرور اور مالدار شخص قارون

یہاں پر گفتگو بنی اسرائیل کے ایک اور مسئلے اور الجھن کی طرف جاتی ہے مسئلہ یہ ہے کہ ان میں ایک سرکش سرمایہ دار تھا اس کا نام قارون تھا جو غرور و سرکشی میں مست کر دینے والی دولت کا مظہر تھا، اصولی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں تین متجاوز طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا ایک فرعون تھا جو حکومت و اقتدار کا مظہر تھا، دوسرا قارودن تھا جو ثروت و دولت کا مظہر تھا اور تیسرا سامری تھا کہ جو مکر و فریب کا مظہر تھا اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معرکہ حکومت کے خلاف تھا لیکن دوسرے معرکہ بھی اہم تھے اور وہ بھی عظیم تربیتی نکات کے حامل ہیں۔

مشہور ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا (چچا، یا چچازاد بھائی یا خالہ زاد بھائی) اس نے توریت کا خوب مطالعہ کیا تھا پہلے وہ مومنین کی صف میں تھا لیکن دولت کا گھمنڈ اسے کفر کی آغوش میں لے گیا اور اسے زمین میں غرق کر دیا اس غرور نے اسے پیغمبر خدا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور اس کی موت سب کے لئے باعث عبرت بن گئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

"قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا"۔ [1]

اس ظلم کا سبب یہ تھا کہ اس نے بہت سی دولت کمالی تھی اور چونکہ وہ کم ظرف تھا اور ایمان مضبوط نہ تھا اس لئے فراواں دولت نے اسے بہکا دیا اور اسے انحراف و استکبار کی طرف لے گئی۔

قرآن کہتا ہے: "ہم نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دیے کہ انہیں اٹھانا ایک طاقتور گروہ کے لئے بھی مشکل تھا"۔ [2]

قارون کے پاس اس قدر سونا چاندی اور قیمتی اموال تھے کہ ان کے صندوقوں کو طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا تھا۔

چار نصیحتیں

آیئے اس بحث سے آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کیا کہا: قرآن کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا: تم میں ایسی خوشی نہیں ہونی چاہئے جس میں تکبر اور غفلت ہو کیونکہ خدا غرور میں ڈوبے ہوئے خوشحال افراد کو پند و نصیحت نہیں کرتا"۔ [3]

اس کے بعد چار اور قیمتی، سرنوشت ساز اور تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں اس طرح کل پانچ ہو گئیں۔

پہلے کہتے ہیں: "اللہ نے جو کچھ تجھے دیا ہے اس سے دار آخرت حاصل کر"۔ [4]

---

[1] سورہ قصص آیت 76

[2] سورہ قصص آیت 76

[3] سورہ قصص آیت 76

[4] سورہ قصص آیت 77

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض کج فہم افراد کے خیال کے برخلاف مال و دولت کوئی بری چیز نہیں ہے اہم بات یہ ہے کہ وہ کس راستے پر صرف ہو رہا ہے اگر اس کے ذریعے دار آخرت کو تلاش کیا جائے تو پھر اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ غرور، غفلت، ظلم و تجاوز اور ہوس پرستی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں۔

دوسری نصیحت انہوں نے مزید کی: ''دنیا سے اپنے حصے کو نہ بھول جا''۔[۱]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اس دنیا میں ایک محدود حصہ ہے یعنی وہ مال جو اس کے بدن، لباس اور مکان کے لئے درکار ہوتا ہے اور ان پر صرف ہوتا ہے اس کی مقدار معین ہے اور ایک خاص مقدار سے زیادہ اس کے لئے قابل جذب ہی نہیں ہوتا۔

انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے۔

تیسری نصیحت یہ ہے: ''جیسے خدا نے احسان کیا ہے تو بھی نیکی کر''۔[۲]

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ کے احسان پر نظر لگائے ہوئے ہے اور اس کی بارگاہ سے ہر خیر کا تقاضا کر رہا ہے اور اسی سے ہر قسم کی توقع باندھے ہوئے ہے تو اس طرح سے وہ کیونکر کسی کے صریح تقاضے کو یا زبان حال کے تقاضا کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اس سے کیسے بے اعتنائی برت سکتا ہے۔

آخر میں چوتھی نصیحت یہ ہے: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادی وسائل تجھے دھوکہ دیں اور تو انہیں گناہ اور دعوت گناہ میں صرف کر دے، زمین میں ہرگز گناہ و فساد نہ کر کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں کرتا''۔[۳]

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نصیحت کرنے والے یہ افراد کون تھے۔

البتہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ اہل علم، پرہیزگار، زیرک بابصیرت اور جرأت مند افراد تھے۔

قارون کا جواب

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس سرکش و ستمگر بنی اسرائیل نے ان ہمدرد واعظین کو کیا جواب دیا۔

قارون تو اپنی اس بے حساب دولت کے نشے میں چور تھا اس نے اسی غرور سے کہا: ''میں نے یہ سب دولت اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر حاصل کی ہے''۔[۴]

تمہیں اس سے کیا کہ میں اپنی دولت کیسے خرچ کرتا ہوں، جو میں نے کمایا اسے خود کمایا ہے تو پھر صرف کرنے میں بھی مجھے تمہاری راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں خدا مجھے اس دولت کے لائق سمجھتا تھا تبھی تو اس نے مجھے عطا کی ہے اور اسے صرف کرنے کی راہ بھی اس نے مجھے بتائی ہے میں دوسروں سے بہتر جانتا ہوں۔ تمہیں اس میں دخیل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر زحمت میں نے کی ہے، تکلیف میں نے اٹھائی ہے، خون جگر پیا ہے تب کہیں یہ دولت جمع کی ہے، دوسروں کے پاس بھی ایسی لیاقت و توانائی ہوتی تو وہ زحمت و کوشش کیوں نہ کرتے۔ میں نے کوئی ان کا راستہ تو نہیں روک رکھا اور اگر ان میں اس کی لیاقت نہیں ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے

---

[۱] سورہ قصص آیت 77

[۲] سورہ قصص آیت 87

[۳] سورہ قصص آیت 77

[۴] سورہ قصص آیت 78

کہ بھوکے رہیں اور مر جائیں۔

یہی وہ بوسیدہ اور گھٹیا منطق ہے کہ جو عام طور پر بے ایمان سرمایہ دار نصیحت کرنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے اس باب کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ قارون کس علم کے بل پر دولت جمع کرتا تھا۔ کیا وہ علم کیمیاء تھا، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا پھر تجارت، زراعت، اور صنعت کا علم تھا یا پھر کیا وہ انتظامی صلاحیت اور علم کا حامل تھا یا یہ سب امور تھے۔

بعید نہیں کہ قرآن کا مفہوم وسیع ہو اور یہ ان سب امور کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ (قطع نظر اس کے کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ علم کیمیا کے ذریعے تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔)

اس موقع پر قرآن قارون اور اس جیسے دیگر افراد کو ایک تیکھا جواب دیتا ہے: ''کیا اسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں، علم میں بڑھ کر تھیں اور سرمایہ بھی ان کے پاس زیادہ تھا''۔[1]

تو کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے لیکن تو بھول گیا ہے کہ تجھ سے زیادہ علم والے اور زیادہ طاقتور افراد بھی تھے۔ کیا وہ عذاب الٰہی سے بچ سکے ہیں؟

نمائش ثروت کا جنون

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مغرور دولت مند لوگ طرح طرح کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمائش ثروت کا جنون ہے۔ انہیں اس عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی دولت کا لوگوں پر اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی گراں قیمت سواری پر سوار ہو کے نکلیں اور برہنہ پا لوگوں کے درمیان سے گزریں۔ ان کے منہ پر گرد و غبار ڈالتے جائیں اور ان کی تحقیر کرتے جائیں۔ انہیں اس عمل سے تسکین ہوتی ہے۔

لیکن دولت کی یہی نمائش ان کے لئے بلائے جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف کینہ پرورش پانے لگتا ہے اور جذبات نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی شرمناک اور مکروہ عمل ان کی زندگی کو ختم کر دیتا ہے یا ان کی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس جنون آمیز عمل کا نتیجہ کسی قسم کی تحریک ہو۔ مثلاً لالچی افراد میں مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں اضافہ ہو۔ اور سرکش لوگوں میں فرمانبرداری کے جذبات پیدا ہوں۔ مگر اہل ثروت، نمائش دولت کے عمل کو اس تصور کے بغیر انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا عمل بھی ایک قسم کی ہوس ہوتا ہے۔ اس میں کسی سوجھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

بہر حال قارون بھی اس قانون سے مستثنٰی نہ تھا۔ بلکہ جنون نمائش ثروت کا ایک واضح نمونہ تھا۔ قرآن میں ایک جملے کے ذریعے قارون کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے: ''قارون پوری زیب و زینت سے اپنی قوم کے سامنے نکلا''۔[2] اس نے اپنی پوری قوت اور توانائی اس کام پر صرف کر دی تھی کہ وہ اپنی تمام دولت و آرائش کی لوگوں کے سامنے نمائش کرے اور یہ بات محتاج ذکر نہیں کہ اتنی دولت کا مالک شخص جب نمود حشمت کا ارادہ کرے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

---

[1] سورہ قصص آیت 78

[2] سورہ قصص آیت 79

کتب تواریخ میں اس واقعے کے متعلق بہت سے افسانے اور داستانیں ذکر ہوئی ہیں۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قارون چار ہزار خادموں کی قطار کے ساتھ بنی اسرائیل کے درمیان سے گزرا، جبکہ چار ہزار خادم گراں قیمت گھوڑوں پر سرخ پوشاکیں پہنے ہوئے سوار تھے۔ اس کے ساتھ خوش گل کنیزیں بھی تھیں جو سفید خچروں پر سوار تھیں جن پر سنہری زین کسے ہوئے تھے۔ ان کی پوشاکیں سرخ اور سب سونے کے زیورات پہنے ہوئی تھیں۔ بعض لوگوں نے اس کے خادموں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے اور اسی طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان تمام بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھ لیں پھر بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ نمائش دولت کے لئے اس کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔

کاش ہم بھی قارون جیسے ہوتے

جیسا کہ دنیا کا معمول ہے قارون کی جاہ وحشمت کو دیکھ کر لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ دنیا پرست اکثریت نے جب اس خیرہ کن منظر کو دیکھا تو ان کے دل میں تمنائیں مچلنے لگیں۔ انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے کہ کاش وہ بھی قارون جیسی دولت کے مالک ہوتے۔ خود ایک دن، ایک ساعت یا ایک لمحے ہی کے لئے یہ شکوہ نصیب ہوتا۔ آہ اس کی کیسی شیریں، جذاب، نشاط انگیز اور لذت بخش زندگی ہے

چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''جو لوگ دنیاوی زندگی کے طلب گار تھے۔ انھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی قارون کے پاس ہے''۔[۱]

حقیقت میں اس کے پاس تو دولت کا فراواں حصہ ہے۔ آفرین ہے قارون پر اور اس کی بے پناہ دولت پر، واہ اس کا کیا جاہ وجلال ہے، اور کتنے خادم اور نوکر چاکر ہیں، تاریخ میں اس جیسا کوئی شخص نہیں ہے۔ یہ عظمت اسے خدا نے عنایت کی ہے۔ غرض لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

درحقیقت اس واقعے میں امتحان کی ایک بہت بڑی بھٹی جل رہی تھی۔ اس بھٹی کے بیچ میں قارون تھا۔ تاکہ وہ اپنی سرکشی اور غرور کا امتحان دے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے دنیا پرست لوگ اس بھٹی کے گرداگرد مقیم تھے۔ لیکن قارون کے لئے ایک دردناک عذاب تھا۔ ایسا عذاب جو ایسی نمائش کے بعد ہوتا ہے۔ یہ عذاب اوج عظمت سے قعر زمین میں لے جاتا ہے۔

لیکن اس دنیا طلب بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک اقلیت اہل علم صاحبان فکر، پرہیزگار اور باایمان لوگوں کی بھی وہاں موجود تھی جن کا افق فکر ان مسائل سے برتر اور بالاتر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک احترام شخصیت کا پیمانہ زر اور زور نہ تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی قدر کا معیار اس کے مادی وسائل نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ دولت وثروت کی عارضی اور مضحکہ انگیز نمود و نمائش پر تمسخر آمیز طور پر مسکرا دیتے تھے، اور اسے ایک بے مغز اور غیر حقیقی شئ سمجھتے تھے۔

چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ: وہ لوگ جنہیں علم و معرفت عطا ہوئی تھی، انھوں نے کہا: ''تم پر افسوس ہے یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں، ان کے لئے خدا کی طرف سے ثواب اور جزا بہتر ہے''۔[۲] ان الفاظ پر انھوں

---

[۱] سورہ قصص آیت 79

[۲] سورہ قصص آیت 80

نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ثواب الٰہی صرف ان لوگوں کا نصیب ہے جو صابرین ہیں۔

قارون کے سامنے زکوٰۃ کا مسئلہ

قارون نے سرکشی اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا تھا۔ مگر تواریخ اور روایات میں اس کے متعلق کچھ اور ہی واقعہ بیان ہوا ہے جو قارون کی انتہائی بے شرمی کی علامت ہے۔ اور وہ ماجرا یہ ہے کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون سے کہا کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تیرے مال میں سے زکوٰۃ لوں جو محتاجوں کا حق ہے۔

جب قارون زکوٰۃ کی ادائیگی کے اصول سے مطلع ہوا اور اس نے حساب لگایا کہ اسے کتنی کثیر رقم دینا پڑے گی تو اس نے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے دولت مندوں کی ایک جماعت کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا: ''اے لوگو موسیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری دولت خود ہضم کر لے۔ اس نے تمہیں نماز کا حکم دیا تم نے قبول کیا۔ اس کے دوسرے احکامات بھی تم نے مان لئے۔ کیا تم یہ بات بھی برداشت کر لو گے کہ اپنی دولت اسے دے دو؟''

قارون کی شیطانی فکر

اس وقت قارون کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے خلاف ایک منافی عصمت سازش کرنی چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک فاحشہ عورت کو تلاش کر کے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں، وہ اس پر شرمناک تہمت لگا دے۔ بنی اسرائیل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ انھوں نے ایک بدکار عورت کو تلاش کیا اور اس سے کہا کہ ''تو جو کچھ مانگے گی تجھے دیں گے بشرطیکہ تو یہ گواہی دے کہ موسیٰ علیہ السلام کا تجھ سے نامشروع تعلق تھا۔''

اس عورت نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ ایک طرف تو یہ سازش ہوئی۔ دوسری طرف قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ''بہتر ہے کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کریں اور انہیں الٰہی احکامات سنائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ پیش کش منظور کر لی اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ: ''آپ ہمیں خدا کے احکام سنائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ ''بجز اس کے کسی کی پرستش نہ کرو'' صلہ رحم بجا لاؤ، ایسا کرو اور ویسا کرو۔ زنا کار آدمی کے لئے خدا نے حکم دیا ہے کہ اگر وہ زنائے محصنہ کرتا ہے تو اسے سنگسار کیا جائے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ الفاظ کہے تو بنی اسرائیل کے دولت مند سازشی لوگوں نے کہا: ''خواہ وہ مجرم تو خود ہی ہو؟''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے خواہ میں خود ہی ہوں۔''

اس مقام پر ان بے شرموں نے، بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی اور کہا کہ: ''ہم جانتے ہیں کہ تو خود اس فعل کا مرتکب ہوا ہے۔ اور فلاں بدکار عورت سے تیرا تعلق رہا ہے۔''

پھر انھوں نے اس عورت کو بلایا اور اس سے کہا کہ تو شہادت دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کی طرف رخ کیا اور کہا کہ ''میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تو اصل حال بیان کر۔''

جب اس بدکارہ عورت نے یہ بات سنی تو کانپ گئی، اس کی حالت بدل گئی اور اس نے کہا: ''جب آپ مجھ سے سچ بات پوچھتے ہیں تو میں حقیقت حال بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں آپ کو متہم کروں، اس کے

بدلے میں انھوں نے مجھے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ باعفت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔''

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ لعنت ہو مجھ پر، میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کئے ہیں مگر کسی پیغمبر پر تہمت نہ لگائی تھی۔

اس کے بعد اس نے دولت کے دو تھیلے جو ان سازشیوں نے اسے دیئے تھے نکال کر سامنے رکھ دیئے اور مذکورہ باتیں کیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے اور رونے لگے۔ اس موقع پر بدسیرت، سازشی قارون پر عذاب نازل ہوا۔ اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا نے قارون کے غرق زمین کرنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دیا تھا۔

عذاب الٰہی

اس مقام پر قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں: ''ہم نے اسے اور اسکے گھر کو زمین میں غرق کر دیا''۔ [1]

یہ درست ہے کہ جب منکرین کا طغیان اور سرکشی اور ان کی جانب سے تہی دست مومنین کی تحقیر و تذلیل، اور پیمبر الٰہی کے خلاف سازش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس وقت دست قدرت الٰہی دراز ہوتا ہے۔ اور ان متکبر گستاخوں کی زندگیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اور انہیں ایسی سزا دیتا ہے کہ ان کی افتاد سب لوگوں کے لئے سبب عبرت بن جاتی ہے۔

قرآن میں کلمہ ''خسف'' اس مقام پر زمین میں گڑ جانے اور زمین میں پوشیدہ ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں ایسے واقعات بارہا پیش آئے ہیں کہ سخت زلزلہ آیا اور زمین شگافتہ ہوگئی اور اس نے شہر یا آبادیوں کو نگل لیا۔ مگر اس مقام پر جس حادثہ ''خسف'' کا ذکر ہے، یہ مختلف نوعیت کا ہے۔ اس میں فقط قارون اور اس کے خزانے ہی لقمہ زمین ہوئے۔

کیا عجب واقعات ہیں کہ فرعون تو دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور قارون شکم زمین میں سما جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ امر ہے کہ پانی جو مایہ حیات ہے، وہ فرعون اور اس کے ہمکاروں کو نابود کرنے پر مامور ہوتا ہے۔ اور زمین جو انسان کے لئے جائے راحت ہے وہ قارون اور اس کے ساتھیوں کے لئے گورستان بن جاتی ہے۔

یہ مسلم ہے کہ قارون اپنے گھر میں تنہا نہ تھا۔ وہ اور اس کے اہل خاندان، اس کے ہم خیال، اور اس کے ظالم اور ستمگر دوست سب کے سب شکم زمین میں سما گئے۔

''لیکن اس وقت اس کی مدد کے لئے کوئی جماعت نہ تھی جو اسے عذاب الٰہی سے بچا سکتی اور وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا''۔ [2]

نہ تو اس کے دسترخوان کے مفت خور، نہ اس کے دلی دوست، نہ اس کا مال و دولت، ان میں سے کوئی شے بھی اسے عذاب الٰہی سے نہ بچا سکی اور وہ سب کے سب قعر زمین میں سما گئے۔

کیا اچھا ہوا کہ ہم قارون کی جگہ نہ تھے

قرآن میں ان لوگوں کے بدل جانے کا ذکر ہے جو گزشتہ روز قارون کے جاہ و جلال اور کروفر کو دیکھ کر وجد اور رشک کر رہے

---

[1] سورہ قصص آیت 81

[2] سورہ قصص آیت 81

تھے اور یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہمیشہ کے لئے یا تھوڑی دیر کے لئے ہی یہ شان ہمیں بھی نصیب ہوتی۔

واقعہ عجیب سبق آموز ہے چنانچہ فرمایا گیا: ''جو لوگ گزشتہ روز یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہم اس کی (قارون کی) جگہ ہوتے جب انھوں نے اسے (قارون) اور اس کی دولت کو زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمارے خیالات پر افسوس ہے (حق یہ ہے کہ) خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے''۔[۱] کلید رزق صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ (انھوں نے کہا) آج یہ بات ہم پر ثابت ہوگئی کہ جس آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی دین ہے۔ اس کی عطا کا انحصار اس امر پر نہیں کہ وہ کسی سے راضی اور خوش ہے۔ اور نہ کسی کی محرومی اس وجہ سے ہے کہ وہ شخص اللہ کی جناب میں بے قدر ہے۔ اللہ افراد اور اقوام کو دولت دے کر ان کا امتحان لیتا ہے اور ان کی سیرت اور فطرت کو آشکار کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ (رشک کرنے والے) سوچنے لگے کہ اگر گزشتہ روز خدا ان کی دعا کو قبول کر لیتا اور انہیں بھی قارون جیسا ہی بنا دیتا تو ان کا کیسا عبرت ناک انجام ہوتا۔ لہٰذا انھوں نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کیا اور کہا کہ: ''اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا اور گویا کہ کافر ہرگز نجات نہیں پائیں گے''۔[۲]

اب ہم حقیقت کی نظر سے غرور و غفلت اور کفر و ہوس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ نیز ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ نمائشی زندگیاں جن کا منظر نہایت دل فریب ہوتا ہے ان کی حقیقت کتنی خوفناک ہے۔

اس ماجرے کے انجام سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آخر کار مغرور کافر اور بے ایمان قارون دنیا سے رخصت ہوا۔ ہر چند کہ اس کا شمار بنی اسرائیل کے دانشمندوں اور توریت کے تلاوت کرنے والوں میں ہوتا تھا، نیز وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رشتہ دار بھی تھا۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام

خدائے بزرگ و برتر نے ایک عبرتناک واقعہ کی طرف نشاندہی کی ہے کہ جس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔

''قوم یہود'' فرعون کے زیر اثر رہ کر قوم بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں انہیں اس افسوسناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قدرت و عظمت حاصل کر لی۔

اس پیغمبر کی برکت سے خداوند عالم نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد بھی تھا، یہودی اپنے لشکر کے آگے اسے اٹھائے رکھتے تھے۔ اس سے ان میں ایک طرح کا سکون قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی۔

بنی اسرائیل کو یہ قدرت و عظمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور و تکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں انہیں فلسطینیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی، وہ اپنی قدرت و عظمت کھو بیٹھے اور صندوق عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے، پھر اس قدر پراگندگی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے

---

[۱] سورہ قصص آیت 82

[۲] سورہ قصص آیت 82

چھوٹے دشمنوں سے بھی دفاع کے قابل نہ رہے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور ان کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا۔

کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور رُشد و ہدایت کے لئے حضرت اشموئیل علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا۔

بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم و جور سے تنگ آ چکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہٰذا ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لئے رہبر اور امیر مقرر کر دیں تا کہ وہ اس کی قیادت میں ہم آواز اور ایک جان ہو کر دشمن سے جنگ کریں اور عزت رفتہ بحال ہو سکے۔

اشموئیل علیہ السلام ان کی اندرونی کیفیات اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا:

''مجھے ڈر ہے کہ جب جہاد کا حکم آئے تو تم کہیں امیر و رہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو''۔

وہ کہنے لگے: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے، ہماری زمینوں پر قبضہ کر چکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا چکا ہے''۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشخیص کر چکے ہیں اور اب انہیں ایک طبیب کی ضرورت ہے۔ گویا وہ اپنی پسماندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس پر حضرت اشموئیل علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی کا رخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا، وحی ہوئی: ''میں نے طالوت کو ان کی سربراہی کے لئے منتخب کیا ہے۔''

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے عرض کیا: خداوندا میں نے ابھی تک طالوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں۔

ارشاد ہوا: ''ہم اسے تمہاری طرف بھیجیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اس کے حوالے کر دینا اور علم جہاد اس کے ہاتھ میں دے دینا''۔

طالوت کون تھے؟

طالوت ایک بلند قامت اور خوبصورت مرد تھے۔ وہ مضبوط اور قوی اعصاب کے مالک تھے۔ روحانی طور پر بھی بہت زیرک، دانشمند اور صاحب تدبیر تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے نام ''طالوت'' کو بھی ان کے طولانی قد کا سبب قرار دیا ہے۔

ان تمام صفات کے باوجود وہ مشہور نہیں تھے۔ اپنے والد کے ساتھ دریا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ والد کے چوپایوں کو چراتے اور زراعت کرتے تھے۔ ایک دن کچھ جانور بیابان میں گم ہو گئے۔ طالوت اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی تلاش میں کئی دن تک سرگرداں رہے۔ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شہر ''صوف'' کے قریب پہنچ گئے۔

ان کے دوست نے کہا: ''ہم تو اشموئیل علیہ السلام کے شہر صوف میں آ پہنچے ہیں۔ آیئے ان کے پاس چلتے ہیں۔ شاید وحی کے سائے میں اور ان کی رائے کی روشنی میں ہمیں کچھ پتہ چل سکے''۔

شہر میں داخل ہوئے تو حضرت اشموئیل علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ جب اشموئیل علیہ السلام اور طالوت نے ایک دوسرے کو دیکھا تو گویا دل مل گئے۔ اشموئیل علیہ السلام نے اسی لمحے طالوت کو پہچان لیا۔ وہ جان گئے کہ یہ وہی نوجوان ہے جسے خدا نے ان لوگوں کی قیادت

کے لئے منتخب کیا ہے۔

طالوت نے اپنی کہانی سنائی تو اشموئیل علیہ السلام کہنے لگے: وہ چوپائے تو اس وقت تمہاری بستی کی راہ پر ہیں اور تمہارے باپ کے باغ کی طرف جارہے ہیں۔ان کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں بڑے کام کے لئے دعوت دیتا ہوں۔خدا نے تمہیں بنی اسرائیل کی نجات کے لئے مامور کیا ہے۔

طالوت پہلے تو اس پروگرام پر حیران ہوئے اور پھر اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔اشموئیل علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: خدا نے طالوت کو تمہاری قیادت سونپی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تم سب اس کی پیروی کرو۔اب اپنے تئیں دشمن سے مقابلے کے لئے تیاری کرلو۔

بنی اسرائیل کے نزدیک تو حسب ونسب اور ثروت کے حوالے سے کئی خصوصیات فرمانروا کے لئے ضروری تھیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی طالوت میں دکھائی نہ دیتی تھی اس انتخاب وتقرر پر وہ بہت حیران وپریشان ہو گئے۔

انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقیدے کے برخلاف وہ نہ تو ''لاوی'' کی اولاد میں سے تھے جن میں سے نبی ہوتے تھے۔نہ یوسفؑ اور یہودا کے خاندان سے تھے جو گذشتہ زمانے میں حکمرانی کرتے تھے بلکہ ان کا تعلق تو بنیامین کے گمنام خاندان سے تھا اور پھر وہ مالی طور پر بھی تہی دست تھے۔

انہوں نے اعتراض کیا: ''وہ کیسے حکومت کرسکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں''۔

اشموئیل علیہ السلام کہتے تھے کہ یہ بہت اشتباہ کررہے ہیں، کہنے لگے: ''انہیں خدا نے تم پر امیر مقرر کیا ہے، نیز قیادت کے لئے ان کی اہلیت اور لیاقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہیں اور روحانی طاقت میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں۔اس لحاظ سے وہ تم سب پر برتری رکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل نے خدا کی طرف سے اس کے تقرر کے لئے کسی نشانی یا علامت کا مطالبہ کر دیا۔اس پر اشموئیل علیہ السلام بولے: انبیاء بنی اسرائیل کی یادگار؛ تابوت (صندوق عہد) جو جنگ میں تمہارے لئے اطمینان اور ولولے کا باعث تھا تمہارے پاس لوٹ آئے گا اور اسے تمہارے آگے آگے چند فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا''۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صندوق عہد ان کے سامنے آ گیا۔یہ نشانی دیکھ کر انہوں نے طالوت کی سربراہی قبول کر لی۔

طالوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی

طالوت نے لشکر کی قیادت کا بیڑا اٹھایا۔انہوں نے تھوڑی ہی مدت میں امور سلطنت کی انجام دہی اور فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔پھر آپ نے فوج کو دشمن سے مقابلے کی دعوت دی۔دشمن نے ان کی ہر چیز کو خطرے سے دوچار کر رکھا تھا۔

طالوت نے تاکید کرتے ہوئے کہا: ''میرے ساتھ وہ لوگ چلیں جن کی ساری توجہ جہاد پر مرکوز رہ سکے۔جن کی صحت ناقص ہو اور جو درمیان ہی میں ہمت ہار بیٹھنے والے ہوں، اس جنگ میں شرکت نہ کریں''۔

بہت جلد ظاہراً ایک کثیر تعداد اور طاقتور فوج جمع ہوگئی اور وہ دشمن کی طرف چل پڑے۔

سورج کی تپش تھی۔گرمی میں چلتے چلتے انہیں سخت پیاس لگ گئی۔طالوت خدا کے حکم سے انہیں آزمانا چاہتے تھے اور ان کی

تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا: ''جلد تمہارے راستے میں ایک نہر آئے گی۔ اس کے ذریعے خدا تمہارا امتحان لے گا۔ جو لوگ اس میں سے سیر ہو کر پانی پئیں گے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں البتہ جو تھوڑا سا پانی پئیں گے وہ میرے ساتھی ہیں''۔

ان کی نظر نہر پر پڑی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ جلدی سے وہاں پہنچے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ تھوڑے سے فوجی اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔

طالوت نے اپنی فوج کو چھانٹا

طالوت نے دیکھا کہ ان کی فوج کی اکثریت بے ارادہ اور کمزور عہد و پیمان کی حامل ہے اور اس میں تھوڑے سے صاحب ایمان افراد موجود ہیں۔ انہوں نے بے قاعدہ اور نافرمان اکثریت کو چھوڑ دیا اور انہی کم تعداد صاحب ایمان کو ساتھ لیا اور شہر سے گزر کر میدان جہاد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

طالوت کی فوج نے اپنی کم تعداد دیکھی تو پریشان اور وحشت زدہ ہوئی۔ فوجیوں نے ان سے کہا: ''ہم میں تو اس طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا دل خدا کی محبت سے معمور تھا وہ دشمن کی فوجی کثرت و قوت اور اپنی تھوڑی تعداد پر ہراساں نہ ہوئے اور کمال شجاعت سے طالوت سے کہنے لگے: آپ جو مصلحت سمجھتے ہیں حکم دیجئے۔ ہم ہر مقام پر آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاء اللہ کم تعداد کے باوجود دشمن سے جہاد کریں گے کیونکہ یہ تو کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ کم تعداد خدا کے ارادہ و مشیت کے سہارے کثیر تعداد پر غالب آئی ہے اور خدا استقامت و پامردی دکھانے والوں کے ساتھ ہے''۔

داؤد نے جالوت کو مار ڈالا

طالوت ان کم تعداد اہل ایمان مجاہدین کے ساتھ آمادہ کارزار ہوئے۔ ان لوگوں نے درگاہ الٰہی سے شکیبائی اور کامیابی کی دعا کی۔

جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ جالوت اپنا لشکر لے کر باہر نکلا۔ لشکروں کے مابین مبارز طلبی ہوئی۔ اس کی بارعب پکار نے دلوں کو لرزا دیا۔ میدان میں جانے کی جرأت کسی میں نہ رہی۔ داؤد ایک کم سن نوجوان تھا۔ شاید وہ جنگ کے لئے بھی میدان میں نہ آیا تھا بلکہ اپنے جنگجو بڑے بھائیوں اور باپ کی خدمت کے لئے چلا آیا تھا لیکن چاک و چوبند اور قوی تھا۔ ''خلدخن'' اس کے ہاتھ میں تھی اس کے ذریعے اس نے پتھر ایسے ماہرانہ انداز میں پھینکے کہ ٹھیک جالوت کی پیشانی اور سر میں پیوست ہو گئے۔ اس کے سپاہیوں پر وحشت اور تعجب کا عالم طاری تھا۔ وہ ان کے درمیان گرا اور مر گیا۔ جالوت کی موت سے اس کی فوج میں عجیب خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ جالوت کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور بنی اسرائیل کامیاب ہو گئے۔

تابوت کیا ہے؟

''تابوت'' کا لغوی معنی ہے وہ صندوق جسے لکڑی سے بنایا جائے۔ جنازے کے صندوق کو بھی اسی لئے تابوت کہتے ہیں۔ لیکن تابوت مردوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کے لکڑی کے صندوق کے لئے مستعمل ہے۔

بنی اسرائیل کا تابوت یا صندوق عہد کیا تھا، وہ کس کے ہاتھ سے بنا تھا اور اس میں کیا چیزیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں ہماری روایات و تفاسیر میں اور اسی طرح ''عہد قدیم'' (توریت) میں بہت کچھ کہا گیا ہے، سب سے زیادہ واضح چیز جو احادیث اہل بیت علیہ السلام اور بعض مفسرین مثلاً ابن عباس سے منقول ہے یہ کہ

''یہ ''تابوت'' وہی صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انہیں لپیٹ کر دریا میں پھینکا تھا۔فرعون کے کارندوں نے اسے دریا میں سے پکڑ لیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں سے نکال لیا گیا اور صندوق جوں کا توں فرعون کے پاس محفوظ کرلیا گیا۔بعدازاں وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا تو وہ اس عجیب صندوق کو محترم شمار کرنے لگے اور اسے متبرک سمجھنے لگے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ الواح مقدسہ جن پر احکام خدا لکھے ہوئے تھے اس میں رکھ دیں۔نیز اپنی زرہ اور دوسری یادگار چیزوں کا بھی اس میں اضافہ کردیا۔صندوق آپؑ نے اپنے وصی حضرت ''یوشع بن نون علیہ السلام'' کے سپرد کردیا۔یوں صندوق کی اہمیت بنی اسرائیل کی نگاہ میں اور بڑھ گئی۔لہٰذا وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں اسے ہمراہ لے جاتے اور اس کا ان پر نفسیاتی اور روحانی طور پر بہت اثر ہوتا۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ دل انگیز صندوق ان مقدس چیزوں کے سمیت ان کے ساتھ رہا وہ سربلند رہے اور آبرومندانہ زندگی بسر کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی دینی بنیادیں کمزور پڑ گئیں اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔وہ صندوق بھی ان سے چھن گیا۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''صندوق عہد تمہاری طرف آئے گا۔(وہی صندوق کہ) جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اسے اٹھا رکھا ہوگا''۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صندوق عہد وہ ایسے تبرکات تھے جو حوادث کے موقع پر بنی اسرائیل کے لئے اطمینان بخش تھے اور معنوی ونفسیاتی اثرات کے حامل تھے۔دوسری بات یہ ہے کہ بعدازاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کی کچھ یادگاریں بھی اس میں رکھ دی گئی تھیں''۔[1]

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یہ بات دل نشین کرائی کہ صندوق عہد دوبارہ انہیں مل جائے گا اور جو سکون اور اطمینان وہ کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل کرلیں گے۔معنوی وتاریخی پہلو کے حامل اس صندوق کی اہمیت دراصل بنی اسرائیل کے لئے ایک پرچم اور شعار سے بڑھ کر تھی۔اسے دیکھ کے ان کی نظروں میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے خبر دی کہ وہ صندوق لوٹ آئے گا فطری امر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے لئے ایک بہت بڑی بشارت تھی۔

فرشتے صندوق عہد کیسے لائے؟

جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ''فرشتے اس صندوق کو اٹھائے ہوئے ہیں'' یہاں پر سوال یہ ہوتا ہے کہ فرشتے صندوق عہد کو کیسے لائے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔ان میں سے زیادہ واضح تواریخ کے حوالے سے یہ ہے کہ جب صندوق عہد فلسطین کے بت پرستوں کے ہاتھ لگا اور وہ اسے اپنے بت خانے میں لے گئے اس کے بعد وہ بہت سی مصیبتوں اور ابتلاؤں کا شکار ہوگئے تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ سب کچھ صندوق عہد کے آثار میں سے ہے، لہٰذا انہوں نے طے کرلیا کہ اسے اپنے شہر اور علاقے سے باہر بھیج دیں گے۔کوئی شخص اسے باہر لے جانے کو تیار نہ ہوا۔مجبوراً دو بیل جوتے گئے اور صندوق عہد کو باندھ کر بیلوں کو بیابان میں جا کر چھوڑا گیا۔اتفاق سے یہ واقعہ ٹھیک اس وقت رونما ہوا جب طالوت کو بنی اسرائیل کا فرمانروا بنایا گیا۔

خدا نے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان دو بیلوں کو اشموئیل کے شہر کی طرف ہانک کرلے جائیں۔بنی اسرائیل نے صندوق عہد کو دیکھا تو اسے طالوت کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی نشانی کے طور پر قبول کرلیا۔اس لئے ظاہراً تو دو بیل اسے شہر میں لائے

---

[1] سورہ بقرہ آیت 248

لیکن درحقیقت یہ کام خدائی فرشتوں کی وجہ سے انجام پذیر ہوا اسی وجہ سے صندوق اٹھالانے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔اصولی طور پر فرشتہ اور ملک قرآن حکیم اور روایات میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔اس مفہوم میں روحانی عقل رکھنے والے موجودات کے علاوہ اس جہان کی مخفی قوتوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔

یہ داؤد کون سے داؤد تھے

اگر چہ قرآن میں صراحت موجود نہیں کہ یہ داؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد گرامی ہیں یا کوئی اور شخص۔لیکن اس قرآن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل ہوئے قرآن آگے چل کر یوں بیان کرتا ہے:

''خدا نے اسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے سکھایا''۔

ایسی تعبیر عام طور سے انبیاء کے متعلق ہی ہوتی ہے۔

''اور ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط کر دیا اور اسے علم و دانش عطا کیا''۔

اس سلسلہ کی ذیل میں جو احادیث منقول ہیں ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ وہی مشہور پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

داؤد علیہ السلام کی زندگی سے درس حاصل کریں

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بزرگ انبیاء میں سے تھے انہیں اللہ نے ایک عظیم حکومت عطا کی۔قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کے بلند مقام کی تعریف کی گئی ہے۔

ان کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب بنی اسرائیل کا ایک ظالم حکمران جالوت میدان جنگ میں آپؑ کے مدمقابل آیا تو آپؑ نے آلہ سنگ اندازی سے اس قوت سے پتھر پھینکا کہ جالوت گھوڑے کی پشت سے زمین پر آ گیا اور اپنے خون میں لوٹنے لگا۔

بعض نے لکھا ہے کہ پتھر نے اس کا سینہ چیر دیا اور دوسری طرف سے نکل گیا۔

دوسری طرف آپؑ کی سیاسی اقتدار کا یہ حال تھا کہ ایک طاقتور حکومت آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور آپؑ پوری طاقت سے دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہوتے تھے۔

علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ آپؑ کی محراب عبادت کے چاروں طرف ہزار افراد شام سے صبح تک تیار کھڑے رہتے تھے۔

نیز آپؑ کی روحانی، اخلاقی اور عبادی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کا ایک حصہ بیدار رہتے اور پرودگار کی عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے آدھے ایام روزے میں گزارتے۔

نعمتوں کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو طرح طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنگ میں، عبادت میں، علم میں اور حکومت میں بہت قوی تھے اور انہیں فراواں نعمتیں حاصل تھیں۔

جناب داؤد علیہ السلام پر الٰہی نعمتیں

قرآن مجید اجمال کے بعد تفصیل کی اپنی خاص روش کے مطابق اب حضرت داؤد علیہ السلام پر نعمات الٰہی کی کچھ تفصیل بیان کرتا

ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے اس کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے، اس طرح سے کہ صبح وشام وہ اس کے ساتھ تسبیح خدا کرتے تھے''۔[1]

''نہ صرف پہاڑ بلکہ سب پرندے بھی اس کے لئے مسخر کر دیئے تا کہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اللہ کی تسبیح کریں''۔[2]

''یہ سب پرندے اور پہاڑ حکم داؤد کے مطیع تھے، اس کے ساتھ ہم آواز تھے اور اس کی طرف بازگشت کرنے والے تھے''۔[3]

اگر چہ عالم کے تمام ذرات خدا کا ذکر، تسبیح اور حمد کرتے ہیں۔خواہ کوئی داؤد علیہ السلام ان کے ساتھ ہم صدا ہو یا نہ ہو، لیکن داؤد علیہ السلام کا امتیاز یہ تھا کہ ان کے صدا بلند کرنے اور تسبیح کی نغمہ سرائی کے وقت ان موجودات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا وہ آشکار وظاہر ہو جاتا تھا اور اندرونی زمزمہ بیرونی نغمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا، جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر ''سنگریزہ'' کی تسبیح کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ: ''داؤد علیہ السلام، دشت و بیابان کی طرف نکلے اور جس وقت آپؑ زبور کی تلاوت کرتے تو کوئی پہاڑ اور پتھر اور پرندہ ایسا نہ تھا کہ جو ان کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو''۔

قرآن اس معنوی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ایک مادی فضیلت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اور ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا۔''

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ خدا نے داؤد علیہ السلام کو معجزانہ طور پر لوہے کو نرم کرنے کا طریقہ سکھایا تھا: ''اس طرح سے کہ وہ اس سے زرہ بنانے کے لئے مضبوط و محکم اور پتلی پتلی نازک قسم کی کڑیاں بنا سکیں''۔[4]

2۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک وشعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں ہے۔اس نظریہ کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم ملکر تسبیح کرتے۔

3۔ بعض نے اس احتمال کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ تسبیح تکوینی ہے کہ جو تمام موجودات زبان حال سے کرتے ہیں اور ان کا نظام خلقت اس امر کی بخوبی حکایت کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک ومنزہ ہے اور علم وقدرت اور ہر قسم کی صفات کمال کا حامل ہے۔

لیکن یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اسے ان کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے۔اس لحاظ سے مناسب تر دوسری تفسیر ہے اور یہ امر قدرت الٰہی سے بعید نہیں ہے۔یہ ایک زمزمہ تھا کہ جو ان موجودات عالم کے اندر اور ان کے باطن

---

[1] سورہ ص، آیت 18

[2] سورہ ص، آیت 19

[3] سورہ ص، آیت 19

مفسرین کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ کس طرح ہم آواز تھے اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ بعض کہتے ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دلکش، جاذب اور دل گداز آواز تھی کہ جو پہاڑوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی (لیکن یہ کوئی ایسی اہم فضیلت نہیں کہ قرآن اسے اس اہمیت کے ساتھ ذکر کرے۔)

2۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک وشعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں ہے۔اس نظریہ کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم ملکر تسبیح کرتے۔

[4] سورہ سباء آیت 11

میں ہمیشہ سے جاری تھا لیکن خدا نے قوت اعجاز سے اسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے ظاہر کیا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر سنگریزوں کا تسبیح کرنا مشہور ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے بھی جنگوں میں دفاع کے لئے لوہے کی سلیٹوں سے استفادہ ہوتا تھا، کہ جو بھاری بھی ہوتی تھیں، اور اگر انہیں پہنا جاتا تو وہ اتنی خشک اور بے لچک بھی ہوتی تھیں کہ جو جنگجو غازیوں کے لئے انتہائی پریشان کن ہوتی تھیں، کوئی بھی شخص اس زمانہ تک لوہے کی باریک اور مضبوط کڑیوں سے زرہ کی مانند کوئی ایسی چیز نہ بنا سکا تھا کہ جو لباس کی مانند آسانی کے ساتھ بدن پر آ سکے اور بدن کی حرکات کے ساتھ نرم اور رواں رہے۔

قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ لوہے کا داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم ہونا، خدا کے حکم سے اور معجزانہ صورت میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہی ذات کہ جو بھٹی کو لوہا نرم کرنے کی خاصیت بخشتی ہے، اسی خاصیت کو ایک دوسری شکل میں داؤد علیہ السلام کے پنجوں میں قرار دے دے، بعض اسلامی روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ:

''تم ایک اچھے آدمی ہو، مگر تم بیت المال سے اپنی روزی حاصل کرتے ہو، داؤد علیہ السلام چالیس دن تک روتے رہے، (اور خدا سے اس کے حل کی درخواست کی) تو خدا نے لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا اور ہر روز ایک زرہ بنا لیتے تھے اور اس طرح سے وہ بیت المال سے بے نیاز ہو گئے۔'' [1]

بہر حال داؤد علیہ السلام اس توانائی کے ذریعہ، کہ جو خدا نے انہیں دی تھی، بہترین طریق یعنی جہاد کا وسیلہ بنانے سے، ایسا وسیلہ جو دشمن سے حفاظت کرے۔ استفادہ کرتے تھے، اور اس سے زندگی کے عام وسائل میں ہرگز فائدہ نہ اٹھایا، اور عجب یہ کہ اس کی آمدنی سے بعض روایات کے مطابق۔ اپنی سادہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ حاجت مندوں پر بھی خرچ کیا کرتے تھے، ان تمام باتوں کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ان کا ایک بولتا ہوا معجزہ شمار ہوتا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش [2]

قرآن میں پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کی خاص صفات بیان کی گئی تھیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اب دادرسی اور قضاوت کے سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کو پیش آنے والے ایک واقعے کا تذکرہ۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ''کیا داؤد کی دیوار محراب سے اوپر جانے والے شکایت کنندگان کا واقعہ تجھ تک پہنچا ہے''۔ [3]

---

[1] یہ ٹھیک ہے کہ بیت المال ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ جو معاشرے کی بغیر عوض کے خدمت کرتے ہیں، اور ایسے اہم بوجھ اٹھاتے ہیں کہ جو پسماندہ ہوں، لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ انسان کسی خدمت کو بھی انجام دے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے (توانائی کی صورت میں) گذراوقات کرے اور داؤد علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ وہ اسی قسم کے ممتاز بندے بنیں۔

[2] قرآن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کرنے کے بارے میں سادہ اور واضح گفتگو کی گئی ہے، اس ضمن میں جو تحریفات اور غلط تعبیرات کی گئی ہیں ان کے باعث لاشعوری طور پر مفسرین کے درمیان ایک بڑا انزاع پیدا ہوا ہے اس پر اس قدر شور وغوغا ہوا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین بھی اس کی زد میں آ گئے ہیں اور انھوں نے اس عظیم نبی کے بارے میں غلط اور کہیں کہیں بہت ہی ناروا فیصلے کئے ہیں۔ ہم سب پہلے بغیر کسی تشریح کے آیات قرآنی کا متن پیش کرتے ہیں۔ تا کہ قارئین خالی ذہن کے ساتھ آیات کا مفہوم سمجھ سکیں۔

[3] سورہ ص، آیت 21

بہر حال حضرت داؤد علیہ السلام کے ارد گرد اگر چہ بہت سے محافظین موجود تھے تا ہم دو آدمی ایک جھگڑے کے سلسلے میں عام راستے سے ہٹ کر محراب اور دیوار قصر سے اوپر آئے اور اچانک آپؑ کے سامنے آدھمکے۔

جیسا کہ قرآن حکیم اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

''وہ اچانک داؤد علیہ السلام کے سامنے آنکلے (بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اجازت کے) لہٰذا ان پر نظر پڑی تو داؤد علیہ السلام وحشت زدہ ہوئے اور گھبرائے۔''[1]

کیونکر انہیں خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں کا ان کے بارے میں غلط ارادہ ہو

لیکن انھوں نے بہت جلد آپؑ کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا: ''ڈریں نہیں، ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپؑ کے پاس آئے ہیں۔ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے اور ہم آپ کے پاس دادرسی کے لئے آئے ہیں''

''اب آپؑ ہمارے بارے میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ظلم روا نہ رکھیں اور راہ راست کی طرف ہماری ہدایت کریں''۔ [2]

واضح رہے کہ اس مقام پر حضرت داؤد علیہ السلام کو زیادہ موقع نہ دیا۔ایک نے شکایت کرنے میں پہل کی، کہنے لگا: ''یہ میرا بھائی ہے،اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں،لیکن یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دے، گفتگو میں یہ مجھ پر بھاری ہے اور مجھ سے زیادہ باتونی ہے''۔[3]

حضرت داؤد علیہ السلام نے دوسرے فریق کی بات سنے بغیر شکایت کرنے والے سے کہا: ''اپنی بھیڑوں میں تیری بھیڑ کا اضافہ کرنے کے لئے اس نے تقاضا کر کے ظلم روا رکھا ہے''۔[4]

بہر حال یوں لگتا ہے کہ طرفین یہ بات سن کر مطمئن ہو گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے یہاں سے چلے گئے۔لیکن داؤد علیہ السلام سوچ میں پڑ گئے۔انھوں نے فیصلہ تو عدل کی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اگر فریق ثانی کو مدعی کا دعویٰ قبول نہ ہوتا تو یقیناً وہ اعتراض کرتا ہے۔اس کا سکوت اس امر کے لئے بہترین دلیل تھا کہ معاملہ وہی ہے جو شکایت کرنے والے نے پیش کیا ہے لیکن ان سب امور کے باوجود عدالتی اقدار کا تقاضا تھا کہ داؤد علیہ السلام اپنی بات میں جلدی نہ کرتے بلکہ فریق ثانی سے بھی شخصاً سوال کرتے اور پھر فیصلہ سناتے۔ لہٰذا اس کام پر وہ خود پشیمان ہوئے ،اور داؤد علیہ السلام نے گمان کیا کہ اس واقعے کے ذریعے،ہم نے اس کا امتحان لیا ہے۔

''اس نے استغفار کی ،اپنے رب سے طلب بخشش کی ،سجدے میں گر گیا اور توبہ کی''۔[5]

بہر حال اللہ نے ان پر اپنا لطف و کرم کیا اور اس ترک اولیٰ میں ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔جیسا کہ بعد کی ابحاث میں قرآن کہتا ہے:

''ہم نے اس کے عمل کو بخش دیا،اور وہ ہمارے نزدیک عالی مقام اور نیک مستقبل کا حامل ہے''۔[6]

---

[1] سورہ ص آیت 22

[2] سورہ ص آیت 22

[3] سورہ ص آیت 23

[4] سورہ ص آیت 24

[5] سورہ ص آیت 24

[6] سورہ ص آیت 25

داؤد علیہ السلام کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت

قرآن مجید سے جو کچھ معلوم ہوتا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ افراد دادخواہی کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کی محراب سے اوپر چڑھ کر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے تو آپ گھبرا گئے۔ پھر شکایت کرنے والے کی بات سنی۔ ان میں سے ایک کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں، دوسرے کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی، ننانوے بھیڑوں والا اپنے بھائی پر زور دے رہا تھا کہ وہ ایک بھیڑ بھی اسے دے دے۔ آپؑ نے شکایت کرنے والے کو سچا قرار دیا اور دوسرے کے اصرار کو ظلم قرار دیا۔ پھر اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اللہ سے معافی کا تقاضا کیا۔ خدا نے آپؑ کو بخش دیا۔

یہاں دو تعبیر زیادہ غور طلب ہیں۔ ایک آزمائش اور دوسری استغفار اور توبہ۔ اس سلسلے میں قرآن نے کسی واضح امر کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن قرآن میں غور وفکر اور ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منقول روایات میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام قضاوت میں بہت زیادہ علم ومہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپؑ کو آزمائے لہٰذا آپؑ کو ایسے غیر معمولی حالات پیش آئے۔ (مثلاً ان آدمیوں کا عام راستے سے ہٹ کر محراب کے اوپر سے آپؑ کے پاس آپہنچا) آپؑ نے جلد بازی کی اور اس سے پہلے کہ فریق ثانی سے وضاحت طلب کرتے آپؑ نے فیصلہ سنا دیا اگرچہ فیصلہ عادلانہ تھا۔

اگرچہ آپؑ بہت جلد اپنی اس لغزش کی طرف متوجہ ہو گئے اور وقت گزرنے سے پہلے اس کی تلافی کی۔ لیکن بہرحال جو کام آپؑ سے سرزد ہوا تھا وہ نبوت کے مقام بلند کے شایان شان نہ تھا۔ اس لئے آپؑ نے ترک اولیٰ پر استغفار کی اور اللہ نے بھی انہیں عفو وبخشش سے نوازا۔

مذکورہ تفسیر کی شاہد وہ قرآنی اشارہ ہے جو زیر بحث قرآنی گفتگو کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق وعدالت کے مطابق فیصلہ کر اور ہوا وہوس کی پیروی نہ کر''۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش فیصلے کے طریقے میں تھی۔ لہٰذا اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم نبی علیہ السلام کی شان اور مقام کے خلاف ہو۔

موجودہ توریت کی خرافاتی داستان

اب ہم توریت کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے:

نیز بعض ناآگاہ اور بے خبر افراد نے جو تفسیریں کی ہیں، ان کی اصل خبر بھی تلاش کرتے ہیں۔

توریت کی دوسری کتاب اشموئیل کی فصل 11 میں جملہ 2 تا 27 میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز داؤد علیہ السلام اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں۔ ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انہیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ داؤد علیہ السلام سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر لشکر داؤد علیہ السلام کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ داؤد علیہ السلام (نعوذ باللہ) ایک بزدلانہ سازش کے ذریعے اسے ایک خطرناک جنگ میں بھجوا کر قتل کروا دیتے ہیں اور پھر اس کی بیوی کو قانونی طور پر اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ توریت کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشموئیل علیہ السلام کی 12ویں فصل میں ہے۔

خداوند نے ''ناثان'' (جو بنی اسرائیل کے ایک نبی اور جناب داؤد علیہ السلام کے مشاور تھے) کو داؤد علیہ السلام کے پاس بھیجا اور کہا:

ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا دوسرا غریب، امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے یہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لئے غذا تیار کرنے میں پس و پیش کیا۔ غریب کا بھیڑ کا بچہ لے کر اسے ذبح کر دیا۔

اب کیا ہونا تھا، داؤد علیہ السلام انتہائی غصے ہوئے۔ ناثان سے کہنے لگے: ''بخدا جس نے یہ کام کیا وہ قتل کا مستحق ہے، اسے ایک بھیڑ کی جگہ پر چار بھیڑیں دینی چاہئیں''۔

لیکن ناثان نے داؤد علیہ السلام سے کہا: ''وہ شخص تو ہے۔''

داؤد علیہ السلام اپنے غلط کام کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی لیکن اس کے باوجود ان پر بھاری مصیبتیں آئیں۔

اس مقام پر توریت میں ایسی عبارت ہے جس کے ذکر سے قلم کو شرم آتی ہے لہٰذا ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ توریت کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں، مثلاً:

1۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس کوئی شخص قضاوت کے لئے نہیں آیا، بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔ اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لئے غریب آدمی کی بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا۔ اس واقعے میں نہ محراب کی دیوار سے اوپر جانے کا ذکر ہے، نہ آپؑ کے وحشت زدہ ہوجانے کی بات ہے، نہ دو بھائیوں کے دعوے کا معاملہ ہے اور نہ ہی توبہ و بخشش کی درخواست کا بیان ہے۔

2۔ داؤد علیہ السلام نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لئے آخر قتل کیوں؟

3۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اسے چار بھیڑیں دینی چاہئیں، آخر کس بناء پر؟

4۔ داؤد علیہ السلام نے ''اوریا'' کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

5۔ خدا نے انہیں معاف کر دیا (اتنی آسانی سے، کس بناء پر؟)۔

6۔ اللہ نے داؤد علیہ السلام کے بارے میں عجیب و غریب سزا کا فیصلہ کیا کہ جسے نقل نہ کرنا بہتر ہے۔

7۔ یہی عورت ایسے ''روشن ماضی'' کے باوجود سلیمان علیہ السلام کی ماں بنی ان داستانوں کا ذکر واقعاً تکلیف دہ ہے لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ بعض جاہل افراد نے نادانی سے ان اسرائیلی روایات کے زیر اثر قرآن مجید کی پاک و پاکیزہ آیات کا چہرہ سیاہ کر دیا ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں کہ حق کو واضح کرنے کے لئے اس رسوا داستان کا کچھ حصہ ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ہم سوال کرتے ہیں:

1۔ وہ نبی کہ قرآن میں اللہ نے جس کے دس عظیم اوصاف بیان کئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس کی سرگزشت سے ہدایت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، کیا ممکن ہے کہ ان تہمتوں کے ہزارویں حصے کی بھی اس کی طرف نسبت دی جاسکے؟

2۔قرآن مجید بعد کی آیات میں کہتا ہے:

"یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ"

اے داوٗدؑ! ہم نے تجھے زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ بنایا۔

کیا یہ آیت مذکورہ خرافات سے ہم آہنگ ہے؟

3۔اگر کوئی عام شخص ہو، خدا کا نبی نہ ہو اور وہ اس قسم کے جرم کا مرتکب ہو، اپنے وفادار پاک طینت باایمان افسر کی بیوی کو ایسے گھٹیا طریقے سے اس کے ہاتھوں سے کھسکا لے تو لوگ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے اور اس کی سزا کیا ہوگی؟ یہاں تک کہ اگر یہ کام افسق الفاسقین سے سرزد ہو تب بھی جائے تعجب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ توریت نے حضرت داوٗد علیہ السلام کو پیغمبر قرار نہیں دیا تاہم ان کا ذکر ایک بلند مرتبہ عادل حکمران کے طور پر کیا ہے، کہ جو بنی اسرائیل کے عظیم عبادت خانے کا موٗسّس تھا۔

4۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ توریت کی مشہور کتب میں سے ایک "مزامیر داوٗد علیہ السلام" ہے جس میں حضرت داوٗد علیہ السلام کی مناجات ہیں۔کیا ایسے شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جاسکتی ہیں؟

5۔جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ تحریف شدہ توریت کی داستانیں خرافات کا ایسا مجموعہ ہیں جو مکتب انبیاء کے دشمنوں یا بہت ہی بے شعور اور جاہل افراد کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔لہٰذا انہیں کس طرح بحث کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے؟

جی ہاں قرآن کی یہ عظمت ہے کہ وہ ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔

اسلامی روایات میں توریت کی بیان کردہ قبیح اور بے ہودہ داستان کی نہایت سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔ان میں سے ایک روایت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔آپؑ نے فرمایا:

"اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا جائے کہ جو یہ کہے کہ داوٗد علیہ السلام نے "اوریا" کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ایک حد نبوت کے لئے اور دوسری اسلام کے لئے"۔

کیونکہ اس میں ایک طرف تو ایک مرد مومن کی طرف ایک غیر شرعی امر کی نسبت ہے اور دوسری طرف مقام نبوت کی ہتک حرمت ہے۔لہٰذا ایسی بات کرنے والے پر دو مرتبہ حد قذف جاری ہونی چاہئے اور اسے دو مرتبہ اَسّی (80) کوڑے لگائے جانے چاہئیں۔

جب امام رضا علیہ السلام سے "اوریا" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

"حضرت داوٗد علیہ السلام کے زمانے میں جن عورتوں کے شوہر مرجاتے یا قتل ہوجاتے وہ پھر کبھی شادی نہ کرتی تھیں (اور یہ امر بہت سی برائیوں اور قباحتوں کی بنیاد تھا) حضرت داوٗد علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جن پر اللہ نے اس کام کو مباح قرار دیا (تاکہ یہ رسم ختم ہوجائے اور بیوہ عورتیں اس مصیبت سے نجات پائیں) لہٰذا جب اوریا (اتفاق سے ایک جنگ میں) مارا گیا تو داوٗد علیہ السلام نے ان کی بیوی سے شادی کرلی، اور یہ امر اس زمانے کے لوگوں پر بہت گراں گزرا (اور بعدازاں اس پر انھوں نے افسانے گھڑ لئے)"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ "اوریا" کی ایک سادہ سی حقیقت کی بنیاد پر تھی۔حضرت داوٗد علیہ السلام نے ایک کام الٰہی

ذمہ داری کے طور پر انجام دیا تھا۔لیکن دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور افسانہ پردازوں نے کہ جنھیں عجیب وغریب باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کی عادت تھی اس واقعے پر خوب حاشیہ آرائی کی اور ایسی ایسی باتیں بنائی کہ انسان کو وحشت ہوتی ہے۔

کسی نے کہا: اس شادی کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور ہے۔

دوسرے نے کہا: ضروری بات ہے کہ ''اوریا'' کا گھر داؤد علیہ السلام کی ہمسائیگی میں ہوگا۔

آخر کسی نے داؤد علیہ السلام کی نظریں اوریا کی بیوی پر ڈلوائیں، پرندے کا قصہ گھڑا۔

آخر کار اس عظیم پیغمبر کو طرح طرح کے شرمناک گناہان کبیرہ سے متہم کیا گیا۔ پھر بے وقوف جاہلوں نے ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچایا اور اگر اس افسانے کا ذکر مشہور کتب میں نہ ہوتا تو ہم بھی اسے نقل کرنا غلط سمجھتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام جیسا باشرف بیٹا عطا فرمانے کی خبر دی گئی ہے کہ جو ان کی حکومت و رسالت کو باقی وجاری رکھنے والے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ دامن خدا کی طرف اور آغوش حق کی طرف لوٹتا تھا''۔[1]

قرآن مجید؛ موجودہ توریت کے برخلاف کہ جو سلیمان علیہ السلام کو ایک جبار، بت خانہ ساز اور عورتوں کی ہوس میں مبتلا بادشاہ کے طور پر متعارف کراتی ہے۔سلیمان علیہ السلام کو خدا کا ایک عظیم پیغمبر شمار کرتا ہے، اور انہیں قدرت اور بے نظیر حکومت کے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے، اور سلیمان علیہ السلام سے مربوط مباحث کے دوران بہت ہی عظیم درس انسانوں کو دیتا ہے، ان داستانوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد وہی ہے۔

خدا نے اس بزرگ پیغمبر کو بہت ہی عظیم نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔

بہت ہی سریع اور تیز رو سواری کہ جس کے ذریعے وہ مختصر سی مدت میں اپنے سارے ملک کی سیر کر سکتے تھے۔

مختلف صنعتوں کے لئے فراواں معدنی مواد۔

اس معدنی مواد کو استعمال کرنے کے لئے کافی فعال قوت۔

انہوں نے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے عبادت خانے بنائے اور لوگوں کو عبادت کی طرف ترغیب دی، علاوہ ازیں حکومت کی فوجوں، کارکنوں اور کمزور لوگوں کے طبقات کی پذیرائی کے لئے وسیع وعریض پروگرام منظم کیا، کہ جس کے برتنوں کے نمونہ سے، باقی چیزوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان تمام نعمتوں کے مقابلہ میں انہیں شکر گزاری کا حکم دیا، اس مطلب پر تاکید کرتے ہوئے کہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا حق بہت ہی کم لوگ ادا کر سکتے ہے۔

اس کے بعد یہ واضح وروشن کیا کہ ایک شخص اس قدرت وعظمت کے باوجود موت کے مقابلہ میں کتنا کمزور اور ناتواں تھا، کہ وہ ایک ہی لحہ میں ناگہانی موت کے ذریعہ دنیا سے چل بسا، اس طرح سے کہ اجل نے اسے بیٹھنے یا بستر پر لیٹنے کی مہلت بھی نہ دی، تاکہ مغرور سرکشی کرنے والے یہ گمان نہ کرلیں۔

[1] سورہ ص آیت 30

کہ اگر وہ کسی مقام پر پہنچ جائیں اور قدرت وقوت حاصل کر لیں تو واقعی طور پر وہ توانا ہو گئے ہیں، وہ جس کے سامنے جن اور انسان، شیطان و پری خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

اور زمین و آسمان جس کی جولانگاہ تھے، اور جس کی حشمت اور شان و شوکت میں جو بھی شک کرے اس کی عقل وفکر پر مرغ و ماہی قہقہہ لگائیں، اور وہ ایک مختصر سے لمحہ میں سمندر کی موجوں پر ابھرنے والے بلبلے کی طرح محو و نابود ہو گیا۔

اور یہ بھی واضح وروشن کر دے کہ ایک ناچیز عصا اسے ایک مدت تک کس طرح اٹھائے رہا اور ''جن'' اسے کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے دیکھتے رہنے کی وجہ سے کیسے سرگرمی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے؟

اور یہ بھی (دکھادے) کہ دیمک نے انہیں کس طرح زمین پر گرایا اور ان کے ملک کے تمام رشتوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ ہاں ایک عصا ہی اس وسیع وعریض ملک کی فعال قوت کو بروئے کار لائے ہوئے تھا اور ایک چھوٹی سے دیمک نے اس کو حرکت سے روک دیا۔

سلیمان علیہ السلام کا سخت امتحان

قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کا ایک دوسرا حصہ بیان کیا کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمایا۔ اس میں ایک ''ترک اولیٰ'' پیش آیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی کا رخ کیا اور اس ترک اولیٰ پر توبہ کی۔ [1] قرآن کہتا ہے: ''ہم نے سلیمان علیہ السلام کا امتحان لیا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے بارگاہ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور اس کی طرف لوٹا''۔ [2]

کلام الٰہی سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی آزمائش بے جان دھڑ کے ذریعے ہوئی تھی وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں قرآن میں کوئی وضاحت نہیں۔ محدثین ومفسرین نے اس سلسلے میں روایات تفاسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ قابل توجہ اور واضح یہ ہے کہ: سلیمان علیہ السلام کی آرزو تھی کہ انہیں باشرف اور شجاع اولاد نصیب ہو جو ملک کا نظام چلانے اور خاص طور پر دشمنوں کے خلاف جہاد میں ان کی مدد کرے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی متعدد بیویاں تھیں۔ انھوں نے دل میں ارادہ کیا کہ میں ان سے ہم بستر ہوتا ہوں تا کہ مجھے متعدد بیٹے نصیب ہوں کہ جو میرے مقاصد میں میری مدد کریں۔

لیکن اس مقام پر ان سے غفلت ہوئی اور آپؑ نے ''انشاء اللہ'' نہ کہا کہ جو انسان کے ہر حالت میں اللہ پر تکیہ کا غماز ہے۔

لہٰذا اس زمانے میں ان کی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی سوائے ایک ناقص الخلقت بچے کے۔ وہ بے جان دھڑ کے مانند تھا کہ جو لا کر ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔

سلیمان علیہ السلام سخت پریشان اور فکرمند ہوئے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لئے اللہ سے غفلت کیوں کی اور کیوں اپنی طاقت

---

[1] قرآن مجید میں چونکہ یہ واقعہ مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے لہٰذا افسانہ طرازوں اور خیال پردازوں نے فائدہ اٹھایا اور بے بنیاد خیالی داستانیں بنا ڈالیں۔ انھوں نے اس عظیم نبی کی طرف بعض ایسی چیزیں منسوب کیں جو یا تو اساس نبوت کے خلاف ہیں یا مقام عصمت کے منافی ہیں یا اصولی عقل ومنطق ہی کے برخلاف ہیں۔ یہ باتیں تمام محققین قرآن کے لئے خود ایک آزمائش ہیں۔ حالانکہ قرآن کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسی پر قناعت کر لی جاتی تو ان بے ہودہ افسانوں کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

[2] سورہ ص، آیت 36

پر بھروسہ کیا اس لئے انھوں نے توبہ کی اور بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کیا۔[1]

قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی توبہ کا مسئلہ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے۔، ارشاد ہوتا ہے:

''اس نے کہا: پروردگار مجھے بخش دے۔ اور مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو کیونکہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے''۔[2]

سلیمان علیہ السلام کی وسیع حکومت

اللہ نے سلیمان علیہ السلام کی درخواست قبول کر لی اور انہیں خصوصی امتیازات اور عظیم نعمات والی حکومت عطا کی۔ ان امتیازات ونعمات کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

ہواؤں پر قبضہ

خدا کی پہلی نعمت تھی ہواؤں کا ایک رہوار اور سواری کی طرح تابع ہونا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا تا کہ اس کے حکم کے مطابق آرام سے چلے اور جہاں کا وہ ارادہ کرے جا سکے''۔[3] واضح ہے کہ ایک وسیع وعریض حکومت میں تیز رفتار رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ بوقت ضرورت سربراہ حکومت تیزی کے ساتھ ملک کے تمام علاقوں میں آ جا سکے۔ اللہ نے یہ امتیاز حضرت سلیمان علیہ السلام کو دے رکھا تھا۔[4]

جنوں پر بھی حکومت

دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان علیہ السلام کو یہ عطا کی تھی کہ سرکش موجودات ان کے لئے مسخر کر دیئے گئے تھے اور ان کے لئے اختیار میں دے دیئے گئے تھے تا کہ آپؑ ان سے مثبت کام لے سکیں۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: خلاصہ یہ کہ وہ کیسا اسرار آمیز وسیلہ تھا کہ جو اس زمانے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی جزئیات اور خصوصیات کے بارے میں جواب ہمارے سامنے واضح نہیں ہے ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا جیسے معجزے نبی کے اختیار میں دیئے

---

[1] ''کرسی'' کا معنی ہے ''چھوٹے پاؤں والا تخت'' یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے پاس دو طرح کے تخت ہوتے تھے۔ ایک تخت عام استعمال کے لئے ہوتا تھا جس کے پاؤں چھوٹے ہوتے تھے اور دوسرا تخت خصوصی پروگراموں کے لئے ہوتا تھا کہ جس کے پائے بلند ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے تخت کو ''کرسی'' کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کے تخت کو ''عرش'' کہتے تھے۔

باقی رہے جھوٹے اور قبیح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب وتاب سے کیا گیا ہے۔ ظاہراً ان کی جڑ تلمود کے یہودیوں کی طرف جاتی ہے اور یہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل ومنطق انہیں قبول نہیں کرتی۔ ان قبیح افسانوں میں کہا گیا ہے سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کھوگئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر آ بیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ افسانے ہر چیز سے قبل انہیں گھڑنے والوں کے انحطاط فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقام نبوت اور حکومت الٰہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے، چہ جائیکہ افسانہ طرازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ پر بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت وقضاوت کرے۔

[2] سورہ ص آیت 35

[3] سورہ ص، آیت 36

[4] ہوا کیسے ان کے تابع فرمان تھی؟ کتنی تیزی سے چلتی تھی؟ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہوا کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے کس چیز پر سوار ہوتے تھے؟ اور کون سے عوامل انہیں گرنے سے بچاتے تھے اور ہوا کے دباؤ کی کمی بیشی اور دیگر مشکلات کے مواقع پر ان کی حفاظت کرتے تھے؟

جاتے تھے۔ یہ ایک عام اور معمول کے مطابق بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم نعمت اور اعجاز تھا اور ایسا کرنا قدرت الٰہی کے لئے سادہ اور آسان کام ہے۔ نیز ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ اصولی طور پر تو ہم انہیں جانتے ہیں لیکن ان کی جزئیات سے ہم واقف نہیں ہیں۔

''اور ہم نے شیطانوں کو اس کے لئے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غواص کو اس کا تابع فرمان بنا دیا''۔ [1]

تاکہ ان میں سے کچھ خشکی میں اس کے کہنے کے مطابق تعمیرات کریں اور کچھ دریا میں غواصی اور غوطہ زنی کے کام آئیں۔

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مثبت کاموں کے لئے موجود قوت ان کے اختیار میں دے دی۔ شیطان کہ جن کے مزاج ہی میں سرکشی ہے وہ ان کے لئے اس طرح سے مسخر ہو گئے کہ ان سے تعمیری اور اصلاحی کام لیا جانے لگا اور گراں بہا منابع سے استفادہ کے لئے وہ استعمال ہونے لگے۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے اور ان کے حکم کے مطابق مثبت کام کرتے تھے۔ البتہ بعض مقامات پر ''شیاطین'' کا لفظ ہے، جبکہ بعض مقامات پر ''جن'' کا لفظ ہے۔

''جن'' ایک ایسا موجود ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن عقل و شعور اور طاقت کا حامل ہے۔ نیز جنوں میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ حکم خدا سے وہ ایک نبی کے تابع فرمان ہو جائیں اور مفید کام انجام دیں۔ [2]

جنوں کے بارے میں لوگوں نے بہت سے بیہودہ افسانے اور داستانیں گھڑ رکھی ہیں، لیکن اگر ہم ان خرافات کو ترک کر دیں، تو ان کا اصل وجود اور مخصوص صفات، جو قرآن میں جنوں کے لئے بیان ہوئی ہیں، ایک ایسے مطلب کا حامل ہے جو علم و عقل سے قطعاً بعید نہیں ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ طاقت دی تھی کہ وہ تمام سرکشوں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم طاقت کی تسخیر بھی پروردگار کے فرمان سے ہی تھی ''اور جس وقت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے سرتابی کرتے تھے تو انہیں سزا دی جاتی تھی''۔ [3]

قرآن کریم واقعہ کو جاری رکھتے ہوئے جنوں کے اہم تولیدی کاموں کے ایک حصہ کی طرف (جو وہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے انجام دیتے تھے) اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''سلیمان علیہ السلام جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کے لئے، عبادت خانوں، تمثالوں، حوض کے مانند بڑے بڑے کھانوں کے برتنوں اور زمین میں ثابت (جمی ہوئی یا گڑی ہوئی) دیگوں سے، تیار کر کے دیتے تھے''۔ [4]

ان میں سے ایک حصہ تو معنوی اور عبادت کے مسائل سے مربوط تھا، اور ایک حصہ انسانوں کی جسمانی ضروریات اور ان کے عظیم لشکریوں اور کارکنوں کی جمعیت کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام کے یہ فعال اور چابک دست کارندے، بڑے بڑے باشکوہ عبادت خانے، کہ جو حکومت الٰہیہ اور اس

---

[1] سورہ ص، آیت 37

[2] یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ ''شیاطین'' کا ایک وسیع تر معنی ہو کہ جس میں سرکش انسان بھی شامل ہوں اور ان کے علاوہ بھی۔ لفظ ''شیطان'' کا اطلاق قرآن مجید میں اس وسیع مفہوم پر ہوا ہے۔ (مثلاً سورہ انعام کی آیت 12)

[3] سورہ سبا آیت 12

[4] سورہ سبا آیت 13

کی مذہبی سلطنت کے لائق تھے،

اس کے لئے بناتے تھے تاکہ لوگ راحت وآرام کے ساتھ اپنے عبادت کے فرائض کوانجام دے سکیں۔

تماثیل کہ جسکا نام قرآن میں لیا گیا ہے''تمثال'' کی جمع ہے۔ یہ بیل بوٹو اور تصویر کے معنی میں آیا ہے،اور مجسمہ کے معنی میں بھی،

اس بارے میں کہ یہ مجسمے یا نقوش،کون سے موجودات کی صورتیں تھیں،اور سلیمان علیہ السلام نے ان کی تیاری کا حکم کیوں دیا تھا،مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ زیب وزینت اور سجاوٹ کا پہلو رکھتے ہوں،جیسا کہ ہماری اہم قدیمی بلکہ جدید عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یا یہ ان عمارتوں کا رعب اور دبدبہ بڑھانے کے لئے ہو،کیونکہ کچھ حیوانات مثلاً شیر کی تصویر،بہت سے لوگوں کے افکار میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ہے۔[1]

شیاطین زنجیروں میں

تیسری نعمت اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ عنایت کی تھی کہ انھوں نے تخریب کار اور فسادی قوتوں پر قابو پا رکھا تھا،کیونکہ بہرحال بعض شیاطین ایسے بھی تھے کہ جن سے ایک مفید اور اصلاحی قوت کے طور پر کام نہیں لیا جاسکتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ وہ قید و بند میں رہیں تاکہ معاشرہ ان کی مزاحمت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رہے۔جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ:''اور شیطانوں کا ایک اور گروہ اس کے قابو میں زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا''۔[2]

چوتھی نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ دی تھی کہ انہیں بہت سے اختیارات دے رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے کسی کو کچھ عطا کرنے اور یا نہ کرنے میں وہ صاحب اختیار تھے۔جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ:''ہم نے اس سے کہا: یہ ہماری عطاو بخشش ہے جسے تو (مصلحت کے مطابق) چاہتا ہے عطا کر اور جس سے تو (مصلحت کے مطابق) روکنا چاہتا ہے روک لے تجھ پر کوئی حساب نہیں

---

[1] کیا سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں ذی روح موجودات کا مجسمہ بنانا جائز تھا۔جبکہ یہ اسلام میں ممنوع ہے؟

یا جو مجسمے وہ سلیمان علیہ السلام کے لئے بناتے تھے،غیر ذی روح کی جنس سے تھے،مثلاً درختوں پہاڑوں،سورج،چانداور ستاروں کی تصویریں۔ یا ان کے لئے صرف دیواروں پر نقش ونگار کیا کرتے تھے جیسا کہ قدیمی تاریخی آثار میں اکثر گلکاروں کی صورت میں نظر آتی ہیں،اور ہم یہ جانتے ہیں کہ نقش ونگار چاہے جیسے بھی ہوں،مجسمہ کے برخلاف،حرام نہیں ہیں۔

یہ سب احتمالات ہیں،چونکہ اسلام میں مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا جاتا ہے ممکن ہے کہ بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ شدید مبارزہ کرنے اور اس کی بیخ کنی کی خاطر ہو،اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس بات کی اتنی ضرورت نہ ہو،اور یہ حکم ان کی شریعت میں نہ ہو۔لیکن ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے یہ بیان کیا گیا ہے:

''خدا کی قسم سلیمان علیہ السلام کے حکم سے بنائی جانے والی تمثال مردوں اور عورتوں کے مجسمے نہ تھے،بلکہ درخت وغیرہ کی تصویریں تھیں''۔

پس معلوم ہوا کہ ذی روح کا مجسمہ بنانا ان کی شریعت میں بھی حرام تھا۔

[2] سورہ ص،آیت 38

البتہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر''شیاطین'' سے مراد''شیاطین جن'' ہیں کہ جو فطری طور پر جسم لطیف رکھتے ہیں او پھر زنجیر اور ہتھکڑیاں ان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں۔اس لئے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر انہیں تخریبی کاروائیوں سے باز رکھنے کے معنی کے لئے کنایہ ہے۔

ہے"۔ [1]

پانچویں نعمت جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دی وہ ان کا روحانی مقام تھا کہ جو اللہ نے ان کی اہلیت وقابلیت کی بناء پر انہیں مرحمت فرمایا تھا۔

جیسا کہ زیر بحث گفتگو میں قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے: "اس کے لئے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک انجام ہے"۔ [2]

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جنھوں نے اس عظیم نبی کے مقام مقدس پر طرح طرح کی ناروا اور بے ہودہ تہمتیں لگانے میں موجودہ توریت کی پیروی کی۔

اس آیت میں قرآن حضرت سلیمان علیہ السلام کو تمام تہمتوں سے مبرا قرار دے رہا ہے اور خدا کے یہاں ان کے معزز مقام کی خبر دے رہا ہے۔

یہاں تک کہ "حسن مآب" کہہ کر ان کے انجام بخیر کی خبر بھی دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ توریت میں آنے والی اس ناروا نسبت کی نفی ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بت پرستوں میں شادی کی تھی۔

جس وجہ سے ان کا میلان بت پرستی کی طرف ہوگیا تھا۔ موجودہ توریت یہاں تک کہتی ہے کہ انھوں نے بت خانہ بنایا تھا، لیکن قرآن "حسن مآب" کہہ کر ان تمام اوہام وخرافات پر خط بطلان کھینچ رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام وادی نمل میں

قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان حکومت کوئی عام سا واقعہ نہیں ہے۔

درحقیقت خداوند عالم نے ایسی عظیم حکومت کے قیام اور اتنی عظیم طاقتیں جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمایا ہے اور ایک موحد انسان کے نزدیک قدرت خدا کے آگے یہ کام بالکل آسان ہے۔ قرآن میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: "سلیمان علیہ السلام کے پاس جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر کے لشکر جمع ہوگئے"۔ [3]

لشکر والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لئے حکم دیا جاتا کہ "اگلی صفوں کو روکے رکھیں اور پچھلی صفوں کو چلاتے رہیں تا کہ سب مل کر حرکت کریں"۔ [4]

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی علاقے پر لشکر کشی کی تھی لیکن اس لشکر کشی کی تفصیل واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔ چونکہ قرآن "وادی نمل" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

لہٰذا بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ وہ "وادی النمل" (چیونٹیوں کی سرزمین) طائف کے قریب کا علاقہ ہے اور بعض نے کہا

---

[1] سورہ ص، آیت 38

"بغیر حساب" یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تیرے مقام عدالت کی بناء پر تجھے وسیع اختیارات دیئے ہیں اور تجھ سے پوچھ گچھ نہ ہوگی، یا اس کا معنی یہ ہے کہ عطائے الٰہی تجھ پر اس قدر ہے کہ جس قدر بھی تو بخشش دے اس میں حساب نہیں ہوگا۔

[2] سورہ ص، آیت 40

[3] سورہ نمل آیت 17

[4] سورہ نمل آیت 17

ہے کہ وہ شام کے نزدیک کی سرزمین ہے۔ ''بہر حال جناب سلیمان علیہ السلام اس عظیم لشکر کے ساتھ چلے حتیٰ کہ چیونٹیوں کی سرزمین پر پہنچ گئے''۔ [1]

یہاں پر چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے مخاطب ہوکر کہا: ''اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ تا کہ سلیمان علیہ السلام اوران کا لشکر تمہیں بے خبری میں پامال نہ کردے۔'' [2]

''سلیمان علیہ السلام یہ سن کر مسکرادیئے اور ہنسے''۔ [3]

حضرت سلیمان علیہ السلام کس وجہ سے ہنسے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ظاہر امر یہ ہے کہ بذات خود یہ قضیہ ایک عجیب چیز تھی کہ ایک چیونٹی اپنے ساتھیوں کو سلیمان علیہ السلام کے عظیم لشکر سے آگاہ کرے اور اس کی بے توجہی کا ذکر کرے اور یہی عجب امر جناب سلیمان علیہ السلام کے ہنسنے اور مسکرانے کا سبب بنا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ آپؑ کی یہ ہنسی، خوشی کی ہنسی تھی کیونکہ آپؑ کو معلوم ہوگیا کہ چیونٹی تک کی مخلوق ان کی اور ان کے لشکر والوں کی عدالت اور تقویٰ کا اعتراف کرتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آپؑ کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ خداوند عالم نے انہیں ایسی قدرت عطا فرمائی ہے کہ لشکر عظیم کے شور و غل کے باوجود وہ چیونٹی جیسی مخلوق کی آواز سے غافل نہیں ہیں۔

بہر حال وجہ خواہ کچھ بھی ہو، اس موقع پر جناب سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں چند معروضات پیش کیں۔ پہلی یہ کہ ''خداوند جونعمتیں تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں ان کا شکر کرنے کا طریقہ مجھے سکھادے''۔ [4]

دوسری یہ کہ ''مجھے توفیق عطا فرما تا کہ ایسا نیک عمل بجالاؤں کہ جس سے تو راضی ہو''۔ [5]

آخر میں تیسری عرضداشت یہ پیش کی کہ ''پروردگارا مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شامل فرما''۔ [6]

جناب سلیمان علیہ السلام کا جانوروں کی بولی جاننا

حیوانات کی دنیا کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں اور اس بارے میں تمام ترقی کے باوجود ابھی تک اس پر شک وابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ البتہ بہت سے کاموں میں ہم ان کی فہم، سمجھ اور مہارت کے آثار ضرور دیکھتے ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا گھر بنانا، شہد کے چھتے کا منظم ومضبوط کرنا، چیونٹیوں کا موسم سرما کی ضروریات کے لئے اپنی غذا کو جمع کرنا۔

---

[1] سورہ نمل آیت 18

البتہ ضمنی طور پر اس جملے سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کی عدالت چیونٹیوں تک پر آشکار ہوگئی کیونکہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوں تو ایک کمزور سی چیونٹی کو بھی پامال کرنا گوارا نہیں کرتے چنانچہ اگر وہ پامال کرتے ہیں تو ان کی اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔

[2] سورہ نمل آیت 18

[3] سورہ نمل آیت 19

[4] سورہ نمل آیت 19

[5] سورہ نمل آیت 19

[6] سورہ نمل آیت 19

سلیمان علیہ السلام اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

قرآن میں موجود مختلف قرائن سے مجموعی طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے کہ جنھیں میدان جہاد کے لئے تیار کیا گیا تھا۔عصر کا وقت تھا۔ مامورین مذکورہ گھوڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ایک عادل اور بااثر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس طاقتور فوج ہو اور اس زمانے میں لشکر کے اہم ترین وسائل میں سے تیز رفتار گھوڑے تھے لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقام ذکر کرنے کے بعد نمونے کے طور پر گھوڑوں کا ذکر آیا ہے۔

ذخیرہ کرنا، جانوروں کا دشمن سے اپنا دفاع کرنا حتیٰ کہ ان کا بہت سی بیماریوں کے علاج سے باخبر ہونا دور دراز کے فاصلوں سے اپنے آشیانوں اور بلوں تک واپس لوٹ آنا، لمبے اور طویل فاصلے طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنا، آئندہ حوادث کے بارے میں پیشگی اندازہ لگا لینا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پر اسرار زندگی کے بارے میں ابھی تک بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قابل حل نہیں۔ان تمام باتوں سے ہٹ کر بہت سے جانور ایسے ہیں کہ اگر انہیں سدھایا جائے اور ان کی تربیت کی جائے تو وہ ایسے ایسے عجیب وغریب کارنامے انجام دیتے ہیں جو انسان کے بھی بس میں نہیں ہوتے۔

لیکن پھر بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ وہ انسانی دنیا سے کس حد تک باخبر ہیں؟ کیا وہ واقعاً یہ جانتے ہیں کہ ہم (انسان) کون لوگ ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے ہمیں ان میں اس قسم کے ہوش اور سمجھ کے آثار نہ ملیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان میں ان چیزوں کا فقدان ہے۔اسی بناء پر اگر ہم نے مندرجہ بالا داستان میں یہ پڑھا ہے کہ چیونٹیوں کو جناب سلیمان کے اس سرزمین میں آنے کی خبر ہوگئی تھی اور انہیں اپنے بلوں میں گھس جانے کا حکم ملا تھا تاکہ وہ لشکر کے پاؤں تلے کچلی نہ جائیں اور سلیمان علیہ السلام بھی اس بات سے باخبر ہو گئے تھے تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس کے علاوہ، سلیمان علیہ السلام کی حکومت غیر معمولی اور معجزانہ امور پر مشتمل تھی اسی بناء پر بعض مفسرین نے اپنے نظریہ کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت میں بعض جانوروں میں اس حد تک آگاہی کا پایا جانا ایک اعجاز اور خارق العادۃ بات تھی لہٰذا اگر دوسرے ادوار میں اس قسم کی باتیں جانوروں میں نہیں ملتیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ان کی اس قسم کی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں سلیمان علیہ السلام اور چیونٹیوں یا سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کی داستان کو کنایہ، مجاز یا زبان حال وغیرہ پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ ظاہر امر کی حفاظت اور حقیقی معنی پر محمول کرنے کا امکان بھی موجود ہے۔

قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ''وہ وقت یاد کرو جب وقت عصر انھوں نے چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس کے سامنے پیش کئے''۔[1]

اس موقع پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ طاقتور گھوڑوں سے ان کا لگاؤ دنیا پرستی کی وجہ سے نہیں جناب سلیمان علیہ السلام نے کہا:

''ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی یاد اور اس کے حکم کی بنا پر پسند کرتا ہوں''۔[2]

میں چاہتا ہوں کہ ان سے دشمنوں کے خلاف جہاد میں کام لوں۔

---

[1] سورہ نمل آیت 31

[2] سورہ ص، آیت 32

سلیمان علیہ السلام کہ جو دشمن کے خلاف جہاد کے لئے آمادہ ان تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کررہے تھے، بہت خوش ہوئے۔

آپؑ انہیں یوں دیکھ رہے تھے کہ نظریں ان پر جم کررہ گئیں "یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔" [1]

یہ منظر نہایت دلکش اور عمدہ تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے عظیم فرماں روا کے لئے نشاط انگیز تھا۔ آپؑ نے حکم دیا "ان گھوڑوں کو واپس میرے پاس لاؤ"۔ [2]

"جب مامورین نے اس حکم کی اطاعت کی اور گھوڑوں کو واپس لائے تو سلیمان علیہ السلام نے خود ذاتی طور پر ان پر نوازش کی اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تھپتھپایا اور ہاتھ پھیرا۔" [3]

یوں آپؑ نے ان کی پرورش کرنے والوں کی بھی تشویق اور قدردانی کی۔

معمول ہے کہ جب کسی سواری کی قدردانی کی جاتی ہے تو اس کے سر، چہرے گردن یا اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور یہ دلچسپی اور پسندیدگی کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے کہ جس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں مدد لیتا ہے لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے نبی کا ایسا کرنا کوئی تعجب انگیز نہیں۔ [4]

داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ

قرآن میں دوسری جگہ داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام کی زندگی کے ایک حصہ کی طرف اشارہ ہورہا ہے۔ ابتداء میں ایک فیصلہ کا ذکر ہے کہ جو حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے کیا تھا۔۔ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"اور داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام کو یاد کرو کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کررہے تھے کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کے وقت چر گئی تھیں، اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے"۔ [5]

اگرچہ قرآن نے اس فیصلے کا واقعہ کا ملاً سربستہ طور پر بیان کیا ہے۔ اور ایک اجمالی اشارہ پر ہی اکتفا کیا ہے، اور صرف اس کے اخلاقی اور تربیتی نتیجہ پر کہ جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے قناعت کی ہے، لیکن اسلامی روایات اور مفسرین کے بیانات میں اس سلسلے میں بہت سی بحثیں نظر آتی ہیں۔

کچھ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح تھا: کہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ رات کے وقت انگوروں کے ایک باغ میں داخل ہوگیا اور انگوروں کی بیلوں اور انگوروں کے گچھوں کو کھا گیا اور انہیں خراب اور ضائع کردیا۔

باغ کا مالک حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس اتنے بڑے نقصان کے

---

[1] سورہ ص، آیت 32

[2] سورہ ص، آیت 33

[3] سورہ ص، آیت 33

[4] مذکورہ بیان کے بارے میں جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے یہ بعض مفسرین سے ہم آہنگ ہے۔ بزرگان شیعہ میں سے عالم نامدار و بزرگوار سید مرتضی کے کلمات سے بھی اس تفسیر کے ایک حصے کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "تنزیہ الانبیاء" میں بعض مفسرین اور ارباب حدیث کی جانب سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف دی جانے والی ناروا نسبتوں کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کیسے ممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اس پیغمبر کی مدح وثناء کرے اور پھر ساتھ ہی اس کی طرف اس برے کام کی نسبت دے کہ وہ گھوڑوں سے بھی ان کا لگاؤ حکم پروردگار سے تھا کیونکہ اللہ ہمیں بھی حکم دیتا ہے کہ گھوڑے پالیں اور دشمنوں کے خلاف جنگ کے لئے انہیں آمادہ رکھیں۔ لہٰذا کیا مانع ہے کہ اللہ کا نبی بھی ایسا ہی ہو"۔

[5] سورہ انبیاء آیت 78

بدلے میں تمام بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔

سلیمان علیہ السلام جو اس وقت بچے تھے باپ سے کہتے ہیں کہ، اے خدا کے عظیم پیغمبر آپ اس حکم کو بدل دیں اور منصفانہ فیصلہ کریں باپ نے کہا کہ وہ کیسے؟ آپؑ جواب میں کہتے ہیں کہ: بھیڑیں تو باغ کے مالک کے سپرد کی جائے تا کہ وہ ان کے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائے اور باغ کو بھیڑوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرے۔ جس وقت باغ پہلی حالت میں لوٹ آئے تو وہ اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائے اور بھیڑیں بھی اپنے مالک کے پاس لوٹ جائیں گی (اور خدا نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی تائید کی)۔

یہاں پر ایک اہم سوال باقی ہے: ان دونوں فیصلوں کی بنیاد اور معیار کیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ معیار اور بنیاد خسارے اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے غور کیا اور دیکھا کہ انگوروں کے باغ میں جو نقصان ہوا ہے، وہ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہے۔ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لئے بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں کیونکہ قصور بھیڑوں کے مالک کا تھا۔

(اس بات کی طرف توجہ رہے کہ بعض اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت بھیڑوں والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ریوڑ کو دوسروں کے کھیتوں میں داخل ہونے سے روکے اور دن کے وقت حفاظت کی ذمہ داری کھیتوں کے مالک کی ہے)۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کا ضابطہ یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ باغ کے مالک کا نقصان بھیڑوں کے ایک سال کے منافع کے برابر ہے۔ اس بناء پر فیصلہ تو دونوں نے حق و انصاف کے مطابق کیا ہے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ گہرائی پر مبنی تھا، کیونکہ اس کے مطابق خسارہ ایک مشت نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس طرح خسارہ تدریجی طور پر پورا ہوتا اور یہ فیصلہ بھیڑوں والے پر بھی گراں نہ تھا۔

علاوہ ازیں نقصان اور تلافی کے درمیان ایک تناسب تھا، کیونکہ انگور کی جڑیں ختم نہیں ہوئی تھیں، صرف ان کا وقتی منافع ختم ہوتا تھا، اندازاً زیادہ منصفانہ فیصلہ یہ تھا کہ اصل بھیڑیں باغ کے مالک کو نہ دی جائیں، بلکہ اسے ان کا منافع دیا جائے۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی اس صورت میں تائید کی گئی ہے: ''ہم نے یہ فیصلہ سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا''۔ [۱]

اور ہماری تائید سے اس نے اس جھگڑے کے حل کی بہترین راہ معلوم کر لی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ غلط تھا۔ کیونکہ قرآن ساتھ ہی کہتا ہے: ''ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو آگاہی اور فیصلے کی اہلیت اور علم عطا کیا تھا''۔ [۲]

ہدہد اور ملکہ سبا کی داستان

قرآن کے ایک حصے میں خداوند عالم حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیرت انگیز زندگی کے ایک اور اہم واقعے کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور ہدہد اور ملکہ سباء کا قصہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: ''سلیمان علیہ السلام کو ہدہد دکھائی نہ دیا تو وہ اسے ڈھونڈنے لگے''۔ [۳]

---

[۱] سورہ انبیاء آیت 79

[۲] سورہ انبیاء آیت 79

[۳] سورہ نمل آیت 20

یہ تعبیر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی حکومت کے حالات اور ملک کی کیفیت کو اچھی طرح مدنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ ایک پرندہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھا۔

سلیمان علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ ہدہد غیر حاضر ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ جب آپؑ سفر کرتے تو پرندے آپؑ کے سر پر سایہ کئے رہتے تھے۔

چونکہ اس وقت اس سائبان میں اسکی جگہ خالی نظر آئی لہٰذا انہیں معلوم ہوگیا کہ ہدہد غیر حاضر ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے نظم حکومت میں پانی کی تلاش کا کام ہدہد کے ذمہ تھا لہٰذا پانی کی ضرورت کے وقت جب اسے تلاش کیا گیا تو وہ نہیں ملا۔

بہر حال، اس گفتگو کی ابتداء میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''مجھے وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے''، پھر فرمایا: ''یا یہ کہ وہ غائب ہے''۔

ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کیا وہ کسی معقول عذر کے بغیر حاضر نہیں ہے یا معقول عذر کی وجہ سے غائب ہے۔

بہرصورت ایک با استقلال منظم اور طاقت ور حکومت میں یہی ہوتا ہے کہ ملک میں جو بھی اتار چڑھاؤ ہو وہ سربراہ حکومت کی نظر میں ہو حتیٰ کہ کسی پرندے کی حاضری اور غیر حاضری ایک عام ملازم کی موجودگی اور عدم موجودگی اس کے پیش نظر ہو اور یہ ایک بہت بڑا درس ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسروں کو درس دینے اور حکم عدولی پر سزا دینے کی خاطر مندرجہ ذیل جملہ کہا تاکہ ہدہد کی غیر حاضری دوسرے پرندوں پر بھی اثر کرے چہ جائیکہ اہم عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انسان، فرمایا: ''میں یقیناً اسے سخت سزا دوں گا''۔

''یا اسے ذبح کر ڈالوں گا، یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی میرے سامنے واضح دلیل پیش کرے''۔[1]

درحقیقت جناب سلیمان علیہ السلام نے غیر حاضری کی صورت میں یک طرفہ فیصلہ دینے کی بجائے خلاف ورزی ثابت ہوجانے پر سزا کی تنبیہ کی ہے اور اپنی اس تنبیہ میں بھی دو مراحل بیان کئے ہیں جو جرم کی نوعیت کے مطابق ہیں ایک مرحلہ بغیر موت کے سزا ہے اور دوسرا سزائے موت کا مرحلہ ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انہیں اپنی حکومت اور طاقت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اگر ایک کمزور سا پرندہ بھی معقول اور واضح دلیل پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ہدہد ایک اہم خبر کے ساتھ

ہدہد کی غیر حاضری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہدہد واپس آگیا اور سلیمان علیہ السلام کی طرف رخ کر کے کہنے لگا: ''مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس سے آپؑ آگاہ نہیں ہیں، میں آپؑ کے لئے سرزمین سباء سے ایک یقینی (اور بالکل تازہ) خبر لایا ہوں''۔[2]

گویا ہدہد نے جناب سلیمان علیہ السلام کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ لئے تھے لہٰذا ان کی ناراضی دور کرنے کے لئے سب سے پہلے اس نے ایک ایسے اہم مطلب کی مختصر الفاظ میں خبر دی جس سے جناب سلیمان علیہ السلام اس قدر علم و دانش رکھنے کے باوجود بے خبر

---

[1] سورہ نمل آیت 21

[2] سورہ نمل آیت 22

تھے، جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اس ماجرا کی تفصیل بیان کی ۔[1]

اس کی گفتار کا طریقہ ایسا نہیں تھا جیسے چاپلوس درباریوں کا جابر بادشاہوں کے سامنے ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے مدتوں خوشامد کرتے رہتے ہیں اپنے آپ کو ذرہ ناچیز بتلاتے ہیں پھر چاپلوسی اور خوشامد کے ہزاروں پردوں میں کوئی بات بادشاہ سلامت کے قدموں پر نثار کرتے ہیں اور کبھی بھی اپنی بات کھول کر بیان نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ پھول کی پتی سے بھی نازک کنایوں کا سہارا لیتے ہیں مبادا بادشاہ سلامت کی خاطر مبارک ملول ہو جائے۔

ہاں تو ہدہد نے واضح الفاظ کہہ دیا کہ میری غیر حاضری کسی دلیل کے بغیر نہیں تھی، میں ایک ایسی اہم خبر لایا ہوں جس سے آپ بھی بے خبر ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر سب لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا درس بھی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہدہد جیسی ایک چھوٹی سی مخلوق ایسی بات جانتی ہو جس سے اپنے دور کے بہت بڑے دانشور بھی بے خبر ہوں۔ انسان کو نہیں چاہئے کہ اپنے علم و دانش پر گھمنڈ کرے چاہے وہ نبوت کے وسیع علم کا مالک سلیمان علیہ السلام ہی کیوں نہ ہو۔

بہر حال ہدہد نے ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا: ''میں سرزمین سباء میں چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اسکے قبضے میں سب کچھ ہے خاص طور پر اس کا ایک بہت بڑا تخت بھی ہے''۔[2]

ہدہد نے ان تین جملوں میں ملک سباء کی تقریباً تمام خصوصیات بتا دیں اور وہاں کے طرز حکومت سے بھی سلیمان علیہ السلام کو باخبر کر دیا۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے وہ ایک ایسا آباد اور شاد ملک ہے جس میں ہر طرح کی نعمتیں اور سہولیات مہیا ہیں۔

دوسری یہ کہ ان لوگوں پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے جس کا ایک نہایت ہی آراستہ دربار ہے حتیٰ کے سلیمان علیہ السلام کے دربار سے بھی زیادہ آراستہ کیونکہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت دیکھا ہوا تھا اس کے باوصف ہونے کے باوجود اس نے ملکہ سباء کے تخت کو ''عرش عظیم'' کے عنوان سے یاد کیا۔

ان الفاظ کے ساتھ اس نے سلیمان علیہ السلام کو یہ بات جتلا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؑ یہ تصور کر لیں کہ تمام جہان آپؑ کے قلمرو حکومت میں ہے اور صرف آپؑ کا تخت باعظمت ہے۔

سلیمان ہدہد کی یہ بات سن کر ایک گہری سوچ میں پڑ گئے لیکن ہدہد نے انہیں مزید سوچنے کی مہلت نہ دی اور فوراً ہی ایک اور بات پیش کر دی۔ اس نے کہا: ''جو عجیب و غریب اور تکلیف دہ چیز میں نے وہاں دیکھی ہے وہ یہ کہ میں نے دیکھا کہ وہ عورت اور اس کی قوم خدا کو چھوڑ کر سورج کے سامنے سجدہ کرتے ہیں''۔

''شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کر رکھا ہے''۔[3]

(لہٰذا وہ سورج کو سجدہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں)۔

---

[1] یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر والے حتیٰ کہ پرندہ تک کو بھی جو ان کے تابع فرمان تھے جناب سلیمان علیہ السلام نے اس قدر آزادی، امن وامان اور جسارت عطا کی ہوئی تھی کہ ہدہد نے کھل کر ان سے کہہ دیا: ''مجھے ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس کی آپؑ کو بھی خبر نہیں ہے''۔

[2] سورہ نمل آیت 23

[3] سورہ نمل آیت 24

(اس طرح سے) ''شیطان نے انہیں راہ حق سے روک رکھا ہے''۔[1]

وہ بت پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ آسانی سے اس راہ سے پلٹ جائیں۔ ''وہ بالکل ہدایت نہیں پائیں گے''۔[2]

ہدہد نے ان الفاظ کے ساتھ ان کی مذہبی اور روحانی حیثیت بھی واضح کر دی کہ وہ بت پرستی میں خوب مگن ہیں، حکومت آفتاب پرستی کو ترویج کرتی ہے۔ اور لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہیں۔

ان کے بت کدوں اور دوسرے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس غلط راہ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں اور اپنی اس غلط روش پر فخر کرتے ہیں ایسے حالات میں جبکہ حکومت اور عوام ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں ان کا ہدایت پانا بہت مشکل ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا کے نام

حضرت سلیمان علیہ السلام نے غور سے ہدہد کی باتیں سنیں اور سوچنے لگے۔ ممکن ہے ان کا زیادہ گمان یہی ہو کہ یہ خبر سچی ہے اور اس کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بات معمولی نہ تھی بلکہ ایک ملک اور ایک بڑی قوم کی تقدیر اس سے وابستہ تھی لہٰذا انھوں نے ایک فرد کی خبر پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ اس حساس موضوع پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس طرح فرمایا:

''ہم اس بارے میں تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے''۔[3]

سلیمان علیہ السلام نے نہ تو ہدہد کو جھوٹا کہا اور نہ ہی بغیر دلیل کے اس کی بات کو تسلیم کیا بلکہ اس بارے میں تحقیقات کا حکم صادر فرمایا۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام نے ایک نہایت مختصر لیکن جامع خط تحریر فرمایا اور ہدہد کو دے کر کہا: میرا یہ خط لے جاؤ اور ان کے پاس جا کر ڈال دو پھر لوٹ آؤ اور ایک کونے میں ٹھہر جاؤ اور دیکھو وہ کیا ظاہر رد عمل کرتے ہیں۔[4]

ملکہ سباء نے خط کھولا اور اسکے مندرجات سے آگاہی حاصل کی چونکہ اس نے اس سے پہلے سلیمان علیہ السلام کا نام اور شہرت سن رکھی تھی اور خط کے مندرجات سے بھی واضح ہوتا تھا کہ جناب سلیمان علیہ السلام نے سباء کے بارے میں سخت فیصلہ کر لیا ہے۔

لہٰذا وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور چونکہ ملک کے اہم ترین مسائل میں وہ اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کرتی تھی لہٰذا اس بارے میں بھی انہیں اظہار خیال کی دعوت دی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''اے سردارو اور بزرگو ایک نہایت ہی باوقار خط میری طرف پھینکا گیا ہے''۔[5]

---

[1] سورہ نمل آیت 24

[2] سورہ نمل آیت 24

[3] سورہ نمل آیت 27

[4] سورہ نمل آیت 28

[5] سورہ نمل آیت 29۔ ملکہ نے یہ کیوں کہا کہ یہ بہت ہی باعظمت خط ہے یا تو اس لئے کہ اس خط کے مطالب بہت ہی گہرے تھے یا پھر اس لئے کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے ہوا تھا اور اختتام پر جناب سلیمان علیہ السلام کے صحیح دستخط تھے اور مہر لگی تھی۔ یا اس کا لکھنے والا باعظمت انسان تھا۔ مفسرین نے یہ مختلف احتمالات ذکر کئے ہیں ممکن ہے کہ یہ سب احتمالات جامع مفہوم میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ سورج پرست تھے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے بت پرست خدا پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اسے ''رب الارباب'' کا نام دیتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے اور تعظیم بجالاتے تھے۔

پھر ملکہ سباء نے خط کا مضمون سناتے ہوئے کہا: ''یہ خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس کے مندرجات یوں ہیں: رحمان ورحیم اللہ کے نام سے''۔ [1]

''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی سے کام نہ لواورحق کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ''۔ [2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کا تذکرہ کرنے کے بعد اہل دربار کی طرف رخ کرکے ملکہ نے یوں کہا ''اے سردارو! اس اہم معاملے میں تم اپنی رائے کا اظہار کرو، کیونکہ میں کوئی بھی اہم کام تمہاری شرکت اور تمہاری رائے کے بغیر انجام نہیں دیتی ہوں''۔ [3]

اس رائے طلبی سے وہ ان کے درمیان اپنی حیثیت ثابت کرنا چاہتی تھی اور ان کی نظر اور توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ اس طرح سے وہ ان کی رائے اور اپنے فیصلے کو ہم آہنگ کر سکے۔

اشراف قوم نے جواب میں کہا: ''ہم بڑی طاقت والے اور جنگجو لوگ ہیں لیکن آخری فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے دیکھئے، آپ کیا حکم دیتی ہیں''؟ [4]

اس طرح سے انھوں نے ایک تو اس کے سامنے اپنی فرمانبرداری کا اظہار کردیا اور دوسرے اپنی قوت کا ذکر کرکے میدان جنگ میں لڑنے کا مشورہ بھی دے دیا۔

بادشاہ تباہی لاتے ہیں

جب ملکہ نے ان کا جنگ کی طرف رجحان دیکھا اور اندرونی طور پر اس کا قطعاً یہ ارادہ نہیں تھا تو ان کی اس جنگی پیاس کو بجھانے نیز صحیح حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے انہیں قانع کرنے کے لئے کہا ''جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں تباہ برباد کردیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کردیتے ہیں''۔ [5]

کچھ کو مار ڈالتے ہیں، کچھ کو قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ کو بے گھر کردیتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا ہے، لوٹ مار کرتے ہیں۔

پھر اس نے تاکید کے طور پر بلکہ یقینی صورت میں کہا: ''جی ہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں''۔

درحقیقت ملکہ سباء خود بھی ایک ''بادشاہ'' تھی لہٰذا وہ بادشاہوں سے اچھی طرح واقف تھی کہ بادشاہوں کی جنگی حکمت عملی دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے ایک تباہی اور بربادی اور دوسرے باعزت افراد کو ذلیل کرنا کیونکہ انہیں تو صرف اپنے ہی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ قوم وملت کے مفادات اور ان کی سربلندی سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا لہٰذا عمومی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد

---

[1] سورہ نمل آیت 30و31

[2] سورہ نمل آیت 31و32

بعید معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام نے اسی عبارت اور انہی عربی الفاظ میں خط لکھا ہو بنابریں ممکن ہے مندرجہ بالا جملے یا تو صرف معنی کو بیان کررہے ہیں یا پھر سلیمان علیہ السلام کے خط کا خلاصہ ہوں جسے ملکہ سباء نے ان افراد کے سامنے بیان کیا۔

[3] سورہ نمل آیت 32

[4] سورہ نمل آیت 33

[5] سورہ نمل آیت 34

ہوتے ہیں۔

پھر ملکہ نے کہا: ہمیں سب سے پہلے سلیمان علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو آزمانا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ واقعاً ہیں کیسے لوگ؟ آیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہے یا پیغمبر ہے؟

تباہ کار ہے یا مصلح، اقوام و ملل کو ذلیل کرتا ہے یا عزت بخشتا ہے؟ تو اس کام کے لئے ہمیں تحفے تحائف سے استفادہ کرنا چاہئے لہٰذا ''میں ان کی طرف کچھ معقول تحفے بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ میرے قاصد ان کی طرف سے کیا ردعمل لاتے ہیں''۔[1]
بادشاہوں کو تحفے تحائف سے بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ تحفے اور ہدیے ہی ان کی بہت بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔

انہیں تحفے دے کر جھکایا جا سکتا ہے ہم دیکھیں گے اگر سلیمان علیہ السلام نے ان تحائف کو قبول کر لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بادشاہ ہے اور ہم بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنی پوری طاقت استعمال کریں گے کیونکہ ہم بہرحال طاقتور ہیں اور اگر اس نے ان تحائف سے بے رخی کی اور اپنی باتوں پر ڈٹا رہا تو ہم سمجھ گے کہ وہ خدا کا نبی ہے تو ایسی صورت میں ہمیں بھی عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔

ملکہ سباء نے جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے کیا تحائف بھیجے؟ اس بارے میں قرآن نے تو کچھ نہیں بتایا۔ صرف کلمہ ''ہدیہ'' نکرہ کی صورت میں بیان کر کے اس کی عظمت کو ضرور واضح کر دیا ہے البتہ مفسرین نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے جن میں سے بعض باتیں مبالغہ آرائی اور افسانوی رنگ سے خالی نہیں ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ پانچ سو بہترین غلام اور پانچ سو بہترین کنیزیں ان کے لئے بھیجی گئیں غلاموں کو زنانہ لباس میں اور کنیزوں کو مردانہ لباس میں، غلاموں کے کانوں میں گوشوارے اور ہاتھوں میں کنگن اور کنیزوں کے سر پر خوبصورت ٹوپیاں تھیں۔ ملکہ نے اپنے خط میں لکھا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں تو غلاموں اور کنیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔

انہیں زر و جواہرات اور قیمتی زیورات سے آراستہ کر کے بہترین سواریوں پر سوار کر کے اور جواہرات کی معقول مقدار دے کر جناب سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا گیا۔

اور ساتھ ہی ملکہ نے قاصد کو یہ بات بھی سمجھا دی کہ تمہارے دربار میں پہنچتے ہی اگر سلیمان علیہ السلام نے تمہیں خشم آلود اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھا تو سمجھ لینا کہ یہ بادشاہوں کا انداز ہے اور اگر پیار بھرے انداز میں خندہ پیشانی کے ساتھ تمہیں شرف حضور بخشا تو سمجھ لینا کہ خدا کا نبی ہے۔

مجھے مال کے ذریعہ نہ ورغلاؤ

ملکہ سباء کے روانہ کئے ہوئے افراد نے سرزمین یمن کو خیر باد کہا اور شام اور جناب سلیمان علیہ السلام کے مرکز حکومت کی طرف چل دیئے۔ دل میں یہی تصور لئے ہوئے کہ سلیمان علیہ السلام ان کے تحائف قبول کر لیں گے اور خوش ہو کر انہیں شاباش کہیں گے۔

لیکن جوں ہی وہ سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش ہوئے تو وہاں پر عجیب و غریب منظر دیکھا سلیمان علیہ السلام نے نہ صرف ان کا استقبال نہیں کیا بلکہ ان سے یہ بھی کہا ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ (اپنے) مال کے ذریعے میری مدد کرو؟ حالانکہ یہ مال میری نگاہ میں بالکل بے قیمت سی چیز ہے جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے اس سے کئی حصے بہتر اور کہیں قیمتی ہے۔''[2] ''نبوت، علم و دانش، ہدایت اور تقویٰ

[1] سورہ نمل آیت 35
[2] سورہ نمل آیت 36

کے مقابلے میں مال کی کیا حیثیت ہے؟ یہ تم ہو جو ایسے تحفے پر خوش ہوتے ہو''۔[1]

جی ہاں یہ تمہیں لوگ ہو کہ اس قسم کے حسین اور قیمتی تحفے اگر ایک دوسرے کے لئے بھی بھیجو تو اس قدر مسرور شادماں نظر آتے ہو کہ خوشی کی چمک تمہاری آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے لیکن میری نگاہوں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اس طرح سے جناب سلیمان علیہ السلام نے ان کی اقدار اور معیار کی نفی کر دی اور تحائف کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک اقدار اور معیار کچھ اور ہیں۔ دنیا پرستوں کے مقرر کردہ معیار ان کے سامنے ہیچ اور بے قیمت ہیں۔

جناب سلیمان علیہ السلام نے حق و باطل کے مسئلے میں اپنے اس عزم بالجزم کو ثابت کرنے کے لئے ملکہ سباء کے خاص ایلچی سے فرمایا: ''تم ان کی طرف واپس پلٹ جاؤ (اور اپنے یہ تحفے بھی ساتھ لے جاؤ) لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ ہم کئی لشکر لے کر ان کے پاس بہت جلد پہنچ رہے ہیں جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی، اور ہم انہیں اس سرزمین سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ نہایت ہی حقیر ہوں گے۔''[2]

جناب سلیمان علیہ السلام کی یہ دھمکی ان لوگوں کے نزدیک صحیح اور قابل عمل بھی تھی کیونکہ انھوں نے جناب سلیمان علیہ السلام اور ان کے جاہ و جلال اور فوج و لشکر کو نزدیک سے دیکھا تھا۔

چنانچہ جناب سلیمان علیہ السلام نے ان سے دو چیزوں کا تقاضا کیا تھا ایک تو ''برتری طلبی کو ترک کر دیں'' اور دوسرے ''حق کے آگے جھک جائیں''۔

اہل سباء کا ان دونوں چیزوں کا مثبت جواب نہ دینا اور اس کی بجائے تحائف کا بھیجنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی برتری طلبی سے باز آتے ہیں لہٰذا سلیمان علیہ السلام نے انہیں پر فوجی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔

جبکہ ملکہ سباء اور اس کے درباریوں نے دلیل اور ثبوت یا معجزہ وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا لہٰذا انہیں موقع فراہم کیا کہ مزید تحقیق کریں لیکن تحفوں کے بھیجنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انکار کر چکے ہیں۔

یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام کو ہدہد نے جو ناخوشگوار خبر سنائی تھی وہ یہ کہ ملک سباء کے لوگ سورج پرست ہیں اور غیب و حضور کے جاننے والے سے روگردانی کئے ہوئے ہیں اور مخلوق کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسی بات سے سخت دکھ پہنچا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ بت پرستی ایک ایسی بات ہے جسکے سامنے کوئی بھی خدائی دین خاموش تماشائی نہیں بن سکتا اور نہ ہی بت پرستوں کو ایک مذہبی اقلیت مان سکتا ہے بلکہ بوقت ضرورت زبردستی بھی بت کدوں کو مسمار اور شرک و بت پرستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا توضیحات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے سلیمان علیہ السلام کی یہ دھمکی «لا اکراہ فی الدین» کے بنیادی اصول سے بھی متصادم نہیں ہے کیونکہ بت پرستی کوئی دین نہیں بلکہ ایک خرافات اور راہ حق سے انحراف ہے۔

پلک جھپکتے ہی تخت موجود

آخر کار ملکہ کے کارندے اپنے تحفے تحائف اور ساز و سامان اکٹھا کر کے اپنے ملک واپس چلے گئے اور سارا ماجرا ملکہ اور اس

---

[1] سورہ نمل آیت 36

[2] سورہ نمل آیت 37

کے مصاحبین سے جا کر بیان کیا، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک کی معجزانہ عظمت بھی بیان کی جن میں سے ہر ایک بات اس امر کی دلیل تھی کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی عام دنیاوی بادشاہ ہیں بلکہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی حکومت ایک خدائی حکومت ہے۔

یہاں پر ان کے لئے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ نہ صرف جناب سلیمان علیہ السلام کے ساتھ فوجی مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ اگر بالفرض مقابلہ کریں بھی تو قوی احتمال یہی ہے کہ ان کا خدا کے ایک زبردست طاقتور نبی سے مقابلہ ہوگا۔

لہٰذا ملکہ سبا نے اپنی قوم کے بہت سے سرداروں کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس ذاتی طور پر جا کر اس اہم مسئلے کے بارے میں تحقیقات کریں تاکہ پتہ چل سکے کہ سلیمان علیہ السلام کا کیا مسلک ہے؟

کسی بھی صورت میں یہ خبر حضرت سلیمان علیہ السلام تک بھی پہنچ گئی لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب جبکہ ملکہ اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں انہیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہئے، تاکہ انہیں پہلے سے زیادہ ان کے اعجاز کی حقیقت کا علم ہوجائے اور وہ ان کی دعوت قبول کرلیں۔

لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہوکر کہا ''اے بزرگو تم میں سے کون شخص اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ خود میرے پاس آئیں اور سر تسلیم خم کریں۔''[۱]

اس موقع پر دو قسم کے افراد نے کہا کہ ہم یہ کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جن میں سے ایک عجیب اور دوسرا عجیب تر تھا، سب سے پہلے جنوں میں سے ایک عفریت نے ان کی طرف منہ کر کے کہا: ''میں اس کا تخت آپؑ کی مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے آپؑ کے پاس لا دوں گا۔''[۲]

دوسرا ایک صالح اور متقی انسان تھا اور ''کتاب خدا'' سے بھی اسے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ جیسا کہ اس شخص کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے: ''جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا میں آپؑ کے پلک جھپکنے سے بھی پہلے اس تخت کو لے آؤں گا''۔[۳]

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی پیش کش قبول کر لی تو اس نے بھی اپنی معنوی طاقت کے ذریعے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں آپؑ کے پاس حاضر کر دیا اور جب سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگے: ''یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، تاکہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بجالاتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں''۔[۴]

آصف بن برخیا

یہ شخص کون تھا، اسے یہ عجیب وغریب طاقت کہاں سے ملی اور علم الکتاب سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے

---

[۱] سورہ نمل آیت 38

[۲] سورہ نمل آیت 39

''عفریت'' کا معنی ہے مغرور، سرکش اور خبیث۔ اور ''میں ان کی نسبت طاقتور اور امین ہوں'' جملے کی کئی بار تاکید کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عفریت میں کئی لحاظ سے خیانت کا اندیشہ تھا لہٰذا اسے اپنا دفاع کرنا پڑا اور امانت و وفاداری کا یقین دلانا پڑا۔

صورت حال خواہ کچھ ہو جناب سلیمان علیہ السلام کی زندگی عجائبات اور معجزات سے بھری پڑی ہے اور کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ ایک عفریت اس قسم کا کارنامہ ایک یا چند گھنٹوں میں انجام دے یعنی جتنی دیر سلیمان علیہ السلام لوگوں میں فیصلے کے لئے یا امور مملکت میں غور وفکر کے لئے یا عوام کو نصیحت کے لئے بیٹھے ہیں اتنی دیر میں وہ بھی ملکہ سبا کا تخت لا کر حاضر کر دیتا۔

[۳] سورہ نمل آیت 40

[۴] سورہ نمل آیت 40

مختلف اقوال ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ شخص جناب سلیمان علیہ السلام کے مومن اور قریبی رشتہ داروں اور خاص دوستوں میں سے تھا۔

تواریخ میں اسکا نام ''آصف بن برخیا'' لکھا ہے۔ وہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور بھانجے تھے۔

اور ''علم کتاب'' سے ان کی آسمانی کتابوں سے واقفیت مراد ہے ایسی عمیق اور گہری واقفیت جس سے ان کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اس طرح کا معجزانہ کارنامہ انجام دیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

یعنی علم الٰہی کی لوح اور اس کے صرف ایک گوشے کا اس بندۂ خدا کو علم حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ ملکہ کے تخت کو ''سباء'' سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں لانے پر قادر تھا۔

بہت سے مفسرین اور غیر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ مرد مومن اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم سے باخبر تھا۔ یعنی ایسا باعظمت اور بزرگ نام جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز سر جھکائے ہوئے ہے اور وہ انسان کو بے حد و اندازہ قدرت عطا کرتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسم اعظم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص کلمہ کے زبان سے نکال دینے سے اس کے اس قدر عجیب و غریب اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس نام اور اس کی صفات کو اپنانا ہوتا ہے اور دل و جان سے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور علم، اخلاق تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر خود کو اس کا مظہر بنانا ہوتا ہے تب کہیں جا کر اس اسم اعظم کے پرتو میں انسان کے اندر معجزانہ امور کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ''عفریت جن'' میں ایسے خارق العادۃ کام انجام دینے کی طاقت کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب تو ہم اعجاز سے متعلق بحث میں دے چکے ہیں۔

غیر مومن لوگ بھی زبردست ریاضتوں اور مشقتوں کی وجہ سے کچھ ایسے امور کی انجام دہی پر قادر ہو جاتے ہیں۔

جو عموماً خلاف معمول ہوتے ہیں۔

لیکن ان کے کاموں میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے اس قسم کے کام محدود بشری طاقت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

جبکہ معجزات کا دارومدار خداوند عالم کی بے پایاں اور لایزال قدرت پر ہوتا ہے جو خود خدا کی دوسری صفات کی مانند غیر محدود ہوتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عفریت جن اپنی توانائی کو ملکہ سبا کے تخت کو لانے کے لئے جناب سلیمان علیہ السلام کی مجلس برخاست کرنے میں محدود کرتا ہے جبکہ جناب آصف بن برخیا نے اپنی توانائی کو کسی حد میں محدود نہیں کیا اگر وہ پلک جھپکنے کی بات بھی کرتے ہیں تو در حقیقت ایک کم از کم مدت کی طرف اشارہ ہے جس سے کم مدت اور کوئی ہو نہیں سکتی۔

اور مسلم ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام بھی اس قسم کے کاموں میں صالح شخص کی حمایت کریں گے کیونکہ اس طرح سے اس کا تعارف ہوگا اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے نہ کہ ایک عفریت کی کہ جس کی وجہ سے کوتاہ نظر لوگ شک میں پڑ جائیں اور اسے اس کی پاکیزگی اور اچھائی کی دلیل سمجھنے لگ جائیں۔

ملکہ سبا کے دل میں نورِ ایمان

قرآن میں سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کی سبق آموز داستان سے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کی عقل وخرد کو آزمانے اور خدا پر اس کے ایمان لانے کے لئے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ پہچانا نہ جا سکے چنانچہ انھوں نے کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کردو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پاتے''۔[۱]

اگر چہ ملکہ کے تخت کا سبا سے شام میں آجانا ہی اس بات کے لئے کافی تھا کہ وہ اسے آسانی کے ساتھ نہ پہچان سکے لیکن اس کے باوجود جناب سلیمان علیہ السلام سے حکم دیا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کردی جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلیاں بعض علامتوں اور جواہر کو ادھر ادھر کرکے کی گئی ہوں یا بعض رنگوں کو تبدیل کردیا گیا ہو۔[۲]

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو اب ملکہ پہنچی تو کسی نے (تخت کی طرف اشارہ کرکے) کہا: ''کیا آپ کا تخت اسی طرح کا ہے''۔[۳]

ملکہ سبا نے نہایت ہی زیرکانہ انداز میں ایک بہت ہی شستہ اور جچا تلا جواب دیتے ہوئے کہا: ''یہ تو خود وہی تخت معلوم ہوتا ہے''۔[۴]

اگر وہ کہتی کہ اس جیسا ہے تو جواب صحیح نہ ہوتا اور اگر کہتی کہ بالکل وہی ہے تو خلاف احتیاط بات تھی۔ کیونکہ اس قدر لمبے فاصلوں سے اس کے تخت کا سرزمین سلیمان علیہ السلام میں آنا عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے معجزہ۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ہے کہ ملکہ نے اپنے اس گراں قیمت تخت کی بڑی حفاظت کی تھی اسے اپنے خصوصی محل کے خاص کمرے میں اہم مقام پر نصب کیا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لئے خصوصی دستہ مقرر تھا اور اس محل میں نہایت مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔

لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود ملکہ نے اپنے تخت کو پہچان لیا تھا۔

اس نے فوراً کہا: ''ہم تو اسے پہلے ہی جان چکے تھے اور سر تسلیم خم کر چکے تھے''۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ ان سارے کاموں سے سلیمان علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس کے معجزے پر ایمان لے آئیں لیکن ہم تو اس سے پہلے دوسری علامتوں کی وجہ سے ان کی حقانیت کے معترف ہو چکے ہیں اور ان غیر معمولی چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکے ہیں اس طرح کے کاموں کی اب چنداں ضرورت نہیں تھی۔

---

[۱] سورہ نمل آیت 41

[۲] لیکن یہاں پر جو سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر جناب سلیمان علیہ السلام، اس کی عقل وخرد اور فہم وذکا کو کیوں آزمانا چاہتے تھے؟ ہوسکتا ہے اس لئے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ اس کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہئے۔ لہٰذا وہ اس طرح سے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت کو جاننا چاہتے ہوں۔

[۳] سورہ نمل آیت 42

[۴] سورہ نمل آیت 42

تو اس طرح سے (سلیمان نے) اسے ہر غیر خدا کی عبادت سے روک دیا۔
ہر چند کہ وہ اس سے پہلے کافروں میں سے تھی۔
تو اس نے یہ واضح اور روشن علامات دیکھ کر اپنے تاریک ماضی کو الوداع کہا اور اپنی زندگی کے نئے مرحلے میں قدم رکھا، جو نور ایمان ویقین سے بھرپور تھا۔

ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں

اس سلسلہ کے آخر میں اس داستان کا ایک اور منظر پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ملکہ سباء کا حضرت سلیمان کے محل میں داخل ہونا حضرت سلیمان نے حکم دے دیا تھا کہ ان کے ایک محل کے صحن کو بلور سے تیار کیا جائے اور اس کے نیچے پانی چلا دیا جائے۔

''تو جب ملکہ سباء وہاں پہنچی تو اس سے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہو جاؤ''۔[۱]

ملکہ نے جب صحن کو دیکھا تو اس نے سمجھا کہ پانی کی نہر چل رہی ہے اس نے پنڈلی سے کپڑا اٹھایا تا کہ پانی کو عبور کرے (اور وہ تعجب میں غرق تھی کہ پانی کی نہر کا یہاں کیا کام؟)

''لیکن سلیمان نے اس سے کہا محل کا صحن صاف وشفاف بلور سے بنا ہوا ہے''۔[۲]

(یہ پانی نہیں ہے کہ جسے عبور کرنے کے لئے تم نے پائنچے اٹھار کھے ہیں)۔[۳]

''یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ سبا نے ان مناظر کو دیکھا تو فوراً کہا: پروردگارا:'' میں نے تو اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اب میں سلیمان کے ساتھ مل کر اس اللہ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر چکی ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔[۴]

---

[۱] سورہ نمل آیت 44

[۲] سورہ نمل آیت 44

[۳] اس مقام پر ایک نہایت ہی اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ جناب سلیمان اللہ کے ایک عظیم پیغمبر تھے وہ اس قدر آرائشی اور زیبائشی کاموں میں کیوں لگ گئے؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بادشادہ اور فرمانروا تھے لیکن دوسرے انبیاء کی طرح کیا وہ سادگی کو اختیار نہیں کر سکتے تھے؟

جواباً عرض ہے کہ اگر حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کو مسلمان بنانے کے لئے اس طرح کی آرائش وزیبائش سے کام لیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ خصوصاً جبکہ ملکہ اپنی تمام طاقت وعظمت، خوبصورت تاج وتخت، باشکوہ محل وقصر اور زرق وبرق آرائش وزیبائش میں ہی سمجھتی تھی چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنی سلطنت کی ایک جھلک دکھائی تو ملکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی حکومت کی تمام سج دھج ماند پڑ گئی اور یہی بات اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئی جس میں اسے اقدار اور معیار زندگی کے بارے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

آخر اس بات میں کیا حرج ہے کہ انھوں نے نقصان دہ اور خونریز لشکر کشی کی بجائے ایسی حکمت عملی اختیار کی ملکہ کا دماغ چکرانے لگا وہ اس قدر مبہوت ہوگئی کہ جنگ کا تصور ہی اس کے دماغ سے کافور ہوگیا خصوصاً جبکہ وہ ایک عورت تھی اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس قسم کے تکلفات ہوتے ہیں کیونکہ عورت ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے ملکہ سباء کے سرزمین شام میں قدم رکھنے سے پہلے حضرت سلیمان نے حکم جاری کر دیا تھا کہ اس قسم کا ایک عظیم محل تیار کیا جائے جس سے ان کا مقصد ملکہ کو مطیع کرنے کے لئے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ظاہری طاقت کے لحاظ سے بھی عظیم جناب سلیمان کے پاس ایک بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے انھوں نے ایسا کام انجام دیا ہے۔

''دوسرے لفظوں میں ایک وسیع وعریض علاقے کا امن وامان، دین حق کی قبولیت اور بے پناہ جنگی اخراجات سے بچنے کے لئے اس قسم کے اخراجات کوئی بات نہیں تھے۔''

[۴] سورہ نمل آیت 44

میں پہلے سورج کی پوجا کیا کرتی تھی، زیب وزینت میں کھو چکی تھی اور خود کو دنیا کا سب سے بہتر اور برتر انسان سمجھتی تھی۔
لیکن اب پتہ چلا ہے کہ میری طاقت کتنی کمزور اور حقیر تھی بلکہ اصولی طور پر یہ زر وجواہر اور قیمتی زیورات انسانی روح کو کبھی سیراب نہیں کر سکتے۔''

پروردگارا میں اپنے رہبر سلیمان کے ساتھ مل کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور اپنے کئے پر نادم ہوں اور تیرے آستان قدسی پر میں نے اپنا سر جھکا دیا ہے۔

ملکہ سبا کا انجام

ملکہ سبا کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہی ہے جو ہم نے ابھی پڑھا ہے آخر کار وہ ایمان لے آئی اور صالحین کے کارواں میں شامل ہوگئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ ایمان اختیار کرنے کے بعد اپنے ملک کو واپس لوٹ گئی اور سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ملک پر حکمراں رہی یا سلیمان علیہ السلام کے پاس رہ گئی اور انہی کے ساتھ شادی کر لی یا سلیمان کے مشورہ پر یمن کے کسی بادشاہ جسے ''تبع'' کہا جاتا تھا، اس کے ساتھ عقد کر لیا اس بارے میں قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

چونکہ قرآن کا ہدف اصلی تربیتی مسائل بیان کرنا ہے اور یہ بات ان مسائل سے غیر متعلق تھی لہٰذا اسے بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی لیکن مفسرین اور مؤرخین نے اس کے بارے میں مختلف راستے اختیار کئے ہیں جنکی تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اگر چہ بعض مفسرین کے بقول مشہور ومعروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئی۔

البتہ اس مقام پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکر وحکومت کے بارے میں نیز ملکہ سباء اور اس کی تفصیلی زندگی کے بارے میں بہت ہی افسانہ طرازی کی گئی ہے کہ بعض مواقع پر تو عوام الناس کے لئے حق وباطل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر اس صحیح تاریخی واقعے پر ایسے تاریک پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کی اصلیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ ان خرافات کا غلط نتیجہ ہوتا ہے جو حقائق کے ساتھ ملا دیئے جاتے ہیں لہٰذا ایسے خرافات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیئے۔

عبرت انگیز موت

قرآن ایک مقام پر خدا کے اس عظیم پیغمبر کی عجیب وغریب اور عبرت انگیز موت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور اس حقیقت کو روشن کر رہا ہے کہ اتنے باعظمت پیغمبر اور اتنی قدرت، رعب اور دبدبہ رکھنے والے حکمران نے اپنی جان کس طرح آسانی کے ساتھ جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہاں تک کہ بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی موت کے چنگل نے ان کے گریبان کو پکڑ لیا۔ فرماتا ہے: ''جب ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے موت کا حکم نافذ کر دیا تو کسی نے بھی لوگوں کو اس کی موت سے آگاہ نہ کیا مگر زمین پر رینگنے والے نے کہ جس نے اس کے عصاء کو کھا لیا یہاں تک کہ اس کا عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان علیہ السلام کا پیکر نیچے گر پڑا''۔ [1]

جب سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آن پہنچا تو وہ اس وقت کھڑے ہوئے تھے اور اپنے عصا پر تکیہ کئے ہوئے تھے کہ اچانک موت نے ان کو آ پکڑا، اور ان کی روح بدن سے پرواز کر گئی اور وہ ایک مدت تک اسی حالت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ

---

[1] سورہ سباء آیت 14

دیمک نے کہ قرآن جسے ''دابۃ الارض'' (زمین پر رینگنے والی چیز) سے تعبیر کرتا ہے، ان کے عصا کو کھا لیا، جس سے ان کا اعتدال برقرار نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑے تب لوگ ان کی موت سے آگاہ ہوئے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس دن سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش پوش جوان قصر کے ایک کونے سے باہر آیا اور ان کی طرف بڑھا، سلیمان علیہ السلام نے تعجب کیا، کہا: تو کون ہے؟ اور کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟ میں نے تو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ آج کوئی شخص یہاں نہ آنے پائے۔

اس نے جواب دیا: میں وہ ہوں کہ نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی سے رشوت لیتا ہوں، سلیمان علیہ السلام نے بہت ہی تعجب کیا۔ لیکن اس نے مہلت نہ دی اور کہا میں موت کا فرشتہ ہوں، میں اس لئے آیا ہوں تاکہ میں آپؑ کی روح قبض کروں یہ کہتے ہی فوراً ان کی روح قبض کر لی۔ [1]

سلیمان علیہ السلام کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟

یہ بات کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت ان کے کارکنان حکومت پر کتنی مدت تک مخفی رہی صحیح طور پر واضح نہیں ہے، ایک سال؟ ایک ماہ؟ یا چند روز؟

مفسرین کا اس سلسلہ میں ایک نظریہ نہیں ہے۔

کیا یہ اخفا اور کتمان ان کے اصحاب اور ارکان سلطنت کی جانب سے صورت پذیر ہوا تھا؟ کیا انہوں نے جانتے بوجھتے اس غرض سے کہ کہیں امور سلطنت کا رشتہ وقتی طور پر بکھر نہ جائے، ان کی موت کو پوشیدہ رکھا؟

یا یہ کہ اصحاب وارکان سلطنت بھی اس امر سے آگاہ ہی نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ ایک طولانی مدت تک، یہاں تک کہ ایک دن سے زیادہ ہی سہی، ان کے اطراقیان، (گردوپیش رہنے والے اصحاب وارکان سلطنت) بھی آگاہ نہ ہوں، کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے، کہ کچھ لوگ ان کا کھانا لے جانے پر مامور تھے اور ان تک دوسری ضروریات پہنچاتے تھے، وہ تو اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہو جاتے، اس بنا پر بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔

کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے، لیکن اسے کچھ مصلحتوں کی بنا پر مخفی رکھا، اسی لئے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس مدت میں ''آصف بن برخیا'' ان کے وزیر خاص ملک کے امور کی تدبیر کرتے اور نظم ونسق چلاتے رہے۔

کیا سلیمان علیہ السلام کھڑے ہوئے عصا کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے یا بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ عصا پر رکھے ہوئے تھے، اور سر کو ہاتھوں پر ٹکائے ہوئے تھے اور اسی حالت میں ان کی روح قبض ہو گئی اور وہ ایک مدت تک اسی طرح رہے؟ اس سلسلے میں مختلف احتمالات ہیں، اگرچہ آخری احتمال زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔

اگر یہ مدت طولانی تھی تو کیا غذا کا نہ کھانا اور پانی کا نہ پینا دیکھنے والوں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا۔

چونکہ سلیمان علیہ السلام کے تمام کام عجیب وغریب تھے لہٰذا وہ شاید اس مسئلہ کو بھی عجیب وغریب شمار کرتے تھے، یہاں تک کہ

---

[1] اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے انبیاء کی داستانوں کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان میں بھی افسوسناک حد تک گھڑی ہوئی روایات شامل کر دی گئی ہیں، اور ان کے ساتھ بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں، کہ جنہوں نے اس عظیم پیغمبر کے چہرے کو بدل دیا ہے، اور ان خرافات کا زیادہ تر حصہ موجودہ توریت سے لیا گیا ہے، اور اگر ہم صرف اسی پر قناعت کر لیں کہ جو قرآن نے کہا ہے، تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ایک گروہ کے درمیان زمزمہ پیدا ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کی پرستش کرنا چاہیے یا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار ہے؟ نہ تو وہ سوتا ہے، نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ پانی پیتا ہے۔

لیکن جس وقت عصا ٹوٹا اور سلیمان علیہ السلام نیچے گرے، تو یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے اور ان کے خیالات نقش بر آب ہو گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر

گفتگو حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے، ان کا ذکر اس لئے ہے تا کہ اس وقت کے اور پھر آج کے اور آئندہ کے مسلمانوں کے لئے مشکلوں اور پریشانیوں میں استقامت، قیام اور جدو جہد کا درس ہو اور انہیں پامردی کی دعوت دی جائے اور اس صبر و استقامت کا حسن انجام واضح کیا جائے۔

حضرت ایوب علیہ السلام وہ تیسرے نبی ہیں کہ ہمارے عظیم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض کیا گیا ہے کہ ان کے واقعہ کو مسلمان کے لئے بیان کریں تا کہ مسلمان بڑی بڑی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور اس کی رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں۔ [1]

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ”ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کی: شیطان نے مجھے بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے“۔ [2]

اس گفتگو میں قرآن:

اولاً: بارگاہ الٰہی میں حضرت ایوب علیہ السلام کا بلند مقام ”عبدنا“ (ہمارا بندہ) سے معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: اشارتاً حضرت ایوب علیہ السلام کی شدید اور طاقت فرسا تکلیف اور فراواں مصیبت کا ذکر ہے، اس ماجرے کی تفصیل قرآن میں نہیں آئندہ لیکن حدیث و تفسیر کی مشہور کتب میں اس کی تفصیل نقل ہوئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کیوں مشکلات میں گرفتار ہوئے

کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: وہ مصیبت جو حضرت ایوب علیہ السلام کو دامن گیر ہوئی، کس بنا پر تھی؟ (شاید سائل کا خیال تھا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے انہیں مصیبت میں مبتلا کر دیا)۔

امام علیہ السلام نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جس کا خلاصہ یوں ہے: ایوب علیہ السلام کفران نعمت کی وجہ سے ان عظیم مصائب میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس شکر نعمت کی وجہ سے ہوئے، کیونکہ شیطان نے بارگاہ خدا میں عرض کی کہ یہ جو ایوب تیرا شکر گزار ہے وہ فراواں نعمتوں کی وجہ سے ہے کہ جو تو نے اسے دی ہیں، اگر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو یقیناً وہ کبھی شکر گزار بندہ نہیں ہوگا۔

اس بنا پر کہ ساری دنیا پر ایوب علیہ السلام کا خلوص واضح ہو جائے اور انہیں عالمین کے لئے نمونہ قرار دیا جائے تا کہ لوگ نعمت اور مصیبت ہر دو عالم میں شاکر و صابر رہیں۔ اللہ نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی دنیا پر قبضہ کر لے، شیطان نے اللہ

---

[1] برخلاف موجودہ توریت کے کہ جو انہیں انبیاء کے زمرے میں شمار نہیں کرتی بلکہ انہیں ایک نیک اور صالح انسان سمجھتی ہے کہ جن کی بہت سی اولاد تھی اور جو صاحب مال شخص تھے۔

[2] سورہ انبیاء آیت 41

سے خواہش کی ایوب کا فراواں مال و دولت، ان کی کھیتیاں، بھیڑ بکریاں اور ال اولاد سب ختم ہو جائے۔ آفتیں اور مصیبتیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا لیکن نہ صرف یہ کہ ایوب علیہ السلام کے شکر میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ خدا سے شیطان نے خواہش کی کہ اب اسے ایوب علیہ السلام کے بدن پر بھی مسلط کر دے اور وہ اس طرح بیمار ہو جائیں کہ ان کا بدن شدت درد کی لپیٹ میں آ جائے اور وہ بیماری کے بستر کا اسیر ہو جائے لیکن اس چیز نے بھی ان کے مقام شکر میں کمی نہ کی۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ایوب علیہ السلام کا دل توڑ دیا اور ان کی روح کو سخت مجروح کیا، وہ یہ کہ نبی اسرائیل کے راہبوں کی ایک جماعت انہیں دیکھنے آئی اور انھوں نے کہا کہ تو نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہے؟ ایوب علیہ السلام نے جواباً کہا: میرے پروردگار کی قسم کہ مجھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوا میں ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں کوشاں رہا ہوں اور میں نے جب بھی کوئی لقمہ غذا کا کھایا ہے کوئی نہ کوئی یتیم و بے نوا میرے دسترخوان پر ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایوب علیہ السلام دوستوں کی اس دل آزاری پر ہر دوسری مصیبت سے زیادہ دکھی ہوئے پھر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور شکر کے صاف و شریں پانی کو کفران سے آلودہ نہ کیا، صرف بارگاہ خدا کی طرف رخ کیا اور مذکورہ جملہ عرض کیا اور چونکہ آپ اللہ کے امتحانوں سے خوب عہدہ برا ہوئے لہٰذا اللہ نے اپنے اس شاکر و صابر بندے پر پھر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے اور کھوئی ہوئی نعمتیں یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی زیادہ انہیں عطا کیں تا کہ سب لوگ صبر و شکر کا نیک انجام دیکھ لیں۔

بہر حال کہتے ہیں کہ ان کی بیماری اور ناراحتی سات سال تک رہی اور ایک روایت کے مطابق سترہ برس تک رہی، یہاں تک کہ آپ کے نزدیک ترین ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک بیوی نے وفا میں استقامت کی اور یہ چیز خود ایک شاہد ہے بعض بیویوں کی وفاداری پر۔

سب سے بڑا غم دشمنوں کی دلآزاری باتیں

لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کو جس چیز سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ دشمنوں کی دل آزاری تھی، اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت ایوب علیہ السلام کو کھوئی ہوئی صحت و سلامتی پھر مل گئی اور رحمت الٰہی کے دروازے ان کے لئے کھل گئے تو لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے شدید درد آپ کو کون سا تھا؟ تو آپ نے کہا: دشمنوں کی شماتت۔

آخرکار حضرت ایوب علیہ السلام ازمائش الٰہی کی اس گرم بھٹی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے اور پھر رحمت خدا کا آغاز ہوا، انہیں حکم دیا گیا کہ ''اپنا پاؤں زمین پر مارو'' تو پانی کا چشمہ ابل پڑے گا کہ جو تیرے نہانے کے لئے ٹھنڈا بھی ہوگا اور تیرے پینے کے لئے عمدہ بھی۔[1]

وہی خدا جس نے خشک اور تپتے بیابان میں شیرخوار اسماعیل کی ایڑیوں کے نیچے چشمہ پیدا کر دیا، وہی خدا کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نعمت و عنایت جس کی طرف سے ہے، اس نے یہ فرمان ایوب علیہ السلام کے لئے بھی صادر فرمایا، پانی کا چشمہ ابلنے لگا، ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ جو اندرونی و بیرونی سب بیماریوں کے لئے شفا بخش تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس چشمے میں ایک طرح کا معدنی پانی تھا جو پینے کے لئے بھی اچھا تھا اور بیماریوں کو دور کرنے کے لئے بھی مؤثر تھا، بہر حال کچھ بھی تھا ایک صابر و شاکر نبی کے لئے اللہ کا لطف و کرم تھا۔

---

[1] سورہ ص آیت 42

پہلی اوراہم ترین خدائی نعمت صحت تھی، جب وہ ایوب علیہ السلام کی طرف لوٹ آئی تو دوسری نعمتوں کے لوٹنے کی نوبت ائی، اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''ہم نے اسے اس کے گھر والے بخش دیئے۔اوران کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے۔تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہواور صاحبان فکر ونظر کے لئے نصیحت بھی''۔[1]

ان کا گھرانہ ان کے پاس واپس آیا،اس سلسلے میں مختلف تفسیریں موجود ہیں،مشہور یہ ہے کہ وہ مر چکے تھے اوراللہ نے انہیں پھر زندگی دی۔

لیکن بعض نے لکھا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی طویل بیماری کے باعث وہ ادھرادھر بکھر چکے تھے جب حضرت ایوب علیہ السلام صحت یاب ہوگئے تو وہ پھر آپ کے گرد اگردجمع ہوگئے۔

کچھ لوگوں نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سب یاان میں سے بعض افراد بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے رحمت الٰہی ان کے شامل حال ہوئی وہ سب روبصحت ہوئے اور پروانوں کی طرح وجود پدر کی شمع کے گرد جمع ہوئے۔

''اوران کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے'' یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے ان کے گھر کو پہلے سے بھی زیادہ آباد اور پر رونق کیا اور ایوب علیہ السلام کو مزید بیٹے عطا کئے۔

قرآن میں اگر چہ حضرت ایوب علیہ السلام کے مال ودولت کے بارے میں بات نہیں کی گئی لیکن موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پھر آپ کو مال ودولت بھی فراواں تر عطا فرمایا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی قسم

اب صرف ایک مشکل ایوب علیہ السلام کے لئے باقی تھی، وہ قسم جوانھوں نے اپنی بیوی کے بارے میں کھائی تھی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان سے کوئی خلاف مرضی کام دیکھا تھا لہٰذا انھوں نے اس بیماری کی حالت میں قسم کھائی کہ جس وقت ان میں طاقت پیدا ہو گئی تو وہ اسے ایک سو یا اس سے کچھ کم کوڑے ماریں گے، لیکن صحت یابی کے بعد وہ چاہتے تھے۔

کہ اس کی خدمات اوروفاداریوں کالحاظ رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیں لیکن قسم اورخدا کے نام کا مسئلہ درمیان میں تھا۔

خدا نے یہ مشکل بھی ان کے لئے حل کر دی، جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ ان سے فرمایا گیا: ''گندم کی شاخوں (یا اسی قسم کی کسی چیز) کی ایک مٹھی بھر لو اور اس کے ساتھ مارو اور اپنی قسم نہ توڑو''۔[2]

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کا نام ایک روایت کے مطابق ''لیا'' بنت یعقوب تھا، اس بارے میں کہ اس سے کون سی غلطی ہوئی تھی مفسرین کے درمیان بحث ہے۔

مشہورترین مفسر، ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ شیطان یا (کوئی شیطان صفت) ایک طبیب کی صورت میں ایوب علیہ السلام کی بیوی کے پاس آیا اس نے کہا: میں تیرے شوہر کا علاج کرتا ہوں صرف اس شرط پر کہ جس وقت وہ ٹھیک ہوجائے تو وہ مجھ سے یہ کہہ دے کہ صرف میں نے اسے شفا یاب کیا ہے، اس کے علاوہ میں اور کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ان کی بیوی نے جوان کی مسلسل بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت ایوب علیہ السلام کے سامنے یہ تجویز پیش کی، حضرت ایوب علیہ السلام جو شیطان کے جال

---

[1] سورہ ص آیت 43

[2] سورہ ص آیت 44

کو سمجھتے تھے، بہت ناراض ہوئے اور قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی کو سزا دیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ جناب ایوب علیہ السلام نے اسے کسی کام کے لئے بھیجا تھا تو اس نے دیر کردی، حضرت ایوب علیہ السلام چونکہ بیماری سے تکلیف میں تھے، بہت پریشان ہوئے اور اس طرح کی قسم کھائی۔ بہر حال اگر وہ ایک طرف سے اس قسم کی سزا کی مستحق تھی تو دوسری طرف اس طویل بیماری میں اس کی وفاداری، خدمت اور تیمارداری اس قسم کے عفو و درگذر کا استحقاق بھی رکھتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم کی شاخوں کے ایک دستہ یا خوشہ خرما کی لکڑیوں سے مارنا ان کی قسم کا واقعی مصداق نہیں تھا لیکن خدا کے نام کے احترام کی حفاظت اور قانون شکنی پھیلنے سے روکنے کے لئے انھوں نے یہ کام کیا اور یہ بات صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی مستحق عفو و درگذر ہو، اور انسان چاہے کہ عفو و درگذر کے باجود قانون کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھے ورنہ ایسے مواقع پر جہاں استحقاق عفو و بخشش نہ ہو وہاں ہرگز اس کام کی اجازت نہیں ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کے آخری جملے میں جو اس داستان کی ابتداء و انتہا کا نچوڑ ہے، فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے صابر و شکیبا پایا، ایوب کتنا اچھا بندہ تھا جو ہماری طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا تھا''۔ [1]

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا اور شیطان کو وسوسوں اور درد، تکلیف اور بیماری کے دور ہونے کا تقاضا کرنا، مقام صبر و شکیبائی کے منافی نہیں اور وہ بھی سات سال اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ سال تک بیماری اور فقر و ناداری کے ساتھ نبھانے اور شاکر رہنے کے بعد۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوب علیہ السلام کی تین اہم صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے کہ جو جس کسی میں بھی پائی جائیں وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے۔

1۔ مقام عبودیت　　　2۔ صبر و استقامت

3۔ پے در پے خدا کی طرف بازگشت۔

حضرت ایوب علیہ السلام قرآن اور توریت میں

اس عظیم پیغمبر کا پاک چہرہ، جو صبر و شکیبائی کا مظہر ہے، یہاں تک کہ صبر ایوب علیہ السلام سب کے لئے ضرب المثل ہو گیا ہے، قرآن مجید میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے کس طرح سے اس داستان کی ابتدا اور انتہا میں ان کی تعریف کی ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت بھی جاہلوں یا دانا دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی اور ایسے ایسے خرافات ان پر باندھے گئے جن سے ان کی مقدس و پاک شخصیت منزہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیماری کے وقت حضرت ایوب علیہ السلام کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور ان میں بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ بستی والوں نے انہیں آبادی سے باہر نکال دیا۔

بلا شک و شبہ اس قسم کی روایت جعلی اور من گھڑت ہے، چاہے وہ حدیث کی کتابوں کے اندر ہی کیوں نہ ذکر ہوئی ہوں، کیونکہ پیغمبروں کی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر وقت اور ہر زمانے میں میل و رغبت کے ساتھ ان سے مل سکیں اور جو بات لوگوں کے تنفر و بےزاری اور افراد کے ان سے دور رہنے کا موجب بنے، چاہے وہ تنفر بیماریاں ہوں یا عیوب جسمانی یا اخلاقی خشونت و سختی، ان میں نہیں ہوں گی، کیونکہ یہ چیزیں ان کے فلسفہ رسالت سے تضاد رکھتی ہیں۔

لیکن توریت میں ایک مفصل قصہ ''ایوب'' کے بارے میں نظر آتا ہے جو ''مزامیر داود'' سے پہلے موجود ہے، یہ کتاب

---

[1] سورہ ص آیت 44

42 فصل پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں تفصیلی بحث موجود ہے،بعض فصول میں تو انتہائی تکلیف دہ مطالب نظر آتے ہیں،ان میں سے تیسری فصل میں ہے کہ: ایوب علیہ السلام نے شکایت کے لئے زبان کھولی اور بہت زیادہ شکوہ کیا، جب کہ قرآن نے ان کی صبر وشکیبائی کی تعریف کی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام

''یونس''،''متی'' کے فرزند ہیں ''ذوالنون'' (مچھلی والا) آپ کا لقب ہے اور یہ لقب اس بنا پر ہے کہ چونکہ ان کی سر گذشت، جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ایک مچھلی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، آپ ان مشہور پیغمبروں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد اس دنیا میں آئے۔

بعض نے انہیں حضرت ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے قرار دیا ہے اور ان کی ماموریت قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگوں کی ہدایت قرار دیا ہے۔

ان کے ظہور کا مقام عراق کا ایک علاقہ ہے جس کا نام نینوا تھا۔

بعض نے ان کا ظہور 825 قبل مسیح لکھا ہے اور اب بھی کوفہ کے نزدیک شط فرات کے کنارے ''یونس'' کے نام کی معروف قبر موجود ہے۔

بعض کتابوں نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔[1]

یونس علیہ السلام امتحان کی بھٹی میں

یونس علیہ السلام نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی دعوت کی ابتداء توحید اور بت پرستی کے خلاف قیام سے شروع کی۔ اس کے بعد ان برائیوں کے خلاف نبرد آزمائی کی جو اس ماحول میں رائج تھے۔

لیکن وہ متعصب قوم، جو آنکھیں اور کان بند کرکے، اپنے بوڑھوں کی تقلید کررہی تھی۔ ان کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جو قرآن کے بیان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی روایت کے مطابق تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دینے کے لئے قیام کیا اور اس سلسلے میں اپنے فریضے اور ذمہ داری کو انجام دیا اور جب انکی قوم نے ان کی دعوت کو رد کردیا تو انھوں نے انہیں نفرین کی اور بد دعا دی پھر ان کے درمیان سے چلے گئے اور کشتی اور مچھلی کا واقعہ انہیں پیش آیا لیکن توریت کی عبارت بہت ناموزوں سی ہے اور تصریح کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ انجام ذمہ داری سے پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ استعفی دے دیں۔ لہٰذا وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور کشتی اور مچھلی والا واقعہ پیش آیا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ''توریت'' کہتی ہے: جب خدا نے اس قوم سے ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب

---

[1] کتاب ''یوناہ'' میں جو عہد عتیق (توریت) کی کتابوں میں سے ہے۔ ''یونس'' کے بارے میں تفصیلی ذکر ''یوناہ بن متی'' کے نام سے کیا گیا ہے۔
اس کے مطابق وہ اس کے لئے مامور ہوئے تھے کہ عظیم شہر نینوا جائیں اور لوگوں کی شرارت کے خلاف قیام کریں،

اٹھالیا، تو یونس کو بہت دکھ ہوااور وہ بھڑک اٹھے۔

توریت کی فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ یونس علیہ السلام کو دومرتبہ مامور کیا گیا پہلی ماموریت کے موقع پر انکار کردیا اور اس دردناک انجام میں مبتلا ہوئے۔ دوبارہ انہیں مامور کیا گیا کہ اسی شہر ''نینوا'' کی طرف جائیں کہ نینوا کے لوگ بیدار ہو چکے ہیں اور خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کرلی ہے۔ اور وہ عفو الٰہی ان کے شامل حال ہو گیا ہے۔ لیکن عفو و بخشش یونس علیہ السلام کو اچھی نہیں لگی۔

قرآن اور اسلامی روایات کے بیانات کا موجودہ توریت کے بیانات سے موازنہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ''توریت'' میں کتنی تحریف ہوگئی ہے کہ اس نے اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کے مقام کو اس قدر گرادیا ہے کبھی ان کی طرف ماموریت اور ذمہ داری قبول نہ کرنے کی نسبت دیتی ہے اور کبھی ایک توبہ کرنے والی قوم پر پروردگار کے عفو و رحمت کو دیکھ کر خشم ناک ہونے کی نسبت دیتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ موجودہ توریت کسی لحاظ سے بھی قابل اعتماد کتاب نہیں ہے بہرحال وہ ایک عظیم پیغمبر ہیں جن کو قرآن نے عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام اسی طرح ایک مہربان باپ کے مانند دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس گمراہ قوم کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، لیکن اس حکیمانہ منطق کے مقابلے میں دشمنوں کے پاس مغالطہ اور ڈھٹائی کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

صرف ایک چھوٹا سا گروہ جو شاید دو افراد (ایک عابد اور ایک عالم) پر مشتمل تھا ان پر ایمان لایا۔

حضرت یونس علیہ السلام نے اس قدر تبلیغ کی کہ ان سے تقریباً مایوس ہو گئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ عابد کے کہنے پر (گمراہ قوم کی کیفیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے) آپؑ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان کے خلاف بددعا کریں۔

یہ پروگرام پورا ہو گیا اور حضرت یونس علیہ السلام نے ان پر نفرین کی اور انہیں بددعا دی۔ جو آپؑ پر وحی آئی کہ فلاں وقت عذاب الٰہی نازل ہوگا۔ جب عذاب کے وعدے کا وقت قریب آیا تو حضرت یونس علیہ السلام اس عابد کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے باہر چلے گئے۔ ایسی حالت میں کہ آپؑ نہایت غصے میں تھے یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے وہاں لوگوں اور وزن سے بھری ایک کشتی دیکھی۔ آپؑ نے ان سے خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں۔

یونس علیہ السلام فراری بندہ

اسی واقعے کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اس وقت کو یاد کرو جب اس نے وزن اور لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا''۔ [1]

قرآن میں ''ابق'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ''ابق'' کے مادہ سے غلام کے اپنے آقا و مولا کے پاس سے بھاگ جانے کے معنی میں ہے اس مقام پر یہ ایک عجیب و غریب تعبیر ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت ہی چھوٹا سا ترک اولیٰ کہ جو عالی مقام پیغمبروں سے سرزد ہوجائے، خدا کی طرف سے کس قدر سخت گیری اور عتاب کا باعث بنتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے پیغمبر کو بھاگ جانے والے غلام کا نام دیتا ہے۔

بلاشک و شبہ یونس علیہ السلام معصوم پیغمبر تھے اور وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام

---

[1] سورہ صافات آیت 140

لیتے اورنزول عذاب سے قبل کے آخری لمحات تک اپنی قوم کے ساتھ رہتے کہ شاید وہ بیدار ہو جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق آپؑ نے چالیس سال تک تبلیغ کی تھی، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ چند روز یا چند گھنٹے اور ٹھہر جاتے۔ آپؑ نے چونکہ ایسا نہیں کیا لہٰذا آپؑ کو بھاگ جانے والے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔

قرعہ تین بار جناب یونس علیہ السلام کے نام

بہر حال یونس علیہ السلام کشتی پر سوار ہو گئے۔ روایات کے مطابق ایک بہت بڑی مچھلی نے کشتی کی راہ روک لی اور منہ کھول دیا گویا وہ کچھ کھانے کو مانگ رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گنہگار ہمارے درمیان ہے (کہ جسے اس مچھلی کا لقمہ بننا چاہئے اور قرعہ اندازی سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔) اس موقع پر انھوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکل آیا۔

ایک روایت کے مطابق انھوں نے تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔ ناچار انھوں نے یونس علیہ السلام کو پکڑ کر اس بہت بڑی مچھلی کے منہ میں پھینک دیا۔

یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ دریا میں طوفان آ گیا تھا اور کشتی پر وزن بہت زیادہ تھا کشتی میں بیٹھنے والوں کو ہر لمحے غرق ہونے کا خطرہ ہونے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو دریا میں پھینک دیا جائے اور قرعہ یونس علیہ السلام کے نام نکل آیا۔ انھوں نے آپؑ کو دریا میں پھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت ایک مگرمچھ وہاں آن پہنچا اور اس نے آپؑ کو نگل لیا۔

لیکن وہ خدا جو آگ کو پانی کے اندر اور شیشے کو پتھر کی آغوش میں محفوظ رکھتا ہے، اس نے اس عظیم جانور کو حکم تکوینی دیا کہ اس کے بندے یونس علیہ السلام کو معمولی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے، حضرت یونس علیہ السلام کو ایک بے نظیر اور عجیب قید میں رہنا تھا، تاکہ وہ اپنے ترک اولیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلافی کریں۔ ایک روایت میں اس طرح آیا ہے: "خدا نے اس مچھلی کی طرف وحی کی کہ اس کی کوئی ہڈی نہ توڑنا اور اس کے کسی جوڑ کو نہ کاٹنا"۔

جناب یونس علیہ السلام نے استغفار کیا

یونس علیہ السلام بہت جلد ہی اصل قضیے کی طرف متوجہ ہو گئے، آپ نے پوری توجہ کے ساتھ بارگاہ خداوندی کی طرف رخ کیا اور اپنے ترک اولیٰ پر استغفار کی اور اس کی مقدس اور معروف بارگاہ سے عفو کا تقاضا کیا۔ [1]

میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور تیری بارگاہ سے دور ہو گیا ہوں اور تیرے عتاب و سرزنش میں، جو میرے لئے جہنم سوزان کے مانند ہے، گرفتار ہو گیا ہوں۔

یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ تعبیر دریا اور پانی کی گہرائیوں کی تاریکی اور اس بہت بڑی مچھلی کے پیٹ کی تاریکی اور رات کی تاریکی کی طرف اشارہ ہو، اور ایک روایت کہ جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

اس مخلصانہ اعتراف اور ندامت سے ملی ہوئی تسبیح نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے: اس نے تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پاک و منزہ ہے میں ہی ظالموں میں سے تھا۔ "ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور

[1] اس مقام پر ایک نہایت پر معانی اور معروف ذکر حضرت یونس علیہ السلام کی زبانی نقل ہوا ہے جو سورہ انبیاء کی آیہ 87 میں آیا ہے اور اہل عرفان کے درمیان ذکر "یونسیہ" کے نام سے مشہور ہے: "فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾"

اسے غم واندوہ سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح سے نجات دیا کرتے ہیں''۔[1]

اب دیکھیں قرآن اس سلسلے میں کیا کہتا ہے، ارشاد پروردگار ہوا: ''اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا، تو یقیناً وہ قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا''۔[2]

اور یہ وقتی قید خانہ دائمی زنداں میں بدل جاتا اور وہ دائمی زنداں اس کے لئے قبرستان میں بدل جاتا۔ وہ بہت بڑی مچھلی خشک و بے گیاہ ساحل کے نزدیک آئی اور حکم خدا سے اس لقمے کو جو اس سے زائد تھا باہر پھینک دیا۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عجیب و غریب زندان نے یونس علیہ السلام کے جسم کی سلامتی کو درہم و برہم کر دیا تھا، لہٰذا وہ بیمار و ناتواں اس زنداں سے آزاد ہوئے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کتنی مدت تک مچھلی کے پیٹ میں رہے، لیکن یقینی طور پر جتنا عرصہ بھی رہے اس کے عوارض سے بچ نہیں سکتے تھے، یہ ٹھیک ہے کہ فرمان الٰہی صادر ہوا تھا کہ مچھلی کے بدن میں ہضم اور جذب نہ ہوں، لیکن یہ اس معنی میں نہیں تھا کہ اس زندان کے کچھ آثار بھی وہ اپنے ساتھ نہ لائیں لہٰذا مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ ایک نو مولود، ضعیف و ناتوان اور بے پر و بال، پرندے کے بچے کی طرح مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے، اس طرح سے کہ ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

جناب یونس علیہ السلام کدو کی بیل کے سایہ میں

پھر لطف الٰہی ان کے شامل حال ہوا، کیونکہ ان کا بدن بیمار اور خستہ حال اور ان کا جسم کمزور و ناتواں تھا، ساحل کی دھوپ انہیں تکلیف پہنچاتی تھی، لہٰذا ان کے لئے ایک نرم و گداز اور لطیف قسم کے لباس کی ضرورت تھی تا کہ ان کے بدن کو اس کے نیچے آرام حاصل ہو، اس مقام پر قرآن کہتا ہے: ہم نے ایک کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی''(1) تا کہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے نیچے ارام کرے۔

کہتے ہیں کہ کدو کی بیل میں اس کے علاوہ کہ اس کے پتے چوڑے اور پانی سے پر ہوتے ہیں اور اس سے اچھا سائبان بنایا جاسکتا ہے، مکھی بھی اس کے پتوں پر نہیں بیٹھتی۔

اور یونس علیہ السلام کے بدن کی جلد مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اس قدر نازک اور حساس ہوگئی تھی کہ اس پر حشرات کے بیٹھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی،

انھوں نے اپنے بدن کو اس کدو کی بیل کے ساتھ چھپا لیا تا کہ سورج کی تپش سے بھی مامون رہیں اور حشرات الارض سے بھی۔

شاید خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ سبق جو حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں دیا تھا اس کی اس مرحلہ میں تکمیل کرے، وہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت کو اپنے بدن کی نازک جلد پر محسوس کریں،

تا کہ آئندہ رہبر ہوتے ہوئے اپنی امت کو جہنم کی جلانے والی آگ سے نجات کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

---

[1] سورہ انبیاء آیت 88

[2] سورہ صافات آیت 143-144

قوم یونس علیہ السلام کا انجام

اب ہم حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھوڑتے ہیں اور ان کی قوم کا حال بیان کرتے ہیں۔

جب حضرت یونس علیہ السلام نے غیض وغضب کی حالت میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور خدا کے غضب کے آثار بھی اس پر ظاہر ہو گئے۔تو وہ لوگ شدت کے ساتھ لرزا ٹھے،

اب انہیں ہوش آیا،ایک عالم کہ جوان کے درمیان رہتا تھا وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی رہبری اور ہدایت سے توبہ پر آمادہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ سب مل کر بیابان کی طرف چل پڑے اور عورتوں اور بچوں نیز جانوروں اور ان کے بچوں کے درمیان جدائی ڈال دی، پھر گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے اور نالہ وفریاد کی صدا بلند کی،اور خلوص کے ساتھ اپنے گناہوں اور ان کوتاہیوں پر توبہ کی کہ جو انھوں نے خدا کے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ روا رکھی تھیں۔

اس موقع پر عذاب کے پردے ہٹ گئے اور وہ حادثہ پہاڑوں پر جا گرا،اور توبہ کرنے والے اہل ایمان نے لطف الٰہی کے باعث نجات پائی۔

حضرت یونس علیہ السلام اس ماجرے کے بعد اپنی قوم کے پاس آئے تا کہ دیکھیں کہ عذاب سے ان پر کیا گزری۔

جب وہ آئے تو بہت متعجب ہوئے کہ گویا دنیا بدل گئی،وہ ان کی ہجرت کے وقت سب کے سب بت پرست تھے لیکن اب وہ سب کے سب خدا پرست مؤحد بن گئے ہیں۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی طرف بھیجا۔[1]

وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انہیں معین مدت تک دنیاوی نعمتوں اور زندگی سے بہرہ مند کیا۔[2]

البتہ ان کا اجمالی ایمان اور توبہ تو پہلے ہو چکی تھی لیکن خدا اور اس کے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی تعلیمات واحکام پر تفصیلی ایمان اس وقت صورت پذیر ہوا جب جناب یونس علیہ السلام ان کے درمیان پلٹ کر آئے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات قرانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماموریت نئے سرے سے اسی قوم کی طرف ہوئی تھی اور یہ جو بعض نے ان کی جدید ماموریت کو ایک نئی قوم کے لئے سمجھا ہے وہ ظاہر قرآن کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟

بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ چند گھنٹے یا چند دن یا چند ہفتے ؟ بعض روایات میں نو گھنٹے،بعض میں تین دن اور بعض میں اس سے زیادہ، یہاں تک کہ چالیس دن تک کی مدت بیان کی گئی ہے،لیکن ان اقوال کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے،صرف تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں توقف 9 گھنٹے بیان ہوا ہے۔بعض مفسرین اہل سنت نے اس کی مدت ایک گھنٹہ بھی بیان کی ہے۔

---

[1] سورہ صافات آیت 147

[2] سورہ صافات آیت 148

لیکن جو کچھ بھی ہو بلا شک وشبہ یہ توقف ایک غیر معمولی امر ہے انسان ایسے ماحول میں جہاں ہوا نہ ہو چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا، اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں کے پیٹ میں کئی ماہ تک زندہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے تنفس کی مشینری نے اپنا کام کرنا شروع نہیں کیا ہوتا ہے اور وہ ضروری آکسیجن صرف ماں کے خون کے راستے سے حاصل کرتا ہے۔

اس بنا پر حضرت یونس علیہ السلام کا ماجرا بلا شبہ ایک اعجاز ہے اور یہ پہلا اعجاز نہیں ہے جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے، وہی خدا جس نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے درمیان سالم رکھا، اور موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کو دریا کے وسط میں خشک راستے بنا کر غرق ہونے سے بچایا، اور نوح علیہ السلام کو ایک سادہ اور عام کشتی کے ذریعے اس عظیم اور وسیع طوفان سے نجات بخشی اور صحیح وسالم زمین پر اتارا، وہی خدا یہ قدررت بھی رکھتا ہے کہ اپنے مخصوص بندوں میں سے ایک بندے کو بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں صحیح وسالم رکھے۔

البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اس قسم کی بڑی مچھلیوں کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس وقت بھی بڑی مچھلیاں ''وہیل'' نام کی موجود ہیں، جس کی لمبائی 20 میٹر سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس زمین کا سب سے بڑا جانور ہے اور اس کا جگر ایک ٹن تک ہوتا ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور قرآنی آیات نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ''الیاس خدا کے رسولوں میں سے تھے''۔[1]

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو سورہ صافات میں اور دوسرا سورہ انعام میں چند انبیاء کے ساتھ۔

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انہی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

الف:۔ بعض کہتے ہیں کہ ''الیاس''، ''ادریس'' کا دوسرا نام ہے (کیونکہ ادریس کا دوسرا نام ''ادراس'' بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصری تبدیلی کے ساتھ الیاس ہو گیا)۔

ب:۔ بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں ''یاسین'' کے فرزند ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج:۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جب کہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاؤں پر مامور ہیں، بعض دوسرے الیاس کی ماموریت بیابانوں میں اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لئے عمر جاودانی کے قائل ہیں، بعض الیاس کو ''الیسع'' کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د:۔ بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی ''ایلیا'' پیغمبر ہیں جو ''اجاب'' بادشاہ بنی اسرائیل کے ہم عصر تھے جنھیں لوگوں نے ''مسیح'' بھی جانا ہے جو مسیح کے تعمید دہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن میں

[1] سورہ صافات آیت 123

جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک بت پرست قوم کی ہدایت کے لئے مامور ہوئے تھے اور اس قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مومنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام ''بعل'' تھا یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ پیغمبر سرزمین ''شامات'' میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر ''بعلبک'' تھا جو اس وقت لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہرحال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابل اعتماد و اطمینان نہیں لہٰذا ہم نے انہیں نقل نہیں کیا۔

پیغمبر خدا مشرکین کے مقابلے میں

قرآن میں جناب الیاس علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے قوم کو خبردار کیا اور کہا: ''کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے''؟[1]

آگے چل کر قرآن میں اس مسئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے: ''کیا تم'' بعل ''بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو''۔[2]

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بت تھا، جس کا نام ''بعل'' تھا۔

اور وہ اس کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے حضرت الیاس علیہ السلام نے انہیں اس قبیح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگار عالم اور توحید خالص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی فعالیت کا مرکز ''شامات'' کے شہروں میں سے شہر ''بعلبک'' تھا۔

کیونکہ ''بعل'' اس مخصوص بت کا نام تھا اور ''بک'' کا معنی ہے شہر۔

ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے ''بعلبک'' ہوگیا، کہتے ہیں کہ سونے کا اتنا بڑا بت تھا کہ اس کا طول بیس ہاتھ تھا، اس کے چار چہرے تھے اور اس بت کے چار سو سے زیادہ خادم تھے

البتہ بعض کسی معین بت کو ''بعل'' نہیں سمجھتے بلکہ بت کے مطلق معنی میں لیتے ہیں مگر بعض دوسرے اسے ''رب اور معبود'' کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

بہرحال الیاس علیہ السلام نے اس بت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: ''اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمہارا اور تمہارے گزشتہ آباواجداد کا پروردگار ہے۔''[3]

تم سب کا مالک و مربی وہی تھا اور ہے، اور جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دست قدرت سے ہوتا ہے،

اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

---

[1] سورہ صافات آیت 124

[2] صافات آیت 125

[3] سورہ صافات 126

قوم الیاس علیہ السلام کا ردعمل

لیکن اس سرپھری اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پندو نصائح اور واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور ''اس کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے''۔[1]

خدا نے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا''وہ بارگاہ عدل الٰہی اور اس کی دوزخ کے عذاب میں حاضر کئے جائیں گے۔''[2] اور اپنے قبیح اور بداعمال کی سزا کا مزا چکھیں گے۔لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا لہٰذا ان کا حق فراموش نہ کرتے ہوئے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے:''مگر خدا کے مخلص بندے۔''[3]

قرآن اس واقعہ کے آخر میں فرماتا ہے:''ہم نے الیاس کا نیک نام بعد والی امتوں میں جاوداں کردیا۔''[4] دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے:''الیاسین پر سلام ودرود ہو۔''[5]

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے:''ہم نیکوں کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔''[6]

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیادی یعنی ایمان کا ذکر ہے:''یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مومن بندوں میں سے ہے''[7]

''ایمان''و''عبودیت''احسان کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار ہونے کا سبب ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام

''الیسع''جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔[8]

قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔''ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری وفضیلت بخشی۔''[9]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر''یوشع بن نون'' ہیں جن پر''الف ولام''داخل ہوا ہے اور اس کا

---

[1] سورہ صافات 127

[2] سورہ صافات 127

[3] سورہ صافات 128

[4] سورہ صافات 129

[5] سورہ صافات 130

''الیاس'' کی جگہ''الیاسین'' آنا اس وجہ سے ہے کہ الیاسین بھی الیاس کے ہم معنی ہیں یا الیاس اور ان کے پیروکاروں کے لئے آیا ہے۔

[6] سورہ صافات 131

[7] سورہ صافات 132

[8] سورہ ص آیت 48

[9] سورہ انعام آیت 86

''شین''، ''سین'' سے بدل گیا ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر یہ عبری نام ہے، الف و لام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب ''اسکندر'' کو ''الاسکندر'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے اسے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو "یسع" (مادہ ''وسعت''، فعل مضارع) سے لیا گیا ہے اور اسمی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف والام جو مشخصات اسم میں سے ہے اس پر آ گیا ہے۔

سورہ انعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟ توریت کی کتاب ''بادشاہان'' میں ان کا نام ''الیشع'' بن ''شافات'' لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الیشع کا معنی ''ناجی'' اور ''شافات'' کا معنی ''قاضی'' ہے۔

بعض اسے اور ''خضر علیہ السلام'' کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض اسے ''ذالکفل'' ہی سمجھتے ہیں تو یہ قرآن کے صریح برخلاف ہے کیونکہ قرآن نے ذالکفل کا ''الیسع'' پر عطف کیا ہے۔ بہر حال وہ ایک بلند مقام اور پر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے یہی کافی ہے۔

حضرت ذَالکفل علیہ السلام

مشہور یہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورہ انبیاء کی آیت 85 میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے بعد ذکر اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انہیں ایوب علیہ السلام کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام ''بشر'' یا ''شرف'' تھا، بعض انہیں ''حزقیل'' سمجھتے ہیں کہ ذالکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہو گیا ہے۔

انہیں ذالکفل کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ''کفل'' نصیب اور حصہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت وعہدہ داری کے معنی میں بھی علماء نے مختلف احتمال ذکر کئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ راتوں کو عبادت کے لئے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور قضاوت اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے لہٰذا انہیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بادشاہ سے ان کی جان بچائی تھی اس لئے انہیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہر حال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور کل کے لئے ایک سبق ہے۔ اگر چہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زمانے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت عزیر علیہ السلام

یہ گفتگو ایک نبی کی ہے جو اثنا سفر ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشت ناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہو چکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آ رہی

تھیں، جب اس نے یہ وحشت ناک منظر دیکھا تو کہنے لگا: ''خدا ان مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا''۔ البتہ اس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے تعجب تھی کیونکہ قرآن میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے، جیسا کہ خدا نے اس سے گفتگو کی، روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خداوند عالم نے اسی وقت اس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال بعد اسے زندہ کیا، اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو؟ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے، فوراً جواب عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو۔

لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، کیسے طویل مدت میں حکم خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تمہاری جلد خراب ہونے والی غذا کو صحیح و سالم رکھ سکتا ہے اس کے لئے مردوں کو زندہ کرنا آسان ہے کیونکہ یہاں یک سرح سے زندگی کا ادامہ ہے، اور غذا کو صحیح و سالم رکھنا جس کی عمر کم ہوتی ہے مردوں کو زندہ کرنے سے آسان ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پیغمبر کے ساتھ کونسی غذا تھی۔ قرآن نے نہیں بیان کیا، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ان کی غذا ''انجیر'' اور پھلوں کا رس تھا، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں، لہٰذا ان دونوں کا باقی رہنا ایک اہم موضوع ہے۔

اس کے بعد دوبارہ حکم ہوا کہ اب اس دلیل کے لئے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں، اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔

اب دیکھو کہ ہم اس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں، اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آ گیا ہے۔ اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے، مختلف احتمالات دیئے گئے ہیں، بعض نے ''ارمیا'' کہا ہے اور بعض ''خضر'' سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ ''عزیر'' تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر علیہ السلام کے نام کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی، بعض اسے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو ''بخت النصر'' کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا، لیکن یہ احتمال بعید نظر آیا ہے''۔[1]

حضرت عزیر علیہ السلام نے دین یہود کی بہت خدمت کی

عربی زبان میں ''عزیر'' انہی کو کہا جاتا ہے جو یہودیوں کی لغت میں ''عزرا'' کہلاتے ہیں، عرب چونکہ جب غیر زبان کا کوئی نام اپناتے ہیں تو عام طور پر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں خصوصاً اظہار محبت کے لئے اسے صیغہ تصغیر میں بدل لیتے ہیں۔ ''عزرا'' کو بھی ''عزیر'' میں تبدیل کیا گیا ہے جیسا کہ ''عیسیٰ'' کے اصل نام کو جو دراصل ''یسوع'' تھا اور ''یحیٰ'' کو جو کہ ''یوحنا'' تھا بدل دیا۔

بہرحال عزیر یا عزرا یہودیوں کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض ملت وقوم کی بنیاد اور اس جمعیت کی تاریخ کی درخشندگی کی نسبت ان کی طرف دیتے ہیں۔ درحقیقت حضرت عزیر علیہ السلام نے اس دین کی بڑی خدمت کی ہے

---

[1] یہ واقعہ سورہ بقرہ کی آیت 259 کی ذیل میں بیان ہوا ہے۔

کیونکہ ''بخت النصر'' بادشاہ ''بابل'' نے یہود کو نیست و نابود کر دیا تھا اور ان کے شہر اس کی فوج کے ہاتھ آ گئے، ان کا عبادت خانہ ویران ہو گیا اور ان کی کتاب توریت جلا دی گئی، ان کے مرد قتل کر دیئے گئے اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر کے بابل کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور وہ تقریباً ایک سو سال وہیں رہے۔

پھر جب ایران کے بادشاہ ''کورش'' نے بابل فتح کیا تو عزرا جو اس وقت کے یہودیوں کے ایک سردار اور بزرگ تھے اس کے پاس آئے اور اس سے ان کے بارے میں سفارش کی، ''کورش'' نے ان سے موافقت کی کہ یہودی اپنے شہروں کی طرف پلٹ جائیں اور نئے سرے سے توریت لکھی جائے، اسی لئے یہودی انہیں ایک نجات دہندہ اور اپنے دین کا زندہ کرنے والا سمجھتے ہیں، اسی بناء پر ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔

اسی امر کے سبب یہودیوں کے ایک گروہ نے انہیں ''ابن اللہ'' (اللہ کا بیٹا) کا لقب دیا، اگر چہ بعض روایات سے مثلاً احتجاج طبرسی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ لقب حضرت عزیر علیہ السلام کے احترام کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اسی روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اگر تم حضرت عزیر علیہ السلام کا ان عظیم خدمات کی وجہ سے احترام کرتے ہو اور اس بناء پر انہیں اس نام سے پکارتے ہو تو پھر یہ لقب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیوں نہیں دیتے جب کہ انھوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کی نسبت تمہاری بہت زیادہ خدمت کی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی جواب تھا۔

بہر حال اس نام سے بعض لوگوں کے اذہان میں احترام سے بالاتر صورت ہو گئی اور جیسا کہ عوام کی روش ہے کہ اس سے اپنی فطرت کے مطابق حقیقی مفہوم لیتے تھے اور انھیں واقعا خدا کا بیٹا خیال کرتے تھے کیونکہ ایک تو حضرت عزیر علیہ السلام نے انہیں در بدر کی زندگی سے نجات دی تھی اور دوسرا توریت لکھ کر ان کے دین کو ایک نئی زندگی بخشی تھی، البتہ ان کا یہ عقیدہ نہ تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ خصوصیت سے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا کہ یہی نظر فکر تھی یہی وجہ ہے کہ کسی تاریخ میں یہ نہیں ہے کہ انھوں نے آیت کو سن کر کہ ''یہود کہتے ہیں: عزیر اللہ کا بیٹا ہے'' [1] ان کا کیا ہوا یا انھوں نے کوئی آواز بلند کی ہو، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ کوئی ردّ عمل ظاہر کرتے۔

حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء میں بانجھ تھیں، جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی ان کی بھی مریم سلام اللہ علیہا جیسی پاکیزہ اور پرہیز گار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔

حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطۂ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب ان کی کوئی اولاد ہو۔

لیکن عشق الٰہی اور مریم سلام اللہ علیہا کے محراب عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی امید پیدا ہوئی اور انھوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ کیا ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو

[1] سورہ توبہ آیت 30

جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے انھوں نے خداوند عالم سے فرزند کا تقاضا کیا: ''خداوندا مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے''۔ [1]

ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت

زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی۔

''وہ محراب عبادت میں مناجات کر رہے تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خداوند عالم انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا''۔ [2]

''جوان صفات کا حامل ہوگا؛

1. وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا''۔ [3]

یاد رہے کہ قرآن مجید میں مختلف آیات میں ''کلمہ'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی۔

اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہٰذا جب حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ان کی رغبت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لئے بہت مؤثر ثابت ہوئی

2. علم و عمل سے لحاظ کے معاشرے کی رہبری ان کے ذمہ ہوگی۔

3. علاوہ ازایں وہ اپنے تیئں سرکش ہوا و ہوس اور دنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے۔ [4]

4. ''وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے''۔ [5]

ملائکہ نے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا: کیسے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی:

''خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے لیتا ہے۔'' [6]

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی نشانی

یہاں حضرت زکریا علیہ السلام، یحی علیہ السلام کی ولادت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب و

---

[1] سورہ آل عمران آیت 38
[2] سورہ آل عمران آیت 39
[3] سورہ آل عمران آیت 39
[4] سورہ آل عمران آیت 39
[5] سورہ آل عمران آیت 39
[6] سورہ آل عمران آیت 40

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تعجب اور حیرانی کس بناء پر تھی جب کہ خداوند عالم کی بے پایاں قدرت پر بھی ان کی نظر تھی۔

غرب واقعے پر حضرت زکریا علیہ السلام کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے، خصوصاً جب کہ قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماہانہ عادت بھی چھوڑ چکی تھی اس کے یہاں بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے، اس میں کیا تغیر وتبدل ہوگا کیا پھر سے جوان یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کی طرح سے ماہواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے، حضرت زکریا علیہ السلام دراصل چاہتے تھے کہ ایمان درجہ شہود تک پہنچ جائے، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پرندوں کے واقعے سے ملتی جلتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اس طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبیعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ غور وفکر میں پڑ جاتا ہے اور اسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لئے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔ ''اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے'' کہہ کر بشارت الٰہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے، حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس امر سے ان کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کر لے، وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل اطمینان سے مالا مال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشاہدہ حسی کے ذریعے اطمینان کے حصول کی خواہش کی تھی، وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

خداوند عالم نے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ درخواست بھی قبول فرمالی اور اس کے لئے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبیعی عامل کے بغیر تین دن کے لئے بے کار ہو گئی، وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خداوند عالم کے ذکر اور اس کی تسبیح کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی، یہ عجیب وغریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لئے ایک نشانی تھی، وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایسا باایمان بچہ پیدا کر دے جو ذکر پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے۔

ممکن ہے اس نشانی میں ایک نکتہ بھی پنہاں ہو اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں جناب زکریا علیہ السلام اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہرحال ترک اولیٰ سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لئے خداوند عالم کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرت نمائی تھی اور ترک اولیٰ پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہ بات جالب نظر ہے کہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مثلاً: بچپن میں بعثت نبوت کے لحاظ سے۔

نام کے مفہوم کے اعتبار سے۔

کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام دونوں کا معنی ہے ''زندہ رہتا ہے'' اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پر، موت اور حشر ونشر تین مواقع پر درود و سلام بھیجا ہے۔

یحییٰ علیہ السلام، عشق الٰہی میں سرشار پیغمبر

حضرت یحییٰ علیہ السلام خداوند متعال کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بچپن میں مقام نبوت

پر فائز ہوئے، خداوندمتعال نے انہیں اس سن وسال میں ایسی روشن عقل اوراتنی تابناک فہم وفراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

بہرحال منابع اسلامی اورمنابع مسیحی سے معلوم ہوتا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے۔

منابع مسیحی میں تصریح ہوئی ہے، کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوغسل تعمید دیا اور اسی لئے انہیں ''یحییٰ تعمید دہندہ'' کے نام سے پکارتے ہیں، (غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں۔اوران کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اسے گناہ سے پاک کرتا ہے) اورجب حضرت مسیح علیہ السلام نے اعلان نبوت کیا توحضرت یحییٰ علیہ السلام ان پر ایمان لائے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بعض چیزیں قدر مشترک تھیں، انتہائی زیادہ زہد وتقوی، کچھ اسباب کی بناء پر ترک ازدواج، معجزانہ طور پر پیدا ہونا اوراسی طرح بہت ہی زیادہ قریبی نسب۔ [1]

''یحییٰ''''حیوۃ'' کے مادہ سے ہےاوراس کا معنی ہے''زندہ رہتا ہے''اور یہ اس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا، زندگی سے یہاں مراد مادی اورمعنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصب نبوت اور خدا سے ربط کے زیر سایہ ہو، سورہ مریم کی آیت 7 سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندعالم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لئے انتخاب فرمایا تھا۔

''اے زکریا ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور قبل از ایں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔''

یحییٰ علیہ السلام کی عمدہ صفات

قرآن مجید میں ان دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں یا انھوں نے توفیق الٰہی سے کسب کی تھیں۔

1۔''ہم نے اسے بچپن میں فرمان نبوت اور عقل وہوش ودرایت عطا کی''۔

2۔''ہم نے اپنی طرف سے اپنے بندوں کے لئے رحمت ومحبت بخشی''۔

3۔''ہم نے اسے روح وجان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی''۔

4۔''وہ پرہیز گار تھے''اور جو بات فرمان پروردگار کے مخالف ہوتی تھی اس سے دوری اختیار کرتے تھے۔

5۔''اسے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گفتار، نیکوکار اور محبت کرنے والا پایا''۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کی مانند تھی (حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسین علیہ السلام کا نام بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت شکم مادر میں تھے) معمول کی نسبت بہت کم تھی۔

6۔''وہ خلق خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم ومتکبر نہیں تھا''۔

---

[1] اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں، لہٰذا امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام نے اس طرح نقل ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ہم امام حسین علیہ السلام کے ساتھ (کربلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جس منزل میں نزول اجلال فرماتے یا اس سے کوچ کرتے تو یحییٰ علیہ السلام اوران کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوندتعالی کے نزدیک دنیا کی بے قدری کے لئے یہی کافی ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا سر بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کے پاس ہدیہ کے طور پر لایا گیا۔

7۔ ''وہ معصیت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا''۔

8، 9، 10۔ ''اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہٰذا جس دن وہ پیدا ہوا اس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے قبر سے اٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر ہمارا درود و سلام ہو''۔[1]

بچپن میں نبوت

یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقاء کا دور عام طور پر ایک خاص حد پر ہوتا ہے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانوں میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں، تو اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ خداوند متعال (عقل کے ارتقاء کے) اس دور کو بعض بندوں کے لئے کچھ مصالح کی بناء پر زیادہ مختصر کر دے اور کم اسے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے جیسا کہ بچوں کے لئے بولنا سیکھنے کے لئے عام طور پر دو سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پر معنی تھی اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افرد کے شایان شان تھی۔[2]

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ: ''میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جب کہ آپ کا سن بہت چھوٹا تھا) میں ان کے قد و قامت میں گم ہو گیا تا کہ اسے اپنے ذہن میں بٹھا لوں اور جب میں واپس مصر لوٹ کر جاوں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم و کیف کو بیان کروں، عین اسی وقت جب کہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رخ کیا اور فرمایا: اے علی بن اسباط خداوند متعال نے مسئلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت

نہ صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی، اکثر مسلمان مؤرخین اور اسی طرح مشہور مسیحی منابع ان کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگر چہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے): حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بناء پر شہید ہوئے، ہوا یہ کہ ''ہیرودیس'' فلسطین کا ہوس پرست بادشاہ تھا، وہ اپنے بھائی کی بیٹی ''ہیرودیا'' پر عاشق ہو گیا، وہ بہت خوبصورت تھی، اس کے حسن نے اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی۔ بادشاہ نے اس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

یہ خبر جب خداوند متعال کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پہنچی تو انھوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور توریت کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کروں گا۔ اس مسئلہ کی تمام شہر میں شہرت ہو گئی، اور یہ خبر اس لڑکی ''ہیرودیا'' کے کانوں تک بھی جا پہنچی، وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب موقع پر ان سے انتقام لے گی اور اپنی ہوا و ہوس کی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹا دے گی، اس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ رسم میں اضافہ کر دیا اور اپنے حسن و جمال کو اس کے لئے ایک جال بنا دیا اور اس پر اس طرح سے

---

[1] مذکورہ صفات سورہ مریم کی آیت 12 تا 15 میں بیان ہوئی ہیں۔

[2] یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض ائمہ کے بارے میں کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقام امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

اثر انداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔''ہم نے یحییٰ کو بچپن میں فرمان نبوت وعقل و دانش عطا کی۔ اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے: ''جبکہ انسان، کامل عقل کی حد بلوغ، چالیس سال کو پہنچ گیا۔لہٰذا جس طرح خدا کے لئے یہ ممکن ہے بچپن میں حکمت عطا کرے اس کی قدرت اس کو چالیس سال میں حکمت عطا کرتی ہے''۔ ہیرودیا نے کہا میں یحییٰ کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اس نے مجھے اور تجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے، تمام لوگ ہماری عیب جوئی کر رہے ہیں، اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہیئے۔ ہیرودیس جو اس عورت کا دیوانہ تھا انجام پر غور کئے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا، اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر اس بدکار عورت کو پیش کر دیا، لیکن اخرکار اس کے لئے اس کام کے ہولناک نتائج نکلے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا

''حنہ'' اور ''اشیاع'' دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریا علیہ السلام نے اپنی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا۔

کئی سال گزر گئے۔ حنہ کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو غذا دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ انہوں نے خلوص دل سے بارگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی، تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا یہ مخلصانہ دعا ہدف اجابت کو پہنچی اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا، جو لا علاج مریضوں کو شفا دے گا۔ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لئے پیغمبری کے فرائض بھی انجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریم سلام اللہ علیہا ہیں۔ اسی لئے انہوں نے نذر کی تھی کہ بیٹے کو خانہ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔

قرآن میں زوجہ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے ان کے شوہر عمران کو جو اطلاع دی تھی اس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ ان کے یہاں لڑکا ہوگا۔ ''محرراً'' استعمال کیا ہے اور ''محررۃ'' نہیں کہا، انھوں نے خدا سے درخواست کی وہ ان کی نذر قبول کرے، ''محرر'' ''تحریر'' کے مادے سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ''آزاد کرنا'' اس زمانے میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لئے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لئے معین کئے جائے تاکہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات انجام دیں اور فراغت کے وقت پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں۔ ''محرر'' ان خدمت گزاروں کو اس لئے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے کچھ قابل ہو جاتے، بالغ ہونے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت انجام دیتے تھے اور بعد ازاں خود سے کام کرنے لگتے تھے چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا کام ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

پالنے والے یہ تو لڑکی ہے

جب پیدائش ہوئی تو مادر مریم سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔اب وہ پریشان ہوئیں۔سوچنے لگیں کہ کیا کروں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ قرآن میں بچی کی ولادت کے بعد مادر مریم سلام اللہ علیہا کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔انہوں نے پریشان ہوکر کہا: خداوند میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی ہے اس کے لئے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہوسکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔[1]

لیکن قرآن کہتا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے مریم سلام اللہ علیہا کو حسن قبول سے نوازا اور ان کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی"۔[2]

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانہ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کرلیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لئے قبول کرلیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں ماہواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دور ہونا پڑتا۔ممکن ہے اس نذر کی قبولیت اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کا قبول بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں ان کی والدہ کو الہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو۔

قرآن کہتا ہے: "خدا نے زکریا کو مریم سلام اللہ علیہا کی کفالت کے لئے منتخب کیا تھا کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے، مریم سلام اللہ علیہا کے والد ان کی پیدائش سے پہلے وفات پاچکے تھے"۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا یہ نام ان کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ "مریم سلام اللہ علیہا" ان کی لغت میں "عبادت گزار خاتون" کو کہتے تھے۔

یہ نام حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کرنے کے لئے تھا لہٰذا انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور انہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے۔

مریم سلام اللہ علیہا کی پرورش کے لئے قرعہ کشی

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نوزائیدہ بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر عبادت خانے میں لے آئیں۔وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں: یہ نومولود بچی خانہ خدا کی خدمت کے لئے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں۔

جناب مریم سلام اللہ علیہا چونکہ حضرت عمران علیہ السلام کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لئے بنی اسرائیل کے

---

[1] سورہ آل عمران 26

[2] سورہ آل عمران آیت 37

علماء اور عباد ان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے پر ان کا اتفاق ہو گیا۔ وہ ایک نہر کے کنارے گئے وہاں انہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی لکڑیاں پیش کیں۔ ان میں سے ہر ایک لکڑی یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا۔ جو قلم پانی میں ڈوب جاتی اس کا قرعہ نکلتا صرف جس کی قلم سطح آب پر رہتی اس کے نام قرعہ شمار ہوتا۔ جس قلم پر حضرت زکریا علیہ السلام کا نام تھا پہلے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر ابھر آئی۔

یوں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریا علیہ السلام کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لئے اہل تر تھے کیونکہ ایک تو وہ پیغمبر خدا تھے اور دوسرے ان کی بیوی حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی خالہ تھیں۔

پھر اس واقعے کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کے تعین کے لئے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے۔

''یونہی جب وہ کفالت مریم سلام اللہ علیہا پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے''۔[1]

جناب مریم کے سرپرست حضرت زکریا علیہ السلام

جناب مریم سلام اللہ علیہا حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیزگاری اور معرفت الٰہی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام ان کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں رکھی رہتی تھیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن پوچھنے لگے: ''یہ کھانے کہاں سے لائی ہو؟''۔

مریم سلام اللہ علیہا بولیں: ''یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔[2]

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کے لئے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں قرآن میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ و سنی کتب کی روایات سے جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکورہ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکم پروردگار سے جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا متعال اپنے کسی پرہیزگار بندے کی یوں پذیرائی کرے۔

ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے: ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لائے۔ حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے یہاں ٹھیک سے کھانا بھی میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے ان کے پاس مخصوص غذا دیکھی۔ آپؐ نے پوچھا: ''یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟''

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے عرض کیا:

---

[1] سورہ آل عمران آیت 44

[2] سورہ آل عمران آیت 37

''خدا کے یہاں سے، کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

اس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کی طرح ہے، وہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس آئے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے: یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے یہاں سے آیا ہے''۔

فرشتے جناب مریم سلام اللہ علیہا سے باتیں کرتے ہیں

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ایک بلند فضیلت یہ تھی کہ فرشتے ان سے باتیں کیا کرتے تھے جس سے آپؑ کی عظمت واضح ہوجاتی ہے۔

''فرشتے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگزیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا''۔ [1]

یعنی تقوی، پرہیز گاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہوگئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لئے چن لیا گیا ہے۔

پہلا حصہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی اعلی انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں ''اصطفك'' ان کے اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔

یہ قرآنی گفتگو اس بات پر گواہ ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے زمانے میں عظیم ترین منزلت کی مالک خاتون تھیں۔ [2]

قرآن میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا سے فرشتوں کی گفتگو کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو خدا کی طرف سے برگزیدہ ہونے کی بشارت دینے کے بعد کہا: ''اب پروردگار کے حضور خضوع کرو اور سجدہ و قیام بجالاؤ''۔ [3]

یہ درحقیقت اس عظیم نعمت پر شکرانہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سر آغاز

قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''آسمانی کتاب قرآن میں مریم سلام اللہ علیہا کی بات کرو کہ جس وقت اس نے اپنے گھر والوں سے جدا ہوکر مشرقی حصہ میں

---

[1] سورہ آل عمران آیت 42

[2] یہ امر بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بارے میں منقول ان روایات کی نفی نہیں کرتا جن میں ان کے لئے فرمایا گیا ہے کہ آپؑ تمام جہانوں کی عورتوں سے برتر اور افضل ہیں کیونکہ متعدد روایات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

جناب مریم سلام اللہ علیہا تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھی، لیکن جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اولین و آخرین تمام زمانوں کی عورتوں کی سردار ہیں ''العالمین'' کا لفظ بھی اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن حکیم میں اور دیگر عبارات میں ایسے لوگوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے: ''اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی''۔

واضح ہے یہاں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مومنین کو اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔

[3] سورہ آل عمران آیت 43

قیام کیا''۔[۱]

درحقیقت وہ ایک ایسی خالی اور فارغ جگہ چاہتی تھی جہاں پر کسی قسم کا کوئی شور وغل نہ ہوتا کہ وہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہ سکے، اور کوئی چیز اسے یادِ محبوب سے غافل نہ کرے، اسی مقصد کے لئے اس نے عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کی مشرقی سمت کو جو شاید زیادہ آرام وسکون کی جگہ تھی یا سورج کی روشنی کے لحاظ سے زیادہ پاک وصاف اور زیادہ مناسب تھی، انتخاب کیا۔

اس وقت مریم سلام اللہ علیہا نے ''اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ ڈال لیا''۔[۲]

تا کہ اس کی خلوت گاہ ہر لحاظ سے کامل ہو جائے۔

بہرحال اس وقت ہم نے اپنی ''روح'' (جو بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے) اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں مریم سلام اللہ علیہا کے سامنے ظاہر ہوئی۔[۳]

ظاہر ہے ایسے موقع پر مریم سلام اللہ علیہا کی کیا حالت ہوگی۔ وہ مریم سلام اللہ علیہا کہ جس نے ہمیشہ پاکدامنی کی زندگی گزاری، پاکیزہ افراد کے دامن میں پرورش پائی اور تمام لوگوں کے درمیان عفت وتقویٰ کی ضرب المثل تھی، اس پر اس قسم کے منظر کو دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ ایک خوبصورت اجنبی آدمی اس کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس پر بری وحشت طاری ہوئی۔ فوراً پکاریں کہ ''میں خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھے تجھ سے بچائے۔ اگر تو پرہیزگار ہے''۔[۴]

اور یہ خوف ایسا تھا کہ جس نے مریم سلام اللہ علیہا کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدائے رحمٰن کا نام لینا اور اس کی رحمت عامہ کے ساتھ توصیف کرنا ایک طرف اور اسے تقویٰ اور پرہیزگاری کی تشویق کرنا دوسری طرف، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اگر وہ اجنبی آدمی کوئی برا ارادہ رکھتا ہو تو اس پر کنڑول کرے اور سب سے بڑھ کر خدا کی طرف پناہ لینا، وہ خدا کہ جو انسان کے لئے سخت ترین حالات میں سہارا اور جائے پناہ ہے اور کوئی قدرت اس کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا یہ بات کہنے کے ساتھ اس اجنبی آدمی کے ردّعمل کی منتظر تھیں۔ ایسا انتظار جس میں بہت پریشانی اور وحشت کا رنگ تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی، اس اجنبی نے گفتگو کے لئے زبان کھولی اور اپنی عظیم ذمہ داری اور ماموریت کو اس طرح سے بیان کیا ''اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں''۔[۵]

اس جملہ نے اس پانی کی طرح جو آگ پر چھڑکا جائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاکیزہ دل کو سکون بخشا لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

کیونکہ اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: ''میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا لڑکا بخشوں جو جسم وروح

---

[۱] سورہ مریم آیت16

[۲] سورہ مریم آیت17

[۳] سورہ مریم آیت17

اس میں شک نہیں ہے، کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ جبرائیل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتے جیسی تھی، لیکن حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ خبر نہیں تھی لہٰذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

[۴] سورہ مریم ایت18

[۵] سورہ مریم آیت19

اوراخلاق وعادات کے لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو“۔[1]

یہ بات سنتے ہی مریم سلام اللہ علیہا کانپ اٹھیں وہ پھرایک گہری پریشانی میں ڈوب گئیں اور” کہا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہوحالانکہ کسی انسان نے اب تک مجھے چھوا تک نہیں اور میں ہرگز کوئی بدکارعورت بھی نہیں ہوں“۔[2]

وہ اس حالت میں صرف معمول کے اسباب کے مطابق سوچ رہی تھیں کیونکہ کوئی عورت صاحب اولاد ہو،اس کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں یاتو وہ شادی کرے یا بدکاری اور انحراف کا راستہ اختیار کرے، میں توخود کوکسی بھی دوسرے شخص سے بہترطور پر جانتی ہوں، نہ تو ابھی تک میرا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی میں کبھی منحرف عورت رہی ہوں۔اب تک تو یہ بات ہرگز سننے میں نہیں آئی کہ کوئی عورت ان دونوں صورتوں کے سواصاحب اولاد ہوئی ہو۔

لیکن جلدی ہی اس نئی پریشانی کا طوفان بھی پروردگار عالم کے قاصد کی ایک دوسری بات سننے سے تھم گیا اس نے مریم علیہاالسلام سے صراحت کے ساتھ کہا:”مطلب تو یہی ہے کیونکہ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام میرے لئے سہل اورآسان ہے“۔[3]

تواچھی طرح میری قدرت سے آگاہ ہے،تو نے تو بہشت کے وہ پھل جو دنیا میں اس فصل میں ہوتے ہی نہیں اپنے محراب عبادت کے پاس دیکھے ہیں،تو نے تو فرشتوں کی وہ آوازیں سنی ہیں جو تیری پاکیزگی کی شہادت کے لئے تھیں۔تجھے تو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے جدامجد آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے۔پھر یہ کیسا تعجب ہے کہ جو تجھے اس خبر سے ہورہا ہے۔

اس کے بعداس نے مزید کہا:”ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لئے آیت اورایک معجزہ قرار دیں“۔اورہم چاہتے ہیں کہ اسے اپنے بندوں کے لئے اپنی طرف سے رحمت قرار دیں۔”بہرحال”یہ فیصلہ شدہ امر ہے“[4] اوراس میں گفتگوں کی گنجائش نہیں ہے۔

”روح خدا“ سے کیا مراد ہے؟

تقریباًتمام مشہورمفسرین نے یہاں پرروح کی خداوندمتعال کے بزرگ فرشتے جبرائیل علیہ السلام سے تفسیر کی ہے اوراسے روح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔وہ ایک ایسا وجود ہے جوحیات بخش ہے۔چونکہ وہ انبیاء ومرسلین کے پاس خداوند متعال کی رسالت کا پہنچانے والا ہے لہٰذا تمام لائق انسانوں کے لئے حیات بخش ہے اور یہاں پرروح کی خدا کی طرف اضافت اس روح کی عظمت وشرافت کی دلیل ہے۔کیونکہ اضافت کی ایک قسم اضافت تشریفیہ ہے۔

مریم سلام اللہ علیہا سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں

”سرانجام مریم سلام اللہ علیہا حاملہ ہوگئی[5] اوراس موعود بچے نے اس کے رحم میں جگہ پائی“۔

اس بارے میں کہ یہ بچہ کس طرح وجود میں آیا،کیا جبرائیل علیہ السلام نے مریم سلام اللہ علیہا کے پیراہن میں پھونکا یا ان کے منہ

[1] سورہ مریم آیت19
[2] سورہ مریم آیت20
[3] سورہ مریم آیت21
[4] سورہ مریم آیت21
[5] سورہ مریم آیت22

میں،قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔اگر چہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

بہر حال ''اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دور دراز مقام پر چلی گئی''۔[1]

وہ اس حالت میں ایک امید وبیم کے درمیان پریشانی وخوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی،کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ آخر کار یہ حمل ظاہر ہوجائے گا،مانا کہ چند یا چند مہینے ان لوگوں سے دور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کرلوں گی مگر آخر کار کیا ہوگا،کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی۔سوائے اس کے کہ اس کا دامن آلودہ ہو،میں اس اتہام کے مقابلہ میں کیا کروں گی۔واقعاً وہ لڑکی جو سالہا سال سے پاکیزگی وعفت اور تقویٰ وپرہیزگاری کی علامت تھی۔اور خدا کی عبادت وبندگی میں نمونہ تھی،جس کے بچپنے میں کفالت کرنے پر،بنی اسرائیل کے زاہد وعابد فخر کرتے تھے۔اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیر نظر پرورش پائی تھی،خلاصہ یہ ہے کہ جس کے اخلاق کی دھوم اور پاکیزگی کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی اس کے لئے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اس کا یہ سب معنوی سرمایہ خطرے میں پڑ گیا ہے،اور وہ ایک ایسی تہمت کے گرداب میں پھنس گئی ہے کہ جو بدترین تہمت شمار ہوتی ہے۔اور یہ تیسرا لرزہ تھا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا،وہ خدا کہ جس نے مجھے ایسے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے معجزانہ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتہام کے مقابلہ میں میرا دفاع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف وکرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دست رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریم سلام اللہ علیہا کی مدت حمل کس قدر تھی،مفسرین کے درمیان اختلاف ہے،اگر چہ قرآن میں سربستہ طور پر بیان ہوا ہے(پھر بھی)بعض نے اسے ایک گھنٹہ،بعض نے نو گھنٹے بعض نے چھ ماہ بعض نے سات ماہ بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کہا ہے،لیکن یہ موضوع اس واقعے کے مقصد پر اثر نہیں رکھتا۔روایات بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ ''قصیٰ''(دور دراز)کہاں تھی،بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ شہر ''ناصرہ'' تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھر ہی میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

جو کچھ بھی تھا مدت حمل ختم ہوگئی اور مریم سلام اللہ علیہا کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہوگئے انہیں سخت دردزہ کا آغاز ہوگیا۔ایسا درد جو انہیں آبادی سے بیابان کی طرف لے گیا۔ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی،خشک اور بے آب تھا۔جہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اگر چہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزاء کی پناہ لیتی ہیں تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں،لیکن مریم سلام اللہ علیہا کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی،وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع حمل کو دیکھے،لہٰذا دردزہ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے:''وضع حمل کا وہ درد اسے کھجور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا''۔[2] قرآن میں ''جذع

---

[1] سورہ مریم آیت22

[2] سورہ مریم آیت23

النخلة، کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ''جذع'' درخت کے تنا کے معنی میں ہے، یہ نشاندہی کرتا ہے کہ: اس درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا۔

اے کاش اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی!

اس حالت میں غم واندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریم سلام اللہ علیہا کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا ہے ایسا لحظہ کہ جس میں وہ سب کچھ آشکار ہوجائے گا جو اب تک چھپا ہوا ہے اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تہمت کے تیروں کے بارش شروع ہوجائے گی۔

یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہوکر بولیں: ''اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل بھلادی جاتی'' [۱]

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو صرف آئندہ کی تہمتوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جو ان کے دل کو بے چین کیے ہوئے تھا، بلکہ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدم و مددگار کے بغیر وضع حمل، سنسان بیابان میں بالکل تنہائی، آرام کے لئے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لئے پانی اور کھانے کے لئے غذا کا فقدان اور نومولود کے لئے نگہداشت کے کسی وسیلے کا نہ ہونا یہ ایسے امور تھے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کررکھا تھا۔ اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند متعال کے اتنے لطف وکرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ ''اے کاش میں مرگئی ہوتی اور فراموش ہوچکی ہوتی'' انہوں نے اس وقت میں جناب مریم سلام اللہ علیہا کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہوجائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی بھی خبر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور امید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ ان کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا چمکنے لگا ''یکا یک ایک آواز ان کے کانوں میں آئی جو ان کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہورہی تھی کہ غمگین نہ ہو، ذرا غور سے دیکھ تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کردیا ہے''۔ [۲]

ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہ بار اور کھجور کے درخت میں تبدیل ہوگیا ہے، کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے'' اور اس کھجور کو ہلاؤ تا کہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں۔ اس لذیذ اور قوت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس کے خوشگوار پانی میں سے پیو۔ اور اپنی آنکھوں کو اس نومولود سے روشن رکھو۔ اور اگر آئندہ کے حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو، جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اس سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی''۔ [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپ اپنا دفاع کرو، وہ ذات کہ جس نے یہ مولود تمہیں عطا کیا ہے، اس نے تیرے دفاع کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی ہے اس لئے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم واندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ

---

[۱] سورہ مریم آیت 23

[۲] سورہ مریم آیت 24

[۳] سورہ مریم آیت 25 تا 26

دو۔ان پے در پے واقعات نے جوایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے،ان کے دل کو پوری طرح روشن کر دیا تھااورانہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی گہوارے میں باتیں

''آخر کار حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ داروں کے پاس آئیں''۔[1]

جونہی انھوں نے ایک نومولود بچہ ان کی گود میں دیکھا تعجب کے مارے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ لوگ کہ جو مریم سلام اللہ علیہا کی پاکدامنی سے اچھی طرح واقف تھے اوران کے تقویٰ وکرامت کی شہرت کوسن چکے تھے،سخت پریشان ہوئے، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ تو شک وشبہ میں پڑ گئے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انھوں نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بدکاری کے ساتھ تمہارے روشن ماضی پر بہت افسوس اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا'' کہنے لگے:اے مریمؑ تو نے یقیناً بہت ہی عجیب اور بُرا کام انجام دیا ہے''۔[2]

بعض نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا:''اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی''۔[3]

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں،تونے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے چلن میں کون سی بُرائی دیکھی تھی کہ تو نے اس سے روگردانی کر لی۔[4]

اس وقت جناب مریم سلام اللہ علیہا نے خداوند متعال کے حکم سے خاموشی اختیار کی،صرف ایک کام جو انھوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے نومولود بچے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن اس کام نے ان کے تعجب کواور بھی برانگیختہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کوان کے ساتھ ٹھٹھہ کرنے پر محمول کیا اور وہ غصے میں آ کر بولے:اے مریمؑ ایسا کام کر کے تو اپنی قوم کا مذاق اڑا رہی ہے۔

بہر حال انھوں نے اس سے کہا:''ہم ایسے بچے کے ساتھ جو کہ ابھی گہوارے میں ہے کیسے باتیں کریں''۔[5]

بہر حال وہ لوگ اس کی بات سن کر پریشان ہو گئے، بلکہ شاید غضب ناک ہو گئے،جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس تمسخر اور استہزاء کرنا، جادہ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لئے زیادہ سخت اور سنگین تر ہے۔لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی، کیونکہ اس نومولود بچے نے بات کرنے کے لئے زبان کھولی اور کہا:

---

[1] سورہ مریم آیت27

[2] سورہ مریم آیت27

[3] سورہ مریم آیت28

[4] یہ بات کہ جوانھوں نے مریم سلام اللہ علیہا سے کہی کہ ''اے ہارون کی بہن'' مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے،لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک وصالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔
وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے،مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے

[5] سورہ مریم آیت29

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے، اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے''۔

''اور خدانے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں، میرا وجود بندوں کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے''۔

''اور اس نے مجھے تاحیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے''۔

''اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدردانی کرنے والا اور خیرخواہ قرار دیا ہے''۔

''اور اس نے مجھے جبار وشقی قرار نہیں دیا ہے''۔[1]

آخر میں یہ نومولود کہتا ہے: ''خدا کا مجھ پر سلام و درود ہو اس دن کہ جب میں پیدا ہوا اور اس دن جب میں مروں گا اور اس دن کہ جب میں زندہ کرکے اٹھایا جاوں گا''۔[2]

یہ تین دن انسان کی زندگی میں ----- زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں کہ، جن میں سوائے لطف خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی، اسی لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بارے میں بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوند متعال نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ تقاضا کیا ہے۔[3]

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ کے بغیر بچہ پیدا ہو، کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صرف اکیلی ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ، اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا بہت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

''ڈاکٹر الکسیس کارل''، مشہور فرانسیسی ''فزیالوجسٹ'' اور حیات شناس اپنی کتاب ''انسان موجود ناشناختہ'' میں لکھتا ہے:

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں کہ تولید مثل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں ''لوب'' اور ''باٹایون'' کے تجربوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ قورباغہ کے بارور نہ ہوتے ہوئے چھوٹے سے تخم کو ''سپرماٹوز'' کے دخل کے بغیر ہی خاص ٹکنیک کے ذریعہ ایک جدید قورباغہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کیمسٹری یا فزکس کے ایک عامل کو ''نرسل'' کا جانشین بنادیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل مادہ کا وجود ضروری ہے۔

اس بناء پر وہ چیز کہ جو سائنسی لحاظ سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ ''اوول'' کا وجود ہے، ورنہ نر کے نطفہ (سپرماٹوزا) کی جگہ پر دوسرا عامل کو جانشین بنایا جاسکتا ہے، اسی بناء پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں کے نزدیک قابل قبول قرار پا چکی ہے، اگرچہ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر یہ مسئلہ خداوند متعال کے قوانین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: عیسیٰ کی مثال خدا

---

[1] سورہ مریم آیت 30 تا 32 ''جبار اس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو غیظ و غضب کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو، اور فرمان عقل کی پیروی کرتا ہو۔

[2] سورہ مریم آیت 33

[3] باکرہ سے بچہ پیدا ہونا

کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہوجا تو وہ بھی ایک کامل موجود ہوگیا۔[1]

یعنی یہ خارق العادۃ اس خارق العادۃ سے زیادہ اہم نہیں ہے نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کرسکتا ہے؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کوئی نوزائیدہ بچہ تولد کے ابتدائی گھنٹوں یا دنوں میں بات نہیں کرتا، کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشوونما اور اس کے بعد زبان وحنجرہ کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے مختلف اعضاء کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے، اور ان امور کے لئے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تاکہ یہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بچوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے، صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اسی قسم کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں نہ کہ محال عقلی۔

جناب عیسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا آغاز

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں علم و دانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں، اور زندہ وانسان ساز آئین وقوانین پیش کریں، پھر دوسرے مرحلے میں خدا سے اپنے ارتباط کے لئے واضح اسناد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے منسوب ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لئے ہر پیغمبر اپنے زمانے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے لیس ہوتا ہے تاکہ جہان ماوراء طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح ہوجائے اور ہر زمانے کے علماء ان کے مقابلے میں اپنے عجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقانیت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ہے، ان سے سوال کیا گیا تھا: ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے، اس سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگر بہت زیادہ دتھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آ گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں اور دعوت کے موقع پر اطباء بیماروں کے علاج میں مہارت رکھتے تھے، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بیماروں کو مادی مسائل کے بغیر شفاء دیکر اپنی حقانیت کو ثابت کردیتے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خطبائ، شعراء اور سخنور، بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: ''خدا نے اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دی'' اور اس کے بعد کتاب وحکمت کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: ''توریت وانجیل سکھائی''، اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے، فرمایا: ''ہم نے ان کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا''۔[2]

معجزات عیسیٰ علیہ السلام

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لئے قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی تفصیل کے

---

[1] سورہ آل عمران 59

[2] سورہ آل عمران آیت 49

موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا ہے:
''میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں، میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے''۔[1]

حکم خدا سے ایجاد حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آئے ہیں،

زیادہ سے زیادہ اسے تدریجی تحول وتغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہوجائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط ماوراء الطبیعات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابل علاج نہیں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ''میں مادر زاد اندھے اور ابرص (برص اور سفید داغ والی بیماری) میں مبتلا لوگوں کا علاج کرسکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباس حیات پہنا سکتا ہوں''۔[2]

واضح ہے کہ یہ امور خصوصاً اس زمانے کے اطباء اور علماء کے لئے ناقابل انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ روابط کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتادے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس نے غیبی منبع عالم سے الہام حاصل کیا ہے، جناب مسیح علیہ السلام کہتے ہیں: ''میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں''۔[3]

تفسیر المنار کے مؤلف اور بعض دیگر مفسرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن میں مذکورہ معجزاتی امور جو حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہئے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو فقط دعویٰ کیا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کرسکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دیئے حالانکہ اگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیت (110) میں ہے:

''وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ''۔

''(اے عیسیٰ) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہوجاتا تھا''

لہٰذا مندرجہ بالا دلیل قابل قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری صراحت سے ان کے عملاً کر گزرنے کا ذکر ہے۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت 49

[2] سورہ آل عمران آیت 49

[3] کیا یہ معجزات باعث تعجب ہیں؟

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لئے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مراد انبیاء کے خارق العادۃ افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدھ جگہ پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر کیا کیا کریں گے۔

ان سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانین فطرت وطبیعت پر حاکم جانتے ہیں نہ کہ ان کا محکوم، تو پھر کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہوجائے۔ اگر وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحید افعالی، کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں تو قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جگہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکم خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت و طاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ حکم خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ عین توحید ہے شرک نہیں۔

میں خدا کا بندہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لئے اور اس لئے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپؑ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے: ''اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے'' نیز کہتے: ''میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں''۔[1]

اس کے برخلاف موجودہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کے بارے میں باپ کا لفظ نقل کیا گیا ہے، قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ ''رب'' یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

''ان اللہ ربی و ربکم''۔

اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح علیہ السلام کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عیسائیوں کی گفتگو

نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر وحی نازل ہوئی، وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مدینہ میں آئے۔ اس میں ان کے چند نمائندہ روسا اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کئے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اس کی طرف سے ہدایت مخلوق کی خاطر رسالت کے منصب پر فائز ہوں۔ نیز یہ کہ مسیح علیہ السلام اس کے بندوں میں سے ایک تھے، حالات بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔

انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔

درحقیقت قرآن کا یہ ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ الوہیت کا جواب ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خدا کے بیٹے یا خود خدا تھے، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہوچکی ہے۔ وہ تو

[1] سورہ آل عمران آیت 51

ماں باپ دونوں کے بغیر دنیا میں آئے تھے، اس لئے جیسے حضرت آدم کی مٹی سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور وہ خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے، بلکہ حضرت آدم کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے، پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدم اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

خیالی تثلیث

قرآن میں کفار اور اہل کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔

مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

قرآن پہلے انہیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔''[1]

تثلیث اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:

1۔عیسیٰ علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں:

قرآن حکیم میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے یعنی ''عیسیٰ علیہ السلام صرف مریم کے بیٹے ہیں'' یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی دیگر انسانوں کی طرح رحم مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گزرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوش مادری میں پرورش پائی۔

یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا متمول و محکوم ہو، وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ ''انما'' جو قرآن میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف اور صرف مریم سلام اللہ علیہا کا بیٹا ہے۔

2۔عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں ''رسول اللہ''، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لئے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

3۔عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں جو مریم سلام اللہ علیہا کی طرف القاء ہوا۔ قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا ہے، یہ تعبیر مسیح کے

---

[1] سورہ نساء آیت 171

مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لئے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندورنی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات وصفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقات عالم بھی خدا کی صفات جمال وجلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لئے لفظ ''کلمہ'' استعمال کیا گیا ہے۔[1]

البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں، بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

4۔ عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں:

جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے، یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنی کے لحاظ سے تمام نوع انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیح علیہ السلام اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات، والد کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: ''اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے''۔[2]

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں

اہل یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشن گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے منتظر تھے۔ لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے اور احکام کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر ومنزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔ دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کج روی سے دستبردار نہیں ہوگا، لہٰذا انہوں نے پکار کر کہا: ''کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے؟''۔[3]

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاک باز افراد تھے جنہیں قرآن نے ''حواریین'' کا نام دیا ہے۔

انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پکار کا جواب دیا اور ہر لحاظ کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع

[1] مثلاً سورہ کہف آیت 109، سورہ لقمان آیت 29

[2] سورہ نساء آیت 171

[3] سورہ آل عمران آیت 52

کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے ان سے نقل کیا ہے، کہنے لگے: ''ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں، خدا پر ایمان لائے ہیں اور آپؑ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں''۔[1]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپؑ کے مددگار رہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بو نہ آئے، وہ کہنے لگے: ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپؑ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں۔ گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا دعویٰ کریں گے لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے۔

حواری کون تھے؟

''حوارین'' ''حواری'' کی جمع ہے اس کا مادہ ''حور'' ہے جس کا معنی ہے ''دھونا اور سفید کرنا'' ہے، کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے اسی لئے سفید غذا کو عرب لوگ ''حواری'' کہتے ہیں۔ بہشت کی حوروں کو بھی ان کے سفید رنگ کی وجہ سے ''حور'' کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کو ''حواری'' کیوں کہا گیا، اس کے لئے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیزیں زیادہ قریب عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روح باصفا کے مالک تھے اس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے، لوگوں کے دامن کو آلودگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے۔

عیون الرضا میں امام علی بن موسی علیہما السلام سے منقول ہے: آپؑ سے سوال کیا گیا: حواریوں کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟

آپؑ نے فرمایا: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا مشغلہ کپڑے دھونا تھا، لیکن ہمارے نزدیک اس کی علت یہ ہے کہ انھوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا تھا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے''۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے۔[2]

لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔ انجیل متی اور لوقا کے باب 6 میں حواریوں کے نام اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

1۔ پطرس،	2۔ اندریاس،	3۔ یعقوب،
4۔ یوحنا،	5۔ فیلوپس،	6۔ برتولولما،
7۔ ثوما،	8۔ متی،	9۔ یعقوب بن حلفا،
10۔ شمعون (جن کا لقب غیور تھا)	11۔ یہودا (جو یعقوب کے بھائی تھے)	

---

[1] سورہ آل عمران آیت 52

[2] سورہ صف آیت 14

12۔ یہودائے اسخر یوطی (جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں: حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں بھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب و غذا ان کے لئے مہیا ہوجاتی۔ وہ اسے اپنے لئے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے، تو وہ کہتے: ہاں "وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اپنی کمائی کھاتا ہے"۔ اس کے بعد وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کام سے اجرت لیتے تھے (یوں عملاً انہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ و عار نہیں ہے)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کرلینے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے: "پروردگار جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں"۔[1]

لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لئے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی پیروی کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: "ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیح کی پیروی کی"۔[2]

اور یہ ہمارے ایمان راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا ان کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

قرآن ان نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیکی اصحاب و انصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کرلیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لئے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے؟"۔[3]

حضرت مسیح علیہ السلام نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات و آیات دکھانے کے باوجود شک اور تردید کی بو آ رہی تھی، غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ: "اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو"۔[4]

لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بتادیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے" بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے

---

[1] سورہ آل عمران 53

[2] سورہ آل عمران 53

[3] سورہ مائدہ آیت 112

[4] سورہ مائدہ آیت 112

دل میں پیدا ہوگی، کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے،اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم ''علم الیقین'' کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تا کہ ہم اس پر گواہی دے سکیں''۔[1]

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا: ''کہ خداوندا ہمارے لئے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول و آخر کے لئے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے''۔[2]

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی و عمومی مصالح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خداوند متعال نے اس دعا کو کہ جو حسن نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول کرلیا اور ان سے فرمایا کہ: ''میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہئے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی''۔[3]

یہ آسمانی مائدہ کیا تھا

یہ آسمانی مائدہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں ہے کہ جن میں سے ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔

شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر مائدہ آسمانی اترا تھا۔لہٰذا انہوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

عہد جدید اور مائدہ

موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں۔اگر چہ انجیل یوحنا باب 21 میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور ان کی طرف سے روٹی مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے۔

کتاب ''اعمال رسولان'' میں بھی جو ''عہد جدید'' کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر نزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے مگر وہ موجودہ انجیلوں میں نہیں ہیں، ایسے ہی جیسا کہ بہت سے ایسے مطالب ہیں جو

---

[1] سورہ مائدہ آیت 113

[2] سورہ مائدہ آیت 114

[3] سورہ مائدہ آیت 115

انجیلوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

انجیل یا اناجیل؟

''انجیل'' اصل میں یونانی لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے ''بشارت'' یا ''جدید تعلیم'' یہ اس کتاب کا نام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن نے محل گفتگو میں اور دیگر آیات کہ جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام لیا ہے، یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے، اب وہ بہت سی اناجیل جو عیسائیوں میں مروج ہیں، وحی الٰہی نہیں ہیں۔ ان اناجیل میں یہ چار زیادہ مشہور ہیں:

1۔لوقا 2۔مرقس 3۔متی 4۔یوحنا

ان کے وحی الٰہی نہ ہونے کا خود عیسائی بھی انکار نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلیں سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں یا ان کے شاگردوں کی ہیں اور آپ سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ عیسائیوں کا دعویٰ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے یہ اناجیل الہام الٰہی سے لکھی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید اور اناجیل کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کے مصنفین سے واقفیت حاصل کریں۔

عیسائیوں کی اہم ترین مذہبی کتاب عہد جدید کا مجموعہ ہے جس پر تمام عیسائی فرقے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔

عہد جدید کا مجموعہ عہد قدیم کے تیسرے حصے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ 27 متفرق کتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی ترتیب یہ ہے:

1۔انجیل متی: متی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ یہ انجیل اس نے 38 عیسوی میں یا بعض کے نظریہ کے مطابق سنہ میلادی 50 سے لیکر سنہ میلادی 60 کے درمیان لکھی۔

2۔انجیل مرقس: کتاب قاموس مقدس کے صفحہ 792 پر ہے کہ مرقس حواریوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اپنی انجیل پطرس کی زیر نگرانی تصنیف کی۔ مرقس سنہ میلادی 68 میں قتل ہوگیا۔

3۔انجیل لوقا: ''لوقا پولس رسول کا رفیق اور ہمسفر تھا۔ پولس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ایک عرصہ بعد عیسائیت قبول کی، یہ آپ کے زمانے میں متعصب یہودی تھا۔ لوقا کی وفات سنہ میلادی 70 کے قریب ہوئی ہے قاموس مقدس کے مؤلف نے اپنی تألیف کے صفحہ 772 پر لکھا ہے کہ انجیل لوقا کی تالیف عام خیال کے مطابق تقریباً سنہ میلادی 63 میں ہوئی۔

4۔انجیل یوحنا: یوحنا مسیح علیہ السلام کے شاگردوں میں سے تھا اور پولس کا دوست اور ہمسفر تھا۔ مؤلف مذکور کے بقول اس کی تألیف زیادہ تر ناقدین کے نزدیک پہلی صدی کے آخری حصے میں لکھی گئی۔

یہ اناجیل عموماً حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دیئے جانے اور اسکے بعد کے حوادث کے ذکر سے معمور ہیں۔ اس سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب اناجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں، اور ان میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں ہے جو حضرت

مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی ہو۔

5۔اعمال رسولانہ: (صدر اول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور مبلغین کے اعمال۔)

6۔14رسالے: مختلف افراد اور اقوام کے نام پولس کے خطوط۔

7۔رسالہ یعقوب: (عہد جدید کے ستائیس کتب ورسائل میں سے یہ بیسواں رسالہ ہے۔)

8۔پطرس کے خطوط: یہ عہد جدید کے اکیسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔

9۔یوحنا کے خطوط: (یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں 23، 24 اور 25 رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔)

10۔نامہ یہودا: (یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔)

11۔مکاشفہ یوحنا: (یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔)

لہٰذا عیسائی مؤرخین کی تصریح، نیز اناجیل اور عہد جدید کی دیگر کتب ورسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔مزید یہ کہ یہ تمام کتب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں۔اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے اٹھ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔اس کے کچھ حصے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے اپنی اناجیل میں بیان کئے ہیں باعث تاسف ہیں کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا متعال نے ان کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیح علیہ السلام پر کیے ہیں ان کا ذکر ہوا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''اے عیسیٰ میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا)۔ [۱]

سورہ نساء کی آیت 157 سے استشہاد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل ہوئے اور بعد از اں انہیں دفن کر دیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اٹھے، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ [۲]

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ محل بحث آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگر چہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ ''متوفيك'' کا مادہ ''وفات'' ہے اور یہ موت کے معنی میں ہے۔اس لئے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے منافی ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز فوت ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور توفی (بروزن ترقی) ''وفی'' کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے ''کسی چیز کی تکمیل کرنا'' عہد و پیمان کرنے کو ''وفا'' بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں۔اسی بناء پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں لے لے تو عرب کہتے ہیں ''توفی دینہ'' یعنی اپنا حق پورا پورا وصول

---

[۱] آل عمران آیت 55

[۲] المنار کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا۔

کرلیا۔آیات قرآنی میں بھی ''توفی'' بارہا ''لینے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً:

وھو الذی یتوفکم بالیل و یعلم ما جرحتم بالنھار۔

وہ ذات وہ ہے جو تمہاری روح کو رات کے وقت لے لیتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔(انعام۔60)اس آیت میں نیند کو ''توفی روح'' کہا گیا ہے۔یہی معنی سورہ زمر کی آیہ 42 میں بھی آیا ہے۔قرآن کی متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ ''توفی'' ''لینے'' کے معنی میں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ''توفی'' بعض اوقات ''موت'' کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی درحقیقت موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے۔اصولی طور پر ''توفی'' کے معنی میں ''موت'' پوشیدہ نہیں ہے۔اور ''فوت'' کا مادہ ''وفی'' کے مادہ سے بالکل جدا ہے۔

مسیح علیہ السلام قتل نہیں ہوئے،افسانہ صلیب

قرآن کہتا ہے: ''مسیح قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انہیں قتل نہیں کیا''۔[1]

موجودہ چاروں اناجیل (متی،لوقا،مرقس اور یوحنا) میں حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصوں میں تشریح و تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔بلکہ ایک لحاظ سے تو قتل مسیح علیہ السلام اور انہیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت،تربیت اور ارشاد کے لئے آیا ہو بلکہ وہ انہیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی خدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوع بشر کے گناہوں کا سودا کرتا ہے۔

عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لئے آئے تاکہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تاکہ نوع بشر کے گناہوں کو دھو ڈالیں اور عالمین کو سزا سے نجات دلائیں۔اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ راہ نجات مسیح علیہ السلام سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو ''مذہب نجات'' یا ''مذہب خدا'' کہتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کو ''ناجی'' یا ''فادی'' کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں،اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ،لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔

1۔حضرت مسیح علیہ السلام دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ و نظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

2۔گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے،ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے اور راہ نجات خود انسان کا اپنا

[1] سورہ نساء آیت 157

ایمان اور عمل صالح ہے۔

3۔ گناہ گاروں کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب وتشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیح علیہ السلام کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تاکہ وہ نجات کے لئے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدہ صلیب کا سہارا لیں۔

4۔ بہت سے قرائن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

الف: ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مؤرخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہٰذا انھوں نے مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح علیہ السلام کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب: دوسرا عامل جو یہ امکاں ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر ''جستیمانی'' باغ میں جو لوگ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب ورسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج: اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د: تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم ''پیلاطس'' کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لئے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیان رسا، قوت گویائی اور شجاعت اور شہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور وحشت واضطراب کا ایسا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کہہ سکا ہو، قوی احتمال یہ ہے کہ وہ ''اسخر یوطی نامی یہودی'' تھا جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوسی کا کردار ادا کیا، کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسیٰ علیہ السلام سے بہت مشابہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخر یوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی۔

ر: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہٰذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس میں کون سے تعجب

کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س: اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختہ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لئے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔

لہٰذا اگر حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوع انسان کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لئے ایسی باتیں کر رہا تھا ورنہ مسیح علیہ السلام ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے۔

ش: مسیحوں کے نزدیک قابل قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل ''برنابا'' میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نام کے دو شخص تھے ایک عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل اور صلیب دیئے جانے کے بارے میں قرآن کے ''دعویٰ اشتباہ'' کو واضح کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت، جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی

قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کارشکنی اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں''۔

''اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے''۔[1]

عہدین کی بشارتیں اور ''فارقلیطا'' کی تعبیر

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس جو کچھ توریت و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ان کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور کتب آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا ہے۔ اسی بناء پر جو کچھ عہد قدیم (توریت اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہد جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سارے کے سارے کو قبول ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابل انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دوسرے لوگوں کے افکار و تصورات سے وجود میں آئی ہیں۔

بہر حال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اسکے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

---

[1] سورہ صف آیت 6

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جوان کتابوں میں نظر آتی ہیں اور پیغمبر اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں، ان کے علاوہ انجیل ''یوحنا'' کے تین موارد میں لفظ ''فارقلیطا'' آیا ہے۔اس کا فارسی نسخوں میں ''تسلی دینے والا'' کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں: ''میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا ''تسلی دینے والا'' دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔''

بعد والے باب میں آیا ہے: ''اور جب وہ تسلی دینے والا آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی، وہ میرے بارے میں شہادت دے گی''۔

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے: ''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے مفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ ''تسلی دینے والا'' تمہارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا''۔

اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں ''تسلی دینے والے'' کے بجائے ''پارقلیطا'' آیا ہے۔اور یونانی متن میں ''پیرکلتوس'' آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے ''لائق تعریف شخص'' کے معنی میں ہے جو ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' و ''احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا معادل ہے۔

لیکن جب ارباب کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی نشر واشاعت ان کے گھڑے ہوئے نظریات پر ضرب شدید لگائے گی تو ''پیرکلتوس'' کی بجائے ''پاراکلتوس'' لکھ دیا کہ جو ''تسلی دینے والے'' کے معنی میں ہے اس واضح تحریف کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا اگرچہ اس تحریف کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں دائرۃ المعارف کے بزرگ نے فرانسہ میں کیا ہے:

''محمد موسس دین اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے لفظ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' بہت زیادہ تعریف کئے گئے کے معنی میں ہے اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل وتمجید کے معنی میں ہے عجب اتفاق کے زیر اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی حمد ہی ہے اور لفظ محمد کا مترادف اور ہم معنی میں ہے عجیب اتفاق فوق یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو ''فارقلیط'' کے بجائے استعمال کرتے تھے احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ ''پیرکلتوس'' کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ ''پاراکلتوس'' رکھ دیا گیا ہے، مسلمان مذہبی مولفین نے یہ بارہا گوش زد کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے اور قرآن مجید بھی سورہ صف کی حیرت انگیز آیت میں اس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے''۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ ''فارقلیطا'' کا معنی روح القدس یا تسلی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ ''احمد'' کے معادل مفہوم رکھتا ہے۔

ایک اور زندہ گواہ

''فخر الاسلام'' جو کتاب ''انیس الاعلام'' کے مؤلف ہیں علماء نصاری میں سے تھے، انھوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علماء ہی میں مکمل کی تھی اوران کے یہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب

---

[1] دائرۃ المعارف بزرگ فرانسہ جلد 23 ص 4176

واقعے کواس طرح بیان کرتے ہیں: بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جوزہد و تقویٰ میں ممتاز تھا، ''کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اسی سے رجوع کرتے تھے، ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا، اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص ہی لگاؤ تھا، اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں، صرف ایک صندوق خانے کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی، اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جا کر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا، جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث ومباحثے میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ ''فارقلیطا'' اور یونانی زبان کے لفظ ''پریکلتوس'' کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے، ہر کسی کی الگ رائے تھی، واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقیلطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے، میں نے کہا فلاں مفسر کے قول کا میں نے پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ اس تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو ''راسخون فی العلم'' کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں، میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتایئے ے، وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا، لیکن اس نام کے معنی معلوم ہو جانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا، اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں، اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے او، میں کتابیں اس کے پاس لے آیا، یہ دونوں کتابیں رسول اسلام ﷺ کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں دونوں کتب میں لفظ ''فارقلیطا'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ انحضرت کے ظہور سے پہلے علماء نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد ومحمد ہیں، لیکن ظہور محمد ﷺ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔

میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملے کی اس نے تین مرتبہ تکرار کی۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم، کون سا ہے۔

اس نے کہا: مختصر ہے محمد ﷺ کی پیروی و اتباع میں۔

میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں، اس نے کہا ہاں خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی)

پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کرلو، میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد ﷺ کا پیروکار رہوں اور علماء نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست کش نہیں ہو سکتے ورنہ

کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔''

آپ دیکھیں کہ علماء اہل کتاب نے پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے بعد اپنے شخصی منافع کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور نشانیوں کی اور توجیہات کر دی ہیں۔

حضرت لقمان

حضرت لقمان کا نام سورہ لقمان کی دو آیات میں آیا ہے، آیا وہ پیغمبر تھے یا صرف ایک دانا اور صاحب حکمت انسان تھے؟ قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، لیکن ان کے بارے میں قرآن کا لب ولہجہ نشان دہی کرتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت؛ توحید کی طرف دعوت، شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے نبرد آزمائی، رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت وانذار کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں، جب کہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا، صرف انکے پند نصائح بیان ہوئے ہیں جو اگرچہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لئے ہیں لیکن ان کا مفہوم عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مرد حکیم ودانا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے:

''سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور وفکر کیا کرتے، ان کا ایمان ویقین اعلی درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا''۔

بعض تواریخ میں ہے لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے غلام تھے باوجود یکہ ان کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفا روح کے مالک تھے وہ ابتدائے زندگی سے سچ بولتے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرتے اور جو امور ان سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے ان کی نبوت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

یہ تمام حکمت کہاں سے

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے؟

آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم وحکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟

لقمان نے فرمایا: اللہ کی قدرت، امانت کی ادائیگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے

حدیث بالا کے ذیل میں انحضرت سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ:

''ایک دن حضرت لقمان دو پہر کے وقت ارام فرما رہے تھے کہ اچانک انھوں نے ایک آواز سنی کہ اے لقمان کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تاکہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں؟

لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں عافیت کی راہ قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انہیں دیکھ رہے تھے کہا اے لقمان کیوں (ایسا نہیں کرتے؟)

تو انھوں نے کہا اس لئے کیونکہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور اہم ترین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم وستم کی موجیں اس کی طرف متوجہ ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پا جائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے منحرف ہو جائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور آخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور آخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے تو نہ تو وہ دنیا کو پا سکے گا اور نہ ہی آخرت کو حاصل کر سکے گا۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں سے متعجب ہوئے، لقمان نے یہ بات کہی اور سو گئے اور خدا نے نور حکمت ان کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو ان کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں''۔

اصحاب کہف

چند بیدار فکر اور با ایمان نوجوان تھے، وہ ناز ونعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے، انھوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لئے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر ماردی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی، وہ جس میں کچھ بھی نہ تھا، یہ اقدام کر کے انھوں نے راہ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کردی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فن فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سر گزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے، اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اصحاب کہف کی زندگی کا اجمالی جائزہ

پہلے فرمایا گیا ہے: ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف ورقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے''۔[1]

زمین وآسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمت تخلیق کا ایک نمونہ ہے، خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحاب کہف کی داستان مسلماً ان سے عجیب تر نہیں ہے۔

''اصحاب کہف'' (اصحاب) کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے جان بچانے کے لئے میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن ''رقیم'' دراصل ''رقم'' کے مادہ سے ''لکھنے'' کے معنی میں ہے، زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخرکار اس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

---

[1] سورۂ کہف آیت 9

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا بعض کا خیال ہے کہ یہ اس شہر کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ [۱]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

''اس وقت کا سوچو جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی''۔ [۲]

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا اور عرض کی: ''پروردگارا ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر''۔ [۳]

اور ہمارے لئے راہ نجات پیدا کردے۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کردے۔ ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دعا قبول کی ''ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے''۔

''پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں''۔ [۴]

داستان اصحاب کہف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ''ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں''۔ [۵]

ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات بے بنیاد چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہوگا۔

---

[۱] سورہ کہف آیت 9

[۲] رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کہف اور تھے اور اصحاب رقیم اور تھے بعض روایت میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیر قرآن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف ''اصحاب کہف'' کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور انکے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا، یہ صورت حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

[۳] سورہ کہف آیت 10

جیسا کہ قرآن میں موجود ہے: "اذا وی الفتیة الی الکهف"

(فتیة) فتی کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جواں مردی حق کے لئے ڈٹ جانے اور حق کے حضور سر تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔

امام علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: ''فتی'' کس شخص کو کہتے ہیں؟۔ اس نے جواباً عرض کیا: ''فتی'' نوجوان کو کہتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کہف پکی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں ''فتیة'' کہا ہے اس لئے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقوی اختیار کیے ہو وہ ''فتی'' (جواں مرد) ہے۔

[۴] سورہ کہف آیت 10

[۵] سورہ کہف آیت 11 تا 12

''وہ چند جواں مرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھادی تھی''۔[1]

قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف جس دور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفر و بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کہ جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارت گری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سروں پر مسلط تھی۔

لیکن یہ جواں مرد کہ جو ہوش و صداقت کے حامل تھے آخر کار اس دین کی خرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کی خلاف قیام کا مصمم ارادہ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لئے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کہتا ہے: ''جب انہوں نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے''۔[2]

''اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دور بات کہی''۔[3]

ان باایمان جواں مردوں نے واقعاً توحید کے اثبات اور ''الٰھہ'' کی نفی کے لئے واضح دلیل کا سہارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین کا کوئی مالک اور پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ ''ہماری قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں''[4]

تو کیا دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جا سکتا ہے ''وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے''۔[5]

کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بناء پر ایسا عقیدہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا کھلم کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کونپل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم بے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوق خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نغمہ توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

لہٰذا انھوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لئے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لئے ہجرت کا عزم کیا۔ لہٰذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں، کس طرف کوکوچ کریں۔ آپس میں کہنے لگے: ''جب اس بت پرست قوم سے کنارہ کشی اختیار کر لو خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا حساب کتاب ان سے جدا کر لو تو غار میں جا پناہ لو''

تا کہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کر دے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر لگا دے۔

''غار'' ایک پناہ گاہ

''کہف'' ایک معنی خیز لفظ ہے، اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرز زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے، وہ ماحول کہ جب

---

[1] سورہ کہف آیت 13
[2] سورہ کہف آیت 13
[3] سورہ کہف آیت 14
[4] سورہ کہف آیت 15
[5] سورہ کہف آیت 15

راتیں تاریک اور سرد تھیں۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جب نہ نرم بستر تھے نہ خوشحالی۔

اب جب اس طرف توجہ کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحاب کہف اس دور میں بادشاہ کے وزیر اور بہت بڑے اہل منصب تھے۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناز ونعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا کس قدر عزم، حوصلہ دلیری اور جانثاری کا غماز ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روح کتنی عظیم تھی۔

یہ تاریک غار، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور وصفا اور توحید ومعنویت کی ایک دنیا آباد تھی۔

رحمت الٰہی کے نور کی لکیروں نے اس کی دیواروں پر گویا نقش ونگار کر دیا تھا اور لطف الٰہی کے آثار اس میں موجزن تھے۔ اس میں طرح طرح کے مضحکہ خیز بت نہیں تھے اور ظالم بادشاہ کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی فضا نے جہل وجرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی، فکر وآزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی۔

جی ہاں ان خدا پرست جواں مردوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ قید خانہ کی مانند تھی اور اس کو انتخاب کر لیا کہ جو اپنی تنگی وتاریکی کے باوجود وسیع تھی۔

بالکل پاکباز یوسف علیہ السلام کی طرح کہ جنہوں نے عزیز مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے سر نہ جھکایا اور تاریک وخوف ناک قید خانے میں جانا قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کی استقامت و پامردی میں اضافہ کر دیا اور آخر کار انہوں نے بارگاہ خداوندی میں یہ حیران کن جملہ کہا: ''پروردگارا یہ قید خانہ اپنی جانکاہ تنگی وتاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تو ان کے وسوسوں کو مجھ سے دفع نہ کرے تو میں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا''۔[1]

اصحاب کہف کا اہم مقام

قرآن اصحاب کہف کی عجیب وغریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص ان کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوئے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

سورہ کہف میں چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

1۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہٰذا سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''اگر تو وقت طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ ان کی دائیں جانب جھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب''۔[2] غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اچھی ہوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں۔ لہٰذا تازہ ہوا آسانی سے میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی۔

2۔ ''وہ کی ایک وسیع جگہ میں تھے''۔[3]

---

[1] سورہ کہف آیت 15

[2] سورہ یوسف آیت 33

[3] سورہ کہف آیت 17

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے۔ وہ کے وسطی حصے میں تھے تا کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہ راست چمک سے بھی۔

3۔ ''ان کی نیند عام نیند جیسی نہ تھی''۔ ''اگر تو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے''۔[1]

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بناء پر تھی کہ موذی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب انگیز رہے تا کہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورت حال ان کے لئے ایک سپر کا کام دے۔

4۔ ''اس بناء پر کہ سالہا سال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہو جائیں''۔ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلواتے رہتے تھے۔[2]

تا کہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹھہر جائے اور طویل عرصہ تک ایک طرف ٹھہرنے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہو جائیں۔

5۔ ''اس دوران میں ان کا کتا کہ جوان کے ہمراہ تھا کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلائے ہوئے تھا اور پہرہ دے رہا تھا''۔[3]

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔اسی طرح یہاں اصحاب کہف کے کتے کا ذکر آیا ہے، یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جوان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ کہ یہ کتا ان کے ساتھ کہاں سے شامل ہوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اس چرواہے کا کتا تھا کہ جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہولیا تھا کیونکہ وہ ایک حق تلاش اور دیدار الٰہی کا طالب انسان تھا۔اس وقت کتا ان سے جدا نہ ہوا اور ان کے ساتھ ہولیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقان حق اس تک رسائی کے لئے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کوئے یار کے دروازے کسی کے لئے بند نہیں ہیں۔ظالم بادشاہ کے تائب ہونے والے وزیروں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لئے بارگاہ الٰہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے؟، قرآن کہتا ہے: ''زمین و آسمان کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب چلنے پھرنے والے ذکر الٰہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور سب کے دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے''۔[4]

---

[1] سورہ کہف آیت 17

[2] سورہ کہف آیت 18

[3] سورہ کہف آیت 18

[4] سورہ کہف آیت 18

6۔ غار میں اصحاب کہف کا منظر ایسا رعب دار تھا کہ اگر تو انہیں جھانک کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا وجود سرتا پا خوفزدہ ہوجاتا''۔[۱]

''یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا متعال نے رعب اور خوف کو اپنے باایمان بندوں کے لئے ڈھال بنایا تھا۔ بلکہ دوسری جگہ بھی اس طرح کا خطاب ہوا ہے۔''ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے۔''[۲]

دعائے ندبہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں منقول ہے:''خداوندا پھر تونے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح کی کہ اس کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا''۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحاب کہف کو دیکھنے والے کو سرتا پا لرزا دیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پر اسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیات قرآنی میں کوئی وضاحت نہیں ہے''۔

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

اصحاب کہف کی نیند اتنی لمبی ہوگئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوئے رہے اور ان کی نیند موت سے بالکل ملتی جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے:''اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا''۔[۳]

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سلائے رکھتے اور انہیں پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا، تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک نے پوچھا۔تمہارا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ انہوں نے کہا:''ایک دن یا دن کا کچھ حصہ''۔[۴]

اس میں تردد شاید انہیں اس لے ہوا کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور آکر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

لیکن آخر کار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہٰذا کہنے لگے: تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے ہو۔[۵]

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام''تملیخا'' تھا اور یہاں پر''قالوا''[۶] کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول جیسی بات ہے۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لئے کہی کہ ان کے چہرے سے، ناخنوں سے، بالوں سے اور لباس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا

---

[۱] بنی اسرائیل آیت 44
[۲] سورہ کہف آیت 18
[۳] سورہ آل عمران آیت 151
[۴] سورہ کہف آیت 19
[۵] سورہ کہف آیت 19
[۶] سورہ کہف آیت 19

کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

بہر حال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی، لہٰذا پہلے انہوں نے یہی تجویز کی کہ ''تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تا کہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں چاہیئے تمہارے لئے لے آئے''۔[1]

''لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے''۔[2]

''کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگسار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (بت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے،''اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے''۔[3]

پاکیزہ ترین غذا

یہ بات بہت جاذب نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران ان کے جسم میں جو غذا تھی، وہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے جسے کھانا لانے کے لئے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ خرید لائے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسی کو لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے۔

بہر حال جلد ہی لوگوں میں ان عظیم جواں مردوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے، اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ دور یا نزدیک کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دین توحید کی تبلیغ نہ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کے خلاف جد وجہد شروع کر دیں۔ لہٰذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھا تہ پتہ معلوم ہو تو گرفتار کے لئے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لئے ایک معمہ اور ان کے دل و دماغ کے لئے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند ارا کین نے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لئے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔

بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہو گئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی۔ اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔

---

[1] سورہ کہف آیت 19

[2] سورہ کہف آیت 19

[3] سورہ کہف آیت 20

سامان خریدنے والے پر کیا گزری

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لئے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اس کا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا، شہر کی عمارتوں کی شکل وصورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں ویرانے تھے۔

شاید تھوڑی دیر کے لئے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ وہ میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟

دوسری طرف اس کا چہرہ مہرہ اور حالت لوگوں کے لئے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس، اس کی گفتار اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اسکی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

اس وقت لوگوں کا تعجب انتہاء کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا، دکاندار کی نگاہ سکے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دور کا تھا اور شاید اس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا: میرے ہاتھ میں تو یہ سکہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔

قرائن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی محفلوں میں ہم نے جن کی پراسرار داستان سنی ہے۔

خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔ اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آن کی آن میں پھیل گئی۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معاد جسمانی اور موت کے بعد مردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کہف کی نیند کا واقعہ معاد جسمانی کے طرفداروں کے لئے ایک دندان شکن دلیل بن گیا۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے: ''جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو ان کے حال کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے۔ اور دنیا کے خاتمے اور قیام قیامت میں کوئی شک نہیں''۔[1]

کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی حوالوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا، تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا

---

[1] سورہ کہف آیت 21

مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

اصحاب کہف کے واقعہ کا اختتام

جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا، وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب و انصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں ان کو یہ زندگی بہت سخت اور نا گوار لگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوار رحمت حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا، اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔[1]

اس مقام پر معاد جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحاب کہف کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں ''لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں''۔[2]

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لئے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے ''ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے''۔[3]

لہٰذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کے لئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہٰذا انہوں نے کہا: ''ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں''۔[4]

تا کہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواح پاک سے لوگ استمداد کریں۔

قرآن میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جو اصحاب کہف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا''۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتّا تھا۔

کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے۔

صرف تھوڑے سے لوگ ان کی تعداد جانتے ہیں۔[5]

قرآن نے ان جملوں میں اگر چہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا

---

[1] سورہ کہف آیت 21

[2] سورہ کہف آیت 21

[3] سورہ کہف آیت 21

[4] سورہ کہف آیت 21

[5] سورہ کہف آیت 22

جاسکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابق حقیقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد (اندھیرے میں تیر مارنا) آیا ہے کہ جوان اقوال کے لئے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: کہہ دے: ''میرا رب ان کی تعداد سے بہتر طور پر آگاہ ہے''۔اور یہ بھی فرمایا گیا ہے'ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں''۔یہ جملے بھی اس تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ''استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث نہ کر''۔[1]

بہرحال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحی خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے۔تو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے میں محکم ترین دلیل یہی ہے۔''لہٰذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے اس بارے میں سوال نہ کر''۔[2]

اصحاب کہف کی نیند

قرآن میں موجودہ قرائن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کی نیند بہت لمبی تھی۔یہ بات ہر شخص کی حس جستجو کو ابھارتی ہے۔ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔

قرآن اس داستان کے متعلق تردد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں اس سوال کا جواب دیتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ''وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ سوتے رہے''۔[3]

اس لحاظ سے وہ کل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا300 سال،نو سال اس سے زیادہ،یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبارت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کردی جائے۔

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلاف آراء کو ختم کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: ''کہہ دیجئے: خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے۔کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں''۔[4] اور وہ ہر کسی کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے۔

اور جو کل کائنات ہستی سے باخبر ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اصحاب کہف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

غار کہاں ہے؟

یہ کہ اصحاب کہف کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی؟ اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے،البتہ اس واقعے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان،اس کے تربیتی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا،یہ

---

[1] سورہ کہف آیت 22

[2] سورہ کہف آیت 22

[3] سورہ کہف آیت 25

[4] سورہ کہف آیت 26

کوئی واحد واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں، لیکن مسلم ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہر ''افسوس'' میں ہوا اور یہ اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات ''ازمیر'' کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام ''ایاصولوک'' ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے ''ینایرداغ''۔ اب بھی اس میں ایک نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے، یہ ایک وسیع غار ہے، کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کی یہی غار ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے، حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی موید ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اسکے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً سترہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو ''اردن'' کے دارالحکومت ''عمان'' میں واقع ہے۔ یہ ''رجیب'' نامی ایک بستی کے قریب ہے اس کے اوپر گرجے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرائن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کا غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور آذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

اصحاب کہف کا واقعہ دیگر تواریخ میں

یہ بات مسلم ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا (چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ) اور نہ اسے کتابوں میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہور مسیح علیہ السلام کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ ''دکیوس'' کے دور کا ہے، جسے عرب ''دقیانوس'' کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مؤرخین کے مطابق یہ واقعہ 49 تا 152 عیسوی کے درمیان کا ہے۔ ان مؤرخین کے خیال میں اصحاب کہف کی نیند کی مدت 157 سال ہے۔ یورپی مؤرخین انہیں ''افسوس کے 7 سونے والے'' کہتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں انہیں ''اصحاب کہف'' کہا جاتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ''افسوس'' شہر کہاں ہے؟ سب سے پہلے کن علماء نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

''افسوس'' یا ''اُفسُس'' ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ ''دریائے کاستر'' کے پاس ''ازمیر'' شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ ''الونی'' بادشاہ کا پایہ تخت شمار ہوتا تھا۔

افسوس اپنے مشہور بت خانے اور ''طامیس'' کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔
کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔اس کا نام ''اک'' تھا۔وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔اس نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔اس کا نام ''گوگویوس'' تھا ترجمے کا نام اس نے ''جلال شہداء'' کا ہم معنی رکھا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے ایک دوصدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجالس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔ جیسے ان کے سونے کی مدت کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت 309 سال بیان کی ہے۔
''یاقوت حموی'' نے اپنی کتاب ''معجم البلدان ج 2 ص 6 0 8 پر'' خرداد بہ نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' ص 106 تا 110 میں اور ''ابوریحان بیرونی'' نے اپنی کتاب ''الاثار الباقیہ'' ص 290 پر نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر'' آبس'' میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔
سورہ کہف میں قرآن کے لب ولہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شان ہائے نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یہودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی، اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کی تاریخی ماخذ میں موجود رہا ہے۔[1]

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

چند قریشیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمانا چاہا، اس مقصد کے لئے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا۔ دوسرا مسئلہ روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل عرصے سے فلاسفہ اور محققین غور وخوض کرتے چلے آئے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔
اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط جو قرآن میں بیان ہوا ہے وہ بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی تحقیق سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابل غور پہلو ہیں۔ اس کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لئے ہم آیات، روایات اور مؤرخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔
دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پہلا موضوع وہی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ

---
[1] اصحاب کہف کا واقعہ کیا سائنس کے لحاظ سے قابل قبول ہے؟ رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد 7 ص 86۔

حصہ تم سے بیان کروں گا''۔[1]

بہر حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا۔اسی لئے انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے ضروری وضاحتیں چاہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:''ہم نے اسے زمین پر تمکنت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی)۔اور ہر طرح کے وسائل اور اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔اس نے بھی ان سے استفادہ کیا۔یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا۔وہاں اس نے محسوس کیا کہ سورج تاریک اور کیچڑ آلود چشمے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے''۔[2]

وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ تھے)''تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا: کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا''۔[3]

ذوالقرنین نے کہا:''وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے۔اور وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا''۔[4]

یہ ظالم و ستمگر دنیا کا عذاب بھی چکھیں گے اور آخرت کا بھی۔

''اور رہا وہ شخص کہ جو با ایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزاء ملے گی۔اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے''۔[5]

اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

ذوالقرنین کے اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم و شرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہو گا جو اس الٰہی تعمیری پروگرام کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام و سکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک و ظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے:''جو وسائل اس کے اختیار میں تھے اس نے ان سے پھر استفادہ کیا۔اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکز طلوع تک جا پہنچا۔وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے''۔[6]

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار میں لباس پہنتے تھے

---

[1] سورہ کہف آیت 83

[2] سورہ کہف آیت 84

[3] سورہ کہف آیت 86

بعض مفسرین نے لفظ''قلنا''(ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الہام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

[4] سورہ کہف آیت 87

[5] سورہ کہف آیت 88

[6] سورہ کہف آیت 89-90

کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔[1]

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہداف کے حصول کے لئے) کیا وسائل تھے۔[2]

بعض مفسرین نے یہاں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟

قرآن میں حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''اس کے بعد اس نے حاصل وسائل سے پھر استفادہ کیا''۔[3]

''اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے''۔[4]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے۔ مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے، یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماندہ تھے کیونکہ انسانی تمدن کیسب سے واضح مظہر انسان کی گفتگو ہے۔[5]

اس وقت یہ لوگ یاجوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کہ جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے، ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی۔ انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور'' کہنے لگے: اے ذوالقرنینیا جوج ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں''۔[6]

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہوسکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اظہار مدعا کیا ہو۔[7]

بہر حال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار، منصوبہ بندی، اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے۔ لہٰذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں، اس شرط کے ساتھ ذوالقرنین

---

[1] بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے۔ اس سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لئے کوئی سایہ نہ تھا۔

[2] سورہ کہف آیت 91

[3] سورہ کہف آیت 96

[4] سورہ کہف آیت 97

[5] سورہ کہف آیت 97

[6] سورہ کہف آیت 98

[7] سورہ کہف آیت 95

نے اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کرلیں۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا: ''یہ تم نے کیا کہا؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو''۔[1]

اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں۔

''تم قوت و طاقت کے ذریعے میری مدد کرو تا کہ میں تمہارے اور ان دو مفسد قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنادوں''۔[2]

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: ''لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ''۔[3]

جب لوہے کی سلیں آ گئیں تو انہیں ایک دوسرے پر چننے کا حکم دیا ''یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی''۔[4]

تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہوکر آخر پگھل جائیں۔[5]

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دینا چاہتے تھے۔ یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے، لوہے کی سلوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہوکر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: ''کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تا کہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں''۔[6]

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ آخر کار یہ دیوار اتنی مضبوط ہوگئی کہ اب وہ مفسد لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔[7]

یہاں پر ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ مستکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مرد خدا تھے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 96

[2] سورہ کہف آیت 96

[3] سورہ کہف آیت 96

[4] سورہ کہف آیت 96

[5] سورہ کہف آیت 92

[6] سورہ کہف آیت 93

[7] بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے۔

''لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ کہنے لگے: یہ میرے رب کی رحمت ہے''۔[1]

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لئے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کرسکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ چیزیں اور ان کا ڈھالنا میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی وسیع رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر و ناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بندوں پر احسان جتا تا پھروں۔ اس کے بعد مزید کہنے لگے: ''یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے'' جب میرے پروردگار کا حکم آ گیا تو یہ درہم برہم ہوجائے گی اور زمین بالکل ہموار ہوجائے گی، اور میرے رب کا وعدہ حق ہے''۔[2]

یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتام دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہوجائے گا۔

ذوالقرنین کون تھے؟

جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں۔[3]

جدید ترین نظریہ یہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دور میں ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ذوالقرنین، ''کورش کبیر'' ''بادشاہ کامنشی'' ہے۔[4]

لہٰذا وہ اسے اسکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا۔ وہاں سے ارمنستان گیا۔ عراق و ایران کو فتح کیا۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا وہاں سے خراسان پلٹ آیا۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ عراق آ گیا۔ اس کے بعد وہ شہر ''زور'' میں بیمار پڑا اور مر گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا جسد خاکی اسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

دوسرا: مؤرخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔

اصمعی نے اپنی تاریخ ''عرب قبل از اسلام'' میں، ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ ''سیرۃ'' میں اور ابوریحان بیرونی نے ''الآثار الباقیۃ'' میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔

یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم ''حمیری'' کے شعراء اور زمانہ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں

---

[1] سورہ کہف آیت 94

[2] یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان مترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو یا پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت سلیمان بعض پرندوں سے بات کرلیا کرتے تھے۔

[3] پہلا: بعض کا خیال ہے کہ ''اسکندر مقدونی'' ہی ذوالقرنین ہے۔

[4] فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام ''ذوالقرنین یا کورش کبیر'' رکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مزید آگاہی کیلئے رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد 7 صفحہ 197

نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے۔

ذوالقرنین کو یہ نام کیوں دیا گیا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ''ذوالقرنین'' کا معنی ہے۔''دوسینگوں والا'' سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق ومغرب تک پہنچے کہ جسے عرب ''قرنی الشّمس'' (سورج کے دوسینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لئے ہوا کہ انہوں نے دوقرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔ اور پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے، اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین مشہور ہو گئے۔ آخرکار بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دوشاخوں والا تھا۔

جناب ذوالقرنین کی ممتاز صفات

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے، انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔ پہلے مغرب کی طرف، پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کوہستانی درہ موجود تھا، ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔ وہ ایک مرد مومن، مؤحد اور مہربان شخص تھے۔ وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اسی بناء پر اللہ کا لطف خاص ان کے شامل حال تھا۔ وہ نیکوں کے دوست او رظالموں کے دشمن تھے۔ انہیں دنیا کے مال ودولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روز جزاء پر بھی۔ انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی ہے، یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کے بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی اس میں ستعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔ اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم دیدہ لوگوں کی یاجوج وماجوج کے ظلم وستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزول قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔ لہٰذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں:'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ: ''وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے''۔

دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشہور دیوار چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سوکلومیٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوار چین لوہے اور تانبے سے نہیں بنی ہے اور نہ وہ کسی چھوٹے کوہستانی درے میں ہے، وہ ایک عام مصالحے سے بنی ہوئی دیوار ہے، اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سوکلومیٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔ بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوار ''مارب'' ہے کہ جو یمن میں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ دیوار مارب ایک کوہستانی درے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لئے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور ویسے بھی وہ لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جب کہ علماء ومحققین کی گواہی کے مطابق سرزمین ''قفقاز'' میں دریائے خزر اور دریائے سیاہ کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک دیوار کی طرح کا درہ موجود ہے جو

مشہور درہ ''داریال'' ہے، یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوہے کی دیوار نظر آتی ہے، اسی بناء پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوار ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہیں قریب ہی ''سائرس'' نامی ایک نہر موجود ہے اور ''سائرس'' کا معنی ''کورش'' ہی ہے (کیونکہ یونانی ''کورش'' کو ''سائرس'' کہتے تھے)۔ ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو ''بھاگ گورائی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس لفظ کا معنی ہے ''درہ کورش'' یا ''معبر کورش'' (کورش کے عبور کرنے کی جگہ) ہے یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا بانی ''کورش'' ہی تھا۔

یاجوج ماجوج [1] کون تھے؟

قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ یہ دو وحشی خونخوار قبیلوں کے نام تھے، وہ لوگ اپنے اردگرد رہنے والوں پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔ عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیز ان میں لکھا ہے کہ توریت کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج یا یاجوج وماجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے، یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے، یہ جنگجو، غارت گر اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق ''مغولستان'' کے اطراف میں گزشتہ زمانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا، یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے پھلتی اور پھولتی تھی، آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مزرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور سیل رواں کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے، تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دور گزرے ہیں۔ [2]

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف ایک حملہ ہوا، یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی بات ہے لیکن اس زمانے میں ''ماد'' اور ''فارس'' کی متحدہ حکومت معرض وجود میں آچکی تھی لہٰذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہو گیا۔ لہٰذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے، جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے، لہٰذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے دیوار ذوالقرنین کہتے ہیں۔

قوم تُبّع

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دنیا کی ایسی آباد اور بابرکت زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں درخشندہ تمدن کی حامل تھی، اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام ''تُبّع'' (جس کی جمع ''تبابعۃ'' ہے) تھا چونکہ لوگ ان کی ''اتباع'' کیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ''تُبّع'' کہتے تھے یا پھر اس لئے کہ وہ کئی پشتوں تک یکے بعد دیگرے برسراقتدار آتے رہے۔

قوم تُبّع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقام پر ''تُبّع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، ایک تو سورہ دخان آیت 37 میں اور دوسرے سورہ ''ق'' کی

---

[1] قرآن مجید کی دو سورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک سورہ کہف آیت 94 میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت 96 میں۔

[2] ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی عیسوی میں ''اتیلا'' کی کمان میں کیا، اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ ایک اور دور کہ جوان کے حملوں کا تقریباً آخری دور شمار ہوتا ہے، وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا، انھوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا، اس حملے میں بغداد سمیت بہت سے شہر تباہ برباد ہو گئے۔

14ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

''گھنے درختوں کی سرزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا تو خدا کی تہدید بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہوگئی''۔

''تبع'' یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ، ترک سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔

یمن کے بادشاہوں کو ''تبع'' یا تو اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لئے کہ وہ یکے بعد دیگرے براہ مملکت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام ''اسعد ابو کرب'' تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انھوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونوں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''تبع'' کو برا مت کہو کیونکہ وہ ایمان لاچکا تھا۔''

تُبّع مدینہ کے نزدیک

ایک اور روایت میں ہے کہ جب ''تبع'' اپنے کشور کشائی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم ''شامول'' تھا، اس نے کہا: یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا، پھر اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند صفات گنوائیں، تبع جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں اس نے کہا: ''تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا''۔

حتیٰ کہ ایک اور روایت میں اسی داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے ''اوس'' اور ''خزرج'' کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا، حتیٰ کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے اس کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔

تُبّع شہر مکہ میں

صاحب ''اعلام القرآن'' رقمطراز ہیں:

''تبع'' یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنی زیر نگرانی کرلیا، اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکہ معظّمہ پہنچا اور اس نے خانہ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کرلیا، لیکن وہ

ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوگیا کہ طبیب اس کے معالجے سے عاجز آ گئے۔

اس کے ہمرکابوں میں کچھ اہل علم بھی موجود تھے جس کا سرپرست ''شامول'' نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانہ کعبہ کے بارے میں بُری نیت ہے۔

''تبع'' اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانہ کعبہ پر یمانی چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے یہ فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ 5 عیسوی میں وقوع پذیر ہوا، اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام ''دارالتبابعۃ'' ہے۔

بہر حال یمن کے بادشاہوں (تبابعہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ سے ابہام سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد اور ان کی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں، اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں، جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری مواد ہو یا تاریخی اور حدیثی، صرف بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

انطاکیہ کے رسول

''انطاکیہ'' شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا، یہ شہر قدیم زمانے میں دولت وثروت اور علم وتجارت کے لحاظ سے مملکت روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔

شہر انطاکیہ، حلب سے ایک سو کلومیٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

یہ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ''ابوعبیدہ جراح'' کے ہاتھوں فتح ہوا اور رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے انھوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر ''فرانسیسیوں'' نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ وفساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے، انھوں نے اسے ترکی کے حوالے کر دیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کی ابتداء کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور ''پولس'' اور ''برنابا'' شہروں کی طرف گئے، انھوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی، یہاں سے دین عیسوی نے وسعت حاصل کی، اسی بناء پر قرآن میں اس شہر کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے۔

قرآن اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''تم ان سے بستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے۔''[1]

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو ان کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہٰذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لئے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے

[1] سورہ یٰسین آیت 13

کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں''۔[1]

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے،مفسرین کے درمیان اختلاف ہے،بعض نے کہا ہے کہ ان دو کے نام ''شمعون''اور ''یوحنا'' تھے اور تیسرے کا نام ''پولس'' تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کئے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے اور ان کے نمائندے تھے(اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔یہ اختلافی مسئلہ ہے اگر چہ قرآن ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگر چہ اس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟قرآن کہتا ہے:انھوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا:''انھوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے،تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''[2]

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہئے تھا،نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انھوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمان الٰہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسل آدم علیہ السلام ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے،یقیناً وہ انسان ہی تھے اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات،مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے۔؟[3]

بہر حال یہی پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور انھوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں''کہا:ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

''اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔''(وما علینا الا البلاغ المبین)

مسلمہ طور پر انھوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی،بلکہ''بلاغ مبین''ان کا ابلاغ ''بلاغ مبین'' کا مصداق نہ ہونا کیونکہ''بلاغ مبین'' تو اس طرح ہونا چاہئے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور بات یقینی اور محکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح بعض ناقابل علاج بیماروں کو حکم خدا سے شفا بخشی۔

ہم آپ کو سنگسار کر دیں گے

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انھوں نے اپنی خشونت اور سختی میں اضافہ

---

[1] سورہ یٰسین آیت 14

[2] سورہ یٰسین آیت 15

[3] یہاں پر خدا کی صفت رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تا کہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے،کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لئے پیغمبر نہ بھیجے۔یہ احتمال بھی ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ وصف رحمن کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے،یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے تہدید اور شدت کے مرحلے میں داخل ہو گئے ''انھوں نے کہا: ہم تو تمہیں فال بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے بدبختی کا سبب ہو۔''[1]

ممکن ہے کہ ان انبیاء الٰہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آئی ہوں، جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل بھی کیا ہے کہ ایک مدت تک بارش کا نزول منقطع رہا، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا: ''اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی''۔[2] یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول ہذیانی باتوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہو گئے اور ''انھوں نے کہا: تمہاری بدبختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے''۔[3]

اگر بدبختی اور منحوس حوادث تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکات الٰہیہ تمہارے درمیان میں سے اٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ ہماری دعوت میں، یہ تمہی ہو کہ جنھوں نے بت پرستی، خود غرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنے زندگی کی فضا کو تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے سے منقطع کر کے رکھ دیا ہے''۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاوز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاوز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ بُرے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے خلاصہ یہ کہ اگر خیر خواہوں کی خیر خواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاوز کی بنا پر ہے۔

ایک جاں بکف مجاہد

قرآن میں ان رسولوں کی جدوجہد کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر و مشرک اور ہٹ دھرم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیاء الٰہی کا ساتھ دیتے رہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم مرسلین خدا کی پیروی کرو۔''[4]

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے ''حبیب نجار'' بیان کیا ہے وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کار مومن ثابت ہوا جس وقت اسے خبر ملی کہ وسط شہر میں لوگ ان انبیاء الٰہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا چنانچہ

---

[1] سورہ یٰسین آیت 18

[2] سورہ یٰسین آیت 18

[3] سورہ یٰسین آیت 18

[4] سورہ یٰسین آیت 20

"یسعی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکز شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فروگزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشناختہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت وشوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یک وتنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور وحرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا۔

"اقصی المدینة" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور امادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی، اس سے قطع نظر کہ شہر کے دور دراز کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لئے زیادہ وتیار ہوتے ہیں، اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا اسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔ اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے"۔ [1]

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے، وہ تم سے نہ کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ ومقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر وسپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: (علاوہ ازین) یہ رسول جیسا ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے "کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں"۔ [2]

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ روی اور گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے، لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل وتردد کے کیا معنی؟

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے، کہتا ہے: "میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔" [3]

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہئے نہ کہ اس بے قدر و قیمت مخلوق کی۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو "تم سب کے سب آخر کار اکیلے ہی اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔" [4]

اپنے تیسرے استدلال میں بتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لئے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبدیت کی نفی کے ذریعے تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا میں خدا کے سوا اور معبود اپنا لوں، جب کہ خدائے رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی

[1] سورہ یٰسین آیت 21

[2] سورہ یٰسین آیت 22

[3] سورہ یٰسین آیت 22

[4] سورہ یٰسین آیت 22

شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔''[1]

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید وتوضیح کے لئے کہتا ہے: ''اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انھیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔''[2]

اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین وآسمان کے خالق کے برابر جانے۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور مؤثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پر اثر تاثیر آواز کے ساتھ سب لوگوں کے درمیان اعلان کیا: میں تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا ہوں اور ان رسولوں کی دعوت کو قبول کیا ہے۔''اس بناء پر میری باتوں کو سنو۔''[3]

اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے۔

اس مرد مومن کے مقابلہ میں قوم کا ردّ عمل

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہٹ دھرم قوم کا ردعمل کیا تھا، قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی لیکن قرآن کے بعد کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔

ہاں اس کی پر جوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی، مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور مکر وغرور سے بھرے ہوئے سروں پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا بلکہ کینہ وعداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسے بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مرد مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے، ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسے پتھر مارنے شروع کئے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان افرین کے سپرد کر دی، اس کے لبوں پر مسلسل یہ بات تھی کہ''خداوندا میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں''۔

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاوں کے نیچے روندا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سربستہ جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:''اسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہوجا''۔[4]

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دو دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے:''یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہ خدا میں قتل کئے گئے ہیں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔''[5]

جاذب توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مرد مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہوگیا، ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی لطیف تعبیر میں اس کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا، شہیدوں کی منزل یعنی بہشت وسعادت کس قدر نزدیک ہے۔

---

[1] سورہ یٰسین آیت 23

[2] سورہ یٰسین آیت 24

[3] سورہ یٰسین آیت 25

[4] سورہ یٰسین آیت 26

[5] سورہ آل عمران آیت 169

بہر حال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الٰہی کے قرب اور بہشت نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: ''اے کاش میری قوم جان لیتی۔ اے کاش! وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عفو سے نوازا ہے اور مجھے مکرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے۔''[1]

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس باایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد بھی اس کی ہدایت کی ارزو رکھتا تھا۔''

بہر حال یہ تو اس مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شربت شہادت نوش کیا اور جوار رحمت میں جگہ پائی۔

تین پیغمبروں علیہم السلام کا انجام کار

اگر چہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی کہ جو اقوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مرد مومن کو شہید کرنے کے علاوہ اپنے پیغمبروں کو بھی شہید کر دیا جب کہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مرد مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تا کہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں، کہ جو ان کے خلاف کی گئی تھی، اور کسی پر امن جگہ منتقل ہو جائیں۔

اس ظالم اور سرکش قوم کا سرانجام

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی کیسے مخالفت کی، اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: ''ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لئے ان امور سے کام لیں۔''[2]

ہم ان امور کے محتاج نہیں ہیں صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیار عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں۔ پھر قرآن مزید کہتا ہے: ''صرف ایک آسمانی چیخ پیدا ہوئی، ایسی چیخ کہ جو ہلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہوگئی''۔[3]

کیا یہ چیخ بجلی کی کڑک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ براندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے؟

یا یہ ایسی چیخ تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا۔

---

[1] سورہ یٰسین آیت 26 تا 27

[2] سورہ یٰسین آیت 28

[3] سورہ یٰسین آیت 29

ایک چیخ وہ جو کچھ بھی تھی لمحہ بھر سے زیادہ نہ تھی، وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی ہلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر

سزا خودھمین است مربی

بری را

''بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے۔''

انطاکیہ کے رسولوں کی داستان مجمع البیان کی زبانی

مفسر عالی قدر ''طبرسی'' مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انھوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیں چرانے کے لئے لایا تھا، یہ ''حبیب'' صاحب ''یس'' تھا، انھوں نے اسے سلام کیا، بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے نمائندے ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں بتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادرزاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکم خدا سے صحت وتندرستی بخشتے ہیں۔

بوڑھے نے کہا: میرا ایک بیمار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انھوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تا کہ ہم تمہارے گھر جا کر اس کا حال معلوم کریں۔

بوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا، انھوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صحیح وسالم اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو ان کے ہاتھ شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ بت پرست تھا جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی معبود بھی موجود ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لئے ایک دھمکی تھی، اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں نمائندوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انھوں نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور ''اللہ'' کا نام عظمت کے ساتھ لیا، بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سو کوڑے مارے۔

جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہوگئی اور انھیں زدوکوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''شمعون الصفا'' کو ان کے پیچھے روانہ کیا، وہ جو حواریوں کے بزرگ تھے۔

شمعون اجنبی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطرافیوں سے دوستی پیدا کر لی، انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا، بادشاہ نے بھی ان کو دعوت دی اور انہیں اپنے ہم نشینوں میں شامل کر لیا، بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شمعون نے ایک دن بادشاہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انھوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا؟ کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی بھی ہیں؟

بادشاہ نے کہا: مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شمعون نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلا لیں تاکہ ہم دیکھیں تو سہی کہ ان کے پلے ہے کیا۔ بادشاہ نے انہیں بلا لیا، شمعون نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟

انھوں نے کہا: ''اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔''

شمعون نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انھوں نے کہا: جو کچھ تم چاہو بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندھے غلام کو لایا گیا جسے انھوں نے حکم خدا سے شفا بخشی، بادشاہ کو بہت تعجب ہوا، اس مقام پر شمعون بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے ہیں؟

بادشاہ نے کہا تم سے کیا چھپا ہوا ہے ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا مردے کو زندہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انھوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی تک ہم نے اسے دفن نہیں کیا، ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے تم اسے زندہ کر دکھاؤ۔

مردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شمعون دل ہی دل میں، اچانک مردے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مر چکا ہوں میں نے جہنم کی آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدائے یگانہ پر ایمان لے او۔

بادشاہ نے تعجب کیا، جس وقت شمعون کو یقین ہو گیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کر گئی ہیں تو اسے خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئے، اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے، اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے۔

لیکن قرآن کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیحۂ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

اصحاب الرس

''اصحاب الرس'' کون ہیں اس سلسلے میں بہت اختلات ہے۔ [1]

وہ ایسے لوگ تھے جو ''صنوبر'' کے درخت کی پوجا کرتے تھے اور اسے ''درختوں کا بادشاہ'' کہتے تھے یہ وہ درخت تھا جسے جناب نوح علیہ السلام کے بیٹے ''یافث'' نے طوفان نوح کے بعد ''روشن آب'' کے کنارے کاشت کیا تھا ''رس'' نامی نہر کے کنارے انھوں نے بارہ شہر آباد کر رکھے تھے جن کے نام یہ ہیں: آبان، آذر، دی، بہمن، اسفند، فروردین، اردبہشت، خرداد، تیر، مرداد، شہریور اور مہر، ایرانیوں نے اپنے کلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام انہی شہروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ وہ درخت صنوبر کا احترام کرتے تھے لہٰذا انھوں نے اس کے بیج کو دوسرے علاقوں میں بھی کاشت کیا اور آبپاشی کے لئے ایک نہر کو مختص کر دیا انھوں نے اس نہر کا پانی لوگوں کے لئے پینا ممنوع قرار دے دیا تھا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس سے پی لیتا اسے قتل کر دیتے تھے وہ کہتے تھے کیونکہ یہ ہمارے خداؤں کا سرمایہ حیات ہے لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی کو کم کردے۔

وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ ایک ایک شہر میں ایک دن کے لئے عید منایا کرتے تھے اور شہر سے باہر صنوبر کے درخت کے پاس چلے جاتے اس کے لئے قربانی کرتے اور جانوروں کو ذبح کر کے آگ میں ڈال دیتے جب اس سے دھواں اٹھتا تو وہ درخت کے آگے سجدے میں گر پڑتے اور خوب گریہ کیا کرتے تھے۔ ہر مہینے ان کا یہی طریقہ کار تھا چنانچہ جب ''اسفند'' کی آبادی آتی تو تمام بارہ شہروں کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور مسلسل بارہ دن تک وہاں عید منایا کرتے کیونکہ یہ ان کے بادشاہوں کا دارالحکومت تھا یہیں پر وہ مقدور بھر قربانی بھی کیا کرتے اور درخت کے آگے سجدے بھی کیا کرتے۔

جب وہ کفر اور بت پرستی کی انتہا کو پہنچ گئے تو خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ان کی طرف بھیجا تا کہ وہ انہیں شرک سے روکے اور خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دے لیکن وہ اس نبی پر ایمان نہ لائے اب اس نبی نے فساد اور بت پرستی کی اصل جڑ یعنی اس درخت کے قلع قمع کرنے کی خدا سے دعا کی اور بڑا درخت خشک ہو گیا، جب ان لوگوں نے یہ صورت دیکھی تو سخت پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے خداؤں پر جادو کر دیا ہے کچھ کہنے لگے کہ ہمارے خدا اس شخص کی وجہ سے ہم پر ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔ اب بحث مباحثے کے بعد سب لوگوں نے اللہ کے اس نبی کو قتل کرنے کی ٹھان

---

[1] سورہ فرقان آیت 38 میں اس ظالم وستمگر قوم کا ذکر موجود ہے

''رس'' کا لفظ دراصل مختصر اور تھوڑے سے اثر کے معنی میں ہے جیسے کہتے ہیں: ''رس الحدیث فی نفسی'' (مجھے اس کی تھوڑی سی بات یاد ہے) یا کہا جاتا ہے ''وجد رسا من حمی'' (اس نے اپنے اندر بخار کا تھوڑا سا اثر پایا)۔ کچھ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ''رس'' کا معنی ''کنواں'' ہے۔ معنی خواہ کچھ بھی ہو اس قوم کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اب تھوڑا سا اثر یا بہت ہی کم نام اور نشان باقی رہ گیا ہے یا اس وجہ سے انہیں ''اصحاب الرس'' کہتے ہیں کہ وہ بہت سے کنوؤں کے مالک تھے یا کنوؤں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔ (رجوع کریں تفسیر نمونہ ج 8 ص 386)

لی اور گہرا کنوں کھودا جس میں اسے ڈال دیا اور کنوئیں کا منہ بند کر کے اس کے اوپر بیٹھ گئے اور اس کے نالہ وفریاد کی آواز سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے جان جان آفریں کے سپرد کردی، خداوند عالم نے انہیں ان برائیوں اور ظلم وستم کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر کے نیست ونابود کر دیا۔

سرسبز باغات کے مالک

قرآن میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز وشاداب باغ کے مالک تھے اور آخر کار وہ خودسری کی بناء پر نابود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور ومعروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''ہم نے انہیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی۔''

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے، لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا، وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیا کرتا اور باقی مستضعفین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا، لیکن جب اس نے دنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مر گیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال واطفال زیادہ ہیں، لہذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے، اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اٹھاتے تھے محروم کر دیں، لہذا ان کی سرنوشت وہی ہوئی جو قرآن میں بیان ہوئی۔

ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے انہیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کریں گے اور حاجت مندوں کے لئے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں۔''[۱]

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعیف ایمان کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ حاجت مندوں کے لئے مخصوص کر سکتا ہے۔

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''رات کے وقت جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہو گیا''[۲]

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مسلط ہوئی کہ: ''وہ سرسبز وشاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہو گیا۔[۳] اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔

بہر حال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ پھلوں سے لدے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لئے جائیں: ''صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکارا۔ انھوں نے کہا: ''اگر تم باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف

---

[۱] سورہ قلم آیت 17-18

[۲] سورہ قلم آیت 19

[۳] سورہ قلم آیت 20

چلو۔''[1]

''اسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔ کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمہارے پاس نہ آنے پائے۔''[2]

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہوجائے اور بچے کچے پھل چننے کے لئے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آجائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصہ انہیں بھی ملے، اسی لئے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آپہنچا ہے، اور جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

''اسی طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لئے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔''[3]

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

وہ باغ والے اس امید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کرلیں اور یہ سب کچھ اپنے لئے خاص کرلیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے، یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کردیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے، ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔''[4]

پھر انھوں نے مزید کہا: ''بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔''[5]

ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہوگئے ہیں مادی منافع سے بھی محروم ہوگئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

''اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقل مند تھا، اس نے کہا: ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔''[6]

کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکریہ بجالاؤ اور حاجت

---

[1] سورہ قلم آیت 21
[2] سورہ قلم آیت 21، 22
[3] سورہ قلم آیت 23، 24
[4] سورہ قلم آیت 26
[5] سورہ قلم آیت 27
[6] سورہ قلم آیت 28

مندوں کو اپنے سوال سے بہرہ مند کرو لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مرد مومن تھا جو انہیں بخل اور حرص سے منع کیا کرتا تھا، چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی، اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہوگئی، اور وہ انہیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

وہ بھی ایک لمحہ کے لئے بیدار ہوگئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا: ''انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم وستمگر تھے،[۱] ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور دوسروں پر بھی۔''

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہوگیا: ''انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رخ کیا اور ایک دوسرے کی ملامت وسرزنش کرنے لگے''۔[۲]

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کی سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے ورنہ ہم خدا اور اس کی عدالت سے اس قدر بیگانے نہیں تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: ''وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔''[۳]

آخرکار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا اور کہا: ''امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ دے گا، کیونکہ ہم نے اس کی طرف رخ کرلیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگالی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں۔''[۴]

کیا یہ گروہ واقعاً اپنے فعل پر پشیمان ہوگیا تھا، اس نے پرانے طرز عمل میں تجدید نظر کرلی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہوجاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہوجاتا ہے تو وہ دوبارہ انہیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیت کے لب ولہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر قبول نہیں ہوئی، لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے خلوص نیت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُرمیوہ درخت تھے۔

قرآن آخر میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لئے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: ''خدا کا عذاب اس طرح کا

---

[۱] سورہ قلم آیت 29
[۲] سورہ قلم آیت 30
[۳] سورہ قلم آیت 31
[۴] سورہ قلم آیت 32

ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے۔‘‘[1]

قوم سبا

قوم سبا ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہٰذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر برستی تھیں اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہوجاتا تھا، اس سرزمین کے سمجھدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند ’’مارب‘‘[2] تھا۔

’’مارب‘‘ (بروزن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان دروں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور ’’صراۃ‘‘ کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درہ کے دہانہ پر ’’بلق‘‘ نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انھوں نے ایک مضبوط بند بنایا تھا، اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہوگئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف، کہ جو بند تک جاتی تھی، بہت ہی خوبصورت وزیبا باغات لگائیں اور پر برکت کھیت تیار کریں۔

اس سرزمین کی آبادبستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور ان کی شاخوں پر اتنے پھل لگا کرتے تھے کہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا تو یکے بعد دیگرے اتنے پھل اس میں آ کر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری بھر جاتی تھی۔

امن وامان کے ساتھ نعمت کے وفور نے پاک وصاف زندگی کے لئے بہت ہی عمدہ اور مرفہ ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقاء وتکامل کے لئے مہیا تھا۔

لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفران نعمت میں مشغول ہوگئے، اور فخر ومباہات کرنے لگے اور طبقاتی اختلاف پیدا کردیئے۔

صحرائی چوہوں نے مغرور ومست لوگوں کی آنکھوں سے دور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کردیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں دھڑام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا، اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سجے سجائے قصور ومحلات اور مکانات کو ویران کردیا اور اس کے بعد آباد سرزمین کو خشک اور بے آب وگیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز وشاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند ’’اراک‘‘ کے کڑوے شجر، کچھ، جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، غزل خوانی کرنے والے پرندے وہاں سے کوچ کر گئے اور الوؤں اور کوّوں نے ان کی جگہ لے لی۔

---

[1] سورہ قلم آیت 33

[2] مغرب کے وزن پر

ہاں جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کر دیتا ہے، تا کہ بندے اپنے ضعف اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

اس بارے میں کہ ''سبا'' کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے،

لیکن مشہور یہ ہے کہ ''سباء''، ''یمن'' کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام ''سباء'' تھا اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا۔ [1]

ایک درخشاں تمدن جو کفران نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت بیان کی ہے، اور ان کی زندگی کے جزئیات وخصوصیات کے اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: ''قوم سبا کے لئے ان کے محل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی''۔ [2]

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا کہ قوم سباء اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات وشرائط، اور اپنی خداداد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے، ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی وتباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قوی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انھوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا، یہ کتنی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران وآبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جائے۔

جب کہ زیر بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (ھم) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تفسیر کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سباء کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کہتا ہے: ''دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف''

یہ دونوں باغ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم بند کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے قوم سباء اس عظیم بند کے ذریعہ، جو انھوں نے اس علاقہ کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا، اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراواں سیلابوں کو، جو ویرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار وفضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے، اس بند کے پیچھے ذخیرہ کر لیں، اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لئے اپنے کنٹرول میں کر لیں اور اس طرح سے وسیع وعریض زمینوں کو زیر کاشت لائیں۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی وبربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا

---

[1] بعض ''سباء'' کو سرزمین یمن کا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان و ہد ہد کے قصہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے ''سبا'' کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کہتا ہے کہ ''میں سرزمین سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔''

[2] سورہ سباء آیت 15

یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی۔؟

یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے،لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے، بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن وامان ہوتا ہے،لہٰذا مزید کہتا ہے:''ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے رکھے''(تا کہ وہ آسانی اور امن وامان کے ساتھ ایک دوسری جگہ آجاسکیں)اور ہم نے ان سے کہا:''تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن وامان کے ساتھ سفر کرو،اوران آبادیوں میں چلو پھرو۔''[1]

اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور جچا تلا فاصلہ رکھتی تھیں،اور وحشی اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن وامان میں تھیں،اس طرح سے کہ لوگ زادراہ،سفرخرچ اور سواری کے بغیر ہی،اس صورت میں کہ نہ اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی،راستے کی بے امنی کی جہت سے، یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈراور خوف کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے:''ہم نے ان سے کہا کہ اپنے پروردگار کی فراواں روزی میں سے کھاؤاوراس کا شکرادا کرو۔ایک پاک وپاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی ومعنوی نعمتوں کے مجموعے کو زیباترین شکل میں منعکس کردیا ہے،مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک وپاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں،ظالموں،آفات وبلیات،خشک سالی وقحط اور بدامنی ووحشت جیسے طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک وپاکیزہ تھی، پاک وپاکیزہ ہوائیں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی،زمین زرخیز تھی اور درخت پُر بار تھے۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش وغفران ان کے شامل حال تھی،وہ ان کی تقصیروکوتاہی پر صرف نظر کرتا تھا اورانہیں مشمول عذاب اوران کی سرزمین کو بلاومصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا۔

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدردانی نہیں کی اور آزمائش کی بھٹی سے صحیح وسالم باہر نہ آسکے،انھوں نے کفران نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کرلی لہٰذا خدا نے بھی ان کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی۔

اسی لئے خداوندعالم فرماتا ہے:''وہ خدا سے روگرداں ہوگئے۔''[2]

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پرآکر پڑا،جیسا کہ قرآن کہتا ہے:''ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشت ناک سیلاب ان کے پاس بھیجا''اوران کی آباد سرزمین ایک ویرانے میں بدل گئی۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت وکیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے:''ہم نے ان کے دووسیع اور پرنعمت باغوں کو، بےقدروقیمت کڑوے پھلوں والے،اور جھاؤ کے بےمصرف درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا۔''

اوراس طرح سے ان تمام سرسبز وشاداب درختوں کے بجائے، بہت ہی کم قدروقیمت والے بیابانی اور جنگلی قسم کے چند ایک درخت، کہ شاید ان میں سے سب سے زیادہ اہم درخت وہی بیری کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں، باقی رہ گئے

---

[1] سورہ سباء آیت 18

[2] سورہ سباء آیت 16

تھے،(اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگالو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سر زمین پر کیا گزری؟)

ممکن ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان ہے کہ جو اس سر زمین میں باقی رہ گئے تھے،(درختوں کے) تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان دہ تھا، بعض بے مصرف تھے۔اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ ضرب المثل بن گئے

کس قدر عمدہ تعبیر ہے، قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے:''ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی لپیٹ کر رکھ دیا کہ: انہیں ہم نے دوسروں کے لئے داستان اور افسانہ بنا دیا۔''[1]

ہاں ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں، دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا:''اور ہم نے انہیں بری طرح سے حیران و پریشان کر دیا۔''[2]

ان کی سر زمین ایسی ویران ہوئی کہ ان میں وہاں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لئے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف رخ کرے اور خزاں کے پتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں، ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب کبھی لوگ یہ کہنا چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہوگئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ:(وہ قوم سباء اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے ہیں)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلہ''غسان'' شام کی طرف گیا اور''اسد'' عمان کی طرف،''خزاعہ'' تہامہ کی طرف، اور قبیلہ''انمار'' یثرب کی طرف۔

اور آخر میں فرماتا ہے:''یقیناً اس سرگزشت میں، صبر اور شکر کرنے والوں کے لئے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں۔''[3]

دو دوست یا دو برادر

قرآن میں دو دوست یا دو بھائی کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ان میں سے ہر ایک مستکبر ین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا۔ان کی طرز فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے موقف کا ترجمان تھے۔ پہلے فرمایا گیا ہے:''اے رسول ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ جو طرح طرح کے انگور تھے۔ان کے گرداگرد کھجور کے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی''۔[4]

ایسے باغ اور کھیتیاں جن میں ہر چیز خوب تھی۔انگور بھی تھے، کھجوریں بھی تھیں، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا۔خود کفیل کھیتیاں تھیں۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پڑے تھے۔درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور کھیتیوں کے پودے خوب

---

[1] سورہ سباء آیت 9
[2] سورہ سباء آیت 9
[3] سورہ سباء آیت 19
[4] سورہ کہف آیت 32

خوشہ دار تھے۔ ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ [1]

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہر چیز کے لئے مایہ حیات ہے، خصوصاً باغات و زراعت کے لئے، انہیں فراہم تھا: ''کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی''۔ [2]

''اس طرح سے ان باغات اور کھیتیوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی''۔ [3]

دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور تو کم ظرف اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا: ''میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں، میری آبرو، عزت اور حیثیت تجھ سے زیادہ ہے''۔ [4]

اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے۔ معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔ تو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جاوداں، مال و دولت کو ابدی اور مقام وحشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔ ''وہ مغرور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سرسبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔ اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا، نہر کے آب رواں کی لہروں پر نظر کی کہ جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا میرا خیال نہیں ہے کہ میرا باغ بھی کبھی اجڑے گا''۔ [5]

پھر اس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔ اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ عقیدہ قیامت کے منافی ہے لہٰذا وہ انکار قیامت کا سوچنے لگا۔ اس نے کہا: میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے۔ [6]

پھر مزید کہنے لگا: فرض کیا جائے کہ قیامت ہو بھی ''اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اس سے بہتر جگہ پاؤں گا''۔ [7]

وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا۔

مستضعفین کا جواب

قرآن میں اس مغرور، بے ایمان، خودغرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سنتا رہا تا کہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آ جائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا

---

[1] سورہ کہف آیت 32
[2] سورہ کہف آیت 33
[3] سورہ کہف آیت 33
[4] سورہ کہف آیت 34
[5] سورہ کہف آیت 34
[6] سورہ کہف آیت 35
[7] سورہ کہف آیت 36

جائے۔ ''اس نے کہا: کیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا''۔ [1]

اس کے بعد اس باایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لئے کہا: ''لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے، [2] اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے''۔

تو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل اور پانی فراواں ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق ورازق وہ ہے، تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید وایمان پر، ''اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا''۔ [3]

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشت میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ پھر اس کے بارے میں گفتگو آگے بڑھائی اور اس کی ملامت کرتے ہوئے کہا: ''جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے''۔ [4] تو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجالایا۔ ''تو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں''۔ [5]

اگر تو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلمیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں، اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: ''یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ میں مال واولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔ اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کرسکتا ہے''۔ [6]

''بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز وشاداب زمین ایسے چٹیل

---

[1] سورہ کہف آیت 36

[2] سورہ کہف آیت 37

[3] یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجود خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے ظاہراً سب سے پہلے اسے انکار خدا پر سرزنش کررہا ہے اور اسے تخلیق انسان کے حوالے سے خدائے عالم وقادر کی طرف متوجہ کررہا ہے کیونکہ تخلیق انسان دلائل توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

1۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکار خدا ہے کیونکہ معاد جسمانی کے منکر درحقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منتشر ہوجانے کے بعد مٹی پھر سے لباس حیات پہن سکے گی۔

2۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے۔ یعنی وہ اپنے لئے مالکیت کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جاودانی خیال کرتا تھا۔

3۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالی نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس باایمان شخص کی باتوں سے کیا جاسکتا ہے۔

[4] سورہ کہف آیت 38

[5] سورہ کہف آیت 38

[6] سورہ کہف آیت 39

میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں''۔[1]

یا زمین کو حکم دے کہ وہ ہل جائیں اور ''یہ چشمے اور نہریں اس کی تہہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تو انہیں پا نہ سکے''۔[2]

دراصل وہ کہتا ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم از کم سنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمان سے بجلی لمحہ بھر میں باغوں، گھروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیلوں یا بے آب و گیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تو نے سنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہوجاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اسطرح سے کہ وہ قابل اصلاح بھی نہیں رہتیں۔ جب تو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ غرور و غفلت کس بناء پر؟ تو نے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دل بستگی آخر کیوں؟ تو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ یہ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

اور یہ ان کا انجام

ان دونوں کی آپس کی گفتگو ختم ہوگئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے انہی جذبات اور طرز فکر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لئے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لئے باعث عبرت بن جائے گا۔

شاید اس وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذاب الٰہی نازل ہوا تباہ کن بجلی کی صورت میں یا وحشت ناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اس نے چند لمحوں میں ترو تازہ باغات، سر بہ فلک درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کردیں۔ ''اور عذاب الٰہی حکم خدا سے ہر طرف سے اس کے ثمرہ پر محیط ہوگیا اور اسے نابود کردیا''۔[3]

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اسکے ذہن میں تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا، جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اچانک اس نے وحشت ناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اوندھے پڑے تھے، کھیتیاں زیروزبر ہوچکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی بھی شاداب و سرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہوگیا۔ اس کے دل و دماغ سے سب غرور و نخوت جاتی رہی، اسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوا ہے، ''وہ مسلسل اپنے ہاتھ مل رہا تھا، اسے ان اخراجات کا خیال آرہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کئے تھے، اب وہ سب برباد ہوچکے تھے اور درخت اوندھے گرے پڑے تھے''۔[4]

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیہودہ سوچوں پر پشیمان ہوا، ''وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ

---

[1] سورہ کہف آیت 39

[2] سورہ کہف آیت 39 تا 40

[3] سورہ کہف آیت 40

[4] سورہ کہف آیت 42

قرار دیا ہوتا،اے کاش میں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا"۔[1]

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب والام کے سامنے وہ تن تنہا کھڑا تھا" خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبت عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا"[2] اور چونکہ اس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہو گیا،اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔لہٰذا" وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا"[3]

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات وخیالات کو زمین بوس اور باطل کر دیا،کبھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت وسرمایہ کبھی فنا ہو گا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور باایمان دوست کے سامنے غرور وتکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں،میرے مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔اسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کر سکے۔

برصیصائے عابد

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام "برصیصا" تھا۔[4]

جس نے طویل عرصہ تک عبادت پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جان بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت وسلامتی میسر ہو جاتی تھی ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تاکہ اس کو شفا حاصل ہو۔

اب شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اس عابد نے عورت کے ساتھ زیادتی کی اور کچھ دنوں بعد یہ بات کھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے)اس نے عورت کو قتل کر دیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا،اس عورت کے بھائی اس واقعہ سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اس قسم کے ظلم عظیم کا اقدام کیا ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی،یہاں تک کہ امیر شہر کے کانوں تک جا پہنچی،وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تاکہ حقیقت حال سے باخبر ہو،جس وقت وہ ظلم ثابت ہو گیا تو اس کو اس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے،اقرار گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے جس وقت وہ سولی پر چڑھا دیا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ میں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا،اب اگر جو کچھ میں کہوں وہ مان لے تو میں تیری نجات کا سامان فراہم کرتا ہوں،عابد نے کہا میں کیا کروں،اس نے کہا میرے لئے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 42

[2] سورہ کہف آیت 42

[3] سورہ کہف آیت 43

[4] سورہ کہف آیت 43

عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے، شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے، عابد نے گوشہ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجالایا اور اسی وقت مرگیا اور دنیا سے کافر گیا۔

انسانوں کو جلا دینے والی بھٹیاں

قرآن سورہ بروج میں فرماتا ہے: ''موت اور عذاب ہو تشدد کرنے والوں پر۔''

''وہی خندقیں جو آگ اور لکڑیوں سے پُر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے''۔

''جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) اور جو کچھ وہ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔''[1]

''اخدود'' عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پر تھیں تاکہ تشدد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔

یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرض وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین ومقرر واقعہ تھا، یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین ومؤرخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے ''قبیلہ حمیر'' کے ''ذونواس'' نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذونواس، جو حمیر نامی قبیلہ سے متعلق تھا یہودی ہو گیا اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہو گیا، اس نے اپنا نام یوسفؑ رکھا، ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی، ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے ذونواس کے ہم مسلک لوگوں نے اسے اس بات پر ابھارا کہ اہل نجران کو دین یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دین یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں، لیکن انھوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہو گئے، انھوں نے اپنے دین کو خیر باد نہ کہا، ذونواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کر پکڑ کر اسے آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا، اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلہ دار وگیر سے بچ کر نصاری بنی نجران کا ایک آدمی قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا، اس نے وہاں ذوانواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی، قیصر روم نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے، میں بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی ہے اور تمہارا ہمسایہ ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاری نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی، وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا، نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دین مسیح کے خاموش ہو جانے کا اسے بہت افسوس ہوا، اس نے ذونواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

---

[1] اس واقعہ کو بعض مفسرین نے سورہ حشر 16، 17 کے ذیل میں بیان کیا ہے

اس مقصد کے پیش نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور ایک گھمسان جنگ کے نتیجے میں اس نے ذونواس کو شکست فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا، جلد ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آ گئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا۔

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا، [1]

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔ [2]

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخر کار عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خون ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کو جلانے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرض وجود میں ائیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوئے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ''ہٹلر'' کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذاب حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ''ذونواس یہودی''، جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی بداعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا، جو کچھ اصحاب اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے۔ [3]

بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا

بیٹیوں کا زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی دردناک ہے [4] ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہو جاتی ہے۔

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کر لیا، سچا اسلام۔

ایک روز وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی

---

[1] سورۂ بروج آیت 4 تا 7

[2] ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے۔

[3] مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے، منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتاح رازی نے اپنی تفسیر میں، فخر رازی نے اپنے تفسیر کبیر میں، الوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح ہشام نے اپنی سیرت (جلد اول ص 35) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

[4] لیکن اس ضمن میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحاب اخدود صرف یمن میں ذونواس ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔

بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کئے ہیں۔

ایک روایت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا ہے ''وہ اہل کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے، ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے، لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا، بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنھوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی، جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوا دیا۔''

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے، شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور ''انتیاخوس'' نے انہیں خندق میں جلوایا تھا۔

بعض مفسرین نے اس وقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت دانیال علیہ السلام کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف توریت کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انہی پر منطبق کیا ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ اصحاب اخدود میں یہ سب کچھ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگرچہ اس کا مشہور معروف، مصداق سرزمین یمن کا ذونواس ہی ہے۔

ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا توّاب ورحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یارسول اللہ میرا گناہ بہت ہی بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے بڑا تو نہیں؟ وہ کہنے لگا: اب جب کہ آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں: زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چار سال بعد گھر واپس لوٹا، میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر آیا تو مجھے ایک بچی نظر آئی میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: ایک ہمسایے کی لڑکی ہے، میں نے سوچا گھنٹے بھر تک اپنے گھر چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی، مجھے علم نہ تھا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟

بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بیٹی پیدا ہوئی، یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔

اس شخص نے مزید کہا: میں نے وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا، صبح قریب تھی، میں بستر سے نکلا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی، میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا، اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینکتی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تا کہ وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی مظلومانہ فریاد کی؛ وہ کہتی تھی ابو جان آپ مجھ سے یہ سلوک کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آ پڑی بیٹی نے ہاتھ بڑھایا اور میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کے نالہ وفریاد کی آخری آواز بہ خاک دم توڑ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داستان بڑے غم کے عالم میں سنی، وہ بہت دکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جارہے تھے۔ اپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر رحمت خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا[1]۔

میں نے اپنی بارہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے

''قیس بن عاصم'' ابن تمیم کے سرداروں میں سے تھا، ظہور رسالت مآب کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اسے

---

[1] سورہ نحل آیت 58، 59

کچھ ہلکا کرے، اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنھوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے یہاں تیرہویں بیٹی ہوئی بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس نے یہ ظاہر کیا کہ نومولود مردہ پیدا ہوئی ہے، لیکن اسے چھپ چھپا کر اپنے قبیلے والوں کے یہاں بھیج دیا اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرے کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا

اس نے بہت آہ وزاری کی، میری منتیں کیں، گریہ وبکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ درگور کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے، آپؐ کی آنکھوں سے انسو جاری تھے کہ آپ نے فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کھایا جائے گا۔

اس کے بعد آپؐ نے قیس کی طرف رخ کیا اور یوں گویا ہوئے: تمہیں سخت ترین دن درپیش ہے۔

قیس نے عرض کیا: میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہو جائے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے غلام آزاد کر (کہ شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔)

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا ''صعصعہ بن ناجیۃ'' کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سی بری عادات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے 360 لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انہیں موت سے نجات بخشی، ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نومولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے، اس بچی کی نجات کے لئے اس نے اپنی سواری کا گھوڑا تک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دے دیئے اور اس بچی کو نجات دلائی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔[1]

اصحاب فیل

مفسرین اور مؤرخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق ''سیرۃ ابن ہشام'' و ''بلوغ الارب'' و ''بحار الانوار'' اور ''مجمع البیان'' سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ ''ذونواس'' نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے، اس لئے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ (قرآن نے اس واقعہ کو سورہ ''بروج'' میں ''اصحاب الاخدود'' کے عنوان سے بیان کیا ہے۔)

اس عظیم جرم کے بعد ''دوس'' نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو مسیحیت پر تھا جا پہنچا اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ ''روم'' اور ''یمن'' کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا اس نے حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کو خط لکھا کہ وہ ''ذونواس'' سے

---

[1] فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا؛

ترجمہ شعر: ''اور وہ شخص ہمارے خاندان سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا، اس نے لڑکیوں کو لے لیا اور انہیں زندگی عطا کی اور انہیں تہہ خاک دفن نہ ہونے دیا۔''

نصارائے نجران کا انتقام لے، اور اس خط کو اسی شخص کے ہاتھ ''نجاشی'' کے پاس روانہ کیا۔

''نجاشی'' نے ایک بہت بڑا لشکر جو ستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا ''ارياط'' نامی شخص کے کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔ ''ابرہہ'' بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔

''ذونواس'' کو شکست ہوئی، اور ''ارياط'' یمن کا حکمران ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد ''ابرہہ'' نے ارياط کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس واقعہ کی خبر نجاشی کو پہنچی تو اس نے ''ابرہہ'' کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ابرہہ نے اپنی نجات کے لئے اپنے سر کے بال منڈوا کر یمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کی نشانی کے طور پر نجاشی کے پاس بھیج دیئے، اور وفاداری کا اعلان کیا۔ نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرہہ کو معاف کر دیا، اور اسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

ابرہہ نے بہت بڑا گرجا گھر تعمیر کرایا

اس موقع پر ''ابرہہ'' نے اپنے حسن خدمت کو ثابت کرنے کے لئے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا گھر تعمیر کرایا۔ جس کی اس زمانے میں کرہ ارض پر کوئی مثل ونظیر نہ تھی۔ اور اس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کے بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کرلیا، اور یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ اس جگہ کو عرب کے حج کا مرکز بنا کر مکہ کی اہم مرکزیت کو وہاں منتقل کر دے۔

اس مقصد کے لئے اس نے ہر طرف عرب کے قبائل اور سرزمین حجاز میں بہت سے مبلغ بھیجے۔ عربوں نے، جو مکہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اور اسے ابراہیم علیہ السلام کے آثار میں سے جانتے تھے، اس سے خطرہ محسوس کیا۔ بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جا کر مخفی طور پر اس گرجے کو آگ لگا دی، اور دوسری روایت کے مطابق بعض نے اسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کر دیا۔ اور اس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا، اور ''ابرہہ'' کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنا دیا۔

ابرہہ حملہ کے لئے تیار

ظاہر ہے اس پر ''ابرہہ'' کو بہت غصہ آیا اور اس نے خانہ کعبہ کو کلی طور پر ویران کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس کا خیال تھا اس طرح وہ انتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ، جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے، مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے کچھ لوگوں کو مکہ والوں کے اونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لئے بھیجا۔ ان میں سے دوسو اونٹ عبدالمطلب علیہ السلام کے بھی لوٹ لئے گئے۔

''ابرہہ'' نے کسی آدمی کو مکہ کے اندر بھیجا اور اس سے کہا کہ رئیس مکہ کو تلاش کر کے اس سے کہنا کہ ''ابرہہ'' یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ: میں جنگ کرنے کے لئے نہیں آیا۔ میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کر دوں۔ اگر تم جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اونٹوں کا مالک ہوں

''ابرہہ'' کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس وشریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ سب نے ''عبدالمطلب علیہ السلام'' کی

طرف راہنمائی کی۔اس نے عبدالمطلب علیہ السلام کے سامنے ماجرا بیان کیا۔عبدالمطلب علیہ السلام نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

''ابرہہ'' کے قاصد نے عبدالمطلب علیہ السلام سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔ جب عبدالمطلب علیہ السلام اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپؑ کے بلند قد، حسین چہرے اور حد سے زیادہ رعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ ''ابرہہ'' ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور عبدالمطلب علیہ السلام کو اپنے پہلو میں بٹھایا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔اس کے بعد اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ ان سے پوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے؟

آپؑ نے مترجم سے کہا: میری حاجت یہ ہے کہ میرے دوسو اونٹ تیرے لشکری لوٹ کر لے گئے ہیں، تو انہیں حکم دے کہ وہ میرا مال واپس کردیں۔

''ابرہہ'' کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے مترجم سے کہا: ان سے کہو: جب میں نے تمہیں دیکھا تھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب تم نے یہ بات کہی تو میری نظر میں تمہاری تو قیر گھٹ گئی۔تم اپنے دوسو اونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن ''کعبہ'' کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ واجداد کا دین ہے، اور میں اسے ویران کرنے کے لئے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

عبدالمطلب علیہ السلام نے کہا: ''انارب الابل،وان للبیت رباً سیمنعه''۔

''میں اونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔'' (اس بات نے ابرہہ کو ہلا کررکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا)۔

عبدالمطلب علیہ السلام مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جائیں۔اور آپؑ خود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تاکہ دعا کریں اور مدد طلب کریں۔آپؑ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر مشہور اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''خدایا ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما۔''

''ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی دن ان کی صلیب اور ان کی قدرت تیری قدرتوں پر غلبہ حاصل کرے''۔

''اور اپنے شہروں کی تمام توانائیاں اور ہاتھیساتھ لے کر آئے ہیں تاکہ تیرے حرم کے ساکنوں کو قیدی بنالیں''۔

لاهم ان المرء یمنع رحله فامنع رحالك

لایغلبن صلیبهم و محالهم ابداً محالك

جروا جمیع بلادهم والفیل کی یبسواعیالك

لاهم ان المرء یمنع رحله فامنع عیالك

والنصر علی ال الصلیب و عابدیه الیوما لك

ترجمه:

خدایا ہر شخص اپنے گھر والوں کا دفاع کرتا ہے تو بھی اپنے حرم امن کے رہنے والوں کا

دفاع کر، اور آج اس حرم کے رہنے والوں کی آل صلیب اور اس کی عبادت کرنے
والوں کے برخلاف مدد فرما۔

اس کے بعد عبدالمطلب علیہ السلام اطراف مکہ کے ایک درہ کی طرف آئے، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ''ابوقبیس'' کے اوپر جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپؐ کے پاس آیا اور کہا: بابا جان سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آرہا ہے عبدالمطلب علیہ السلام خوش ہو گئے اور پکار کر کہا:

''اے جمعیت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لئے آرہی ہے''۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی۔

دوسری طرف سے ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار ہوا جس کا نام ''محمود'' تھا اس نے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لئے اطراف کے پہاڑوں سے مکہ کی طرف اترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا، لیکن جب وہ اس کا رخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑتا تھا۔ ابرہہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔

اسی اثناء میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ، چھوٹے چھوٹے پرندوں کے آن پہنچے، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتی سوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرہہ کے لشکر پر ایک عجیب وغریب وحشت طاری ہوگئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لئے یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خزاں کے پتوں کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ گر جاتے تھے۔

ایک پتھر خود ''ابرہہ'' کے آکر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اس کو صنعا (یمن کے پائے تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہ وہاں جا کر ہلاک ہو گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ چیچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔

ہاتھیوں کی تعداد جو ابرہہ اپنے ساتھ لے گیا تھا بعض نے وہی ''محمود'' ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے۔

مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپؐ کے نور وجود سے منور ہو گیا۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔

بہرحال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام ''عام الفیل'' (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا۔

ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل وطولانی داستان کو چند مختصر اور چبھنے والے انتہائی فصیح وبلیغ جملوں

میں بیان کر دیا ہے اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کئے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشانی دہی کرتا ہے کہ معجزات وخوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب وغریب اعجاز آمیز اور عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے کیونکہ طوفان نوح علیہ السلام کا عذاب، اور قوم لوط علیہ السلام کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

لیکن لشکر ابرہہ کی نابودی کی داستان ان سنگریزوں کے ذریعے جو چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چونچ اور پنجوں سے گرتے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طبعی حوادث سے مشابہ ہو۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریوں کا لانا، خاص طور سے انہی کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہو جانا، یہ سب کے سب خارق العادۃ امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔

وہی خدا جس نے انہی سنگ ریزوں کے اندر ایٹم کی قدرت پیدا کی ہے کہ اگر وہ آزاد ہو جائیں تو ایک عظیم تباہی پھیلا دیں۔ اس کے لئے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کر دے کہ ابرہہ کے لشکر کے جسموں کو "عصف ماکول" (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنا دے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرح اس حادثہ کی توجیہہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبا یا چیچک کے جراثیم تھے۔ اور اگر بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چیچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیپ آتی تھی، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چیچک میں مبتلا تھے۔ اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پسے ہوئے ایٹم تھے جن کے درمیان کی ہوا ختم ہو گئی تھی، اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کر دیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبعی بنانے کے لئے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب وغریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہر حال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔

ایک مسلم تاریخی روئیداد

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "اصحاب فیل" کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلم تھا کہ یہ ان کے لئے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر "الم تر" (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی سے دیکھا تھا، جو اس ماجرے کے مسلم ہونے کی

ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہو جاتا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس دین پر تھے؟

اس بات میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو کسی بت کو سجدہ کیا اور نہ ہی توحید کی راہ سے سرمو انحراف کیا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس دین پر پابند تھے؟ تو اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آپؐ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو مستقل، قانونی اور غیر منسوخ دین تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین ہی تھا۔

بعض علماء آپؐ کو دین ابراہیمی پر پابند سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جناب ابراہیم علیہ السلام شیخ الانبیاء اور ابوالانبیاء تھے اور قرآن کی بعض آیات میں بھی دین اسلام کا دین ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تعارف کروایا گیا ہے۔[1]

بعض علماء نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یقیناً آپؐ کسی دین پر تو پابند تھے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کونسا دین تھا؟

اگرچہ ان احتمالات میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ پر دلیل تو ہے لیکن مسلم کوئی بھی نہیں۔ البتہ ان تینوں اقوال سے ہٹ کر ایک چوتھا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے ایک خاص پروگرام رکھتے تھے، اور اسی پر عمل پیرا تھے اور درحقیقت یہ آپؐ کی ذات کے لیے مخصوص ایک دین تھا، جب تک کہ اسلام نازل نہیں ہو گیا''۔

اس قول پر وہ حدیث شاہد ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے: ''جس وقت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دودھ بڑھائی ہوئی، اللہ نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے کو آپؐ کے ساتھ ملا دیا، جو شب و روز مکارم الاخلاق اور نیک راستوں پر آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتا''۔

اس قول کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود یا نصاریٰ یا کسی اور مذہب کے عبادت خانوں میں عبادت کے لیے تشریف لے گئے ہوں، نہ تو کفار کے ساتھ مل کر کبھی کسی بت خانے میں گئے اور نہ ہی اہل کتاب کے ساتھ کسی عبادت خانے میں بلکہ ہمیشہ راہ توحید پر گامزن رہے اور آپؐ اخلاقی اصولوں اور عبادت الٰہی کے سخت پابند تھے۔

بحارالانوار میں علامہ مجلسی کے مطابق، بہت سی اسلامی روایات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر کے آغاز ہی سے روح القدس کے ساتھ موید تھے اور اس تائید کے ساتھ یقیناً وہ روح القدس کی راہنمائی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

علامہ مجلسی ذاتی طور پر اس بات کے معتقد ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے مقام نبوت پر فائز تھے، اور کبھی آپؐ ان کی آواز سنا کرتے تھے اور کبھی سچے خواب کی صورت میں آپؐ پر خدائی الہام ہوا کرتا تھا۔ چالیس سال

[1] "ملة ابیکم ابراھیم" (سورہ حج آیت 78)

کے بعد اعلان رسالت کا حکم ہوا اور اسلام و قرآن باقاعدہ طور پر آپؐ پر نازل ہوئے۔

علامہ مجلسی نے اپنے اس مدعا پر چھ دلائل ذکر کئے ہیں جن میں سے کچھ ان دلائل کے ساتھ ملتے جلتے اور ہم آہنگ ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

آغاز وحی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ حرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبرائیل آئے اور کہا: اے محمد پڑھ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ جبرائیل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا: پڑھ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اسی جواب کو دہرایا۔ اس کے بعد جبرائیل نے پھر وہی کام کیا اور وہی جواب سنا، اور تیسری بار کہا: (اقرا باسم ربك الذی خلق) [1]

جبرائیل علیہ السلام یہ بات کہہ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظروں سے غائب ہوگئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ سلام اللہ علیہا کے پاس آئے اور فرمایا: ''زملونی ودثرونی'' مجھے اڑھا دو اور کوئی کپڑا میرے اوپر ڈال دو تا کہ میں آرام کروں۔

''علامہ طبرسی'' بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ سے فرمایا: ''جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سن کر پریشان ہو جاتا ہوں''۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: خدا آپ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلہ رحم بجالاتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

''خدیجہ'' سلام اللہ علیہا کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ہم ورقہ بن نوفل کے پاس گئے (نوفل حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا زاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ''ورقہ'' سے بیان کیا ''ورقہ'' نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے: اے محمدؐ کہو:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ② الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ③ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ④ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ⑤
اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ⑥ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ⑦

اور کہو ''لا الہ الا اللہ'' اس کے بعد آپ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: ''آپ کو بشارت ہو پھر بھی آپ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل ہیں۔ آج کے بعد بہت جلد ہی جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو آپ کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا''۔

جب ورقہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اس روحانی شخص کو بہشت (برزخی جنت) میں

[1] سورہ علق آیت 1

دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی''۔[1]

پہلا مسلمان[2]

اس سوال کے جواب میں سب نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ عورتوں میں سے جو خاتون سب سے پہلے مسلمان ہوئیں وہ جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا تھیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفادار اور فداکار زوجہ تھیں باقی رہا مردوں میں سے تو تمام شیعہ علماء ومفسرین اور اہل سنت علماء کے ایک بہت بڑے گروہ نے کہا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مردوں میں سے دعوت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لبیک کہی علماء اہل سنت میں اس امر کی اتنی شہرت ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اس پر اجماع واتفاق کا دعویٰ کیا ہے ان میں سے حاکم نیشاپوری[3] نے کہا ہے:

مؤرخین میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں کہ علی ابن ابی طالب علیہما السلام اسلام لانے والے پہلے شخص ہیں۔ اختلاف اسلام قبول کرتے وقت ان کے بلوغ کے بارے میں ہے۔

جناب ابن عبدالبر (3) لکھتے ہیں: اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ خدیجہ سلام اللہ علیہا وہ پہلی خاتون ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور جو کچھ وہ لائے تھے اسی کی تصدیق کی۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے ان کے بعد یہی کام انجام دیا۔[4]

ابوجعفر الکافی معتزلی لکھتا ہے: تمام لوگوں نے یہی نقل کیا ہے کہ سبقت اسلام کا افتخار علی سے مخصوص ہے۔[5] قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، خود حضرت علی علیہ السلام سے اور صحابہ سے اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، ذیل میں چند روایات ہم نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

1۔ پہلا شخص جو حوض کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچے گا وہ شخص ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور وہ علی بن ابی طالب ہے۔[6]

2۔ علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: یہ پہلا شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور پہلا شخص ہے جو قیامت میں مجھ سے مصافحہ کرے گا اور یہ ''صدیق اکبر'' ہے۔[7]

---

[1] (2) یقینی طور پر مفسرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب نظر آتے ہیں جو مسلمہ طور پر جعلی وضعی گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلیات سے ہیں مثلاً یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القا آت نہ ہوں یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کرلیا کہ خود کو پہاڑ سے گرادیں اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانش مندی مدبریت صبر وتحمل وشکیبائی نفس پر تسلط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف ورکیک روایات دشمنان اسلام کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی مورد اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی۔

[2] اس سوال کو اکثر مفسرین نے سورہ توبہ آیت 100 ''السابقون الاولون'' کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

[3] مستدرک علی الصحیحین کتاب معرفت ص 22

[4] استیعاب، ج 2 ص 457

[5] الغدیر ج، 3 ص 237

[6] الغدیر ج، 3 ص 237

[7] الغدیر میں یہ حدیث مستدرک حاکم ج 2 ص 136، استیعاب ج 2 ص 457 اور شرح ابن ابی الحدید ج 3 ص 258 سے نقل کی گئی ہے۔

3۔ابوسعید خدری رسول اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان ہاتھ مار کر فرمایا: ''اے علی! تم سات ممتاز صفات کے حامل ہو کہ جن کے بارے میں روز قیامت کوئی تم سے حجت بازی نہیں کر سکتا۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو خدا پر ایمان لائے اور خدائی پیمانوں کے زیادہ وفادار ہو اور فرمان خدا کی اطاعت میں تم زیادہ قیام کرنیوالے ہو''۔ [1]

تحریف تاریخ

یہ امر لائق توجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی جو ایمان اور اسلام میں حضرت علی علیہ السلام کی سبقت کا سیدھے طریقے سے تو انکار نہیں کر سکے لیکن کچھ واضح البطلان علل کی بنیاد پر ایک اور طریقے سے انکار کی کوشش کی ہے یا اسے کم اہم بنا کر پیش کیا ہے بعض نے کوشش کی ہے ان کی جگہ حضرت ابوبکر کو پہلا مسلمان قرار دیں یہ لوگ کبھی کہتے ہیں کہ علی اس وقت دس سال کے تھے لہٰذا طبعاً نابالغ تھے اس بناء پر ان کا اسلام ایک بچے کے اسلام کی حیثیت سے دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ [2]

یہ بات واقعاً عجیب ہے اور حقیقت میں خود پیغمبر خدا پر اعتراض ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یوم الدار (دعوت ذی العشیرہ کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ نے اسلام اپنے قبیلے کے سامنے پیش کیا اور کسی نے حضرت علی علیہ السلام کے سوا اسے قبول نہ کیا اس وقت حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے ان کے اسلام کو قبول کیا بلکہ یہاں تک اعلان کیا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شیعہ سنی حافظان حدیث نے کتب صحاح اور مسانید میں نقل کی ہے، اسی طرح کئی مؤرخین اسلام نے اسے نقل کیا ہے یہ نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کی اس کم سنی میں نہ صرف ان کا اسلام قبول کیا ہے بلکہ ان کا اپنے بھائی، وصی اور جانشین کی حیثیت سے تعارف بھی کروایا ہے۔ [3]

کبھی کہتے ہیں کہ عورتوں میں پہلی مسلمان خدیجہ تھیں، مردوں میں پہلے مسلمان ابوبکر تھے اور بچوں میں پہلے مسلمان علی علیہ السلام تھے یوں دراصل وہ اس امر کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں۔ [4]

حالانکہ اول تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی اہمیت اس وقت کی سن سے اس امر کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ قرآن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے: ''ہم نے اسے بچپن کے عالم میں حکم دیا''۔ [5]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بچپن کے عالم میں بھی بول اٹھے اور افراد ان کے بارے میں شک کرتے تھے ان سے کہا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے آسمانی کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے''۔ [6]

---

[1] الغدیر ہی میں یہ حدیث طبرانی اور بیہقی سے نقل کی گئی ہے نیز بیہقی نے مجمع میں، حافظ گنجی نے کفایۃ کمال میں اور کنز العمال میں نقل کی ہے۔

[2] الغدیر میں یہ حدیث حلیۃ الاولیاء ج اص 66 کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

[3] یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں سورہ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر کی ہے۔
یہ تعبیر مشہور اور متعصب مفسر مؤلف المنار نے بھی سورہ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر ہے۔

[4] یہ حدیث مختلف عبارات میں نقل ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے ابوجعفر اسکافی نے کتاب ''نہج العثمانیہ'' میں، برہان الدین نے ''نجباالانبا'' میں، ابن اثیر نے کامل میں اور بعض دیگر علماء نے نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لئے الغدیر، عربی کی جلد دوم ص 278 تا 286 کی طرف رجوع کریں)

[5] سورہ مریم آیت 12

[6] سورہ مریم آیت 30

ایسی آیات کو اگر ہم مذکورہ حدیث سے ملا کر دیکھیں کہ جس میں آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب المنار کی متعصّبانہ گفتگو کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر تاریخی لحاظ سے مسلّم نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص تھے بلکہ تاریخ وحدیث کی بہت سی کتب میں ان سے پہلے بہت سے افراد کے اسلام قبول کرنے ذکر ہے۔ یہ بحث ہم اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خود اپنے ارشادات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں پہلا مومن، پہلا مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پہلا نماز گذار ہوں اور اس سے آپ نے اپنے مقام وحیثیت کو واضح کیا ہے یہ بات آپ سے بہت سی کتب میں منقول ہے۔

علاوہ ازیں ابن ابی الحدید مشہور عالم ابوجعفر اسکافی معتزلی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر اسلام میں سبقت رکھتے تھے اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر خود انھوں نے اس سے کسی مقام پر اپنی فضیلت کے لیے استدلال کیوں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے حامی کسی صحابی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ [1]

دعوت ذوالعشیرۃ

تاریخ اسلام کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال اس دعوت کا حکم ہوا کیونکہ اب تک آپ کی دعوت مخفی طور پر جاری تھی اور اس مدت میں بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾"۔ [2]

اور یہ آیت بھی "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾"۔ [3] تو آپ کھلم کھلا دعوت دینے پر مامور ہو گئے اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم ہوا۔

اس دعوت اور تبلیغ کی اجمالی کیفیت کچھ اس طرح سے ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جناب ابوطالب علیہ السلام کے گھر میں دعوت دی اس میں تقریباً چالیس افراد شریک ہوئے آپ کے چچاؤں میں سے ابوطالب علیہ السلام، حمزہ علیہ السلام اور ابولہب نے بھی شرکت کی

کھانا کھا لینے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے بڑھ کر کچھ ایسی باتیں کیں جس سے سارا مجمع منتشر ہو گیا لہٰذا آپ نے انہیں کل کے کھانے کی دعوت دے دی۔

دوسرے دن کھانا کھانے کے بعد آپ نے ان سے فرمایا: "اے عبدالمطلب کے بیٹو: پورے عرب میں مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو اپنی قوم کے لیے مجھ سے بہتر چیز لایا ہو، میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں اس دین کی دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تاکہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہو"؟ سب لوگ خاموش رہے سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جو سب سے کم سن تھے، علی علیہ السلام اٹھے اور عرض کی: "اے اللہ کے رسول اس راہ میں میں آپ کا یار و مددگار رہوں گا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ علی علیہ السلام کی گردن پر رکھا اور فرمایا:

"ان هذا اخي ووصي وخليفتي فيكم فاسمعوا له واطيعوه"۔

---

[1] الغدیر ج2 ص240

[2] سورہ شعراء آیت214

[3] سورہ حجر آیہ94

یہ(علی علیہ السلام) تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی باتوں کو سنو اور اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔ یہ سن کر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی، ابوطالب علیہ السلام سے کہنے لگے،''اب تم اپنے بیٹے کی باتوں کو سنا کرو اور اس کے فرمان پر عمل کیا کرنا''۔[1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دنوں کس حد تک تنہا تھے اور لوگ آپ کی دعوت کے جواب میں کیسے کیسے تمسخر آمیز جملے کہا کرتے تھے اور علی علیہ السلام ان ابتدائی ایام میں جب کہ آپ بالکل تنہا تھے کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدافع بن کر آپ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت قریش کے ہر قبیلے کا نام لے لے کر انہیں بلایا اور انہیں جہنم کے عذاب سے ڈرایا، کبھی فرماتے:

"یابنی کعب انقذوا انفسکم من النار"۔

اے بنی کعب: خود کو جہنم سے بچاؤ، کبھی فرماتے:''یا بنی عبد الشمس''، کبھی فرماتے:''یا بنی عبد مناف''۔کبھی فرماتے:''یا بنی ہاشم''۔کبھی فرماتے: "یابنی عبد المطلب انقذوا انفسکم النار"۔تم خود ہی اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، ورنہ کفر کی صورت میں میں تمہارا دفاع نہیں کرسکوں گا۔

ایمان ابوطالب علیہ السلام

تمام علمائے شیعہ اور اہل سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً''ابن ابی الحدید'' شارح نہج البلاغہ نے اور''قسطلانی'' نے ارشاد الساری میں اور''زینی دحلان'' نے سیرۃ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کو مومنین اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے۔اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام پر ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے جا تہمیں کیوں لگائی گئیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا کرتا تھا اور بار ہا خود اپنے فرزند کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مقدس کو بچانے کے لئے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنا دیا کرتا تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے۔

یہی سبب ہے کہ دقت نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کے خلاف، مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو''شجرہ خبیثہ بنی امیہ'' کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابوطالب علیہ السلام کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے قربت رکھتا ہے ایسے ناجو ان مردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا، حقیقت میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے اس کے وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ تھے۔

---

[1] اس روایت کو بہت سے اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری مؤرخ ابن اثیر نے یہ واقعہ اپنی کتاب''کامل'' میں اور''ابوالفداء'' نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے بہت سے مؤرخین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے مزید آگاہی کے لئے کتاب''المراجعات''ص130 کے بعد سے اور کتاب''احقاق الحق'' ج2،ص62 ملاحظہ فرمائیں۔

ایمان ابوطالب پر سات دلیل

ہم یہاں پر ان بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمان ابوطالب علیہ السلام کی گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں تفصیلات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

1۔حضرت ابوطالب علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کا بھتیجا مقام نبوت تک پہنچے گا کیونکہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جس سفر میں حضرت ابوطالب علیہ السلام قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سالہ بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔اس سفر میں انہوں نے آپ سے بہت سی کرامات مشاہدہ کیں۔

ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جونہی قافلہ ''بحیرا'' نامی راہب کے قریب سے گزرا جو قدیم عرصے سے ایک گرجے میں مشغول عبادت تھا اور کتب عہدین کا عالم تھا، تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لئے جاتے تھے، تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جم کر رہ گئیں، جن کی عمر اس وقت بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بحیرا نے تھوڑی دیر کے لئے حیران و ششدر رہنے اور گہری اور پُر معنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا: یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

''بحیرا'' نے کہا: اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اسکی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں۔

ابوطالب علیہ السلام اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہل سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل ونحل) اور دوسرے علماء کی نقل کے مطابق: ''ایک سال آسمان مکہ نے اپنی برکت اہل مکہ سے روک لی اور سخت قسم کی قحط سالی نے لوگوں کو گھیر لیا تو ابوطالب علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے بھتیجے محمد کو جو ابھی شیر خوار ہی تھے لایا جائے، جب بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا انہیں دیا گیا تو وہ اسے لینے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تضرع و زاری کے ساتھ اس طفل شیر خوار کو تین مرتبہ اوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے، پروردگارا، اس بچہ کے حق کا واسطہ ہم پر برکت والی بارش نازل فرما۔

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق کے کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا کہ یہ خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے''۔

اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے کہ یہی واقعہ جو ابوطالب علیہ السلام کی اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت و رسالت سے آگاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے ان کے پیغمبر پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابوطالب علیہ السلام نے بعد میں اشعار ذیل اسی واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے:

و ابيض يستسقى الغمام بوجهه
ثمال اليتامى عصمة الارامل

''وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برساتے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں''

يلوذ به الهلاك من آل هاشم

فهم عنده فی نعمة و فواضل

''بنی ہاشم میں سے جو چل بسے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں اور احسانات سے بہرہ مند ہوتے ہیں،،

وميزان عدله يخيس شعيرة

ووزان صدق وزنه غير هائل

''وہ ایک ایسی میزان عدالت ہے کہ جو ایک جَو برابر بھی ادھر ادھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے کہ جس کے وزن کرنے میں کسی شک وشبہ کا خوف نہیں ہے''

قحط سالی کے وقت قریش کا ابوطالب علیہ السلام کی طرف متوجہ ہونا اور ابوطالب علیہ السلام کا خدا کو آنحضرتؐ کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مؤرخین نے بھی نقل کیا ہے۔[1]

اشعار ابوطالب علیہ السلام زندہ گواہ

2۔اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابوطالب علیہ السلام کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں ان میں سے کچھ اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

والله ان يصلوا اليك بجمعهم

حتیٰ اوسد فی التراب دفينا

''اے میرے بھتیجے خدا کی قسم جب تک ابوطالب علیہ السلام مٹی میں نہ سو جائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنا لے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے''

فاصدع بأمرك ماعليك غضاضته

وابشر بذاك وقرمنك عيونا

''لہٰذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کر، بشارت دے اور آنکھوں کو ٹھنڈا کر''۔

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی

ولقد دعوت و كنت ثم امينا

''تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف ومقصد صرف پند ونصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہے''

ولقد علمت ان دين محمدٌ

[1] علامہ امینی نے اسے اپنی کتاب ''الغدیر'' میں ''شرح بخاری''، ''المواهب اللدنیہ''، ''الخصائص الکبری''، ''شرح بجهۃ المحافل''، ''سیرہ حلبی''، ''سیرہ نبوی'' اور ''طلبۃ الطالب'' سے نقل کیا ہے۔

من خير اديان البرية ديناً

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمد کا دین ومکتب تمام دینوں اور مکتبوں میں سب سے بہتر دین ہے''۔

اور یہ اشعار بھی انہوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمد اً

رسولا کموسیٰ خط فی اول الکتب

''اے قریش کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پالیا ہے''۔

وان علیه فی العباد محبة

ولاحیف فی من خصه الله فی الحب

''خدا کے بندے اس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند متعال نے اپنی محبت کے لئے مخصوص کرلیا ہو اس شخص سے یہ لگاؤ بے موقع نہیں ہے۔''

ابن ابی الحدید نے جناب ابوطالب علیہ السلام کے کافی اشعار نقل کرنے کے بعد (کہ جن کے مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے ''متشابہات القرآن'' میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے: ''ان تمام اشعار کے مطالعہ سے ہمارے لئے کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ابوطالب علیہ السلام اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے''۔

3۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کے فدا کار چچا ابوطالب علیہ السلام کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں منجملہ ان کے کتاب ''ابوطالب علیہ السلام مومن قریش'' کے مؤلف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابوطالب علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تشیع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے ضمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپ کررہے تھے آپ یہ بھی کہتے تھے:

''ہائے میرے بابا ہائے ابوطالب علیہ السلام میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں کس طرح آپ کی مصیبت کو میں بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش اور تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانہ چشم میں اور روح بدن میں''۔

نیز آپ ہمیشہ یہ کیا کرتے تھے: ''مانالت منی قریش شیئًا اکرھه حتیٰ مات ابوطالب''

''اہل قریش اس وقت تک کبھی میرے خلاف ناپسندیدہ اقدام نہ کرسکے جب تک ابوطالب علیہ السلام کی وفات نہ ہوگئی''۔

4۔ایک طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوطالب علیہ السلام کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابوطالب علیہ السلام کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہرومحبت کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہوسکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابوطالب علیہ السلام سے عشق کی حد تک مہرومحبت رکھیں۔

5۔ان احادیث میں بھی کہ جو اہل بیت پیغمبر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایمان واخلاص کے

بڑی کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، جن کا یہاں نقل کرنا طول کا باعث ہوگا، یہ احادیث منطقی استدلالات کی حامل ہیں ان میں سے ایک حدیث چوتھے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابوطالب علیہ السلام مومن تھے؟ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا: "ان هنا قوماً یزعمون انه کافر"، اس کے بعد فرمایا کہ: ''تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابوطالب علیہ السلام کافر تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ اس عقیدہ کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوطالب علیہ السلام پر طعن کرتے ہیں کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلم ہے کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور وہ ابوطالب علیہ السلام کی زوجیت میں ابوطالب علیہ السلام کی وفات تک رہیں۔''

ابوطالب علیہ السلام تین سال تک شعب میں

6۔ ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے اگر انسان ہر چیز میں ہی شک کریں تو کم از کم اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ابوطالب علیہ السلام اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجہ اول کے حامی و مددگار تھے، ان کی اسلام اور پیغمبر کی حمایت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصّبات سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔

اس کا زندہ نمونہ شعب ابوطالب علیہ السلام کی داستان ہے۔ تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کر لیا اور اپنے ہر قسم کے روابط ان سے منقطع کر لئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واحد حامی اور مدافع، ابوطالب علیہ السلام نے اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا اور برابر تین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا اور بنی ہاشم کو ایک درہ کی طرف لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور ''شعب ابوطالب'' کے نام سے مشہور تھا اور وہاں پر سکونت اختیار کر لی۔

ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کہ قریش کے حملوں سے بچانے کے لئے کئی ایک مخصوص قسم کے برج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے بستر سے اٹھاتے اور دوسری جگہ ان کے آرام کے لئے مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علی کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علی علیہ السلام کہتے: ''بابا جان میں تو اسی حالت میں قتل ہو جاؤں گا'' تو ابوطالب علیہ السلام جواب میں کہتے: میرے پیارے بچے بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ موت کی طرف رواں دواں ہے، میں نے تجھے فرزند عبداللہ کا فدیہ قرار دیا ہے۔

یہ بات اور بھی طالب توجہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں راہ محمدؐ میں قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کا اطاعت گزار اور احمد مجتبیٰ کی نصرت و مدد کے لئے آمادہ و تیار ہوں۔

قارئین کرام ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب علیہ السلام کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہمصدا ہو کر کہے گا:

و لو لا ابوطالب وابنه لما مثل الدین شخصا و قاما

فذاك بمكة آوى و حامى و هذا بیثرب جس الحماما

''اگر ابوطالب علیہ السلام اور ان کا بیٹا نہ ہوتے تو ہرگز مکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا قد سیدھا نہ کرتا، ابوطالب علیہ السلام تو مکہ میں

پیغمبر کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور علی یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ میں گرداب موت میں ڈوب گئے''

ابوطالب علیہ السلام کا سال وفات ''عام الحزن''

7۔''ابوطالب علیہ السلام کی تاریخ زندگی، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان کی عظیم قربانیاں اور رسول اللہ اور مسلمانوں کی ان سے شدید محبت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی موت کے سال کا نام ''عام الحزن'' رکھا یہ سب باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کو اسلام سے عشق تھا اور وہ جو پیغمبر اسلام کی اس قدر مدافعت کرتے تھے وہ محض رشتہ داری کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس دفاع میں آپ کی حیثیت ایک مخلص، ایک جاں نثار اور ایسے فدا کار کی تھی جو اپنے رہبر اور پیشوا کا تحفظ کر رہا ہو۔''

ابولہب کی دشمنی

اس کا نام ''عبدالعزیٰ'' (عزیٰ بت کا بندہ) اور اس کی کنیت ''ابولہب'' تھی۔ اس کے لیے اس کنیت کا انتخاب شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کا چہرہ سرخ اور بھڑکتا ہوا تھا، چونکہ لغت میں لہب آگ کے شعلہ کے معنی میں ہے۔

وہ اور اس کی بیوی ''ام جمیل'' جو ابوسفیان کی بہن تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت بدزبان اور سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔

''طارق محارق'' نامی ایک شخص کہتا ہے: میں ''ذی المجاز'' کے بازار میں تھا۔[1]

اچانک میں نے ایک جوان کو دیکھا جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا: اے لوگو: لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلو تو نجات پا جاؤ گے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اس کے پاؤں کے پچھلے حصہ پر پتھر مارتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سے خون جاری تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اے لوگو یہ جھوٹا ہے اس کی بات نہ ماننا''۔

میں نے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کا گمان یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور یہ بوڑھا اس کا چچا ابولہب ہے جو اس کو جھوٹا سمجھتا ہے۔

''ربیع بن عباد'' کہتا ہے: میں اپنے باپ کے ساتھ تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ وہ قبائل عرب کے پاس جاتے اور ہر ایک کو پکار کر کہتے: میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں: تم خدائے یگانہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

جب وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا تو ایک خوبرو بھینگا آدمی جوان کے پیچھے پیچھے تھا، پکار کر کہتا: اے فلاں قبیلے: یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ بت اور اپنے ہم پیمان جنوں کو چھوڑ دو اور اس کی بدعت وضلالت کی پیروی کرنے لگ جاؤ اس کی نہ سننا، اور اس کی پیروی نہ کرنا''۔

میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ ''اس کا چچا ابولہب ہے''۔

ابولہب پیغمبر کا پیچھا کرتا رہا

جب مکہ سے باہر کے لوگوں کا کوئی گروہ اس شہر میں داخل ہوتا تھا تو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی رشتہ داری اور سن وسال کے

[1] ذی المجاز عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے۔

لحاظ سے بڑا ہونے کی بنا پر ابولہب کے پاس جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تحقیق کرتا تھا وہ جواب دیتا تھا: محمد ایک جادوگر ہے، وہ بھی پیغمبر سے ملاقات کئے بغیر ہی لوٹ جاتے اسی اثناء میں ایک ایسا گروہ آیا جنہوں نے یہ کہا کہ ہم تو اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے ابولہب نے کہا: ''ہم مسلسل اس کے جنون کا علاج کر رہے ہیں: وہ ہلاک ہو جائے''۔

وہ اکثر مواقع پر سایہ کی طرح پیغمبر کے پیچھے لگا رہتا تھا اور کسی خرابی سے فروگذاشت نہ کرتا تھا خصوصاً اس کی زبان بہت ہی گندی اور آلودہ ہوتی تھی اور وہ رکیک اور چبھنے والی باتیں کیا کرتا تھا اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب دشمنوں کا سرغنہ شمار ہوتا تھا اسی بناء پر قرآن کریم اس پر اور اس کی بیوی ام جمیل پر ایسی صراحت اور سختی کے ساتھ تنقید کر رہا ہے وہی ایک اکیلا ایسا شخص تھا جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بنی ہاشم کی حمایت کے عہد و پیمان پر دستخط نہیں کئے تھے اور اس نے آپ کے دشمنوں کی صف میں رہتے ہوئے دشمنوں کے عہد و پیمان میں شرکت کی تھی۔

ابولہب کے ہاتھ کٹ جائیں

''ابن عباس'' سے نقل ہوا ہے کہ جس وقت آیہ "وانذر عشيرتك الاقربين" نازل ہوئی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرنے اور اسلام کی دعوت دینے پر مامور ہوئے، تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہ صفا پر آئے اور پکار کر کہا'' یا صباحاه'' (یہ جملہ عرب اس وقت کہتے تھے جب ان پر دشمن کی طرف سے غفلت کی حالت میں حملہ ہو جاتا تھا تا کہ سب کو باخبر کر دیں اور وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، لہٰذا کوئی شخص ''یا صباحاه'' کہہ کر آواز دیتا تھا ''صباح'' کے لفظ کا انتخاب اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ عام طور پر غفلت کی حالت میں حملے صبح کے وقت کیے جاتے تھے۔

مکہ کے لوگوں نے جب یہ صدا سنی تو انہوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو فریاد کر رہا ہے۔

کہا گیا کہ یہ ''محمد'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ کچھ لوگ آپؐ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے قبائل عرب کو ان کے نام کے ساتھ پکارا۔ آپؐ کی آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا:

''مجھے بتلاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے والے ہیں، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے''۔

انہوں نے جواب دیا: ''ہم نے آپؐ سے کبھی بھی جھوٹ نہیں سنا''۔

آپؐ نے فرمایا:

"انی نذیر لكم بين يدي عذاب شديد"۔

''میں تمہیں خدا کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں''۔

(''میں تمہیں توحید کا اقرار کرنے اور بتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں'') جب ابولہب نے یہ بات سنی تو اس نے کہا:

"تبا لكا ما جمعتنا الا لهذا؟"۔

تو ہلاک ہو جائے کیا تو نے ہمیں صرف اس بات کے لیے جمع کیا ہے؟

اس موقع پر یہ سورہ نازل ہوا: (تبت يدا ابي لهب و تب)۔[1]

---

[1] سورہ لہب آیت 1 تا 2

''اے ابولہب تو ہی ہلاک ہو اور تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تو ہی زیاں کار اور ہلاک ہونے والا ہے، اس کے مال و ثروت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اس نے، اسے ہرگز کوئی فائدہ نہیں دیا اور وہ اسے عذاب الٰہی سے نہیں بچائے گا''۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دولت مند مغرور شخص تھا جو اپنی اسلام دشمن کوششوں کے لئے اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتا تھا۔

بعد میں قرآن مزید یہ کہتا ہے، ''وہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہو گا جس کے شعلے بھڑکنے والے ہیں''۔[1]

اگر اس کا نام ''ابولہب'' ہے تو اس کے لئے عذاب بھی ''بولہب'' ہے یعنی اس کے لئے بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلہ ہیں۔

ایندھن اٹھائے ہوئے

قرآن کریم نے اس کے بعد اس کی بیوی ''ام جمیل'' کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''اس کی بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہو گی، جو اپنے دوش پر ایندھن اٹھاتی ہے''۔[2]

''اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسی یا گردن بند ہے''۔[3]

''فی جیدھا حبل من مسد''

''مسد'' (بروزن حسد) اس رسی کے معنی میں ہے جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ''مسد'' وہ رسی ہے جو جہنم میں اس کی گردن میں ڈالیں گے جس میں کھجور کے پتوں جیسی سختی ہو گی اور اس میں آگ کی حرارت اور لوہے کی سنگینی ہو گی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ بڑے لوگوں کی عورتیں اپنی شخصیت کو آلات و زیورات خصوصاً گردن کے قیمتی زیورات سے زینت دینے میں خاص بات سمجھتی ہیں، لہٰذا خدا قیامت میں اس مغرور و خود پسند عورت کی تحقیر کے لیے لیف خرما کا ایک گردن بند اس کی گردن میں ڈال دے گا یا یہ اصلاً اس کی تحقیر سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر کے بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ ''ام جمیل'' کے پاس جواہرات کا ایک بہت ہی قیمتی گردن بند تھا اور اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کرے گی لہٰذا اس کے اس کام کے بدلے میں خدا نے بھی اس کے لئے ایسا عذاب مقرر کر دیا ہے۔

ابولہب کا عبرت ناک انجام

روایات میں آیا ہے کہ جنگ ''بدر'' اور سخت شکست کے بعد، جو مشرکین قریش کو اٹھانی پڑی تھی، ابولہب نے جو خود میدان جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، ابوسفیان کے واپس آنے پر اس ماجرے کے بارے میں سوال کیا، ابوسفیان کے قریش کے لشکر کی شکست اور سرکوبی کی کیفیت بیان کی، اس کے بعد اس نے مزید کہا: خدا کی قسم ہم نے اس جنگ میں آسمان و زمین کے درمیان ایسے سوار دیکھے ہیں جو محمد کی مدد کے لیے آئے تھے۔

اس موقع پر ''عباس'' کے ایک غلام ''ابورافع'' نے کہا: میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا کہ وہ آسمانی

---

[1] سورہ لہب آیت 3

[2] سورہ تبت آیت 4

[3] سورہ تبت آیت 4

فرشتے تھے۔

اس سے ابولہب بھڑک اٹھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا، مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھے پیٹنے چلے جارہا تھا وہاں عباس کی بیوی ''ام الفضل'' بھی موجود تھی اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور ابولہب کے سر پر دے ماری اور کہا: ''کیا تو نے اس کمزور آدمی کو اکیلا سمجھا ہے؟''

ابولہب کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا سات دن کے بعد اس کے بدن میں بدبو پیدا ہوگئی، اس کی جلد میں طاعون کی شکل کے دانے نکل آئے اور وہ اسی بیماری سے واصل جہنم ہوگیا۔

اس کے بدن سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے وہ اسے مکہ سے باہر لے گئے اور دور سے اس پر پانی ڈالا اور اس کے بعد اس کے اوپر پتھر پھینکے یہاں تک کہ اس کا بدن پتھروں اور مٹی کے نیچے چھپ گیا۔

ابوسفیان وابوجہل چھپ کر قرآن سنتے ہیں

ایک شب ابوسفیان، ابوجہل اور مشرکین کے بہت سے دوسرے سردار جداگانہ طور پر اور ایک دوسرے سے چھپ کر آنحضرت ﷺ سے قرآن سننے کے لئے آگئے آپ اس وقت نماز پڑھنے میں مشغول تھے اور ہر ایک، ایک دوسرے سے بالکل بے خبر علیحدہ علیحدہ مقامات پر چھپ کر بیٹھ گئے چنانچہ وہ رات گئے تک قرآن سنتے رہے اور جب واپس پلٹنے لگے تو اس وقت صبح کی سفیدی نمودار ہوچکی تھی۔ اتفاق سے سب نے واپسی کے لیے ایک ہی راستے کا انتخاب کیا اور ان کی اچانک ایک دوسرے سے ملاقات ہوگئی اور ان کا بھانڈا وہیں پر پھوٹ گیا انھوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور اس بات پر زور دیا کہ آئندہ ایسا کام نہیں کریں گے، اگر نا سمجھ لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ شک وشبہ میں پڑ جائیں گے۔

دوسری اور تیسری رات بھی ایسا ہی اتفاق ہوا اور پھر وہی باتیں دہرائی گئیں اور آخری رات تو انھوں نے کہا جب تک اس بات پر پختہ عہد نہ کرلیں اپنی جگہ سے ہلیں گے نہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر ہر ایک نے اپنی راہ لی۔ اسی رات کی صبح اخنس بن شریق نامی ایک مشرک اپنا عصا لے کر سیدھا ابوسفیان کے گھر پہنچا اور اسے کہا: تم نے جو کچھ محمدؐ سے سنا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا: خدا کی قسم: کچھ مطالب ایسے سنے ہیں جن کا معنی بخوبی سمجھ سکا ہوں اور کچھ مسائل کی مراد اور معنی کو نہیں سمجھ سکا۔

اخنس وہاں سے سیدھا ابوجہل کے پاس پہنچا اس سے بھی وہی سوال کیا: تم نے جو کچھ محمد سے سنا ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

ابوجہل نے کہا: سنا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری اور اولاد عبد مناف کی قدیم زمانے سے رقابت چلی آرہی ہے انھوں نے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ہم نے بھی کھلایا، انھوں نے پیدل لوگوں کو سواریاں دیں ہم نے بھی دیں، انھوں نے لوگوں پر خرچ کیا، سو ہم نے بھی کیا گویا ہم دوش بدوش آگے بڑھتے رہے۔ جب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس وحی آسمانی بھی آتی ہے تو اس بارے میں ہم ان کے ساتھ کس طرح برابری کرسکتے ہیں؟ اب جب کہ صورت حال یہ ہے تو خدا کی قسم ہم نہ تو کبھی اس پر ایمان لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔ اخنس نے جب یہ بات سنی تو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ [1]

جی ہاں: قرآن کی کشش نے ان پر اس قدر اثر کردیا کہ وہ سپیدہ صبح تک اس الٰہی کشش میں گم رہے لیکن خودخواہی، تعصب

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص337، اور تفسیر فی ظلال القرآن جلد 6 ص173

اور مادی فوائدان پر اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نور الٰہی میں اس قدر طاقت ہے کہ ہر آمادہ دل کو وہ جہاں بھی ہو، اپنی طرف جذب کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس (قرآن) کا ان آیات میں ''جہاد کبیر'' کہہ کر تعارف کروایا گیا ہے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن ''اخنس بن شریق'' کا ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا جب کہ وہاں پر اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ تو اخنس نے اس سے کہا: سچ بتاؤ محمدؐ سچا ہے، یا جھوٹا؟ قریش میں سے کوئی شخص سوا میرے اور تیرے یہاں موجود نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سنے۔

ابوجہل نے کہا: وائے ہو تجھ پر خدا کی قسم وہ میرے عقیدے میں سچ کہتا ہے اور اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اگر یہ اس بات کی بنا ہو جائے کہ محمدؐ کا خاندان سب چیزوں کو اپنے قبضہ میں کر لے، حج کا پرچم، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی پردہ داری اور مقام نبوت تو باقی قریش کے لئے کیا باقی رہ جائے گا۔[2]

اسلام کے پہلے مہاجرین

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے قریش نے قبائل عرب کو یہ نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم وقبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہاد آزادی شروع کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لئے حجاز سے باہر قیام گاہ مہیا کرنے کے لئے انہیں ہجرت کا حکم دے دیا اور اس مقصد کے لئے حبشہ کو منتخب فرمایا اور کہا کہ وہاں ایک نیک دل بادشاہ ہے جو ظلم وستم کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ کوئی مناسب موقع ہمیں عطا فرمائے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد نجاشی سے تھی (نجاشی ایک عام نام تھا جیسے ''کسریٰ'' جو حبشہ کے تمام بادشاہوں کا خاص لقب تھا لیکن اس نجاشی کا اصل نام جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عصر تھا اصحمہ تھا جو کہ حبشہ کی زبان میں عطیہ وبخشش کے معنی میں ہے)۔

مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب جعفر بن ابوطالب علیہ السلام بھی مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں 82 مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

مشرکین، مہاجرین کی تعقیب میں

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لئے سخت تکلیف وہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام کو قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن وامان کی طرف چلے گئے ہیں، مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے یہ حیثیت ختم کرنے کے لئے انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا اس مقصد کے لئے انہوں نے

---

[1] تفسیر نمونہ ج 8 ص 144

[2] مندرجہ بالا روایات تفسیر المنار اور مجمع البیان سے سورہ انعام آیت 33 کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر سے لی گئی ہیں۔

جوانوں میں سے دو ہوشیار، فعال، حیلہ باز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کا انتخاب کیا بہت سے ہدیے دے کران کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا، ان دونوں نے کشتی میں بیٹھ کر شراب پی اور ایک دوسرے سے لڑ پڑے لیکن آخر کار وہ اپنی سازش کو روبہ عمل لانے کے لئے سرزمین حبشہ میں داخل ہوگئے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے، دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انہوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کران کو اپنا موافق بنایا تھا اور ان سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

''عمرو عاص'' نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہم کلام ہوا:

ہم سرداران مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں، اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں، انہوں نے فتنہ وفساد برپا کر دیا ہے لوگوں میں نفاق کا بیج بودیا ہے، آپ کی سرزمین کی آزادی سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور انہوں نے یہاں آکر پناہ لے لی ہے، ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں بہتر یہ ہے کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم انہیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کران لوگوں نے وہ ہدیئے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پیش کیے۔

نجاشی نے کہا: جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرسکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تمہاری موجودگی میں مذہبی نمائندوں کو بھی ایک جلسہ میں دعوت دی جائے۔

جعفر بن ابی طالب مہاجرین کے بہترین خطیب

چنانچہ دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا، اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر ہوئے نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کریں جناب جعفر ادائے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے: پہلے ان سے پوچھیے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمرو نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھئے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمہ ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟

عمرو: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟

عمرو: نہیں ایسا کچھ نہیں ہے؟

جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سرزمین سے جو سراسر مرکز ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رخ کیا اور کہا: ہم جاہل اور نادان تھے، بت پرستی کرتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے، طرح طرح کے برے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو معبوث فرمایا، جس نے

ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک نہ بنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم و ستم اور قمار بازی ترک کر دیں ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیح علیہ السلام بھی انہی چیزوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا: ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں۔ جعفر نے کہا: جی ہاں: اور پھر انہوں نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کر دی، اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں، جناب جعفر کے حسن انتخاب نے عجیب وغریب اثر کیا یہاں تک کہ مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرط شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکار کر کہا: خدا کی قسم: ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمر نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے، نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمرو کے منہ پر مارا اور کہا: خاموش رہو، خدا کی قسم اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا، یہ کہہ کر مامورین حکومت کی طرف رخ کیا اور پکار کر کہا: ان کے ہدیے ان کو واپس کر دو اور انہیں حبشہ کی سرزمین سے باہر نکال دو جناب جعفر اور ان کے ساتھیوں سے کہا: تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔

اس واقعہ نے جہاں جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں سے کہا تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔ [1]

اس واقعہ نے جہاں حبشہ کے کچھ لوگوں پر اسلام شناسی کے سلسلے میں گہرا تبلیغی اثر کیا وہاں یہ واقعہ اس بات کا بھی سبب بنا کہ مکے کے مسلمان اس کو ایک اطمینان بخش جائے پناہ شمار کریں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو اس دن کے انتظار میں کہ جب وہ کافی قدرت وطاقت حاصل کریں، وہاں پر بھیجتے رہیں۔

فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹنے کی

کئی سال گزر گئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت جب کہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے لوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے، دور سے انہوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں، جو آغوش وطن میں پلٹ کر آرہے ہیں، جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب جعفر اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

''میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی''

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سورہ یٰسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیح علیہ السلام کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

---

[1] بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ آیات 82 تا 86 نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اس روایت کے مطابق جو تفسیر المنار، میں سعید بن جبیر سے منقول ہے نجاشی نے اپنے یار وانصار میں سے تیس بہترین افراد کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کے ساتھ اظہار عقیدت کے لئے مدینہ بھیجا تھا اور یہ وہی تھے جو سورہ یٰسین کی آیات سن کر رو پڑے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔

معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علماء اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت مکہ میں تھے تو ایک ہی رات میں آپ قدرت الٰہی سے مسجد الحرام سے اقصیٰ پہنچے کہ جو بیت المقدس میں ہے، وہاں سے آپ آسمانوں کی طرف گئے، آسمانی وسعتوں میں عظمت الٰہی کے آثار مشاہدہ کئے اور اسی رات مکہ واپس آ گئے۔

نیز یہ بھی مشہور ہے کہ یہ زمینی اور آسمانی سیر جسم اور روح کے ساتھ تھی البتہ یہ سیر چونکہ بہت عجیب غریب اور بے نظیر تھی لہٰذا بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی اور اسے معراج روحانی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک طرح کا خواب تھا یا مکاشفہ روحی تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بات قرآن کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ظاہر قرآن اس معراج کے جسمانی ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

معراج کی کیفیت قرآن وحدیث کی نظر سے

قرآن حکیم کی دو سورتوں میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پہلی سورت بنی اسرائیل ہے اس میں اس سفر کے ابتدائی حصے کا تذکرہ ہے۔ (یعنی مکہ کی مسجد الحرام سے بیت المقدس کی مسجد الاقصیٰ تک کا سفر) اس سلسلے کی دوسری سورت سورہ نجم ہے اس کی آیات 13 تا18 میں معراج کا دوسرا حصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آسمانی سیر کے متعلق ہے ارشاد ہوتا ہے:

ان چھ آیات کا مفہوم یہ ہے: رسول اللہ نے فرشتہ وحی جبرائیل کو اس کو اصلی صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا (پہلے آپ اسے نزول وحی کے آغاز میں کوہ حرا میں دیکھ چکے تھے) یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی، یہ منظر دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے آپ نے عظمت الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں۔

یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول واقعہ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا خصوصاً "مازاغ البصر وماطغی"، اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ کسی خطا واشتباہ اور انحراف سے دو چار نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے سلسلے میں مشہور اسلامی کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں۔

علماء اسلام نے ان روایات کے تواتر اور شہرت کی گواہی دی ہے۔

معراج کی تاریخ

واقعہ معراج کی تاریخ کے سلسلے میں اسلامی مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بعثت کے دسویں سال 27 رجب کی شب پیش آیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ بعثت کے بارہویں سال 17 رمضان المبارک کی رات وقوع پذیر ہوا جب کہ بعض اسے اوائل بعثت میں ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ میں اختلاف، اصل واقعہ پر اختلاف میں حائل نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صرف مسلمان ہی معراج کا عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ دیگر ادیان کے پیروکاروں میں بھی کم و بیش یہ عقیدہ پایا جاتا ہے ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ عجیب تر صورت میں نظر آتا ہے جیسا کہ انجیل مرقس کے باب 6 لوقا کے باب 24 اور یوحنا کے باب 21 میں ہے:

عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہونے کے بعد دفن ہوگئے تو مردوں میں سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور چالیس روز تک لوگوں میں موجود رہے پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے (اور ہمیشہ کے لئے معراج پر چلے گئے)

ضمناً یہ وضاحت بھی ہو جائے کہ بعض اسلامی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ انبیاء کو بھی معراج نصیب ہوئی تھی۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آسمانی سفر چند مرحلوں میں طے کیا۔

پہلا مرحلہ، مسجد الحرام اور مسجد اقصی کے درمیانی فاصلہ کا مرحلہ تھا، جس کی طرف سورہ اسراء کی پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے: ''منزہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصی تک لے گیا''۔ بعض معتبر روایات کے مطابق آپؐ نے اثناء راہ میں جبرائیل علیہ السلام کی معیت میں سرزمین مدینہ میں نزول فرمایا اور وہاں نماز پڑھی۔

اور مسجد الاقصی میں بھی ابراہیم وموسیٰ وعیسی علیہم السلام انبیاء کی ارواح کی موجودگی میں نماز پڑھی اور امام جماعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، اس کے بعد وہاں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آسمانی سفر شروع ہوا، اور آپؐ نے ساتوں آسمانوں کو یکے بعد دیگرے عبور کیا اور ہر آسمان میں ایک نیا ہی منظر دیکھا، بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں سے، بعض آسمانوں میں دوزخ اور دوزخیوں سے اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک سے بہت سی تربیتی اور اصلاحی قیمتی باتیں اپنی روح پاک میں ذخیرہ کیں اور بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کیا جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے اسرار میں سے ایک راز تھا، اور واپس آنے کے بعد ان کو صراحت کے ساتھ اور بعض اوقات کنایہ اور مثال کی زبان میں امت کی آگاہی کے لئے مناسب فرصتوں میں بیان فرماتے تھے، اور تعلیم و تربیت کے لئے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس آسمانی سفر کا ایک اہم مقصد، ان قیمتی مشاہدات کے تربیتی وعرفانی نتائج سے استفادہ کرنا تھا، اور قرآن کی یہ پُرمعنی تعبیر "لقد رای من آیات ربہ الکبری"[1]

ان تمام امور کی طرف ایک اجمالی اور سربستہ اشارہ ہو سکتی ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ بہشت اور دوزخ جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر معراج میں مشاہدہ کیا اور کچھ لوگوں کو وہاں عیش میں اور عذاب میں دیکھا، وہ قیامت والی جنت اور دوزخ نہیں تھیں، بلکہ وہ برزخ والی جنت و دوزخ تھیں، کیونکہ قرآن مجید کے مطابق جیسا کہ کہتا ہے کہ قیامت والی جنت و دوزخ قیام قیامت اور حساب وکتاب سے فراغت کے بعد نیکوکاروں اور بدکاروں کو نصیب ہوگی۔

آخر کار آپ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے، وہاں نور کے بہت سے حجابوں کا مشاہدہ کیا، وہی جگہ جہاں پر ''سدرۃ المنتہیٰ'' اور ''جنۃ الماویٰ'' واقع تھی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہان سراسر نور وروشنی میں، شہود باطنی کی اوج، اور قرب الی اللہ اور مقام ''قاب قوسین اوادنی'' پر فائز ہوئے اور خدا نے اس سفر میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے اہم احکام دیئے اور بہت سے ارشادات فرمائے جن کا ایک مجموعہ اس وقت اسلامی روایات میں ''احادیث قدسی'' کی صورت میں ہمارے لئے یادگار رہ گیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تصریح کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک

---

[1] سورہ نجم آیت 18

علی علیہ السلام کو اپنے پہلو میں دیکھا، اوران روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام کے مقام کی حد سے زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

معراج کی ان سب روایات کے باوجود کچھ ایسے پیچیدہ اور اسرار آمیز جملے ہیں جن کے مطالب کو کشف کرنا آسان نہیں ہے، اور اصطلاح کے مطابق روایات متشابہ کا حصہ ہیں یعنی ایسی روایات جن کی تشریح کو خود معصومین علیہم السلام کے سپرد کردینا چاہئے۔[1]

ضمنی طور پر، معراج کی روایات اہل سنت کی کتابوں میں بھی تفصیل سے آئی ہیں، اور ان کے راویوں میں سے تقریباً 30 افراد نے حدیث معراج کو نقل کیا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے: یہ اتنا لمبا سفر طے کرنا اور یہ سب عجیب اور قسم قسم کے حادثات، اور یہ ساری لمبی چوڑی گفتگو، اور یہ سب کے سب مشاہدات ایک ہی رات میں یا ایک رات سے بھی کم وقت میں کس طرح سے انجام پا گئے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے، سفر معراج ہرگز ایک عام سفر نہیں تھا، کہ اسے عام معیاروں سے پرکھا جائے نہ تو اصل سفر معمولی تھا اور نہ ہی آپ کی سواری معمولی اور عام تھی، نہ آپ کے مشاہدات عام اور معمولی تھے اور نہ ہی آپ کی گفتگو، اور نہ ہی وہ پیمانے جو اس میں استعمال ہوئے، ہمارے کرہ خاکی کے محدود اور چھوٹے پیمانوں کے مانند تھے، اور نہ ہی وہ تشبیہات جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان مناظر کی عظمت کو بیان کرسکتی ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشاہدہ کیے، تمام چیزیں خارق العادت صورت میں، اور اس مکان و زمان سے خارج ہونے کے پیمانوں میں، جن سے ہم آشنا نہیں، واقع ہوئیں۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ امور ہمارے کرہ زمین کے زمانی پیمانوں کے ساتھ ایک رات یا ایک رات سے بھی کم وقت میں واقع ہوئے ہوں[2]

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

شیعہ اور سنی علمائے اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں صورت پذیر ہوا، سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی مذکورہ آیات کا ظاہری مفہوم بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

تواریخ اسلامی بھی اس امر پر شاہد وصادق ہیں، تاریخ کہتی ہے: جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ معراج کا ذکر کیا تو مشرکین نے شدت سے اس کا انکار کردیا اور اسے آپ کے خلاف ایک بہانہ بنالیا۔

یہ بات گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہؐ ہرگز خواب یا مکاشفہ روحانی کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اس قدر شور وغوغا نہ کرتے۔

یہ جو حسن بصری سے روایت ہے کہ: ''یہ واقعہ خواب میں پیش آیا''۔

اور اسی طرح جو حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ: ''خدا کی قسم بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپ کی روح آسمان پر گئی''، ایسی روایات ظاہراً سیاسی پہلو رکھتی ہیں۔

معراج کا مقصد

گزشتہ مباحث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیدار خدا کے

[1] روایات معراج کے سلسلہ میں مزید اطلاع کے لئے بحار الانوار کی جلد 18 از ص 282 تا ص 410 رجوع فرمائیں

[2] تفسیر نمونہ ج 13 ص 97 تا 99

لئے آسمانوں پر جائیں، جیسا کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی ناآگاہی کی بناء پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں ان میں سے ایک مسٹر ''گیورگیو'' بھی ہیں وہ بھی کتاب ''محمد وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہیے''[1] میں کہتے ہیں:

''محمد اپنے سفر معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی، انہوں نے سمجھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں''۔

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ قلم لکڑی کا تھا، ایسا کہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا، اسی طرح کی اور بہت سارے خرافات اس میں موجود ہیں۔ جبکہ مقصد معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات میں بالخصوص عالم بالا میں موجود عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت ورہبری کے لئے ایک نیا ادراک اور ایک نئی بصیرت حاصل کریں۔

یہ ہدف واضح طور پر سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی آیت 18 میں بیان ہوا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے مقصد معراج پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آکر آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں''۔

معراج اور سائنس

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیموس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ بہ تہہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہوگئے اور پھر آپس میں مل گئے۔[2]

لیکن ''بطلیموسی'' نظریہ ختم ہوگیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ختم ہوگیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً؛

1) ایسے فضائی سفر میں پہلی بار رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی وسائل وذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لئے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

2) دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

3) تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اس حصہ میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے جبکہ جس حصہ پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اسی طرح اس حصے میں جان لیوا سردی ہے جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی ہے۔

4) اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ جو فضائے زمین کے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز cosmic ravs الٹراوائلٹ ریز ultra violet ravs اور ایکس ریز x ravs یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم

[1] مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے ''محمد پیغمبری کہ ازنو باید شناخت'' ص 125 دیکھئے

[2] بعض قدیم فلاسفہ کا نظریہ یہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں۔۔ ''خرق'' (پھٹنا) اور ''التیام'' (ملنا) ممکن نہیں۔

otganism کے لئے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں (زمین پر رہنے والوں کے لئے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تپش ختم ہوجاتی ہے)

5) ایک اور مشکل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے اگر چہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل ہے۔

6) آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہوگا کہ اس کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ان سوالات کے پیش نظر چند چیزوں پر توجہ

ان امور کے جواب میں ان نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

1۔ ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخر کار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کر چکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہوچکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔

2۔ اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمولی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ اللہ کی لامتناہی قدرت وطاقت کے ذریعے صورت پذیر ہوااور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہئے اور جب معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے، تو باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہوجاتے ہیں۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنالے جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کرسکیں اور ایسے لباس تیار کرلے کہ جو اسے انتہائی زیادہ گرمی اور سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور مشق کے ذریعے بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرلے، یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کرسکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعہ یہ کام نہیں کرسکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس سفر کے لئے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں اپنی مدد کا لباس پہنایا تھا، ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا براق؟ رفرف؟ یا کوئی اور؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہو چکا ہے اگر چہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

آج کے سائنسداں کہتے ہیں کہ امواج جاذمہ rdvsofatffion زمانے کی احتیاج کے بغیر آن واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہوجاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے منظومے موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکز جہان سے دور ہوجاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور نظام ہائے شمسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہورہے ہیں) (غور کیجئے گا) مختصر یہ کہ اس سفر کے لئے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعہ معراج کو محال عقلی سمجھا

جائے اس راستے میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے۔

بہرحال واقعہ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالے سے ناممکن ہے اور نہ دور حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے، البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہٰذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہوجائے تو اسے قبول کرلینا چاہیئے۔

شب معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کی باتیں

پیغمبر نے شب معراج پروردگار سبحان سے اس طرح سوال کیا:

پروردگارا: کونسا عمل افضل ہے؟

خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

''کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے، اور جو کچھ میں نے تقسیم کرکے دیا ہے اس پر راضی ہونے سے بہتر نہیں ہے، اے محمدؐ جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں میری محبت ان کے شامل حال ہوگی اور جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور میری خاطر دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں انہیں دوست رکھتا ہوں علاوہ بر ایں میری محبت ان لوکوں کے لئے جو مجھ پر توکل کریں فرض اور لازم ہے اور میری محبت کے لئے کوئی حد اور کنارہ اور اس کی انتہا نہیں ہے''۔

اس طرح سے محبت کی باتیں شروع ہوتی ہیں ایسی محبت جس کی کوئی انتہا نہیں، جو کشادہ اور اصولی طور پر عالم ہستی میں اسی محور محبت پر گردش کررہا ہے۔

ایک اور ددسرے حصہ میں یہ آیا ہے۔

''اے احمد بچوں کی طرح نہ ہونا جو سبز و زرد اور زرق و برق کو دوست رکھتے ہیں اور جب انہیں کوئی عمدہ اور شیریں غذا دے دی جاتی ہے تو وہ مغرور ہوجاتے ہیں اور ہر چیز کو بھول جاتے ہیں''۔

پیغمبر نے اس موقع پر عرض کیا: پروردگارا: مجھے کسی ایسے عمل کی ہدایت فرما جو تیری بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔

فرمایا: رات کو دن اور دن کو رات قرار دے۔

عرض کیا: کس طرح؟

فرمایا: اس طرح کے تیرا سونا نماز ہو اور ہرگز اپنے شکم کو مکمل طور پر سیر نہ کرنا۔

ایک اور حصہ میں آیا ہے:

''اے احمد میری محبت فقیروں اور محروموں سے محبت ہے، ان کے قریب ہوجاؤ اور ان کی مجلس کے قریب بیٹھو کہ میں تیرے نزدیک ہوں اور دنیا پرست اور ثروت مندوں کو اپنے سے دور رکھو اور ان کی مجالس سے بچتے رہو''۔

اہل دنیا و آخرت

ایک اور حصہ میں آیا ہے:

''اے احمد دنیا کے زرق برق اور دنیا پرستوں کو مبغوض شمار کر اور آخرت کو محبوب رکھ'' عرض کرتے ہیں:

پروردگارا: اہل دنیا اور اہل آخرت کون ہیں؟

فرمایا: ''اہل دنیا تو وہ لوگ ہیں جو زیادہ کھاتے ہیں زیادہ ہنستے ہیں زیادہ سوتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں اور تھوڑا خوش ہوتے

ہیں نہ ہی تو برائیوں کے مقابلہ میں کسی سے عذر چاہتے ہیں۔اور نہ ہی کسی عذر چاہنے والے سے اس کا عذر قبول کرتے ہیں اطاعت خدا میں سست ہیں اور گناہ کرنے میں دلیر ہیں، لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے ہیں حالانکہ ان کی اجل قریب آ پہنچی ہے مگر وہ ہرگز اپنے اعمال کا حساب نہیں کرتے ان سے لوگوں کو بہت کم نفع ہوتا ہے، باتیں زیادہ کرتے ہیں احساس ذمہ داری نہیں رکھتے اور کھانے پینے سے ہی غرض رکھتے ہیں۔

اہل دنیا نہ تو نعمت میں خدا کا شکر یہ ادا کرتے ہیں اور نہ ہی مصائب میں صبر کرتے ہیں۔ زیادہ خدمات بھی ان کی نظر میں تھوڑی ہیں (اور خود ان کی اپنی خدمات تھوڑی بھی زیادہ ہیں) اپنے اس کام کے انجام پانے پر جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے تعریف کرتے ہیں اور ایسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔ ہمیشہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بات کرتے ہیں اور لوگوں کے عیوب تو بیان کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی نیکیوں کو چھپاتے ہیں''۔

عرض کیا: پروردگارا: کیا دنیا پرست اس کے علاوہ بھی کوئی عیب رکھتے ہیں؟

فرمایا: ''اے احمد ان کا عیب یہ ہے کہ جہل اور حماقت ان میں بہت زیادہ ہے جس استاد سے انہوں علم سیکھا ہے وہ اس سے تواضع نہیں کرتے اور اپنے آپ کو عاقل کل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ صاحبان علم کے نزدیک نادان اور احمق ہیں''۔

اہل بہشت کے صفات

خداوند عالم اس کے بعد اہل آخرت اور بہشتیوں کے اوصاف کو یوں بیان کرتا ہے: ''وہ ایسے لوگ ہیں جو با حیا ہیں ان کی جہالت کم ہے، ان کے منافع زیادہ ہیں، لوگ ان سے راحت وآرام میں ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں اور ان کی باتیں سنجیدہ ہوتی ہیں''۔

وہ ہمیشہ اپنے اعمال کا حساب کرتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ خود کو زحمت میں ڈالتے رہتے ہیں ان کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار ہوتے ہیں ان کی آنکھ گریاں ہوتی ہے اور ان کا دل ہمیشہ یاد خدا میں مصروف رہتا ہے جس وقت لوگ غافلوں کے زمرہ میں لکھے جارہے ہوں وہ اس وقت ذکر کرنے والوں میں لکھے جاتے ہیں۔

نعمتوں کے آغاز میں حمد خدا بجالاتے ہیں اور ختم ہونے پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی دعائیں بارگاہ خدا میں قبول ہوتی ہیں اور ان کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں اور فرشتے ان کے وجود سے مسرور اور خوش رہتے ہیں (غافل) لوگ ان کے نزدیک مردہ ہیں اور خدا اُن کے نزدیک حی وقیوم اور کریم ہے (ان کی ہمت اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کے اوپر نظر نہیں رکھتے)

لوگ تو اپنی عمر میں صرف ایک ہی دفعہ مرتے ہیں لیکن وہ جہاد بالنفس اور ہوا و ہوس کی مخالفت کی وجہ سے ہر روز ستر مرتبہ مرتے ہیں (اور نئی زندگی پاتے ہیں)

جس وقت عبادت کے لئے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک فولادی بند اور بنیان مرصوص کے مانند ہوتے ہیں اور ان کے دل میں مخلوقات کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے کہ میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشوں گا اور عمر کے اختتام پر میں خود ان کی روح کو قبض کروں گا اور ان کی پرواز کے لئے آسمان کے دروازوں کو کھول دوں گا تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹادوں گا اور حکم دوں گا کہ بہشت خود اپنے کو ان کے لئے آراستہ کرے'' اے احمد عبادت کے دس حصہ ہیں جن میں سے نو حصے طلب رزق حلال میں ہیں جب تیرا کھانا اور پینا حلال ہوگا تو تیری حفظ وحمایت میں ہوگا''۔

بہترین اور جاویدانی زندگی

ایک اور حصہ میں آیا ہے: ''اے احمد کیا تو جانتا ہے کہ کونسی زندگی زیادہ گوارا اور زیادہ دوام رکھتی ہے''؟

عرض کیا: خداوندا: نہیں۔

فرمایا: ''گوارا زندگی وہ ہوتی ہے جس کا صاحب ایک لمحہ کے لئے بھی میری یاد سے غافل نہ رہے، میری نعمت کو فراموش نہ کرے، میرے حق سے بے خبر نہ رہے اور رات دن میری رضا کو طلب کرے۔

لیکن باقی رہنے والی زندگی وہ ہے جس میں اپنی نجات کے لئے عمل کرے، دنیا اس کی نظر میں حقیر ہو اور آخرت بڑی اور بزرگ ہو، میری رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرے، اور ہمیشہ میری خوشنودی کو طلب کرے، میرے حق کو بڑا سمجھے اور اپنی نسبت میری آگاہی کی طرف توجہ رکھے۔

ہر گناہ اور معصیت پر مجھے یاد کرلیا کرے، اور اپنے دل کو اس چیز سے جو مجھے پسند نہیں ہے پاک رکھے، شیطانی وسوسوں کو مبغوض رکھے، اور ابلیس کو اپنے دل پر مسلط نہ کرے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو میں ایک خاص قسم کی محبت کو اس کے دل میں ڈال دوں گا اس طرح سے کہ اس کا دل میرے اختیار میں ہوگا، اس کی فرصت اور مشغولیت اس کا ہم وغم اور اس کی بات ان نعمتوں کے بارے میں ہوگی جو میں اہل محبت کو بخشتا ہوں۔ میں اس کی آنکھ اور دل کے کان کھول دیتا ہوں تا کہ وہ اپنے دل کے کان سے غیب کے حقائق کو سنے اور اپنے دل سے میرے جلال وعظمت کو دیکھے''۔

اور آخر میں یہ نورانی حدیث ان بیدار کرنے والے جملوں پر ختم ہوجاتی ہے: ''اے احمد اگر کوئی بندہ تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین کے برابر نماز ادا کرے، اور تمام اہل آسمان وزمین کے برابر روزہ رکھے، فرشتوں کی طرح کھانا نہ کھائے اور کوئی فاخرہ لباس بدن پر نہ پہنے (اور انتہائی زہد اور پارسائی کی زندگی بسر کرے) لیکن اس کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا پرستی یا ریاست طلبی یا زینت دنیا کا عشق ہو تو وہ میرے جاودانی گھر میں میرے جوار میں نہیں ہوگا اور میں اپنی محبت کو اس کے دل سے نکال دوں گا، میرا اسلام ورحمت تجھ پر ہو، والحمدللہ رب العالمین''۔

یہ عرشی باتیں۔۔۔ جو انسانی روح کو آسمانوں کی طرف بلند کرتی ہیں، اور آستانۂ عشق وشہود کی طرف کھینچتی ہیں۔ حدیث قدسی کا صرف ایک حصہ ہے۔

مزید براں ہمیں اطمینان ہے کہ پیغمبر نے اپنے ارشادات میں جو کچھ بیان فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی، اس شب عشق وشوق اور جذبہ ووصال کی شب میں، ایسی باتیں، اسرار ورموز اور اشارے آپ کے اور آپ کے محبوب کے درمیان ہوتے ہیں جن کو نہ تو کان سننے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ عام افکار میں ان کے درک کی صلاحیت ہے، اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ پیغمبر کے دل وجان کے اندر ہی مکتوم اور پوشیدہ رہے، اور آپ کے خواص کے علاوہ کوئی بھی ان سے آگاہ نہیں ہوا۔

ہجرت پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [1]

مختلف قبائل قریش اور اشراف مکہ کا ایک گروہ جمع ہوا تا کہ وہ ''دار الندوہ'' میں میٹنگ کریں اور انہیں رسول اللہ کی طرف

[1] سورہ انفال آیت 30 کے ذیل میں واقعہ ہجرت بیان ہوا ہے۔

سے درپیش خطرے پر غور وفکر کریں۔

(کہتے ہیں) اثنائے راہ میں انہیں ایک خوش ظاہر بوڑھا شخص ملا جو دراصل شیطان تھا (یا کوئی انسان جو شیطانی روح وفکر کا حامل تھا)۔

انہوں نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟

کہنے لگا: اہل نجد کا ایک بڑا بوڑھا ہوں، مجھے تمہارے ارادے کی اطلاع ملی تو میں نے چاہا کہ تمہاری میٹنگ میں شرکت کروں اور اپنا نظریہ اور خیر خواہی کی رائے پیش کرنے میں دریغ نہ کروں۔

کہنے لگے: بہت اچھا اندر آ جایئے۔

اس طرح وہ بھی ''دارالندوۃ'' میں داخل ہو گیا۔

حاضرین میں سے ایک نے ان کی طرف رخ کیا اور (پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا: اس شخص کے بارے میں کوئی سوچ بچار کرو، کیونکہ بخدا ڈر ہے کہ وہ تم پر کامیاب ہو جائے (اور تمہارے دین اور تمہاری عظمت کو خاک میں ملا دے گا)

ایک نے تجویز پیش کی: اسے قید کر دو یہاں تک کے زندان ہی میں مر جائے۔

بوڑھے نجدی نے اس تجویز پر اعتراض کیا اور کہا: اس میں خطرہ یہ ہے کہ اس کے طرفدار ٹوٹ پڑیں گے اور کسی مناسب وقت اسے قید خانے سے چھڑا کر اس سرزمین سے باہر لے جائیں لہٰذا کوئی اور بنیادی بات کرو۔

ایک اور شخص نے کہا: اسے اپنے شہر سے نکال دو تا کہ تمہیں اس سے چھٹکارا مل جائے کیونکہ جب وہ تمہارے درمیان سے چلا جائے گا تو پھر جو کچھ بھی کرتا پھرے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور پھر وہ دوسروں ہی سے سروکار رکھے گا۔

اس بوڑھے نجدی نے کہا: واللہ یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے، کیا تم اس کی شیریں بیانی، قدرت زبان اور لوگوں کے دلوں میں اس کے نفوذ نہیں دیکھتے؟ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمام دنیائے عرب کے پاس جائے گا اور وہ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور پھر وہ ایک انبوہ کثیر کے ساتھ تمہاری طرف پلٹے گا اور تمہیں تمہارے شہروں سے نکال باہر کرے گا اور بڑوں کو قتل کر دے گا۔

مجمع نے کہا بخدا یہ سچ کہہ رہا ہے کوئی اور تجویز سوچو۔

ابو جہل کی رائے

ابو جہل ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، اس نے گفتگو شروع کی اور کہا: میرا ایک نظریہ ہے اور اس کے علاوہ میں کسی رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔

حاضرین کہنے لگے: وہ کیا ہے؟

کہنے لگا: ہم ہر قبیلے سے ایک بہادر شمشیر زن کا انتخاب کریں اور ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں ایک تیز تلوار دے دیں اور پھر وہ سب مل کر موقع پاتے ہی اس پر حملہ کریں جب وہ اس صورت میں قتل ہوگا تو اس کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ بنی ہاشم تمام قبائل قریش سے لڑ سکیں گے لہٰذا مجبوراً اس صورت میں خون بہا پر راضی ہو جائیں گے اور یوں ہم بھی اس کے آزار سے نجات پا لیں گے۔

بوڑھے نجدی نے (خوش ہو کر) کہا: بخدا: صحیح رائے یہی ہے جو اس جواں مرد نے پیش کی ہے میرا بھی اس کے علاوہ کوئی

نظریہ نہیں۔

اس طرح یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی اور وہ یہی مصمم ارادہ لے کر وہاں سے اٹھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جان بیچ ڈالی

جبرائیل نازل ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملا کہ وہ رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو غار ثور کی طرف روانہ ہو گئے اور حکم دے گئے کہ علی آپ کے بستر پر سو جائیں (تاکہ جو لوگ دروازے کی دراز سے بستر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نظر رکھے ہوئے ہیں انہیں بستر پر سویا ہوا سمجھیں اور آپ کو خطرے کے علاقہ سے دور نکل جانے کی مہلت مل جائے)۔

اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی کہتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپ غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپ پر حملہ کرنے کے لئے آپ کے گھر کا چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے، آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ آپ کے بستر پر لیٹ جائیں، اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی، اس وقت خداوند عالم نے جبرائیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علی میرے پیغمبر کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کر دے، زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ و نگہبان بن جاؤ، جب جبرائیل، حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تو جبرائیل کہہ رہے تھے: سبحان اللہ، صد آفرین آپ پر اے علی علیہ السلام کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر و مباہات کر رہا ہے، اس موقع پر آیت نازل ہوئی "کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے" اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات "لیلۃ المبیت" (شب ہجرت) کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین سے چھپ کر ابوبکر کے ساتھ غار کی طرف جا رہے تھے یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی جو اس وقت بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوئے ہوئے تھے۔

ابو جعفر اسکافی کہتے ہیں: جیسے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ، جلد 3 ص 270 پر لکھا ہے:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر حضرت علی علیہ السلام کے سونے کا واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار غیر مسلموں اور کم ذہن لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔ [1]

جب صبح ہوئی تو مشرکین گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے جستجو کی تو حضرت علی علیہ السلام کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر دیکھا۔ اس طرح سے خدا نے ان کی سازش کو نقش بر آب کر دیا۔

وہ پکارے: محمد کہاں ہے؟

آپ نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔

وہ آپ کے پاؤں کے نشانوں پر چل پڑے یہاں تک کہ غار کے پاس پہنچ گئے لیکن (انہوں نے تعجب سے دیکھا کہ مکڑی

[1] الغدیر، جلد 2 ص 45 پر ہے کہ غزالی نے احیاء العلوم ج 3 ص 238 پر، صفوری نے نزہتہ المجالس ج 2، ص 209 پر، ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ، میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ الخواص ص 21 پر، امام احمد نے مسند ج اص 348 پر، تاریخ طبری جلد 2 ص 99 پر، سیرۃ ابن ہشام ج 2، ص 291 پر، سیرۃ حلبی ج 1 ص 29 پر، تاریخی یعقوبی ج 2 ص 29 پر لیلۃ المبیت کے واقعہ کو نقل کیا ہے۔

نے غار کے سامنے جالاتن رکھا ہے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر وہ اس غار میں ہوتے تو غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا، اس طرح وہ واپس چلے گئے)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تک غار کے اندر رہے (اور جب دشمن مکہ کے تمام بیابانوں میں آپ کو تلاش کر چکے اور تھک ہار کر مایوس پلٹ گئے تو آپ مدینہ کی طرف چل پڑے)۔

قبلہ کی تبدیلی

بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں اور چند ماہ تک مدینہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد قبلہ بدل گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

مدینہ میں کتنے ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی؟ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے، یہ مدت سات ماہ سے لے کر سترہ ماہ تک بیان کی گئی ہے لیکن یہ جتنا عرصہ بھی تھا اس دوران یہودی مسلمانوں کو طعنہ زنی کرتے رہے کیونکہ بیت المقدس دراصل یہودیوں کا قبلہ تھا وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں بلکہ ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہم حق پر ہیں۔

یہ باتیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے ناگوار تھیں ایک طرف وہ فرمان الٰہی کے مطیع تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے طعنے ختم نہ ہوتے تھے، اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان کی طرف دیکھتے تھے گویا وحی الٰہی کے منتظر تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خانہ کعبہ سے خاص لگاؤ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خصوصیت سے چاہتے تھے کہ قبلہ، کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے اور آپ انتظار میں رہتے تھے کہ خدا کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی حکم نازل ہو، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے آثار سے عشق تھا، علاوہ ازایں کعبہ توحید کا قدیم ترین مرکز تھا، آپؐ جانتے تھے کہ بیت المقدس تو وقتی قبلہ ہے لیکن آپ کی خواہش تھی کہ حقیقی وآخری قبلہ جلد معین ہو جائے۔

آپ چونکہ حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم تھے، پس آپ یہ تقاضا زبان تک نہ لاتے صرف منتظر نگاہیں آسمان کی طرف لگائے ہوئے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو کعبہ سے کس قدر عشق اور لگاؤ تھا۔

اس انتظار میں ایک عرصہ گذر گیا یہاں تک کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا ایک روز مسجد ''بنی سالم'' میں پیغمبر نماز ظہر پڑھا رہے تھے دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ جبرائیل کو حکم ہوا کہ پیغمبر کا بازو تھام کر ان کا رخ انور کعبہ کی طرف پھیر دیں۔

مسلمانوں نے بھی فوراً اپنی صفوں کا رخ بدل لیا، یہاں تک کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ عورتوں نے اپنی جگہ مردوں کو دی اور مردوں نے اپنے جگہ عورتوں کو دیدی، (توجہ رہے کہ بیت المقدس شمالی سمت میں تھا، اور خانہ کعبہ جنوبی سمت میں تھا۔)

اس واقعے سے یہودی بہت پریشان ہوئے اور اپنے پرانے طریقہ کے مطابق، ڈھٹائی، بہانہ سازی اور طعنہ بازی کا مظاہرہ کرنے لگے پہلے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کا کوئی اپنا قبلہ نہیں، یہ ہمارے پیروکار ہیں لیکن جب خدا کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے پھر زبان اعتراض دراز کی چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

''بہت جلد کم عقل لوک کہیں گے ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے''۔[۱]

مسلمانوں نے اس سے کیوں اعراض کیا ہے جو گذشتہ زمانہ میں انبیائے ماسلف کا قبلہ رہا ہے، اگر پہلا قبلہ صحیح تھا تو اس تبدیلی کا کیا مقصد، اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر تیرہ سال اور پندرہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے کیوں نماز پڑھتے رہے ہیں۔؟

چنانچہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا:

''ان سے کہہ دو عالم کے مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے''۔[۲]

تبدیلی قبلہ کا راز

بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی ان سب کے لئے اعتراض کا موجب بنی جن کا گمان تھا کہ ہر حکم کو مستقل رہنا چاہئے تھا اگر ہمارے لئے ضروری تھا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں تو پہلے دن یہ حکم کیوں نہ دیا گیا اور اگر بیت المقدس مقدم ہے جو گذشتہ انبیاء کا بھی قبلہ شمار ہوتا ہے تو پھر اسے کیوں بدلا گیا۔؟

دشمنوں کے ہاتھ بھی طعنہ زنی کا موقع آ گیا، شاید وہ کہتے تھے کہ پہلے تو انبیاء ماسبق کے قبلہ کی طرف نماز پڑھتا تھا لیکن کامیابیوں کے بعد اس پر قبیلہ پرستی نے غلبہ کر لیا ہے لہٰذا اپنی قوم اور قبیلے کے قبلہ کی طرف پلٹ گیا ہے یا کہتے تھے کہ اس نے دھوکا دینے اور یہود و نصاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پہلے بیت المقدس کو قبول کر لیا اور جب یہ بات کارگر نہ ہو سکی تو اب کعبہ کی طرف رخ کر لیا ہے۔

واضح ہے کہ ایسے وسوسے اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں ابھی نور علم نہ پھیلا ہو اور جہاں شرک و بت پرستی کی رسمیں موجود ہوں کیسا تذبذب واضطراب پیدا کر دیتے ہیں اسی لئے قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ ''یہ مومنین اور مشرکین میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک عظیم آزمائش تھی''۔[۳]

ممکن ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کے اہم اسباب میں سے درج ذیل مسئلہ بھی ہو خانہ کعبہ اس وقت مشرکین کے بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا حکم دیا گیا کہ مسلمان وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیا کریں تا کہ اس طرح مشرکین سے اپنی صفیں الگ کر سکیں۔

لیکن جب مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی حکومت وملت کی تشکیل ہوگئی اور مسلمانوں کی صفیں دوسروں سے مکمل طور پر ممتاز ہوگئیں تو اب یہ کیفیت برقرار رکھنا ضروری نہ رہا، لہٰذا اس وقت کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا جو قدیم ترین مرکز توحید اور انبیاء کا بہت پرانا مرکز تھا۔

ایسے میں ظاہر ہے کہ جو کعبہ کو اپنا خاندانی معنوی اور روحانی سرمایہ سمجھتے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے مشکل تھا اور اسی طرح بیت المقدس کے بعد کعبہ کی طرف پلٹنا، لہٰذا اس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی تا کہ شرک کے جتنے آثار ان میں باقی رہ گئے تھے اس کٹھالی میں پڑ کر جل جائیں اور ان کے گذشتہ شرک آلود رشتے ناتے ٹوٹ جائیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اصولی طور پر تو خدا کے لئے مکان نہیں ہے قبلہ تو صرف وحدت اور صفوں میں اتحاد کا ایک

---

[۱] سورہ بقرہ آیت 142

[۲] سورہ بقرہ آیت 142

[۳] سورہ بقرہ آیت 143

رمز ہے اور اس کی تبدیلی کسی چیز کو دگرگوں نہیں کر سکتی، اہم ترین امر تو خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے بتوں کو توڑنا ہے۔

جنگ بدر [1]

جنگ بدر کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ مکہ والوں کا ایک اہم تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جا رہا تھا اس قافلے کو مدینہ کی طرف سے گزرنا تھا اہل مکہ کا سردار ابوسفیان قافلہ کا سالار تھا اس کے پاس ہزار دینار کا مال تجارت تھا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اس عظیم قافلے کی طرف تیزی سے کوچ کا حکم دیا کہ جس کے پاس دشمن کا ایک بڑا سرمایہ تھا تا کہ اس سرمائے کو ضبط کر کے دشمن کی اقتصادی قوت کو سخت ضرب لگائی جائے تا کہ اس کا نقصان دشمن کی فوج کو پہنچے۔

پیغمبر اور ان کے اصحاب ایسا کرنے کا حق رکھتے تھے کیونکہ مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آئے تو اہل مکہ نے ان کے بہت سے اموال پر قبضہ کر لیا تھا جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لہٰذا وہ حق رکھتے تھے کہ اس نقصان کی تلافی کریں۔ اس سے قطع نظر بھی اہل مکہ نے گذشتہ تیرہ برس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے جو سلوک روا رکھا اس سے بات ثابت ہو چکی تھی وہ مسلمانوں کو ضرب لگانے اور نقصان پہنچانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوائیں گے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے پر تل گئے تھے ایسا دشمن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت مدینہ کی وجہ سے بے کار نہیں بیٹھ سکتا تھا واضح تھا کہ وہ قاطع ترین ضرب لگانے کے لئے اپنی قوت مجتمع کرتا پس عقل و منطق کا تقاضا تھا کہ پیش بندی کے طور پر ان کے تجارتی قافلے کو گھیر کر اس کے اتنے بڑے سرمائے کو ضبط کر لیا جاتا تا کہ اس پر ضرب پڑے اور اپنی فوجی اور اقتصادی بنیاد مضبوط کی جاتی ایسے اقدامات آج بھی اور گذشتہ ادوار میں بھی عام دنیا میں فوجی طریقۂ کار کا حصہ رہے ہیں، جو لوگ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے قافلے کی طرف پیغمبر کی پیش قدمی کو ایک طرح کی غارت گری کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں یا تو وہ حالات سے آگاہ نہیں اور اسلام کے تاریخی مسائل کی بنیادوں سے بے خبر ہیں اور یا ان کے کچھ مخصوص مقاصد ہیں جن کے تحت وہ واقعات و حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں بہر حال ایک طرف ابوسفیان کو مدینہ میں اس کے ذریعے اس امر کی اطلاع مل گئی اور دوسری طرف اس نے اہل مکہ کو صورت حال کی اطلاع کے لئے ایک تیز رفتار قاصد روانہ کر دیا کیونکہ شام کی طرف جاتے ہوئے بھی اسے اس تجارتی قافلہ کی راہ میں رکاوٹ کا اندیشہ تھا۔

قاصد، ابوسفیان کی نصیحت کے مطابق اس حالت میں مکہ میں داخل ہوا کہ اس نے اپنے اونٹ کی ناک کو چیر دیا تھا اس کے کان کاٹ دیئے تھے، خون ہیجان انگیز طریقہ سے اونٹ سے بہہ رہا تھا، قاصد نے اپنی قمیص کو دونوں طرف سے پھاڑ دیا تھا اونٹ کی پشت کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہوا تھا تا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، مکہ میں داخل ہوتے ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا:

اے کامیاب و کامران لوگو اپنے قافلے کی خبر لو، اپنے کارواں کی مدد کرو۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ تم وقت پر پہنچ سکو، محمد اور تمہارے دین سے نکل جانے والے افراد قافلے پر حملے کے لئے نکل چکے ہیں۔

اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ بنت عبد المطلب کا ایک عجیب و غریب خواب تھا مکہ میں زبان زد خاص و عام تھا اور لوگوں کے ہیجان میں اضافہ کر رہا تھا۔ خواب کا ماجرا یہ تھا کہ عاتکہ نے تین روز قبل خواب میں دیکھا کہ:

ایک شخص پکار رہا ہے کہ لوگو اپنی قتل گاہ کی طرف جلدی چلو، اس کے بعد وہ منادی کوہ ابوقبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا اس نے پتھر

[1] واقعہ جنگ بدر سورہ انفال آیات 5 تا 18 کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

کی ایک بڑی چٹان کوحرکت دی تو وہ چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی اوراس کا ایک ایک ٹکڑا قریش کے ایک ایک گھر میں جا پڑا اور مکہ کے درے سے خون کا سیلاب جاری ہوگیا۔

عاتکہ وحشت زدہ ہوکر خواب سے بیدار ہوئی اوراپنے بھائی عباس کو سنایا۔اس طرح خواب لوگوں تک پہنچا تو وہ وحشت وپریشانی میں ڈوب گئے۔ابوجہل نے خواب سنا تو بولا: یہ عورت دوسرا پیغمبر ہے جو اولاد عبدالمطلب میں ظاہر ہوا ہے لات وعزیٰ کی قسم ہم تین دن کی مہلت دیتے ہیں اگر اتنے عرصے میں اس خواب کی تعبیر ظاہر نہ ہوئی تو ہم آپس میں ایک تحریر لکھ کر اس پر دستخط کریں گے کہ بنی ہاشم قبائل عرب میں سے سب سے زیادہ جھوٹے ہیں تیسرا دن ہوا تو ابوسفیان کا قاصد آ پہنچا،اس کی پکار نے تمام اہل مکہ کو ہلا کر رکھ دیا۔

اور چونکہ تمام اہل مکہ کا اس قافلے میں حصہ تھا سب فوراً جمع ہو گئے ابوجہل کی کمان میں ایک لشکر تیار ہوا،اس میں 950 جنگجو تھے جن میں سے بعض انکے بڑے اور مشہور سردار اور بہادر تھے 700 اونٹ تھے اور 100 گھوڑے تھے لشکر مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسری طرف چونکہ ابوسفیان مسلمانوں سے بچ کر نکلنا چاہتا تھا،لہٰذا اس نے راستہ بدل دیا اور مکہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

313 وفادار ساتھی

پیغمبر اسلام ﷺ 313 افراد کے ساتھ جن میں تقریباً تمام مجاہدین اسلام تھے سرزمین بدر کے پاس پہنچ گئے تھے یہ مقام مکہ اور مدینہ کے راستے میں ہے یہاں آپ کو قریش کے لشکر کی روانگی کی خبر ملی اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ کیا ابوسفیان کے قافلہ کا تعاقب کیا جائے اور قافلہ کے مال پر قبضہ کیا جائے یا لشکر کے مقابلے کے لئے تیار ہوا جائے؟ ایک گروہ نے دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنے کو ترجیح دی جب کہ دوسرے گروہ نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور قافلہ کے تعاقب کو ترجیح دی،ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم مدینہ سے مکہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے اور ہم نے اس لشکر کے مقابلے کے لئے جنگی تیاری نہیں کی تھی جب کہ وہ ہماری طرف پوری تیاری سے آرہا ہے۔

اس اختلاف رائے اور تردد میں اس وقت اضافہ ہوگیا جب انہیں معلوم تھا کہ دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تقریبا تین گنا ہے اوران کا ساز وسامان بھی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے،ان تمام باتوں کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلے گروہ کے نظریے کو پسند فرمایا اور حکم دیا کہ دشمن کی فوج پر حملہ کی تیاری کی جائے۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو دشمن کو یقین نہ آیا کہ مسلمان اس قدر کم تعداد اور ساز وسامان کے ساتھ میدان میں آئے ہوں گے،ان کا خیال تھا کہ سپاہ اسلام کا اہم حصہ کسی مقام پر چھپا ہوا ہے تا کہ وہ غفلت میں کسی وقت ان پر حملہ کردے لہٰذا انہوں نے ایک شخص کو تحقیقات کے لئے بھیجا،انہیں جلدی معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی جمعیت یہی ہے جسے وہ دیکھ رہے ہیں۔

دوسری طرف جیسا کہ ہم نے کہا ہے مسلمانوں کا ایک گروہ وحشت وخوف میں غرق تھا اس کا اصرار تھا کہ اتنی بڑی فوج جس سے مسلمانوں کا کوئی موازنہ نہیں،خلاف مصلحت ہے،لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے وعدہ سے انہیں جوش دلایا اور انہیں جنگ پر اُبھارا،آپ نے فرمایا: کہ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں کامیابی حاصل ہوگی قریش کے قافلہ پر یا لشکر قریش پر اور خدا کے وعدہ کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

خدا کی قسم ابوجہل اور کئی سرداران قریش کے لوگوں کی قتل گاہ کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔
اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بدر کے کنوئیں کے قریب پڑاوڈالیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے سے خواب میں اس جنگ کا منظر دیکھا تھا، آپ نے دیکھا کہ دشمن کی ایک قلیل سی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں آئی ہے، یہ دراصل کامیابی کی ایک بشارت تھی آپ نے بعینہ یہ خواب مسلمانوں کے سامنے بیان کردیا، یہ بات مسلمانوں کے میدان بدر کی طرف پیش روی کے لئے ان کے جذبہ اورعزم کی تقویت کا باعث بنی۔
البتہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خواب صحیح دیکھا تھا کیونکہ دشمن کی قوت اور تعداد اگرچہ ظاہراً بہت زیادہ تھی لیکن باطناً کم، ضعیف اور ناتواں تھی، ہم جانتے ہیں کہ خواب عام طور پر اشارے اور تعبیر کا پہلو رکھتے ہیں، اور ایک صحیح خواب میں کسی مسئلے کا باطنی چہرہ آشکار ہوتا ہے۔

قریش کا ایک ہزار کا لشکر

اس ہنگامے میں ابوسفیان اپنا قافلہ خطرے کے علاقے سے نکال لے گیا۔ اصل راستے سے ہٹ کر دریائے احمر کے ساحل کی طرف سے وہ تیزی سے مکہ پہنچ گیا۔ اس کے ایک قاصد کے ذریعے لشکر کو پیغام بھیجا: خدا نے تمہارا قافلہ بچالیا ہے میرا خیال ہے کہ ان حالات میں محمدؐ کا مقابلہ کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس کے اتنے دشمن ہیں جو اس کا حساب چکالیں گے۔
لشکر کے کمانڈر ابوجہل نے اس تجویز کو قبول نہ کیا، اس نے اپنے بتوں لات اور عزی کی قسم کھائی کہ نہ صرف ان کا مقابلہ کریں گے بلکہ مدینہ کے اندر تک ان کا تعاقب کریں گے یا انہیں قید کرلیں گے اور مکہ میں لے آئیں گے تاکہ اس کامیابی کا شہرہ تمام قبائل عرب کے کانوں تک پہنچ جائے۔ آخر کار لشکر قریش بھی مقام بدر تک آپہنچا، انہوں نے اپنے غلام کو پانی لانے کے لئے کنویں کی طرف بھیجے، اصحاب پیغمبر نے انہیں پکڑلیا اور ان سے حالات معلوم کرنے کے لئے انہیں خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آئے حضرت نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم قریش کے غلام ہیں، فرمایا: لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہمیں اس کا پتہ نہیں، فرمایا: ہرروز کتنے اونٹ کھانے کے لئے نحر کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نو سے دس تک، فرمایا: ان کی تعداد 9 سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے (ایک اونٹ ایک سو فوجی جوانوں کی خوراک ہے)۔
ماحول پُرہیبت اور وحشت ناک تھا لشکر قریش کے پاس فراواں جنگی ساز وسامان تھا۔ یہاں تک کہ حوصلہ بڑھانے کے لئے وہ گانے بجانے والی عورتوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اپنے سامنے ایسے حریف کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں وہ میدان جنگ میں قدم رکھے گا۔

مسلمانو! فرشتے تمہاری مدد کریں گے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھ رہے تھے کہ ممکن ہے آپ کے اصحاب خوف ووحشت کی وجہ سے رات میں آرام سے سونہ سکیں اور پھر کل دن کو تھکے ہوئے جسم اور روح کے ساتھ دشمن کے مقابل ہوں لہٰذا خدا کے وعدے کے مطابق ان سے فرمایا: تمہاری تعداد کم ہو تو اس کا غم نہ کر، آسمانی فرشتوں کی ایک عظیم جماعت تمہاری مدد کے لئے آئے گی، آپ نے انہیں خدائی وعدے کے مطابق اگلے روز فتح کی پوری تسلی دے کر مطمئن کردیا اور وہ رات آرام سے سوگئے۔
دوسری مشکل جس سے مجاہدین کو پریشانی تھی وہ میدان بدر کی کیفیت تھی، ان کی طرف زمین نرم تھی اور اس میں پاؤں دھنس

جاتے تھے اسی رات یہ ہوا کہ خوب بارش ہوئی، اس کے پانی سے مجاہدین نے وضو کیا، غسل کیا اور تازہ دم ہو گئے ان کے نیچے کی زمین بھی اس سے سخت ہو گئی، تعجب کی بات یہ ہے کہ دشمن کی طرف اتنی زیادہ بارش ہوئی کہ وہ پریشان ہو گئے۔

دشمن کے لشکر گاہ سے مسلمان جاسوسوں کی طرف سے ایک نئی خبر موصول ہوئی اور جلد ہی مسلمانوں میں پھیل گئی، خبر یہ تھی کہ فوج قریش اپنے ان تمام وسائل کے باوجود خوفزدہ ہے گویا وحشت کا ایک لشکر خدا نے ان کے دلوں کی سرزمین پر اتار دیا تھا، اگلے روز چھوٹا سا اسلامی لشکر بڑے ولولے کے ساتھ دشمن کے سامنے صف آراء ہوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے انہیں صلح کی تجویز پیش کی تا کہ عذر اور بہانہ باقی نہ رہے، آپ نے ایک نمائندے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم وہ پہلا گروہ بن جاؤ کہ جس پر ہم حملہ آور ہوں، بعض سرداران قریش چاہتے تھے یہ صلح کا ہاتھ جوان کی طرف بڑھایا گیا ہے اسے تھام لیں اور صلح کر لیں، لیکن پھر ابوجہل مانع ہوا۔

ستر قتل ستر اسیر

آخر کار جنگ شروع ہوئی، اس زمانے کے طریقے کے مطابق پہلے ایک کے مقابلے میں ایک نکلا، ادھر لشکر اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حمزہ اور حضرت علی علیہ السلام جو جوان ترین افراد تھے میدان میں نکلے، مجاہدین اسلام میں سے چند اور بہادر بھی اس جنگ میں شریک ہوئے، ان جوانوں نے اپنے حریفوں کے پیکر پر سخت ضربیں لگائیں اور کاری وار کئے اور ان کے قدم اکھاڑ دیئے، دشمن کا جذبہ اور کمزور پڑ گیا، یہ دیکھا تو ابوجہل نے عمومی حملے کا حکم دے دیا۔

ابوجہل پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے جو اہل مدینہ میں سے ہیں انہیں قتل کر دو، مہاجرین مکہ کو اسیر کر لو مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کے پروپیگنڈا کے لئے انہیں مکہ لے جائیں۔

یہ لمحات بڑے حساس تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جمعیت کی کثرت پر نظر نہ کریں اور صرف اپنے مد مقابل پر نگاہ رکھیں دانتوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر پیسیں، باتیں کم کریں، خدا سے مدد طلب کریں، حکم پیغمبر سے کہیں رتی بھر سرتابی نہ کریں اور مکمل کامیابی کی امید رکھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست دعا آسمان کی طرف بلند کئے اور عرض کیا: ''پالنے والے اگر یہ لوگ قتل ہو گئے تو پھر تیری عبادت کوئی نہیں کرے گا''۔

دشمن کے لشکر کی سمت میں سخت ہوا چل رہی تھی اور مسلمان ہوا کی طرف پشت کر کے ان پر حملے کر رہے تھے۔ ان کی استقامت، پامردی اور دلاوری نے قریش کا ناطقہ بند کر دیا ابوجہل سمیت دشمن کے ستر آدمی قتل ہو گئے ان کی لاشیں خاک وخون میں غلطاں پڑی تھیں ستر افراد مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گئے مسلمانوں کے بہت کم افراد شہید ہوئے۔

اس طرح مسلمانوں کی پہلی مسلح جنگ طاقتور دشمن کے خلاف غیر متوقع کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، ان میں 77 مہاجر تھے اور دو سو چھتیس (236) انصار، مہاجرین کا پرچم حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا، اور انصار کا پرچم بردار ''سعد بن عبادہ'' تھے، اس عظیم معرکہ کے لئے ان کے پاس صرف 70 اونٹ دو گھوڑے، 6 زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں، دوسری طرف دشمن کی فوج ہزار افراد سے متجاوز تھی، اس کے پاس کافی ووافی اسلحہ تھا اور ایک سو گھوڑے تھے، اس جنگ میں 22 مسلمان شہید ہوئے ان میں چودہ مہاجر اور 8 انصار تھے، دشمن کے ستر (70) افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے، اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کامرانی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ گئے۔

واقعاً یہ عجیب وغریب بات تھی کہ تواریخ کے مطابق مسلمانوں کے چھوٹے سے لشکر کے مقابلہ میں قریش کی طاقتور فوج نفسیاتی طور پر اس قدر شکست خوردہ ہو چکی تھی کہ ان میں سے ایک گروہ مسلمانوں سے جنگ کرنے سے ڈرتا تھا، بعض اوقات وہ دل میں سوچتے کہ یہ عام انسان نہیں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ یہ موت کو اپنے اونٹوں پر لاد کر مدینہ سے تمہارے لئے سوغات لائے ہیں۔

''سعد بن معاذ انصاری'' نمائندہ کے طور پر خدمت پیغمبر میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے: میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی نبوت کی گواہی دی ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہے، آپ جو بھی حکم دینا چاہیں دیجئے اور ہمارے مال میں سے جو کچھ آپ چاہیں لے لیں، خدا کی قسم اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ اس دریا (دریائے احمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو وہاں سے قریب تھا) میں کود پڑو تو ہم کود پڑیں گے ہماری یہ آرزو ہے کہ خدا ہمیں توفیق دے کہ ایسی خدمت کریں جو آپ کی آنکھ کی روشنی کا باعث ہو۔

روز بدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: زمین سے مٹی اور سنگریزوں کی ایک مٹھی بھر کے مجھے دے دو۔

حضرت علی علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مشرکین کی طرف پھینک دیا اور فرمایا: ''شاہت الوجوہ'' (تمہارے منہ قبیح اور سیاہ ہو جائیں)

لکھا ہے کہ معجزانہ طور پر گرد و غبار اور سنگریزے دشمن کی آنکھوں میں جا پڑے اور سب وحشت زدہ ہو گئے۔

مجاہدین کی تشویق

ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر کے روز مجاہدین اسلام کی تشویق کے لئے کچھ انعامات مقرر کیے مثلاً فرمایا کہ جو فلاں دشمن کو قید کر کے میرے پاس لائے گا اُسے یہ انعام دوں گا ان میں پہلے ہی روح ایمان و جہاد موجود تھی اوپر سے یہ تشویق بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان سپاہی بڑے افتخار سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے اور اپنے مقصد کی طرف لپکے بوڑھے سن رسیدہ افراد جھنڈوں تلے موجود رہے جب جنگ ختم ہوئی تو نوجوان اپنے پر افتخار انعامات کے لئے بارگاہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھے، بوڑھے ان سے کہنے لگے کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے کیونکہ ہم تمہارے لئے پناہ اور سہارے کا کام کر رہے تھے اور تمہارے لئے جوش وخروش کا باعث تھے اگر تمہارا معاملہ سخت ہو جاتا ہے تو تمہیں پیچھے ہٹنا پڑتا تو یقیناً تم ہماری طرف آتے اس موقع پر دو انصاریوں میں تو تو میں میں بھی ہو گئی اور انہوں نے جنگی غنائم کے بارے میں بحث کی۔

اس اثناء میں سورہ انفال کی پہلی آیت نازل ہوئی جس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا کہ غنائم کا تعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے وہ جیسے چاہیں انہیں تقسیم فرمائیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مساوی طور پر سب سپاہیوں میں غنائم تقسیم کر دیئے اور برادران دینی میں صلح و مصالحت کا حکم دیا۔

جنگ کا خاتمہ اور اسیروں کا واقعہ

جنگ بدر کے خاتمہ پر جب جنگی قیدی بنا لئے گئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ قیدیوں میں سے دو خطرناک افراد عقبہ اور نضر کو قتل کر دیا جائے تو اس پر انصار گھبرا گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ حکم تمام قیدیوں کے متعلق جاری ہو جائے اور وہ فدیہ لینے سے محروم ہو جائیں) لہٰذا انہوں نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا: ہم نے ستر آدمیوں کو قتل کیا ہے اور ستر ہی کو قیدی بنایا ہے اور یہ آپ کے قبیلے میں سے آپ ہی کے قیدی ہیں، یہ ہمیں بخش دیجئے تا کہ ہم ان کی آزادی کے بدلے فدیہ لے سکیں۔

(رسول اللہ اس کے لئے وحی آسمانی کے منتظر تھے) اس موقع پر وحی الٰہی نازل ہوئی اور قیدیوں کی آزادی کے بدلے فدیہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔

اسیروں کی آزادی کے لئے زیادہ سے زیادہ چار ہزار درہم اور کم سے کم ایک ہزار درہم معین کی گئی، یہ بات قریش کے کانوں تک پہونچی تو انھوں نے ایک ایک کے بدلے معین شدہ رقم بھیج کر اسیروں کو ازاد کرالیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا داماد ابوالعاص بھی ان قیدیوں میں تھا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی یعنی زینب جو ابولعاص کی بیوی تھی نے وہ گلو بند جو جناب خدیجہ نے ان کی شادی کے وقت انہیں دیا تھا فدیہ کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا، جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ گلو بند پر پڑی تو جناب خدیجہ جیسی فدا کار اور مجاہدہ خاتون کی یادیں ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوگئیں، آپؐ نے فرمایا: خدا کی رحمت ہو خدیجہ پر، یہ وہ گلو بند ہے جو اس نے میری بیٹی زینب کو جہیز میں دیا تھا (اور بعض دوسری روایات کے مطابق جناب خدیجہ کے احترام میں آپؐ نے گلو بند قبول کرنے سے احراز کیا اور حقوق مسلمین کو پیش نظر کرتے ہوئے اس میں ان کی موافقت حاصل کی)۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوالعاص کو اس شرط پر آزاد کردیا کہ وہ زینب کو (جو اسلام سے پہلے ابوالعاص کی زوجیت میں تھیں) مدینہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیج دے، اس نے بھی اس شرط کو قبول کرلیا اور بعد میں اسے پورا بھی کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس کا اسلام قبول کرنا

انصار کے کچھ آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت چاہی کہ آپ کے چچا عباس جو قیدیوں میں تھے ان سے آپؐ کے احترام میں فدیہ نہ لیا جائے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''خدا کی قسم اس کے ایک درھم سے بھی صرف نظر نہ کرو'' (اگر فدیہ لینا خدائی قانون ہے تو اسے سب پر جاری ہونا چاہئے، یہاں تک کہ میرے چچا پر بھی اس کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اپنی طرف سے اور اپنے بھتیجے (عقیل بن ابی طالب) کی طرف سے آپؐ کو فدیہ ادا کرنا چاہئے۔

عباس (جو مال سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے) کہنے لگے: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے ایسا فقیر اور محتاج کردو کہ میں اہل قریش کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلاؤں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس مال میں سے فدیہ ادا کریں جو آپؐ نے اپنی بیوی ام الفضل کے پاس رکھا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اگر میں میدان جنگ میں مارا جاؤں تو اس مال کو اپنے اور اپنی اولاد کے مصارف کے لئے سمجھنا۔

عباس یہ بات سن کر بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے: آپؐ کو یہ بات کس نے بتائی (حالانکہ یہ تو بالکل محرمانہ تھی)؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل نے، خدا کی طرف سے۔

عباس بولے: اس کی قسم کہ جس کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم کھاتا ہے کہ میرے اور میری بیوی کے علاوہ اس راز سے کوئی آگاہ نہ تھا۔

اس کے بعد وہ پکار اٹھے: "اشھد انك رسول الله"

(یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں)

اور یوں وہ مسلمان ہو گئے۔

آزادی کے بعد بدر کے تمام قیدی مکہ لوٹ گئے لیکن عباس، عقیل اور نوفل مدینہ ہی میں رہ گئے کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

عباس کے اسلام لانے کے بارے میں بعض تواریخ میں ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ مکہ کی طرف پلٹ گئے تھے اور خط کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سازش سے باخبر کیا کرتے تھے، پھر سے پہلے فتح مکہ کے سال مدینہ کی طرف ہجرت کر آئے۔

جنگ احد کا پیش خیمہ

جب کفار مکہ جنگ بدر میں شکست خوردہ ہوئے اور ستر (70) قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ گئے تو ابوسفیان نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو مقتولین بدر پر گریہ وزاری نہ کرنے دیں کیونکہ آنسو غم واندوہ کو دور کر دیتے ہیں اور اس طرح محمد کی دشمنی اور عداوت ان کے دلوں سے ختم ہو جائے گی، ابوسفیان نے خود یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک جنگ بدر کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لے اس وقت تک وہ اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کرے گا، بہر حال قریش ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اکساتے تھے اور انتقام کی صدا شہر مکہ میں بلند ہو رہی تھی۔[1]

ہجرت کے تیسرے سال قریش ہزار سوار اور دو ہزار پیدل کے ساتھ بہت سامان جنگ لے کر آپ سے جنگ کرنے کے لئے مکہ سے نکلے اور میدان جنگ میں ثابت قدمی سے لڑنے کے لئے اپنے بڑے بڑے بت اور اپنی عورتوں کو بھی ہمراہ لے آئے۔

جناب عباس کی بروقت اطلاع

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قریش کے درمیان ان کے ہم مشرب و ہم مذہب تھے لیکن اپنے بھتیجے سے فطری محبت کی بنا پر جب انھوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک طاقتور لشکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے کے لئے مکہ سے نکلا ہے تو فوراً ایک خط لکھا اور قبیلہ بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ مدینہ بھیجا، عباس کا قاصد بڑی تیزی سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا، جب آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے سعد بن اُبَ کو عباس کا پیغام پہنچایا اور حتیٰ الامکان اس واقعہ کو پردہ راز میں رکھنے کی کوشش کی۔

پیغمبر کا مسلمانوں سے مشورہ جس دن عباس کا قاصد آپ کو موصول ہوا آپ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ ومدینہ کے راستہ پر جائیں اور لشکر کفار کے کوائف معلوم کریں، آپ کے دو نمائندے ان کے حالات معلوم کر کے بہت جلدی واپس آئے اور قریش کی قوت وطاقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ طاقتور لشکر خود ابوسفیان کی کمان میں ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند روز کے بعد تمام اصحاب اور اہل مدینہ کو بلایا اور ان در پیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میٹنگ کی، اس میں عباس کے خط کو بھی پیش کیا گیا اور اس کے بعد مقام جنگ کے بارے میں رائے لی گئی اس میٹنگ میں ایک گروہ نے رائے دی کہ جنگ دشمن سے مدینہ کی تنگ گلیوں میں کی جائے کیونکہ اس صورت میں کمزور مرد، عورتیں بلکہ کنیزیں بھی مددگار ثابت ہو سکیں گی۔

عبداللہ بن ابی نے تائیداً کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں ہوں اور دشمن ہم

[1] جنگ احد کا واقعہ سورہ آل عمران آیت 120 کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

پر کامیاب ہو گیا ہو۔

اس رائے کو آپ بھی اس وقت کی مدینہ کی پوزیشن کے مطابق بنظر تحسین دیکھتے تھے کیونکہ آپ بھی مدینہ ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن نوجوانوں اور جنگجوؤں کا ایک گروہ اس کا مخالف تھا چنانچہ سعد بن معاذ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے کھڑے ہو کر کہا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گذشتہ زمانے میں عربوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ ہماری طرف نظر کرے جبکہ ہم مشرک اور بت پرست تھے اب جبکہ ہمارے درمیان آپ کی ذات والاصفات موجود ہے کس طرح وہ ہمیں دبا سکتے ہیں اس لئے شہر سے باہر جنگ کرنی چاہئے اگر ہم میں سے کوئی مارا گیا تو وہ جام شہادت نوش کرے گا اور اگر کوئی بچ گیا تو اسے جہاد کا اعزاز وافتخار نصیب ہوگا اس قسم کی باتوں اور جوش شجاعت نے مدینہ سے باہر جنگ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھا دیا یہاں تک کہ عبداللہ بن اُبی کی پیش کش سرد خانہ میں جا پڑی خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس مشورے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے طرف داروں کی رائے کو قبول فرمالیا اور ایک صحابی کے ساتھ مقام جنگ کا انتخاب کرنے کے لئے شہر سے باہر تشریف لے گئے آپ نے کوہ احد کا دامن لشکر گاہ کے لئے منتخب کیا کیونکہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام زیادہ مناسب تھا۔

مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں

جمعہ کے دن آپ نے یہ مشورہ لیا اور نماز جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے آپ نے حمد وثناء کے بعد مسلمانوں کو لشکر قریش کی آمد کی اطلاع دی اور فرمایا:

''تہہ دل سے جنگ کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور پورے جذبہ سے دشمن سے لڑو تو خداوند قدوس تمہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرے گا اور اسی دن آپ ایک ہزار افراد کے ساتھ لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوئے آپ خود لشکر کی کمان کر رہے تھے مدینہ سے نکلنے سے قبل آپ نے حکم دیا کہ لشکر کے تین علم بنائے جائیں جن میں ایک مہاجرین اور دو انصار کے ہوں''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ اور احد کے درمیانی فاصلے کو پیادہ طے کیا اور سارے راستے لشکر کی دیکھ بھال کرتے رہے خود لشکر کی صفوں کو منظم ومرتب رکھا تاکہ وہ ایک ہی سیدھی صف میں حرکت کریں۔

ان میں سے کچھ ایسے افراد کو دیکھا جو پہلی دفعہ آپ کو نظر پڑے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ابی کے ساتھی کچھ یہودی ہیں اور اس مناسبت سے مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے ہیں آپ نے فرمایا کہ مشرکین سے جنگ کرنے میں مشرکین سے مدد نہیں لی جاسکتی مگر یہ کہ یہ لوگ اسلام قبول کرلیں یہودیوں نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور سب مدینہ کی طرف پلٹ آئے یوں ایک ہزار میں سے تین سو افراد کم ہو گئے۔

لیکن مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ عبداللہ بن اُبی کی رائے کو رد کیا گیا تھا اس لئے وہ اثنائے راہ میں تین سو سے زیادہ افراد کو لے کر مدینہ کی طرف پلٹ آیا بہر صورت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر کی ضروری چھان بین (یہودیوں یا ابن ابی ابی کے ساتھیوں کے نکالنے) کے بعد سات سو افراد کو ہمراہ لے کر کوہ احد کے دامن میں پہنچ گئے، اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو آراستہ کیا۔

عبداللہ بن جبیر کو پچاس ماہر تیر اندازوں کے ساتھ پہاڑ کے درہ پر تعینات کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور فوج کے پچھلے حصے کی حفاظت کریں اور اس حد تک تاکید کی کہ اگر ہم دشمن کا مکہ تک پیچھا کریں یا ہم شکست کھا جائیں اور دشمن ہمیں مدینہ تک جانے پر مجبور کردے پھر بھی تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا، دوسری طرف سے ابوسفیان نے خالد بن ولید کو منتخب

سپاہیوں کے ساتھ اس درہ کی نگرانی پر مقرر کیا اور انہیں ہر حالت میں وہیں رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب اسلامی لشکر اس درہ سے ہٹ جائے تو فوراً لشکر اسلام پر پیچھے سے حملہ کر دو۔

آغاز جنگ

دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے اور یہ دونوں لشکر اپنے نوجوانوں کو ایک خاص انداز سے اکسار ہے تھے، ابوسفیان کعبہ کے بتوں کے نام لے کر اور خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے جنگی جوانوں کی توجہ مبذول کرا کے ان کو ذوق وشوق دلاتا تھا۔

جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے اسم مبارک اور انعامات اعلیٰ کے حوالے سے مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے اچانک مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر اللہ اکبر سے میدان اور دامن کوہ کی فضا گونج اٹھی جب کہ میدان کی دوسری طرف قریش کی لڑکیاں نے دف اور سارنگی پر اشعار گا گا کر قریش کے جنگ جو افراد کے احساسات کو ابھارتی تھیں۔

جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں نے ایک شدید حملہ سے لشکر قریش کے پرخچے اڑا دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکر اسلام نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا خالد بن ولید نے جب قریش کی یقینی شکست دیکھی تو اس نے چاہا کہ درہ کے راستے نکل کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرے لیکن تیراندازوں نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا قریش کے قدم اکھڑتے دیکھ کر تازہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کو شکست خوردہ سمجھ کر مال غنیمت جمع کرنے کے لئے اچانک اپنی پوزیشن چھوڑ دی، ان کی دیکھا دیکھی درہ پر تعینات تیراندازوں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا، ان کے کمانڈر عبداللہ بن جبیر نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند (تقریباً دس افراد) کے کوئی اس اہم جگہ پر نہ ٹھہرا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد بن ولید نے درہ خالی دیکھ کر بڑی تیزی سے عبداللہ بن جبیر پر حملہ کیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا، اس کے بعد انہوں نے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اچانک مسلمانوں نے ہر طرف چمک دار تلواروں کی تیز دھاروں کو اپنے سروں پر دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے اور اپنے آپ کو منظم نہ رکھ سکے قریش کے بھگوڑوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی پلٹ آئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اسی موقع پر لشکر اسلام کے بہادر افسر سید الشہداء حضرت حمزہ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا، سوائے چند شمع رسالت کے پروانوں کے اور بقیہ مسلمانوں نے وحشت زدہ ہو کر میدان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔

اس خطرناک جنگ میں جس نے سب سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہونے والے دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا وہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی جرأت اور بڑے حوصلہ سے جنگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی تلوار ٹوٹ گئی، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تلوار آپ کو عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے بالآخر آپ ایک مورچہ میں ٹھہر گئے اور حضرت علی علیہ السلام مسلسل آپ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ بعض مؤرخین کی تحقیق کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کے جسم پر ساٹھ کاری زخم آئے، اور اسی موقع پر قاصد وحی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے محمد یہ ہے مواسات ومعاونت کا حق، آپؐ نے فرمایا (ایسا کیوں نہ ہو کہ) علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں، تو جبرائیل نے اضافہ کیا: میں تم دونوں سے ہوں۔

امام صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاصد وحی کو آسمان میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ: "**لا سیف الا ذوالفقار ولا فتی الا علی**" (ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علی کے سوا کوئی جواں مرد نہیں)

اس اثناء میں یہ آواز بلند ہوئی کہ محمد قتل ہو گئے۔

یہ آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جتنا بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ ایک گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبر شہید ہو گئے ہیں لہٰذا اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کر لی جائے لیکن ان کے مقابلہ میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علی علیہ السلام ابودجانہ اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمد شہید ہو گئے ہیں تو محمد کا خدا تو قتل نہیں ہوا چلو اور جنگ کرو، اسی نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لئے درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ، یہ گفتگو تمام کرتے ہی انھوں نے دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے، تاہم جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں اور اطلاع ایک شایعہ تھی۔

کون پکارا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہو گئے؟

''ابن قمعہ'' نے اسلامی سپاہی مصعب کو پیغمبر سمجھ کر اس پر کاری ضرب لگائی اور باآواز بلند کہا: لات وعزیٰ کی قسم محمد قتل ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ افواہ چاہے مسلمانوں نے اڑائی یا دشمن نے لیکن مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی اس لئے کہ جب آواز بلند ہوئی تو دشمن میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے ورنہ قریش کا فاتح لشکر جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دلوں میں کینہ رکھتا تھا اور انتقام لینے کی نیت سے آیا تھا کبھی میدان نہ چھوڑتا، قریش کے پانچ ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے میدان جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد ایک رات بھی صبح تک وہاں نہ گذاری اور اسی وقت مکہ کی طرف چل پڑے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی خبر نے بعض مسلمانوں میں اضطراب و پریشانی پیدا کر دی، جو مسلمان اب تک میدان کارزار میں موجود تھے، انھوں نے اس خیال سے کہ دوسرے مسلمان پراکندہ نہ ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہاڑ کے اوپر لے گئے تاکہ مسلمانوں کو پتہ چل جائے کہ آپ بقید حیات ہیں، یہ دیکھ کر بھگوڑے واپس آ گئے اور آنحضرت کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے، آپ نے ان کو ملامت وسرزنش کی کہ تم نے ان خطرناک حالات میں کیوں فرار کیا، مسلمان شرمندہ تھے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: یارسول خدا ہم نے آپ کی شہادت کی خبر سنی تو خوف کی شدت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مفسر عظیم مرحوم طبرسی، ابوالقاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ جنگ احد کے دن (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ) سوائے تیرہ افراد کے تمام بھاگ گئے تھے، اور ان تیرہ میں سے آٹھ انصار اور پانچ مہاجر تھے، جن میں سے حضرت علی علیہ السلام اور طلحہ کے علاوہ باقی ناموں میں اختلاف ہے، البتہ دونوں کے بارے میں تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انھوں نے فرار نہیں کیا۔

یوں مسلمانوں کو جنگ احد میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہو گئے لیکن مسلمانوں کو اس شکست سے بڑا درس ملا جو بعد کی جنگوں میں ان کی کامیابی وکامرانی کا باعث بنا۔

جنگ کا خطرناک مرحلہ

جنگ احد کے اختتام پر مشرکین کا فتحیاب لشکر بڑی تیزی کے ساتھ مکہ پلٹ گیا لیکن راستے میں انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انہوں نے اپنی کامیابی کو ناقص کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور اسے غارت و تاراج کر دیں اور اگر محمد زندہ ہوں تو انہیں ختم کر دیں تا کہ ہمیشہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی فکر ختم ہو جائے، اور اسی بنا پر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا اور درحقیقت جنگ احد کا یہ وہ خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ کافی مسلمان شہید اور زخمی ہو چکے تھے اور فطری طور پر وہ ازسرنو جنگ کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ جبکہ اس کے برعکس اس مرتبہ دشمن پورے جذبہ کے ساتھ جنگ کر سکتا تھا۔

یہ اطلاع پیغمبر اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فوراً حکم دیا کہ جنگ احد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لئے تیار ہو جائے، آپ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگ احد کے زخمی بھی لشکر میں شامل ہوں، (حضرت علی علیہ السلام نے جن کے بدن پر دشمنوں نے 60 زخم لگائے تھے، لیکن آپ پھر دوبارہ دشمنوں کے مقابلہ میں آ گئے) ایک صحابی کہتے ہیں:

میں بھی زخمیوں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے، ہم نے ارادہ کر لیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہونچے گے، میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی، جہاں میرا بھائی نہ چل پاتا میں اسے اپنے کندھے پر اٹھا لیتا، بڑی تکلیف سے ہم لشکر تک جا پہنچے، پیغمبر اکرم ﷺ اور لشکر اسلام ''حمراء الاسد'' کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پر پڑاؤ ڈالا یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکر قریش تک پہنچی خصوصاً جب انھوں نے مقابلہ کے لئے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینہ سے تازہ دم فوج ان سے آ ملی ہے۔

اس موقع پر ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلہ کی ہمت نہ رہی، واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام ''معبد خزاعی'' تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا اس نے پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو انتہائی متاثر ہوا، اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کیا: آپ کی یہ حالت و کیفیت ہمارے لئے بہت ہی ناگوار ہے آپ آرام کرتے تو ہمارے لئے بہتر ہوتا، یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا اور ''روحاء'' کے مقام پر ابو سفیان کے لشکر سے ملا، ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا: میں نے محمد ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لئے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں ایسا لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا، معبد خزاعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ تم نے پایا کیا ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اور اسکے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف پلٹ جائیں اور اس مقصد کے لئے کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کریں اور انہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے، انہوں نے قبیلہ عبدالقیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچا دیں کہ ابوسفیان اور قریش کے بت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر ﷺ کے ختم کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں، یہ جماعت گندم خریدنے کے لئے

مدینہ جارہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: "حسبنا اللہ و نعم الو کیل" (خدا ہمارے لئے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے)۔

انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی، لہٰذا تین روز توقف کے بعد، وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔

کھوکھلی باتیں

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل بیٹھتے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کاش یہ اعزاز میدان بدر میں ہمیں بھی نصیب ہو جاتا، یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک چھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی، بہرحال زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جنگ احد کا وحشت ناک معرکہ در پیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پا لیا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکر اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ قرآن انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے، پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے"۔ [1]

حضرت علی علیہ السلام کے زخم

امام باقر علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے: حضرت علی علیہ السلام کو احد کے دن اکسٹھ زخم لگے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ام سلیم" اور "ام عطیہ" کو حکم دیا کہ وہ دونوں حضرت علی علیہ السلام کے زخموں کا علاج کریں، تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ وہ حالت پریشانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے لگے: کہ حضرت علی علیہ السلام کے بدن کی کیفیت یہ ہے کہ ہم جب ایک زخم باندھتے ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے اور ان کے بدن کے زخم اس قدر زیادہ اور خطرناک ہیں کہ ہم ان کی زندگی کے بارے میں پریشان ہیں تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ دیگر مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی عیادت کے لئے ان کے گھر آئے جب کہ ان کے بدن پر زخم ہی زخم تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دست مبارک ان کے جسم سے مس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص راہ خدا میں اس حالت کو دیکھ لے وہ اپنی ہی ذمہ داری کے آخری درجہ کو پہنچ چکا ہے اور جن جن زخموں پر آپؐ ہاتھ رکھتے تھے وہ فوراً مل جاتے تھے تو اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: الحمدللہ کہ ان حالات میں جنگ سے نہیں بھاگا اور دشمن کو پشت نہیں دکھائی خدا نے ان کی کوشش کی قدردانی کی۔

ہم نے شکست کیوں کھائی؟

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اسی سے قرآن میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی۔ [2]

قرآن کہتا ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتداء جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکم خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کر دیا کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت اور پائیداری اور فرمان پیغمبری صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آگھیرا، یعنی اگر تم نے یہ سمجھ

---

[1] سورہ آل عمران آیت 163

[2] سورہ ال عمران آیت 152

رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلا شرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمان خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں۔

عمومی معافی کا حکم

جو لوگ واقعہ احد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ندامت و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خدائے تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہیں عام معافی دینے کے لئے فرمایا لہٰذا حکم الٰہی نازل ہوتے ہی آپ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطا کاروں کو معاف کر دیا۔

قرآن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر مہربان ہو گئے اور اگر تم ان کے لئے سنگدل، سخت مزاج اور تندخو ہوتے اور عملاً ان پر لطف و عنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔ اس کے بعد حکم دیا گیا کہ ''ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیے اور انہیں اپنے دامن عفو میں جگہ دیجئے''۔ [1]

یعنی اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپ کو پہنچائی ہیں، ان کے لئے ان کی مغفرت طلب کیجئے اور میں خود ان کے لئے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں، مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو دوسرے لفظوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کردو اور جو مجھ سے ربط رکھتا ہے اسے میں بخش دیتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمان خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام خطا کاروں کو عام معافی دے دی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء سے مخاطب

ابن مسعود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: خدا نے شہداء بدر و احد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمہاری کیا آرزو ہے تو انہوں نے کہا: پروردگارا ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی نعمتوں میں غرق ہیں اور تیرے عرش کے سائے میں رہتے ہیں، ہمارا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں، اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا۔

انہوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارے پیغمبر کو ہمارا سلام کو پہنچا دے، ہماری حالت ہمارے پسماندگان کو بتا دے اور انہیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ ہمارے بارے میں انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

حنظلہ غسیل الملائکہ

''حنظلہ بن ابی عیاش'' جس رات شادی کرنا چاہتے تھے اس سے اگلے دن جنگ احد برپا ہوئی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے جنگ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ وہ آپ کے پاس آئے اور عرض کی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت دے دیں تو یہ رات میں بیوی کے ساتھ گزار لوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت 159

واضح رہے کہ عفو و درگزر کرنے کے لئے یہ ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لئے فضا ہموار تھی وہ لوگ جو اتنی بری شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول و مجروح پیش کر چکے تھے (اگر چہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم) ایسے لوگوں کو محبت، دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ ان کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جانبر ہو کر آئندہ کے معرکوں کے لئے تیار ہو سکیں۔

صبح کے وقت انہیں جہاد میں شرکت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ غسل بھی نہ کر سکے اسی حالت میں معرکہ کارزار میں شریک ہو گئے اور بالآخر جام شہادت نوش کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔

اسی لئے حنظلہ کو "غسیل الملائکہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قبیلہ بنی نضیر کی سازش

مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے رہتے تھے، بنی نظیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً اہل حجاز نہ تھے لیکن چونکہ اپنی مذہبی کتب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ ایک پیغمبر مدینہ میں ظہور کرے گا لہٰذا انہوں نے اس سرزمین کی طرف کوچ کیا اور وہ اس عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں تھے۔

جس وقت رسول خدا نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ نے ان کے ساتھ عدم تعرض کا عہد باندھا لیکن ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ عہد توڑا۔

دوسری عہد شکنیوں کے علاوہ یہ کہ جنگ احد (جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی) کعب ابن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچا وہ اور اس کے ساتھی سب قریش کے پاس اور ان سے عہد کیا کہ سب مل کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ کریں اس کے بعد ابوسفیان چالیس مکی افراد کے ساتھ اور کعب بن اشرف ان چالیس یہودیوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس اپنے عہد و پیمان کو مستحکم کیا یہ خبر بذریعہ وحی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مل گئی۔

دوسرے یہ کہ ایک روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چند بزرگ اصحاب کے ساتھ قبیلہ بنی نضیر کے پاس آئے یہ لوگ مدینہ کے قریب رہتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ آپ اس طرح بنی نظیر کے حالات قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غفلت کا شکار ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں کے قلعہ کے باہر تھے آپؐ نے کعب بن اشرف سے اس سلسلہ میں بات کی اسی دوران یہودیوں کے درمیان سازش ہونے لگی وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ایسا عمدہ موقع اس شخص کے سلسلہ میں دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا، اب جب کہ یہ تمہاری دیوار کے پاس بیٹھا ہے ایک آدمی چھت پر جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس پر پھینک دے اور ہمیں اس سے نجات دلا دے ایک یہودی، جس کا نام عمر بن حجاش تھا، اس نے آمادگی ظاہر کی وہ چھت پر چلا گیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذریعہ وحی باخبر ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کر مدینہ آ گئے آپ نے اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوٹ کر مدینہ جائیں گے ان کو معلوم ہوا کہ آپ مدینہ پہنچ گئے ہیں چنانچہ وہ بھی مدینہ پلٹ آئے یہ وہ منزل تھی کہ جہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودیوں کی پیمان شکنی واضح و ثابت ہو گئی تھی آپ نے مسلمانوں کو جنگ کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی نظیر کے ایک شاعر نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو میں کچھ اشعار کہے اور آپ کے بارے میں بدگوئی بھی کی ان کی پیمان شکنی کی یہ ایک اور دلیل تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وجہ سے کہ ان پر پہلے سے ایک کاری ضرب لگائیں، محمد بن مسلمہ کو جو کعب بن اشرف رئیس

یہود سے آشنائی رکھتا تھا،حکم دیا کہ وہ کعب کو قتل کردے اس نے کعب کو قتل کردیا، کعب بن اشرف کے قتل ہوجانے نے یہودیوں کو متزلزل کردیا،اس کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر مسلمان اس عہد شکن قوم سے جنگ کرنے کے لئے چل پڑے جس وقت وہ اس صورت حال سے باخبر ہوئے تو انہوں نے اپنے مضبوط و مستحکم قلعوں میں پناہ لے لی اور دروازے بند کر لئے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ چند کھجوروں کے درخت جو قلعوں کے قریب ہیں، کاٹ دیے جائیں یا جلا دیئے جائیں۔

یہ کام غالباً اس مقصد کے پیش نظر ہوا کہ یہودی اپنے مال واسباب سے بہت محبت رکھتے تھے وہ اس نقصان کی وجہ سے قلعوں سے باہر نکل کر آمنے سامنے جنگ کریں گے مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ کاٹے جانے والے کھجوروں کے یہ درخت مسلمانوں کی تیز نقل وحرکت میں رکاوٹ ڈالتے تھے لہٰذا انہیں کاٹ دیا جانا چاہئے تھا بہر حال اس پر یہودیوں نے فریاد کی انہوں نے کہا: ''اے محمدؐ آپ تو ہمیشہ اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے یہ کیا سلسلہ ہے'' تو اس وقت وحی نازل ہوئی[1] اور انہیں جواب دیا کہ یہ ایک مخصوص حکم الٰہی تھا۔

محاصرہ نے کچھ دن طول کھینچا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوں ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مدینہ کو خیر باد کہہ دیں اور کہیں دوسری جگہ چلے جائیں انہوں نے اس بات کو قبول کرلیا کچھ سامان اپنا لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا ایک جماعت ''اذرعات'' شام کی طرف اور ایک مختصر سی تعداد خیبر کی طرف چلی گئی ایک گروہ ''حیرہ'' کی طرف چلا گیا ان کے چھوڑے ہوئے اموال، زمینیں، باغات اور گھر مسلمانوں کے ہاتھ لگے، چلتے وقت جتنا ان سے ہوسکا انہوں نے اپنے گھر توڑ پھوڑ دیئے یہ واقعہ جنگ احد کے چھ ماہ بعد اور ایک گروہ کی نظر کے مطابق جنگ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا۔[2]

جنگ احزاب

تاریخ اسلام کے اہم حادثوں میں سے ایک جنگ احزاب بھی ہے یہ ایک ایسی جنگ جو تاریخ اسلام میں ایک اہم تاریخی موڑ ثابت ہوئی اور اسلام وکفر کے درمیان طاقت کے موازنہ کے پلڑے کو مسلمانوں کے حق میں جھکادیا اور اس کی کامیابی آئندہ کی عظیم کامیابیوں کے لئے کلیدی حیثیت اختیار کرگئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد وہ کوئی خاص قابل ذکر کارنامہ انجام دینے کے قابل نہ رہ سکے۔

''یہ جنگ احزاب'' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تمام اسلام دشمن طاقتوں اور ان مختلف گروہوں کی طرف سے ہر طرح کا مقابلہ تھا کہ اس دین کی پیش رفت سے ان لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے۔ جنگ کی آگ کی چنگاری ''بنی نضیر'' یہودیوں کے اس گروہ کی طرف سے بھڑکی جو مکہ میں آئے اور قبیلہ ''قریش'' کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے پر اکسایا اور ان سے وعدہ کیا کہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیں گے پھر قبیلہ ''غطفان'' کے پاس گئے اور انہیں بھی کارزار کے لئے آمادہ کیا۔

ان قبائل نے اپنے ہم پیمان اور حلیفوں مثلاً قبیلہ ''بنی اسد'' اور ''بنی سلیم'' کو بھی دعوت دی اور چونکہ یہ سب قبائل خطرہ محسوس کئے ہوئے تھے، لہٰذا اسلام کا کام ہمیشہ کے لئے تمام کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تا کہ وہ اس طرح سے پیغمبر کو شہید، مسلمانوں کو سرکوب، مدینہ کو غارت اور اسلام کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کردیں۔

---

[1] سورہ حشر آیت 5

[2] یہ واقعہ سورہ حشر کی ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے۔

کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں

جنگ احزاب کفر کی آخری کوشش، ان کے ترکش کا آخری تیراور شرک کی قوت کا آخری مظاہرہ تھا اسی بنا پر جب دشمن کا سب سے بڑا پہلوان عمرو بن عبدود عالم اسلام کے دلیر مجاہد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلہ میں آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے (کفر اور) شرک کے مقابلہ میں آ گیا ہے''۔

کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فتح کفر کی ایمان پر یا ایمان کی کفر پر مکمل کامیابی تھی دوسرے لفظوں میں یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جو اسلام اور کفر کے مستقبل کا تعین کر رہا تھا اسی بناء پر دشمن کی اس عظیم جنگ اور کارزار میں کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہمیشہ مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔

دشمن کا ستارہ اقبال غروب ہو گیا اور اس کی طاقت کے ستون ٹوٹ گئے اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب کے خاتمہ پر فرمایا:

''اب ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان میں ہم سے جنگ کی سکت نہیں ہے''۔

لشکر کی تعداد

بعض مؤرخین نے لشکر کفار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ مقریزی اپنی کتاب ''الامتاع'' میں لکھتے ہیں: ''صرف قریش نے چار ہزار جنگ جوؤں، تین سو گھوڑوں اور پندرہ سو اونٹوں کے ساتھ خندق کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا، قبیلہ ''بنی سلیم'' سات سو افراد کے ساتھ ''مرالظہر ان'' کے علاقہ میں ان سے آملا، قبیلہ ''بنی فرازہ'' ہزار افراد کے ساتھ، ''بنی اشجع'' اور ''بنی مرۃ'' کے قبائل میں سے ہر ایک چار چار سو افراد کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور دوسرے قبائل نے بھی اپنے آدمی یہ بھیجے جن کی مجموعی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ بنتی ہے''

جبکہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی انہوں نے (مدینہ کے قریب) ''سلع'' نامی پہاڑی کے دامن کو جو ایک بلند جگہ تھی وہاں پر لشکر کفار نے مسلمانوں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور ایک روایت کے مطابق بیس دن دوسری روایت کے مطابق پچیس دن اور بعض روایات کے مطابق ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔

باوجودیکہ دشمن مسلمانوں کی نسبت مختلف پہلوؤں سے برتری رکھتا تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، آخرکار ناکام ہو کر واپس پلٹ گیا۔

خندق کی کھدائی

خندق کے کھودنے کا سلسلہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے وقوع پذیر ہوا خندق کے اس زمانے میں ملک ایران میں دفاع کا مؤثر ذریعہ تھا اور جزیرۃ العرب میں اس وقت تک اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کا شمار نئی ایجادات میں ہوتا تھا اطراف مدینہ میں اس کا کھودنا فوجی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل تھا یہ خندق دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے اور مسلمانوں کے لئے روحانی تقویت کا بھی ایک مؤثر ذریعہ تھی۔

خندق کے کوائف اور جزئیات کے بارے میں صحیح طور پر معلومات تک رسائی تو نہیں ہے البتہ مؤرخین نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس کا عرض اتنا تھا کہ دشمن کے سوار جست لگا کر بھی اس کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس کی گہرائی یقیناً اتنی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں

داخل ہوجاتا ہے تو آسانی کے ساتھ دوسری طرف باہر نہیں نکل سکتا تھا، علاوہ ازیں مسلمان تیر اندازوں کا خندق والے علاقے پر اتنا تسلط تھا کہ اگر کوئی شخص خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو ان کے لئے ممکن تھا کہ اسے خندق کے اندر ہی تیر کا نشانہ بنا لیتے۔

رہی اس کی لمبائی تو مشہور روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس، دس افراد کو چالیس ہاتھ (تقریباً 20 میٹر) خندق کھودنے پر مامور کیا تھا، اور مشہور قول کے پیش نظر لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی تو مجموعی طور پر اس کی لمبائی اندازاً بارہ ہزار ہاتھ (چھ ہزار میٹر) ہوگی۔

اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ اس زمانے میں نہایت ہی ابتدائی وسائل کے ساتھ اس قسم کی خندق کھودنا بہت ہی طاقت فرسا کام تھا خصوصاً جب کہ مسلمان خوراک اور دوسرے وسائل کے لحاظ سے بھی سخت تنگی میں تھے۔

یقیناً خندق کھودی بھی نہایت کم مدت میں گئی یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ لشکر اسلام پوری ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ضروری پیش بندی کر چکا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ لشکر کفر کے مدینہ پہنچنے سے تین دن پہلے خندق کی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

عمرو بن عبدود سے حضرت علی علیہ السلام کی تاریخی جنگ

اس جنگ کا ایک اہم واقعہ حضرت علی علیہ السلام کا دشمن کے لشکر کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود کے ساتھ مقابلہ تھا تاریخ میں آیا ہے کہ لشکر احزاب نے جن دلاوران عرب میں سے بہت طاقتور افراد کو اس جنگ میں اپنی امداد کے لئے دعوت دے رکھی تھی، ان میں سے پانچ افراد زیادہ مشہور تھے، عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ، نوفل اور ضرار یہ لوگ دوران محاصرہ ایک دن دست بدست لڑائی کے لئے تیار ہوئے، لباس جنگ بدن پر سجایا اور خندق کے ایک کم چوڑے حصے سے، جو مجاہدین اسلام کے تیروں کی پہنچ سے کسی قدر دور تھا، اپنے گھوڑوں کے ساتھ دوسری طرف جست لگائی اور لشکر اسلام کے سامنے آ کھڑے ہوئے ان میں سے عمرو بن عبدود زیادہ مشہور اور نامور تھا اس کی ''کوئی ہے بہادر'' کی آواز میدان احزاب میں گونجی اور چونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا لہٰذا وہ زیادہ گستاخ ہو گیا اور مسلمانوں کے عقاید اور نظریات کا مذاق اڑانے لگا اور کہنے لگا:

''تم تو یہ کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں ہیں اور ہمارے مقتول جہنم میں تو کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے میں بہشت میں بھیجوں یا وہ مجھے جہنم کی طرف روانہ کرے؟''

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے شر کو مسلمانوں کے سر سے کم کر دے لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوا تو آنحضرت نے علی ابن اطالب علیہ السلام سے فرمایا: یہ عمر و بن عبدود ہے'' حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی حضورؐ! میں بالکل تیار ہوں خواہ عمرو ہی کیوں نہ ہو''، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''میرے قریب آؤ'' چنانچہ علی علیہ السلام آپ کے قریب گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنی مخصوص تلوار ذوالفقار انہیں عطا فرمائی اور ان الفاظ میں انہیں دعا دی: ''خدایا علی کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے حفاظت فرما''۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی تیزی سے عمرو کے مقابلہ کے لئے میدان میں پہنچ گئے۔

یہی وہ موقع تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا: ''کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں

جارہا ہے''۔

ضربت علی علیہ السلام ثقلین کی عبادت پر بھاری

امیر المومنین علی علیہ السلام نے پہلے تو اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہ کیا پھر میدان چھوڑ کر چلے جانے کو کہا اس پر بھی اس نے انکار کیا اور اپنے لئے باعث ننگ وعار سمجھا آپ کی تیسری پیشکش یہ تھی کہ گھوڑے سے اتر آئے اور پیادہ ہو کر دست بدست لڑائی کرے۔

عمرو آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عرب میں سے کوئی بھی شخص مجھے ایسی تجویز دے گا گھوڑے سے اتر آیا اور علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا وار کیا لیکن امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنی مخصوص مہارت سے اس وار کو اپنی سپر کے ذریعے روکا، مگر تلوار نے سپر کو کاٹ کر آپ کے سر مبارک کو زخمی کر دیا اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا عمرو بن عبدود سے فرمایا: تو عرب کا زبردست پہلوان ہے، جب کہ میں تجھ سے تن تنہا لڑ رہا ہوں لیکن تو نے اپنے پیچھے کن لوگوں کو جمع کر رکھا ہے اس پر عمرو نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمرو کی پنڈلی پر تلوار کا وار کیا، جس سے وہ سرو قد زمین پر لوٹنے لگا شدید گرد وغبار نے میدان کی فضا کو گھیر رکھا تھا کچھ منافقین یہ سوچ رہے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام، عمرو کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں لیکن جب انھوں نے تکبیر کی آواز سنی تو علی کی کامیابی ان پر واضح ہو گئی اچانک لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے سر مبارک سے خون بہہ رہا تھا اور لشکر گاہ اسلام کی طرف خراماں خراماں واپس آرہے تھے جبکہ فتح کی مسکراہٹ آپ کے لبوں پر کھیل رہی تھی اور عمرو کا پیکر بے سر میدان کے کنارے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

عرب کے مشہور پہلوان کے مارے جانے سے لشکر احزاب اور ان کی آرزوؤں پر ضرب کاری لگی ان کے حوصلے پست اور دل انتہائی کمزور ہو گئے اس ضرب نے ان کی فتح کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کامیابی کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا:

''اگر تمہارے آج کے عمل کو ساری امت محمد کے اعمال سے موازنہ کریں تو وہ ان پر بھاری ہوگا، کیونکہ عمرو کے مارے جانے سے مشرکین کا کوئی ایسا گھر باقی نہیں رہا جس میں ذلت وخواری داخل نہ ہوئی ہو اور مسلمانوں کا کوئی بھی گھر ایسا نہیں ہے جس میں عمرو کے قتل ہو جانے کی وجہ سے عزت داخل نہ ہوئی ہو''۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم نیشاپوری نے اس گفتگو کو نقل کیا ہے البتہ مختلف الفاظ کے ساتھ اور وہ یہ ہے:

"لمبارزة علی بن ابیطالب لعمروبن عبدود یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامة"

''یعنی علی بن ابی طالب کی خندق کے دن عمرو بن عبدود سے جنگ میری امت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے''

آپ کے اس ارشاد کا فلسفہ واضح ہے، کیونکہ اس دن اسلام اور قرآن ظاہراً نابودی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ان کے لئے زبردست بحرانی لحات تھے، جس شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فداکاری کے بعد اس میدان میں سب سے زیادہ ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، اسلام کو خطرے سے محفوظ رکھا، قیامت تک اس کے دوام کی ضمانت دی، اس کی فداکاری سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور پھر اسلام عالمین پر پھیل گیا لہٰذا سب لوگوں کی عبادتیں اسکی مرہون منت قرار پا گئیں۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے کسی آدمی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تا کہ وہ عمرو بن عبدود کے لاشہ کو دس ہزار درہم میں خرید لائے (شاید ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان عمرو کے بدن کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو سنگدل ظالموں نے حمزہؓ کے بدن کے ساتھ جنگ اُحد میں کیا تھا) لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کا لاشہ تمہاری ملکیت ہے ہم مردوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت عمرو کی بہن اپنے بھائی کے لاشہ پر پہنچی اور اس کی قیمتی زرہ کو دیکھا کہ جو حضرت علی علیہ السلام نے اس کے بدن سے نہیں اتاری تو اس نے کہا:

''میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کا قاتل کریم اور بزرگوار شخص ہی تھا''

نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ

نعیم جو تازہ مسلمان تھے اور ان کے قبیلہ ''غطفان'' کو لشکر اسلام کی خبر نہیں تھی، وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ آپؐ مجھے جو حکم بھی دیں گے، میں حتمی کامیابی کے لئے اس پر کاربند رہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے جیسا شخص ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تم دشمن کے لشکر کے درمیان پھوٹ ڈال سکتے ہو تو ڈالو۔ کیونکہ جنگ پوشیدہ تدابیر کا مجموعہ ہے''۔

نعیم بن مسعود نے ایک عمدہ تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس گیا، جن سے زمانہ جاہلیت میں ان کی دوستی تھی ان سے کہا اے بنی قریظہ تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارے ساتھ محبت ہے۔

انھوں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں: ہم آپ پر اس بارے میں ہرگز کوئی الزام نہیں لگاتے۔

نعیم بن مسعود نے کہا: قبیلہ قریش اور غطفان تمہاری طرح نہیں ہیں، یہ تمہارا اپنا شہر ہے، تمہارا مال اولاد اور عورتیں یہاں پر ہیں اور تم ہرگز یہ نہیں کر سکتے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤ۔

قریش اور قبیلہ غطفان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کے لے آئے ہوئے ہیں اور تم نے ان کی حمایت کی ہے جبکہ ان کا شہر کہیں اور ہے اور ان کے مال اور عورتیں بھی دوسری جگہ پر ہیں، اگر انہیں موقع ملے تو لوٹ مار اور غارت گری کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے، اگر کوئی مشکل پیش آ جائے تو اپنے شہر کو لوٹ جائیں گے، لیکن تم کو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو اسی شہر میں رہنا ہے اور یقیناً تم اکیلے ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تم اس وقت تک اسلحہ نہ اٹھاؤ جب تک قریش سے کوئی معاہدہ نہ کر لو اور وہ اس طرح کہ وہ چند سرداروں اور بزرگوں کو تمہارے پاس گروی رکھ دیں تا کہ وہ جنگ میں کوتاہی نہ کریں۔

بنی قریظہ کے یہودیوں نے اس نظریہ کو بہت سراہا۔

پھر نعیم مخفی طور پر قریش کے پاس گیا اور ابوسفیان اور قریش کے چند سرداروں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ میری دوستی کی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہو، ایک بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، جسے تم تک پہنچانا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں تا کہ خیر خواہی کا حق ادا کر سکوں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔

انھوں نے کہا کہ تم بالکل مطمئن رہو۔

نعیم کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہودی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تمہارے طرز عمل سے اپنی برائت کا فیصلہ کر چکے ہیں، یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قاصد بھیجا ہے اور کہلوایا ہے کہ ہم اپنے کئے پر پشیمان ہیں اور کیا یہ کافی ہوگا کہ ہم قبیلہ قریش اور غطفان کے چند سردار آپؐ کے لئے یرغمال بنالیں اور ان کو بندھے ہاتھوں آپ کے سپرد کردیں تاکہ آپ ان کی گردن اڑادیں، اس کے بعد ہم آپ کے ساتھ مل کر ان کی بیخ کنی کریں گے؟ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی پیش کش کو قبول کرلیا ہے، اس بناء پر اگر یہودی تمہارے پاس کسی کو بھیجیں اور گروی رکھنے کا مطالبہ کریں تو ایک آدمی بھی ان کے سپرد نہ کرنا کیونکہ خطرہ یقینی ہے۔

پھر وہ اپنے قبیلہ غطفان کے پاس آئے اور کہا: تم میرے اصل اور نسب کو اچھی طرح جانتے ہو۔

میں تمہارا عاشق اور فریفتہ ہوں اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہیں میرے خلوص نیت میں تھوڑا سا بھی شک اور شبہ ہو۔

انھوں نے کہا: تم سچ کہتے ہو، یقیناً ایسا ہی ہے۔

نعیم نے کہا: میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن ایسا ہو کہ گو یا تم نے مجھ سے بات نہیں سنی۔

انھوں نے کہا: مطمئن رہو یقیناً ایسا ہی ہوگا، وہ بات کیا ہے؟

نعیم نے وہی بات جو قریش سے کہی تھی یہودیوں کے پشیمان ہونے اور یرغمال بنانے کے ارادے کے بارے میں حرف بحرف ان سے بھی کہہ دیا اور انہیں اس کام کے انجام سے ڈرایا۔

اتفاق سے وہ (ماہ شوال سن 5 ہجری کے) جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات تھی۔ ابوسفیان اور غطفان کے سرداروں نے ایک گروہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: ہمارے جانور یہاں تلف ہو رہے ہیں اور یہاں ہمارے لئے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ کل صبح ہمیں حملہ شروع کرنا چاہیے تاکہ کام کو کسی نتیجے تک پہنچائیں۔

یہودیوں نے جواب میں کہا: کل ہفتہ کا دن ہے اور ہم اس دن کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے، علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر جنگ نے تم پر دباؤ ڈالا تو تم اپنے شہروں کی طرف پلٹ جاؤ گے اور ہمیں یہاں تنہا چھوڑ دوگے۔ ہمارے تعاون او رساتھ دینے کی شرط یہ ہے کہ ایک گروہ گروی کے طور پر ہمارے حوالے کردو، جب یہ خبر قبیلہ قریش اور غطفان تک پہنچی تو انھوں نے کہا: خدا کی قسم نعیم بن مسعود سچ کہتا تھا، دال میں کالا ضرور ہے۔

لہٰذا انھوں نے اپنے قاصد یہودیوں کے پاس بھیجے اور کہا: بخدا ہم تو ایک آدمی بھی تمہارے سپرد نہیں کریں گے اور اگر جنگ میں شریک ہو تو ٹھیک ہے شروع کرو۔

بنی قریظہ جب اس سے باخبر ہوئے تو انھوں نے کہا: واقعاً نعیم بن مسعود نے حق بات کہی تھی یہ جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ کوئی چکر چلا رہے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ لوٹ مار کر کے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں اور ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں اکیلا چھوڑ جائیں پھر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اصل بات وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں، بخدا جب تک کچھ افراد گروی کے طور پر ہمارے سپرد نہیں کروگے، ہم بھی جنگ نہیں کریں گے، قریش اور غطفان نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا، لہٰذا ان کے درمیان بھی اختلاف پڑ گیا۔ اور یہ وہی موقع تھا کہ رات کو اس قدر زبردست سرد طوفانی ہوا چلی کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے اور دیگیں چولہوں سے زمین پر آپڑیں۔

یہ سب عوامل مل ملا کر اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا اور فرار کو قرار پر ترجیح دینی پڑی۔ یہاں تک کہ میدان میں ان کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔

حذیفہ کا واقعہ

بہت سی تواریخ میں آیا ہے، کہ حذیفہ یمانی کہتے ہیں کہ ہم جنگ خندق میں بھوک اور تھکن، وحشت اور اضطراب سے اس قدر دو چار تھے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، ایک رات (لشکر احزاب میں اختلاف پڑ جانے کے بعد) پیغمبر ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو چھپ چھپا کر دشمن کی لشکر گاہ میں جائے اور ان کے حالات معلوم کر لائے تا کہ وہ جنت میں میرا رفیق اور ساتھی ہو۔

حذیفہ کہتے ہیں: خدا کی قسم کوئی شخص بھی شدت وحشت، تھکن اور بھوک کے مارے اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔

جس وقت آنحضرت ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو مجھے آواز دی، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا جاؤ اور میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے آؤ۔ لیکن وہاں کوئی اور کام انجام نہ دینا یہاں تک کہ میرے پاس آ جاؤ۔

میں ایسی حالت میں وہاں پہنچا جب کہ سخت آندھی چل رہی تھی اور طوفان برپا تھا اور خدا کا یہ لشکر انہیں تہس نہس کر رہا تھا۔ خیمے تیز آندھی کے سبب ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آگ بیابان میں پھیل چکی تھی۔ کھانے کے برتن الٹ پلٹ گئے تھے اچانک میں نے ابوسفیان کا سایہ محسوس کیا کہ وہ اس تاریکی میں بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے قریش تم میں سے ہر ایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے کو اچھی طرح سے پہچان لے تا کہ یہاں کوئی بے گانہ نہ ہو، میں نے پہل کر کے فوراً ہی اپنے پاس بیٹھنے والے شخص سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا، فلاں ہوں، میں نے کہا بہت اچھا۔

پھر ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، ہمارے اونٹ گھوڑے ضائع ہو چکے ہیں اور بنی قریظہ نے اپنا پیمان توڑ ڈالا ہے اور اس طوفان نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ بڑی تیزی سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہونے کے لئے اسے زمین سے اٹھایا، اور اس قدر جلدی میں تھا کہ اونٹ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کھولنا بھول گیا، لہذا اونٹ تین پاؤں پر کھڑا ہو گیا، میں نے سوچا ایک ہی تیر سے اسکا کام تمام کر دوں، ابھی تیر چلہ کمان میں جوڑا ہی تھا کہ فوراً آنحضرت ﷺ کا فرمان یاد آ گیا کہ جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کچھ کاروائی کے بغیر واپس آ جانا، تمہارا کام صرف وہاں کے حالات ہمارے پاس لانا ہے، لہذا میں واپس پلٹ گیا اور جا کر تمام حالات عرض کئے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا:

''خداوندا تو کتاب کو نازل کرنے والا اور سریع الحساب ہے، تو خود ہی احزاب کو نیست و نابود فرما خدایا انہیں تباہ کر دے اور ان کے پاؤں نہ جمنے دے''۔

جنگ احزاب قرآن کی روشنی میں

قرآن اس کا ماجرا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو، اپنے اوپر خدا کی عظیم نعمت کو یاد کرو، اس موقع پر جب کہ عظیم لشکر تمہاری طرف آئے''۔ [1]

''لیکن ہم نے ان پر آندھی اور طوفان بھیجے اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ رہے تھے اور اس ذریعہ سے ہم نے ان کی

---

[1] سورہ احزاب آیت 9

سرکوبی کی اور انہیں تتر بتر کر دیا"۔[1]

"نہ دکھنے والے لشکر" سے مراد جو رسالت مابﷺ کی نصرت کے لئے آئے تھے، وہی فرشتے تھے جن کا مومنین کی جنگ بدر میں مدد کرنا بھی صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے لیکن جیسا (کہ سورہ انفال کی آیہ 9 کے ذیل میں) ہم بیان کر چکے ہیں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ نظر نہ آنے والا فرشتوں کا خدائی لشکر باقاعدہ طور پر میدان میں داخل ہوا اور وہ جنگ میں بھی مصروف ہوا ہو بلکہ ایسے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ وہ صرف مومنین کے حوصلے بلند کرنے اور ان کا دل بڑھانے کے لئے نازل ہوئے تھے۔

بعد والی آیت جو جنگ احزاب کی بحرانی کیفیت، دشمنوں کی عظیم طاقت اور بہت سے مسلمانوں کی شدید پریشانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یوں کہتی ہے "اس وقت کو یاد کرو جب وہ تمہارے شہر کے اوپر اور نیچے سے داخل ہو گئے، اور مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا) اور اس وقت کو جب آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا گئی تھیں اور جاں بلب ہو گئے تھے اور خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے تھے"۔[2]

اس کیفیت سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لئے غلط قسم کے گمان پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک ایمانی قوت کے لحاظ سے کمال کے مرحلہ تک نہیں پہنچ پائے تھے یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ وہ شدت سے متزلزل ہوئے۔

شاید ان میں سے کچھ لوگ گمان کرتے تھے کہ آخر کار ہم شکست کھا جائیں گے اور اس قوت و طاقت کے ساتھ دشمن کا لشکر کامیاب ہو جائے گا، اسلام کے زندگی کے آخری دن آپہنچے ہیں اور پیغمبرﷺ کا کامیابی کا وعدہ بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

البتہ یہ افکار اور نظریات ایک عقیدہ کی صورت میں نہیں بلکہ ایک وسوسہ کی شکل میں بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے جنگ احد کے سلسلہ میں قرآن مجید ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "یعنی تم میں سے ایک گروہ جنگ کے ان بحرانی لحات میں صرف اپنی جان کی فکر میں تھا اور دور جاہلیت کے گمانوں کی مانند خدا کے بارے میں بدگمانی کر رہے تھے"۔

یہی وہ منزل تھی کہ خدائی امتحان کا تنور سخت گرم ہوا جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے کہ "وہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ سخت دہل گئے تھے"۔[3]

فطری امر ہے کہ جب انسان فکری طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو اس کا جسم بھی ان طوفانوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ بھی اضطراب اور تزلزل کے سمندر میں ڈوبنے لگتا ہے، ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو وہ جہاں بھی بیٹھتے ہیں اکثر بے چین رہتے ہیں، ہاتھ ملتے کانپتے رہتے ہیں اور اپنے اضطراب اور پریشانیوں کو اپنی حرکات سے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

اس شدید پریشانی کے شواہد میں سے ایک یہ بھی تھا جسے مؤرخین نے بھی نقل کیا ہے کہ عرب کے پانچ مشہور جنگجو پہلوان جن کا سردار عمرو بن عبدود تھا، جنگ کا لباس پہن کر اور مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ میدان میں آئے اور "هل من مبارز" (ہے کوئی

---

[1] سورہ احزاب آیت 9

[2] سورہ احزاب آیت 10

[3] سورہ احزاب آیت 11

مقابلہ کرنے والا) کی آواز لگانے لگے، خاص کر عمرو بن عبدود رجز پڑھ کر جنت اور آخرت کا مذاق اڑا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ ''کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں جائیں گے؟ تو کیا تم میں سے کوئی بھی جنت کے دیدار کا شوقین نہیں ہے؟'' لیکن اس کے ان نعروں کے برخلاف لشکر اسلام پر بُری طرح کی خاموشی طاری تھی اور کوئی بھی مقابلہ کی جرائت نہیں رکھتا تھا سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جو مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو عظیم کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ اس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

جی ہاں جس طرح فولاد کو گرم بھٹی میں ڈالتے ہیں تا کہ وہ نکھر جائے اسی طرح اوائل کے مسلمان بھی جنگ احزاب جیسے معرکوں کی بھٹی میں سے گزریں تا کہ کندن بن کر نکلیں اور حوادثات کے مقابل میں جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کر سکیں۔

منافقین اور ضعیف الایمان جنگ احزاب میں

ہم کہہ چکے ہیں کہ امتحان کی بھٹی جنگ احزاب میں گرم ہوئی اور سب کے سب اس عظیم امتحان میں گھر گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے بحرانی دور میں جو لوگ عام حالات میں ظاہراً ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں، کئی صفوں میں بٹ جاتے ہیں، یہاں پر بھی مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے، ایک جماعت سچے مومنین کی تھی، ایک گروہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے منافقین کا تھا اور ایک گروہ اپنے گھر بار، زندگی اور بھاگ کھڑے ہونے کی فکر میں تھا، اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ دوسرے لوگوں کو جہاد سے روکیں۔ اور ایک گروہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ منافقین کے ساتھ اپنے رشتہ کو محکم کریں۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص نے اپنے باطنی اسرار اس عجیب ''عرصہ محشر'' اور ''یوم البروز'' میں آشکار کر دیئے۔

میں نے ایران، روم اور مصر کے محلوں کو دیکھا ہے

خندق کھودنے کے دوران میں جب ہر ایک مسلمان خندق کے ایک حصہ کے کھودنے میں مصروف تھا تو ایک مرتبہ پتھر کے ایک سخت اور بڑے ٹکڑے سے ان کا سامنا ہوا کہ جس پر کوئی ہتھوڑا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس خندق میں تشریف لے گئے اور اس پتھر کے پاس کھڑے ہو کر اور ہتھوڑا لے کر پہلی مرتبہ ہی اس کے دل پر ایسی مضبوط چوٹ لگائی کہ اس کا کچھ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس سے ایک چمک نکلی جس پر آپؐ نے فتح و کامرانی کی تکبیر بلند کی۔ آپؐ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے ایک اور سخت چوٹ لگائی تو اس کا کچھ حصہ اور ٹوٹا اور اس سے بھی چمک نکلی۔ اس پر بھی سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی آپؐ کے ساتھ تکبیر کہی آخر کار آپؐ نے تیسری چوٹ لگائی جس سے بجلی کوندی اور باقی ماندہ پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا، اس موقع پر جناب سلمان فارسی نے اس ماجرا کے بارے میں دریافت کیا تو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پہلی چمک میں میں نے ''حیرہ'' کی سرزمین اور ایران کے بادشاہوں کے قصر و محلات دیکھے ہیں اور جبرائیل نے مجھے بشارت دی ہے کہ میری امت ان پر کامیابی حاصل کرے گی، دوسری چمک میں ''شام و روم'' کے سرخ رنگ کے محلات نمایاں ہوئے اور جبرائیل نے پھر بشارت دی کہ میری امت ان پر فتح یاب ہو گی، تیسری چمک میں مجھے ''صنعا و یمن'' کے قصر و محلات دکھائی دیئے ور جبرائیل نے نوید دی کہ میری امت ان پر بھی کامیابی حاصل کرے گی، اے مسلمانو تمہیں خوشخبری ہو''۔

منافقین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: کیسی عجیب وغریب باتیں کررہے ہیں اور کیا ہی باطل اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہے؟ مدینہ سے حیرہ اور مدائن کسری کو تو دیکھ کرتمہیں ان کے فتح ہونے کی خبر دیتا ہے حالانکہ اس وقت تم چند عربوں کے چنگل میں گرفتار ہو (اور خود دفاعی پوزیشن اختیار کئے ہوئے ہو) تم تو ''بیت الخلاء'' (خوف کی جگہ) تک نہیں جا سکتے (کیا ہی خیال خام او رگمان باطل ہے)۔

الٰہی وحی نازل ہوئی اور کہا:

''یہ منافق اور دل کے مریض کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول نے سوائے دھوکہ وفریب کے ہمیں کوئی وعدہ نہیں دیا، (وہ پروردگار کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں''۔)[1]

اس وقت اس قسم کی بشارت اور خوشخبری سوائے آگاہ اور باخبر مومنین کی نظر کے علاوہ (باقی لوگوں کے لئے) دھوکا اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پیغمبر ﷺ کی ملکوتی آنکھیں ان آتشیں چنگاریوں کے درمیان سے جو کدالوں اور ہتھوڑوں کے خندق کھودنے کے لئے زمین پر لگنے سے نکلتی تھیں، ایران روم اور یمن کے بادشاہوں کے قصر ومحلات کے دروازوں کے کھلنے کو دیکھ سکتے تھے اور آئندہ کے اسرار ورموز سے پردے بھی اٹھا سکتے تھے۔

منافقانہ عذر

جنگ احزاب کے واقعہ کے سلسلے میں قرآن مجید منافقین اور دل کے بیمار لوگوں میں سے ایک خطرناک گروہ کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جو دوسروں کی نسبت زیادہ خبیث اور آلودہ گناہ ہیں، چنانچہ کہتا ہے: ''اور اس وقت کو بھی یاد کرو، جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا: اے یثرب (مدینہ) کے رہنے والو یہاں تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ''۔[2]

خلاصہ یہ کہ دشمنوں کے اس انبوہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوسکتا، اپنے آپ کو معرکہ کارزار سے نکال کرلے جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت کے اور بیوی بچوں کو قید کے حوالے نہ کرو۔ اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف سے تو وہ انصار کے گروہ کو لشکر اسلام سے جدا کرلیں اور دوسری طرف ''انہیں منافقین کا ٹولہ جن کے گھر مدینہ میں تھے، نبی اکرم ﷺ سے اجازت مانگ رہے تھے کہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنی اس واپسی کے لئے حیلے بہانے پیش کررہے تھے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے گھردں کے در ودیوار ٹھیک نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا، اس طرح سے وہ میدان کو خالی چھوڑ کر فرار کرنا چاہتے تھے''۔[3]

منافقین اس قسم کا عذر پیش کرکے یہ چاہتے تھے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں میں جا کر پناہ لیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ قبیلہ ''بنی حارثہ'' نے کسی شخص کو حضور رسالت پناہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصار میں سے کسی کا گھر بھی ہمارے گھروں کی طرح نہیں اور ہمارے اور قبیلہ ''غطفان'' کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو مدینہ کی مشرقی جانب سے حملہ آور ہورہے ہیں، لہٰذا اجازت دیجئے تاکہ ہم اپنے گھروں کو پلٹ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع کریں تو سرکار رسالت ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرمادی۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 12

[2] سورہ احزاب آیت 12

[3] سورہ احزاب آیت 13

جب یہ بات انصار کے سردار ''معد بن معاذ'' کے گوش گذار ہوئی تو انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا ''سرکار انہیں اجازت نہ دیجئے، بخدا آج تک جب بھی کوئی مشکل درپیش آئی تو ان لوگوں نے یہی بہانہ تراشا، یہ جھوٹ بولتے ہیں''۔ [۱]

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ واپس آجائیں۔ [۲]

قرآن میں خداوند عالم اس گروہ کے ایمان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''وہ اسلام کے اظہار میں اس قدر ضعیف اور ناتواں ہیں کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف وجوانب سے اس شہر میں داخل ہوجائیں اور مدینہ کو فوجی کنٹرول میں لے کر انہیں پیش کش کریں کہ کفر وشرک کی طرف پلٹ جائیں تو جلدی سے اس کو قبول کرلیں گے اور اس راہ کے انتخاب کرنے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کریں گے''۔ [۳]

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قدرت ضعیف، کمزور اور غیر مستقل مزاج ہوں کہ نہ تو دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں اور نہ ہی راہ خدا میں شہادت قبول کرنے کے لئے، ایسے لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنی راہ فوراً بدل دیتے ہیں۔

پھر قرآن اس منافق ٹولے کو عدالت کے کٹہرے میں لاکر کہتا ہے: ''انھوں نے پہلے سے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہوا تھا کہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے اور اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہوئے توحید، اسلام اور پیغمبر کے لئے دفاع میں کھڑے ہوں گے، کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا سے کئے گئے عہد و پیمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا''۔ [۴]

جب خدا نے منافقین کی نیت کو فاش کردیا کہ ان کا مقصد گھروں کی حفاظت کرنا نہیں، بلکہ میدان جنگ سے فرار کرنا ہے تو انہیں دو دلیلوں کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے: ''کہہ دیجئے کہ اگر موت یا قتل ہونے سے فرار کرتے ہو تو یہ فرار تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچائے گا اور تم دنیاوی زندگی کے چند دن سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا پاؤ گے''۔ [۵]

دوسرا یہ کہ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا سارا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے اور تم اس کی قدرت ومشیت کے دائرہ اختیار سے ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

---

[۱] سورہ احزاب آیت 14

[۲] ''یثرب'' مدینہ کا قدیمی نام ہے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس شہر کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے تک اس کا نام ''یثرب'' رہا پھر آہستہ آہستہ اس کا نام ''مدینۃ الرسول'' (پیغمبر کا شہر) پڑ گیا جس کا مخفف ''مدینہ'' ہے۔ اس شہر کے کئی ایک نام اور بھی ہیں۔ سید مرتضی نے ان دونا موں (مدینہ اور یثرب) کے علاوہ اس شہر کے گیارہ اور نام بھی ذکر کیے ہیں، منجملہ ان کے ''طیبہ''''طابہ''''سکینہ''''محبوبہ''''مرحومہ'' اور ''قاصمہ'' ہیں۔ (اور بعض لوگ اس شہر کی زمین کو ''یثرب'' کا نام دیتے ہیں)

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اس شہر کو یثرب نہ کہا کرو شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ یثرب اصل میں ''ثرب'' (بروزن حرب) کے مادہ سے ملامت کرنے کے معنی میں ہے اور آپ اس قسم کے نام کو اس بابرکت شہر کے لئے پسند نہیں فرماتے تھے''۔

بہر حال منافقین نے اہل مدینہ کو ''یا اہل یثرب'' کے عنوان سے جو خطاب کیا ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نام سے نفرت ہے، یا چاہتے تھے کہ اسلام اور ''مدینۃ الرسول'' کے نام کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کریں۔ یا لوگوں کو زمانہ جاہلیت کی یاد تازہ کرائیں۔

[۳] سورہ احزاب آیت 14

[۴] سورہ احزاب آیت 15

[۵] سورہ احزاب آیت 16

''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہہ دیجئے: کون شخص خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کرسکتا ہے، اگر وہ تمہارے لئے مصیبت یا رحمت چاہتا ہے''۔[1]

روکنے والا ٹولہ

اس کے بعد قرآن مجید منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنگ احزاب کے میدان سے خود کنارہ کش ہوا اور دوسروں کو بھی کنارکشی کی دعوت دیتا ہو فرماتا ہے: ''خدا تم میں سے اس گروہ کو جانتا ہے جو کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو جنگ سے منحرف کردیں، اور اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف آؤ اور اس خطرناک جنگ سے دستبردار ہو جاؤ''۔

وہی لوگ جو اہل جنگ نہیں ہیں اور سوائے کم مقدار کے اور وہ بھی بطور جبر و اکراہ یا دکھاوے کے؛ جنگ کے لئے نہیں جاتے۔[2]

ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک صحابی رسول کسی ضرورت کے تحت میدان ''احزاب'' سے شہر میں آیا ہوا تھا اس نے اپنے بھائی کو دیکھا کہ اس نے اپنے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور شراب رکھے ہوئے تھے، تو صحابی نے کہا تم تو یہاں عیش و عشرت میں مشغول ہو اور رسول خدا نیزوں اور تلواروں کے درمیان مصروف پیکار ہیں اس نے جواب میں کہا، اے بے وقوف: تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور مزے اڑاؤ اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس کی محمدؐ کھاتا ہے وہ اس میدان سے ہرگز پلٹ کر واپس نہیں آئے گا اور یہ عظیم لشکر جو جمع ہو چکا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ سن کر وہ صحابی کہنے لگے: تو بکتا ہے، خدا کی قسم میں ابھی رسول اللہ کے پاس جا کر تمہاری اس گفتگو سے باخبر کرتا ہوں، چنانچہ انھوں نے بارگاہ رسالت میں پہنچ کر تمام ماجرا بیان کیا۔

وہ ہرگز ایمان نہیں لائے

قرآن فرماتا ہے: ''ان تمام رکاوٹوں کا باعث یہ ہے کہ وہ تمہاری بابت تمام چیزوں میں بخیل ہیں''۔[3]

نہ صرف میدان جنگ میں جان قربان کرنے میں بلکہ وسائل جنگ مہیا کرنے کے لئے مالی امداد اور خندق کھودنے کے لئے جسمانی امداد حتیٰ کہ فکری امداد مہیا کرنے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں، ایسا بخل جو حرص کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسا حرص جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے بخل اور ہر قسم کے ایثار سے دریغ کرنے کے بیان کے بعد ان کے ان دوسرے اوصاف کو جو ہر عہد اور ہر دور کے تمام منافقین کے لئے تقریباً عمومیت کا درجہ رکھتے ہیں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''جس وقت خوفناک اور بحرانی لحات آتے ہیں تو وہ اس قدر بزدل اور ڈرپوک ہیں کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کی آنکھوں میں ڈھیلے بے اختیار گردش کررہے

---

[1] سورہ احزاب آیت 17

[2] سورہ احزاب آیت 18

[3] سورہ احزاب آیت 19

ہیں،اس شخص کی طرح جو جاں کنی میں مبتلا ہو‘‘۔ [۱]

چونکہ وہ صحیح ایمان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی میں ان کا کوئی مستحکم سہارا ہے،جس وقت کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ لوگ بالکل اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں جیسے ان کی روح قبض ہی ہو جائے گی۔

پھر مزید کہتا ہے:’’لیکن یہی لوگ جس وقت طوفان رک جاتا ہے اور حالات معمول پر آجاتے ہیں تو تمہارے پاس یہ توقع لے کر آتے ہیں کہ گویا جنگ کے اصلی فاتح یہی ہیں اور قرض خواہوں کی طرح پکار پکار کر سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ مال غنیمت سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس میں سخت گیر،بخیل اور حریص ہیں‘‘۔ [۲]

آخر میں ان کی آخری صفت کی طرف جو درحقیقت میں ان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور بنیاد ہے،اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے’’وہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔اور اسی بنا پر خدا نے ان کے اعمال نیست و نابود کر دیئے ہیں کیونکہ ان کے اعمال خدا کے لئے نہیں ہیں اور ان میں اخلاص نہیں پایا جاتا۔‘‘ [۳]

’’وہ اس قدر وحشت زدہ ہو چکے ہیں کہ احزاب اور دشمن کے لشکروں کے پراگندہ ہو جانے کے بعد بھی یہ تصور کرتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں گئے‘‘۔ [۴]

وحشت ناک اور بھیانک تصور نے ان کی فکر پر سایہ کر رکھا ہے گویا کفر کی افواج پے در پے ان کی آنکھوں کے سامنے قطار در قطار چلی جا رہی ہیں،ننگی تلواریں اور نیزے تانے ان پر حملہ کر رہی ہیں۔

یہ بزدل جھگڑالو،ڈرپوک منافق اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں،جب کسی گھوڑے کے ہنہنانے یا کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنتے ہیں تو مارے خوف کے لرزنے لگتے ہیں کہ شاید احزاب کے لشکر واپس آرہے ہیں۔

اس کے بعد کہتا ہے:’’اگر احزاب دوبارہ پلٹ کر آجائے تو وہ اس بات پر تیار ہیں کہ بیابان کا رخ کرلیں اور بادیہ نشین بدوؤں کے درمیان منتشر ہو کر پنہاں ہو جائیں ہاں،ہاں وہ چلے جائیں اور وہاں جا کر رہیں اور ہمیشہ تمہاری خبروں کے جویا رہیں‘‘۔ [۵]

ہر مسافر سے تمہاری ہر ہر پل کی خبر کے جویا رہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں احزاب ان کی جگہ کے قریب آجائیں اور ان کا سایہ ان کے گھر کی دیواروں پر آپڑے اور تم پر یہ احسان جتلائیں کہ وہ ہمشہ تمہاری حالت اور کیفیت کے بارے میں فکر مند تھے۔

اور آخری جملہ میں کہتا ہے:

’’بالفرض وہ فرار بھی نہ کرتے اور تمہارے درمیان ہی رہتے،پھر بھی سوائے تھوڑی سی جنگ کے وہ کچھ نہ کر پاتے‘‘۔ [۶]

نہ ان کے جانے سے تم پریشان ہونا اور نہ ہی ان کے موجود رہنے سے خوشی منانا،کیونکہ نہ تو ان کی قدر و قیمت ہے اور نہ ہی کوئی خاص حیثیت،بلکہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔

---

[۱] سورہ احزاب آیت 19
[۲] سورہ احزاب آیت 19
[۳] سورہ احزاب آیت 19
[۴] سورہ احزاب آیت 20
[۵] سورہ احزاب آیت 20
[۶] سورہ احزاب آیت 20

ان کی یہی تھوڑی سی جنگ بھی خدا کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کی سرزنش اور ملامت کے خوف اور ظاہرداری یا ریاکاری کے لئے ہے کیونکہ اگر خدا کے لئے ہوتی تو اس کی کوئی حدوانتہا نہ ہوتی اور جب تک جان میں جان ہوتی وہ اس میدان میں ڈٹے رہتے۔

جنگ احزاب میں سچے مومنین کا کردار

اب تک مختلف گروہوں اور ان کے جنگ احزاب میں کارناموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جن میں ضعیف الایمان مسلمان، منافق، کفرونفاق کے سرغنہ اور جہاد سے روکنے والے شامل ہیں۔

قرآن مجید اس گفتگو کے آخر میں ''سچے مؤمنین'' ان کے بلند حوصلوں، پامردیوں، جرأتوں اور اس عظیم جہاد میں ان کی دیگر خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بحث کی تمہید کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے شروع کرتا ہے جو مسلمانوں کے پیشوا، سردار اور اسوہ کامل تھے، خدا کہتا ہے: ''تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور (میدان احزاب میں) ان کا کردار ایک اچھا نمونہ اور اسوہ ہے، ان لوگوں کے لئے جو رحمت خدا اور روز قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔''[1]

تمہارے لئے بہترین اسوہ اور نمونہ، نہ صرف اس میدان میں بلکہ ساری زندگی پیغمبر اسلام کی ذات والا صفات ہے آپ کے بلند حوصلے، صبر واستقامت، پائمردی، زیرکی، دانائی، خلوص، خدا کی طرف توجہ، حادثات پر کنٹرول، مشکلات اور مصائب کے آگے سرتسلیم خم نہ کرنا، غرضکہ ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لئے نمونہ کامل اور اسوہ حسنہ ہے۔

وہ ایسا عظیم ناخدا ہے کہ جب اس کی کشتی سخت ترین طوفانوں میں گھر جاتی ہے تو ذرہ برابر بھی کمزوری، گھبراہٹ اور سراسیمگی کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ کشتی کا ناخدا بھی ہے اور اس کا قابل اطمینان لنگر اور چراغ ہدایت بھی وہ اس میں بیٹھنے والوں کے لئے آرام وسکون کا باعث بھی ہے اور ان کے لئے راحت جان بھی۔

وہ دوسرے مؤمنین کے ساتھ مل کر کدال ہاتھ میں لیتا ہے اور خندق کھودتا ہے، بیلچے کے ساتھ پتھر اکھاڑ کر خندق سے باہر ڈال آتا ہے اپنے اصحاب کے حوصلے بڑھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے لئے ان سے مزاح بھی کرتا ہے ان کے قلب وروح کو گرمانے کے حربی اور جوش وجذبہ دلانے والے اشعار پڑھ کر انہیں ترغیب بھی دلاتا ہے، ذکر خدا کرنے پر مسلسل اصرار کرتا ہے اور انہیں درخشاں مستقبل اور عظیم فتوحات کی خوشخبری دیتا ہے انہیں منافقوں کی سازشوں سے متنبہ کرتا ہے اور ان سے ہمیشہ خبردار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

صحیح حربی طریقوں اور بہترین فوجی چالوں کو انتخاب کرنے سے ایک لحہ بھی غافل نہیں رہتا اس کے باوجود مختلف طریقوں سے دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنے سے بھی نہیں چوکتا۔

جی ہاں: وہ مومنین کا بہترین مقتدا ہے اور ان کے لئے اسوہ حسنہ ہے اس میدان میں بھی اور دوسرے تمام میدانوں میں بھی۔

مومنین کے صفات

اس مقام پر مومنین کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے:

''جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرتے تھے وہ خدا سے کئے ہوئے اپنے اس عہد وپیمان

---

[1] سورہ احزاب آیت 21

پر قائم تھے کہ وہ آخری سانس اور آخری قطرہ خون تک فدا کاری اور قربانی کے لئے تیار ہیں فرمایا گیا ہے مومنین میں ایسے بھی ہیں جو اس عہدو پیمان پر قائم ہیں جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے ان میں سے کچھ نے تو میدان جہاد میں شربت شہادت نوش کر لیا ہے اور بعض انتظار میں ہیں اور انھوں نے اپنے عہدو پیمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی''۔ [1]

اور نہ ہی ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی ہے۔

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ آیت کن افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم ابوالقاسم جسکانی سند کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

آیہ "رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه" ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بخدا میں ہی وہ شخص ہوں جو (شہادت کا) انتظار کر رہا ہوں (اور قبل از ایں ہم میں حمزہ سید الشہداء علیہ السلام جیسے لوگ شہادت نوش کر چکے ہیں) اور میں نے ہرگز اپنی روش اور اپنے طریقہ کار میں تبدیلی نہیں کی اور اپنے کئے ہوئے عہدو پیمان پر قائم ہوں۔

جنگ بنی قریظہ

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل رہتے تھے: بنی قریظہ، بنی النضیر اور بنی قینقاع۔

تینوں گروہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ آپؐ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، ان کے لئے جاسوسی نہیں کریں گے، اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر امن وآشتی کی زندگی گزاریں گے، لیکن قبیلہ بنی قینقاع نے ہجرت کے دوسرے سال اور قبیلہ بنی نضیر نے ہجرت کے چوتھے سال مختلف حیلوں بہانوں سے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے آخر کار ان کی مزاحمت اور مقابلہ کی سکت ختم ہوگئی اور وہ مدینہ سے باہر نکل گئے۔

بنی قینقاع ''اذرعات'' شام کی طرف چلے گئے اور بنی نضیر کے کچھ لوگ تو خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔

اسی بناء پر ہجرت کے پانچویں سال جب کہ جنگ احزاب پیش آئی تو صرف قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں باقی رہ گیا تھا، وہ بھی اس میدان میں اپنے معاہدہ کو توڑ کر مشرکین عرب کے ساتھ مل گئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت لیں۔

جب جنگ احزاب ختم ہوگئی اور قریش، بنی غطفان اور دیگر قبائل عرب بھی رسوا کن شکست کے بعد مدینہ سے پلٹ گئے تو اسلامی روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر لوٹ آئے اور جنگی لباس اتار کر نہانے دھونے میں مشغول ہوگئے تو اس موقع پر جبرائیل حکم خدا سے آپ پر نازل ہوئے اور کہا: کیوں آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں جبکہ فرشتے ابھی تک آمادہ پیکار ہیں آپ فوراً بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کردیں۔

واقعاً بنی قریظہ کا حساب چکانے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا مسلمان اپنی کامیابی پر خوش خرم تھے، بنی قریظہ شکست کی شدید وحشت میں گرفتار تھے اور قبائل عرب میں سے ان کے دوست اور حلیف تھکے ماندے اور بہت ہی پست حوصلوں کے ساتھ شکست خوردہ حالت میں اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جا چکے تھے اور کوئی نہیں تھا جو ان کی حمایت کرے۔

بہر حال منادی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ندا دی کہ نماز عصر پڑھنے سے پہلے بنی قریظہ کی طرف چل پڑو مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ ہی بنی قریظہ کے محکم ومضبوط قلعوں کو مسلمانوں نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 23

پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا چنانچہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کے قلعوں پر حملہ کرنے کے لئے اتنی جلدی کی کہ بعض مسلمان نمازعصر سے غافل ہو گئے کہ مجبوراً بعد میں قضا کی، خداوندعالم نے ان کے دلوں میں سخت رعب و دبدبہ طاری ہو گیا۔

تین تجاویز

''کعب بن اسد'' کا شمار یہودیوں کے سرداروں میں ہوتا تھا اس نے اپنی قوم سے کہا: مجھے یقین ہے کہ محمد ہمیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم جنگ نہ کریں لہٰذا میری تین تجاویز ہیں، ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لو، پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی اختیار کر لو کیونکہ تم پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کی نشانیاں تمہاری کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو اس صورت میں تمہارے مال، جان، اولاد اور عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ہرگز حکم توریت سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کا متبادل اختیار کریں گے۔

اس نے کہا: اگر یہ تجویز قبول نہیں کرتے تو پھر آؤ اور اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالو تا کہ ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر میدان جنگ میں کود پڑیں اور پھر دیکھیں کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ اگر ہم مارے گئے تو اہل وعیال کی جانب سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی اور اگر کامیاب ہو گئے تو پھر عورتیں بھی بہت بچے بھی بہت۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ان بے چاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیں؟ ان کے بعد ہمارے لئے زندگی کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟

کعب بن اسد نے کہا: اگر یہ بھی تم نے قبول نہیں کیا تو آج چونکہ ہفتہ کی رات ہے محمد ﷺ اور اس کے ساتھی یہ خیال کریں گے کہ ہم آج رات حملہ نہیں کریں گے انہیں اس غفلت میں ڈال کر ان پر حملہ کر دیں شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔

وہ کہنے لگے کہ یہ کام بھی ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں ہفتہ کا احترام پامال نہیں کریں گے۔

کعب کہنے لگا: پیدائش سے لے کر آج تک تمہارے اندر عقل نہیں آسکی۔

اس کے بعد انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بات کی کہ ''ابولبابہ'' کو ان کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ ان سے صلاح مشورہ کر لیں۔

ابولبابہ کی خیانت

جس وقت ابولبابہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں کی عورتیں اور بچے ان کے سامنے گریہ وزاری کرنے لگے اس بات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم محمدؐ کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ ابولبابہ نے کہا ہاں اور ساتھ ہی اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا یعنی تم سب کو قتل کر دیں گے۔

ابولبابہ کہتے ہیں، جیسے ہی میں وہاں سے چلا تو مجھے اپنی خیانت کا شدید احساس ہوا پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس نہ گیا بلکہ سیدھا مسجد کی طرف چلا اور اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا اپنی جگہ سے اس وقت تک حرکت نہیں کروں گا جب تک خدا میری توبہ قبول نہ کر لے۔

سات دن تک اس نے نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا اور یونہی بے ہوش پڑا رہا یہاں تک کہ خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی، جب یہ خبر بعض مومنین کے ذریعہ اس تک پہنچی تو اس نے قسم کھائی میں خود اپنے کو اس ستون سے نہیں کھولوں گا یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ آ کر

کھولیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور اس کو کھولا ابولبابہ نے کہا کہ اونی توبہ کو کامل ہونے کے لئے اپنا سارا مال راہ خدا میں دیتا ہوں۔اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: ایک سوم مال کافی ہے،" آخر کار خدا نے اس کا یہ گناہ اس کی صداقت کی بناء پر بخش دیا"[1]

لیکن آخر کار بنی قریظہ کے یہودیوں نے مجبور ہو کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سعد بن معاذ تمہارے بارے میں جو فیصلہ کر دیں کیا وہ تمہیں قبول ہے؟ وہ راضی ہو گئے۔

سعد بن معاذ نے کہا کہ اب وہ موقع آن پہنچا ہے کہ سعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو نظر میں رکھے بغیر حکم خدا بیان کرے۔

سعد نے جس وقت یہودیوں سے دوبارہ یہی اقرار لے لیا تو آنکھیں بند کر لیں اور جس طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے تھے ادھر رخ کر کے عرض کیا: آپ بھی میرا فیصلہ قبول کریں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ضرور: تو سعد نے کہا: میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ تھے (بنی قریظہ کے مرد) انہیں قتل کر دینا چاہئے، ان کی عورتیں اور بچے قید اور ان کے اموال تقسیم کر دیئے جائیں البتہ ان میں سے ایک گروہ اسلام قبول کرنے کے بعد قتل ہونے سے بچ گیا۔

قرآن اس ماجرا کی طرف مختصر اور بلیغ اشارہ کرتا ہے اور اس ماجرا کا تذکرہ خدا کی ایک عظیم نعمت اور عنایت کے طور پر ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جنہوں نے مشرکین عرب کی حمایت کی تھی، ان کے محکم و مضبوط قلعوں سے نیچے کھینچا"۔[2]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قلعے مدینہ کے پاس بلند اور اونچی جگہ پر بنا رکھے تھے اور ان کے بلند برجوں سے اپنا دفاع کرتے تھے "انزل" (نیچے لے آیا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "خدا نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا":

آخر کار ان کا مقابلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ "تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو اسیر بنا رہے تھے او ران کی زمینیں گھر اور مال و متاع تمہارے اختیار میں دے دیا"۔[3]

یہ چند جملے جنگ بنی قریظہ کے عام نتائج کا خلاصہ ہیں۔ان خیانت کاروں میں سے کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، کچھ قید ہو گئے اور بہت زیادہ مال غنیمت جس میں ان کی زمینیں، گھر، مکانات اور مال و متاع شامل تھا، مسلمانوں کو ملا۔

صلح حدیبیہ

چھٹی ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے قصد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مسلمانوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کی اطلاع مل چکی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام اصحاب کے ساتھ "مسجد الحرام" میں وارد ہونے کو

---

[1] سورہ توبہ آیت 102

[2] سورہ احزاب آیت 26

[3] سورہ احزاب آیات 26، 27

خواب میں دیکھا ہے، اور تمام مسلمانوں کو اس سفر میں شرکت کا شوق دلایا، اگر چہ ایک گروہ کنارہ کش ہوگیا، مگر مہاجرین وانصار اور بادیہ نشین اعراب کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ جمعیت جو تقریباً ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل تھی، سب کے سب نے لباس احرام پہنا ہوا تھا، اور تلوار کے علاوہ جو مسافروں کا اسلحہ شمار ہوتی تھی، کوئی جنگی ہتھیار ساتھ نہ لیا تھا۔

جب مسلمان ''ذی الحلیفہ'' مدینہ کے نزدیک پہنچے، اور بہت اونٹوں کو قربانی کے لئے لے لیا۔

پیغمبرؐ (اور آپؐ کے اصحاب کا) طرز عمل بتا رہا تھا کہ عبادت کے علاوہ کوئی دوسرا قصد نہیں تھا۔ جب پیغمبر ﷺ مکہ کے نزدیکی مقام پر پہنچے آپ کو اطلاع ملی کہ قریش نے یہ پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے، یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ مقام ''حدیبیہ'' میں پہنچ گئے (حدیبیہ مکہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، جو ایک کنویں یا درخت کی مناسبت سے اس نام سے موسوم تھی) حضرت ﷺ نے فرمایا: کہ تم سب اسی جگہ پر رک جاؤ، لوگوں نے عرض کی کہ یہاں تو کوئی پانی نہیں ہے پیغمبر ﷺ نے معجزانہ طور پر اس کنویں سے جو وہاں تھا، اپنے اصحاب کے لئے پانی فراہم کیا۔

اسی مقام پر قریش اور پیغمبر ﷺ کے درمیان سفراء آتے جاتے رہے تا کہ کسی طرح سے مشکل حل ہو جائے، آخر کار ''عروہ ابن مسعود ثقفی'' جو ایک ہوشیار آدمی تھا، قریش کی طرف سے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، پیغمبر ﷺ نے فرمایا میں جنگ کے ارادے سے نہیں آیا اور میرا مقصد صرف خانہ خدا کی زیارت ہے، ضمناً عروہ نے اس ملاقات میں پیغمبر ﷺ کے وضو کرنے کا منظر بھی دیکھا، کہ صحابہ آپؐ کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، جب وہ واپس لوٹا تو اس نے قریش سے کہا: میں قیصر وکسری اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں۔ میں نے کسی سربراہ مملکت کو اس کی قوم کے درمیان اتنا باعظمت نہیں دیکھا، جتنا محمد ﷺ کی عظمت کو ان کے اصحاب کے درمیان دیکھا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ محمد ﷺ کو چھوڑ جائیں گے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، دیکھ لو تمہارا مقابلہ ایسے ایثار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے لئے غور وفکر کا مقام ہے۔

بیعت رضوان

اسی دوران پیغمبر ﷺ نے عمر سے فرمایا: کہ وہ مکہ جائیں، اور اشراف قریش کو اس سفر کے مقصد سے آگاہ کریں، عمر نے کہا قریش مجھ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، لہٰذا مجھے ان سے خطرہ ہے، بہتر یہ ہے کہ عثمان کو اس کام کے لئے بھیجا جائے، عثمان مکہ کی طرف آئے، تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر پیغمبر ﷺ نے شدت عمل کا ارادہ کیا اور ایک درخت کے نیچے جو وہاں پر موجود تھا، اپنے اصحاب سے بیعت لی جو ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور ہوئی، اور ان کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ آخری سانس تک ڈٹیں رہیں گے، لیکن تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ عثمان صحیح وسالم واپس لوٹ آئے اور انکے پیچھے پیچھے قریش نے ''سہیل بن عمر'' کو مصالحت کے لئے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں بھیجا، لیکن تاکید کی کہ اس سال کسی طرح بھی آپ کا مکہ میں ورود ممکن نہیں ہے۔

بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد صلح کا عہد و پیمان ہوا، جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ سے باز رہیں اور آئندہ سال مکہ میں آئیں، اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ رہیں، اور مسافرت کے عام ہتھیار کے علاوہ اور کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لائیں۔ اور متعدد مواد جن کا دارومدار ان مسلمانوں کی جان و مال کی امنیت پر تھا، جو مدینہ سے مکہ میں وارد ہوں، اور اسی طرح

مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال جنگ نہ کرنے اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی شامل کی گئی تھی۔

یہ پیمان حقیقت میں ہر جہت سے ایک عدم تعرض کا عہد و پیمان تھا، جس نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مسلسل اور بار بار کی جنگوں کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

صلح نامہ کی تحریر

''صلح کے عہد و پیمان کا متن'' اس طرح تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ لکھو:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'': سہیل بن عمر نے، جو مشرکین کا نمائندہ تھا، کہا: میں اس قسم کے جملہ سے آشنا نہیں ہوں، لہٰذا ''بسمک اللّٰھم'' لکھو: پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا لکھو: ''بسمک اللّٰھم''

اس کے بعد فرمایا: لکھو یہ وہ چیز ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی، سہیل نے کہا: ہم اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سمجھتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے، صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھو: ''یہ وہ چیز ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی، کہ دس سال تک دونوں طرف سے جنگ متروک رہے گی تاکہ لوگوں کو امن و امان کی صورت دوبارہ میسر آئے''۔

علاوہ ازیں جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے (اور مسلمان ہو جائے) اسے واپس کر دیں اور جو شخص ان افراد میں سے جو محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس ہیں، قریش کی طرف پلٹ جائے تو ان کو واپس لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

تمام لوگ آزاد ہیں جو چاہے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد و پیمان میں داخل ہو اور جو چاہے قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہو، طرفین اس بات کے پابند ہیں کہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں، اور ایک دوسرے کی جان و مال کو محترم شمار کریں۔

اس کے علاوہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس سال واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں، لیکن آئندہ سال ہم تین دن کے لئے مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور ان کے اصحاب آجائیں، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں، (اور مراسم عمرہ کے انجام دے کر واپس چلے جائیں) اس شرط کے ساتھ کہ سوائے مسافر کے ہتھیار یعنی تلوار کے، وہ بھی غلاف میں کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔

اس پیمان پر مسلمانوں اور مشرکین کے ایک گروہ نے گواہی دی اور اس عہد نامہ کے کاتب علی علیہ السلام ابن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں کچھ اور امور بھی نقل کئے ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ:

''اسلام مکہ میں آشکارا ہوگا اور کسی کو کسی مذہب کے انتخاب کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور مسلمان کو اذیت و آزار نہیں پہنچائیں گے''۔

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کے وہ اونٹ جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے، اسی جگہ قربان کر دیں اور اپنے سروں کو منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، لیکن یہ بات کچھ مسلمانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوئی، کیونکہ عمرہ کے مناسک کی انجام دہی کے بغیر ان کی نظر میں احرام سے باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ذاتی طور پر خود پیش قدمی کی اور قربانی کے اونٹوں کو

نحر کیا اور احرام سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ احرام اور قربانی کے قانون میں استثناء ہے جو خدا کی طرف سے قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا تو سر تسلیم خم کر دیا، او رپیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حکم کامل طور سے مان لیا، اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی، لیکن غم واندوہ کا ایک پہاڑ ان کے دلوں پر بوجھ ڈال رہا تھا، کیونکہ ظاہر میں یہ سارے کا سارا سفر ایک ناکامی اور شکست تھی، لیکن اسی وقت سورہ فتح نازل ہوئی اور پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو فتح کی بشارت ملی۔

صلح حدیبیہ کے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی نتائج

ہجرت کے چھٹے سال (صلح حدیبیہ کے وقت) مسلمانوں کی حالت میں اور دو سال بعد کی حالت میں فرق نمایاں تھا، جب وہ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ فتح مکہ کے لئے چلے تا کہ مشرکین کو پیمان شکنی کا دندان شکن جواب دیا جائے، چنانچہ انھوں نے فوجوں کو معمولی سی جھڑپ کے بغیر ہی مکہ کو فتح کر لیا، اس وقت قریش اپنے اندر مقابلہ کرنے کی معمولی سی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ایک اجمالی موازنہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ "صلح حدیبیہ" کا عکس العمل کس قدر وسیع تھا۔

خلاصہ کے طور پر مسلمانوں نے اس صلح سے چند امتیاز اور اہم کامیابیاں حاصل کیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(1) عملی طور پر مکہ کہ فریب خوردہ لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ جنگ وجدال کا ارادہ نہیں رکھتے، اور مکہ کے مقدس شہر اور خانہ خدا کے لئے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں، یہی بات ایک کثیر جماعت کے دلوں کے لئے اسلام کی طرف کشش کا سبب بن گئی۔

(2) قریش نے پہلی مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کی رسموں کو تسلیم کیا، یہی وہ چیز تھی جو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو ثابت کرنے کی دلیل بنی۔

(3) صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان سکون واطمنان سے ہر جگہ آجا سکتے تھے او رانکا جان و مال محفوظ ہوگیا تھا، او رعملی طور پر مشرکین کے ساتھ قریبی تعلق اور میل جول پیدا ہوا، ایسے تعلقات جس کے نتیجہ میں مشرکین کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ پہچان کے ساتھ ان کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوئی۔

(4) صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی نشر واشاعت کے لئے سارے جزیرۃ العرب میں راستہ کھل گیا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صلح طلبی کی شرط نے مختلف اقوام کو، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اور اسلام کے متعلق غلط نظریہ رکھتے تھے، تجدید نظر پر آمادہ کیا، اور تبلیغاتی نقطۂ نظر سے بہت سے وسیع امکانات ووسائل مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

(5) صلح حدیبیہ نے خیبر کو فتح کرنے اور یہودیوں کے اس سرطانی غدہ کو نکال پھینکنے کے لئے، جو بالفعل اور بالقوہ اسلام او رمسلمانوں کے لئے ایک اہم خطرہ تھا، راستہ ہموار کر دیا۔

(6) اصولی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک ہزار چار سوافراد کی فوج سے ٹکر لینے سے قریش کی وحشت ہوئی جن کے پاس کسی قسم کے اہم جنگی ہتھیار بھی نہیں تھے، او رشرائط صلح کو قبول کر لینا اسلام کے طرفداروں کے دلوں کی تقویت، او رمخالفین کی شکست کے لئے، جنھوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا خود ایک اہم عامل تھا۔

(7) واقعہ حدیبیہ کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بڑے بڑے ملکوں، ایران وروم وحبشہ کے سربراہوں، او ردنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو متعدد خطوط لکھے او رانہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور یہ چیز اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صلح

حدیبیہ نے مسلمانوں میں کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، کہ نہ صرف جزیرہ عرب میں بلکہ اس زمانہ کی بڑی دنیا میں ان کی راہ کو کھول دیا۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ واقعاً صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتح او رکامیابی تھی، اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید اسے فتح مبین کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ یا عظیم الشان فتح

جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ سے واپس لوٹے (اور سورہ فتح نازل ہوئی) تو ایک صحابی نے عرض کیا: ”یہ کیا فتح ہے کہ ہمیں خانہ خدا کی زیارت سے بھی روک دیا ہے اور ہماری قربانی میں بھی رکاوٹ ڈال دی“؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”تو نے بہت بری بات کہی ہے، بلکہ یہ تو ہماری عظیم ترین فتح ہے کہ مشرکین اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تمہیں خشونت آمیز طریقہ سے ٹکر لئے بغیر اپنی سرزمین سے دور کریں، اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کریں اور ان تمام تکالیف اور رنج و غم کے باوجود جو تمہاری طرف سے انھوں نے اٹھائے ہیں، ترک تعرض کے لئے تمہاری طرف مائل ہوئے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تکالیف جو انھوں نے بدر واحزاب میں جھیلی تھیں انہیں یاد دلائیں، تو مسلمانوں نے تصدیق کی کہ یہ سب سے بڑی فتح تھی اور انھوں نے لاعلمی کی بناء پر یہ فیصلہ کیا تھا۔

”زہری“ جو ایک مشہور تابعی ہے، کہتا ہے: کوئی بھی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ عظیم نہیں تھی، کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ ارتباط اور تعلق پیدا کیا اور اسلام ان کے دلوں میں جاں گزیں ہوا، اور تین ہی سال کے عرصہ میں ایک عظیم گروہ اسلام لے آیا او رمسلمانوں میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا“۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا خواب

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لئے مناسک ادا کرنے کے لئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور اس خواب کو صحابہ کے سامنے بیان کر دیا، وہ سب کے سب شاد و خوش حال ہوئے لیکن چونکہ ایک جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی، تو جس وقت قریش نے مکہ میں ان کے دخیل ہونے کا راستہ حدیبیہ میں ان کے آگے بند کر دیا تو وہ شک وتردید میں مبتلا ہو گئے، کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب غلط بھی ہو سکتا ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوں؟ پس اس وعدہ کا کیا ہوا؟ اور وہ رحمانی خواب کہاں چلا گیا؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال پورا ہوگا؟ اسی بارے میں مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور تاکید کی کہ یہ خواب سچا تھا اور ایسا مسئلہ حتمی وقطعی اور انجام پانے والا ہے۔

ارشاد خداوند عالم ہوتا ہے: ”خدا نے اپنے پیغمبر کو جو کچھ دکھلایا تھا وہ سچ اور حق تھا“۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن وامان کے ساتھ اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوں گے، یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی

---

[1] سورہ فتح آیت 27

خوف ووحشت نہ ہوگی''۔[1]

مومنین کے دلوں پر نزول سکینہ

یہاں گذشتہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اتنی عظیم نعمتیں تھیں جو خدا نے فتح مبین و (صلح حدیبیہ) کے سائے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائی تھیں لیکن یہاں پر اس عظیم نعمت کے بارے میں بحث کی جا رہی ہے جو اس نے تمام مؤمنین کو مرحمت فرمائی ہے، فرماتا ہے: ''وہی تو ہے، جس نے مومنین کے دلوں میں سکون واطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کرے''

اور سکون واطمینان ان کے دلوں پر نازل کیوں نہ ہو'' درآنحالیکہ آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا کے لئے ہیں اور وہ دانا وحکیم ہے''[2]

یہ سکینہ کیا تھا؟

ضروری ہے کہ ہم پھر ''صلح حدیبیہ'' کی داستان کی طرف لوٹیں اور اپنے آپ کو ''صلح حدیبیہ'' کی فضا میں اور اس فضاء میں جو صلح کے بعد پیدا ہوئی، تصور کریں تاکہ آیت کے مفہوم کی گہرائی سے آشنا ہوسکیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا (ایک رؤیائے الٰہی ورحمانی) کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں اور اس کے بعد خانۂ خدا کی زیارت کے عزم کے ساتھ چل پڑے زیادہ تر صحابہ یہی خیال کرتے تھے کہ اس خواب اور رؤیائے صالحہ کی تعبیر اسی سفر میں واقع ہوگی، حالانکہ مقدر میں ایک دوسری چیز تھی یہ ایک بات۔

دوسری طرف مسلمانوں نے احرام باندھا ہوا تھا، لیکن ان کی توقع کے برخلاف خانہ خدا کی زیارت کی سعادت تک نصیب نہ ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دے دیا کہ مقام حدیبیہ میں ہی قربانی کے اونٹوں کو نحر کر دیں، کیونکہ ان کے آداب وسنن کا بھی اور اسلامی احکام ودستور کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جب تک مناسک عمرہ کو انجام نہ دے لیں احرام سے باہر نہ نکلیں۔

تیسری طرف حدیبیہ کے صلح نامہ میں کچھ ایسے امور تھے جن کے مطالب کو قبول کرنا بہت ہی دشوار تھا، منجملہ ان کے یہ کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہوجائے اور مدینہ میں پناہ لے لے تو مسلمان اسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس لازم نہیں تھا۔

چوتھی طرف صلح نامہ کی تحریر کے موقع پر قریش اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ لفظ ''رسول اللہ'' ''محمد'' کے نام کے ساتھ لکھا جائے، اور قریش کے نمائندہ ''سہیل'' نے اصرار کر کے اسے حذف کرایا، یہاں تک کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے لکھنے کی بھی موافقت نہ کی، اور وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ اس کے بجائے ''بسمک اللھم'' لکھا جائے، جو اہل مکہ کی عادت اور طریقہ کے مطابق تھا واضح رہے، کہ ان امور میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک ناگوار امر تھا۔

چہ جائیکہ وہ سب کے سب مجموعی طور سے وہاں جاتے رہے، اسی لئے ضعیف الایمان، لوگوں کے دل ڈگمگا گئے، یہاں تک کہ جب سورہ فتح نازل ہوئی تو بعض نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کونسی فتح؟

یہی وہ موقع ہے جب نصرت الٰہی کو مسلمانوں کے شامل حال ہونا چاہئے تھا اور سکون واطمینان ان کے دلوں میں داخل ہوتا

---

[1] سورہ فتح آیت 27

[2] سورہ فتح آیت 4

تھا نہ یہ کہ کوئی فتور اور کمزوری ان میں پیدا ہوتی تھی۔

بلکہ "لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم" کے مصداق کی قوت ایمانی میں اضافہ ہونا چاہئے تھا او پر والی آیت ایسے حالات میں نازل ہوئی۔

ممکن ہے اس سکون میں اعتقادی پہلو ہو اور وہ اعتقاد میں ڈگمگانے سے بچائے، یا اس میں عملی پہلو ہو اس طرح سے کہ وہ انسان کو ثبات قدم، مقاومت اور صبر و شکیبائی بخشے۔

پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی

گذشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کے ارادہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے بادیہ نشین قبائل میں اعلان ہوا کہ وہ بھی سب کے ساتھ چلیں لیکن ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ نے اس حکم سے روگردانی کر لی، اور ان کا تجزیہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اس سفر سے صحیح و سالم بچ کر نکل آئیں، حالانکہ کفار قریش پہلے ہی ہیجان واشتعال میں تھے، اور انھوں نے احد واحزاب کی جنگیں مدینہ کے قریب مسلمانوں پر تھوپ دی تھیں اب جبکہ یہ چھوٹا سا گروہ بغیر ہتھیاروں کے اپنے پاؤں سے چل کر مکہ کی طرف جا رہا ہے، گویا بھڑوں کے چھتہ کے پاس خود ہی پہنچ رہا ہے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اور قابل ملاحظہ امتیازات کے ہمراہ جو انھوں نے صلح حدیبیہ کے عہد و پیمان سے حاصل کئے تھے، صحیح و سالم مدینہ کی طرف پلٹ آئے ہیں اور کسی کے نکسیر تک بھی نہیں چھوٹی، تو انہوں نے اپنی عظیم غلطی کا احساس کیا اور پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ کسی طرح کی عذر خواہی کر کے اپنے فعل کی توجیہ کریں، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے استغفار کا تقاضا کریں۔

لیکن وحی نازل ہوئی اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا اور انہیں رسوا کیا۔

اس طرح سے منافقین اور مشرکین کی سرنوشت کا ذکر کرنے کے بعد، یہاں پیچھے رہ جانے والے ضعیف الایمان لوگوں کی کیفیت کا بیان ہو رہا ہے تاکہ اس بحث کی کڑیاں مکمل ہو جائیں۔

فرماتا ہے "عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے عذر تراشی کرتے ہوئے کہیں گے: ہمارے مال ومتاع اور وہاں پر بچوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مائل کر لیا تھا، اور ہم اس پُر برکت سفر میں آپ کی خدمت میں نہ رہ سکے، رسالتماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہمارے عذر کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لئے طلب بخشش کیجئے، وہ اپنی زبان سے ایسی چیز کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے"۔[1]

وہ تو اپنی توبہ تک میں بھی مخلص نہیں ہیں۔

لیکن ان سے کہہ دیجئے: "خدا کے مقابلہ میں اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ تمہارا دفاع کر سکے،

---

[1] سورہ فتح آیت 11

اور اگر وہ تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو کس میں طاقت ہے، کہ اسے روک سکے''۔[1]

خدا کے لئے یہ بات کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے، کہ تمہیں تمہارے امن وامان کے گھروں میں، بیوی بچوں اور مال ومنال کے پاس، انواع واقسام کی بلاؤں اور مصائب میں گرفتار کر دے، اور اس کے لئے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دشمنوں کے مرکز میں اور مخالفین کے گڑھ میں تمہیں ہر قسم کے گزند سے محفوظ رکھے، یہ تمہاری قدرت خدا کے بارے میں جہالت اور بے خبری ہے جو تمہاری نظر میں اس قسم کے انکار کو جگہ دیتی ہے۔

''ہاں، خدا ان تمام اعمال سے جنھیں تم انجام دیتے ہو باخبر اور آگاہ ہے''[2]

بلکہ وہ تو تمہارے سینوں کے اندر کے اسرار اور تمہاری نیتوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ عذر اور بہانے واقعیت اور حقیقت نہیں رکھتے اور جو اصل حقیقت اور واقعیت ہے وہ تمہاری شک وتردید، خوف وخطر اور ضعف ایمان ہے، اور یہ عذر تراشیاں خدا سے مخفی نہیں رہتیں، اور یہ ہرگز تمہاری سزا کو نہیں روکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے لب ولہجہ سے بھی اور تواریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی الٰہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کی طرف بازگشت کے دوران نازل ہوئی، یعنی اس سے پہلے کہ پیچھے رہ جانے والے آئیں اور عذر تراشی کریں، ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا گیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

قرآن اس کے بعد مزید وضاحت کے لئے مکمل طور پر پردے ہٹا کر مزید کہتا ہے: ''بلکہ تم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے''۔[3]

ہاں، اس تاریخی سفر میں تمہارے شریک نہ ہونے کا سبب، اموال اور بیوی بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا اصلی عامل وہ سوء ظن تھا جو تم خدا کے بارے میں رکھتے تھے، اور اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ یہ سفر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ختم ہونے کا سفر ہے اور کیونکہ شیطانی وسوسہ تمہارے دلوں میں زینت پا چکے تھے، اور یہ تم نے برا گمان کیا۔[4] کیونکہ تم یہ سوچ رہے تھے کہ خدا نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سفر میں بھیج کر انہیں دشمن کے چنگل میں دے دیا ہے، اور ان کی حمایت نہیں کرے گا''اور انجام کار تم ہلاک ہوگئے''۔[5] اس سے بدتر ہلاکت اور کیا ہوگی کہ تم اس تاریخی سفر میں شرکت، بیعت رضوان، اور دوسرے افتخارات واعزازات سے محروم رہ گئے، اور اس کے پیچھے عظیم رسوائی تھی اور آئندہ کے لئے آخرت کا دردناک عذاب ہے، ہاں تمہارے دل مردہ تھے اس لئے تم اس قسم کی صورت حال میں گرفتار ہوئے۔

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

قرآن اسی طرح سے''حدیبیہ'' کے عظیم ماجرے کے کچھ دوسرے پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے، اور اس سلسلہ میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

---

[1] سورہ فتح آیت 11
[2] سورہ فتح آیت 11
[3] سورہ فتح آیت 11
[4] سورہ فتح آیت 11
[5] سورہ فتح آیت 11

پہلا یہ کہ یہ خیال نہ کرو کہ سرزمین ''حدیبیہ'' میں تمہارے اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو مشرکین جنگ میں بازی لے جاتے، ایسا نہیں ہے، اکثر کفار تمہارے ساتھ وہاں جنگ کرتے تو بہت جلدی پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، اور پھر کوئی ولی ویاور نہ پاتے''۔[1]

اور یہ بات صرف تم تک ہی منحصر نہیں ہے،'' یہ تو ایک سنت الٰہی ہے، جو پہلے بھی یہی تھی اور تم سنت الٰہی میں ہرگز تغیر وتبدیلی نہ پاؤ گے۔[2]

وہ اہم نکتہ جو قرآن خاص طور پر بیان کر رہا ہے، یہ ہے کہ کہیں قریش بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگیں، کہ افسوس ہم نے جنگ کیوں نہ کی اور اس چھوٹے سے گروہ کی سرکوبی کیوں نہ کی، افسوس کہ شکار ہمارے گھر میں آیا، اور اس سے ہم نے غفلت برتی، افسوس، افسوس۔

ہرگز ایسا نہیں ہے اگرچہ مسلمان ان کی نسبت تھوڑے تھے، اور وطن اور امن کی جگہ سے بھی دور تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جاتی تو پھر بھی قوت ایمانی اور نصرت الٰہی کی برکت سے کامیابی انہیں ہی حاصل ہوتی، کیا جنگ ''بدر'' اور ''احزاب'' میں ان کی تعداد بہت کم اور دشمن کا ساز وسامان اور لشکر زیادہ نہ تھا؟ ان دونوں مواقع پر دشمن کو کیسے شکست ہوگئی۔''

بہرحال اس حقیقت کا بیان مومنین کے دل کی تقویت اور دشمن کے دل کی کمزوری اور منافقین کے ''اگر'' اور ''مگر'' کے ختم ہونے کا سبب بن گئی اور اس نے اس بات کی نشاندہی کردی کہ ظاہری طور پر حالات کے برابر نہ ہونے کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو کامیابی مخلص مومنین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ فرماتا ہے'' وہی تو ہے جس نے کفار کے ہاتھ کو مکہ میں تم سے باز رکھا اور تمہارے ہاتھ کو ان سے، یہ اس وقت ہوا جبکہ تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہوگئی تھی، اور خدا وہ سب کچھ جو تم انجام دے رہے ہو دیکھ رہا ہے''۔[3]

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے لئے ایک ''شان نزول'' بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: مشرکین مکہ نے ''حدیبیہ'' کے واقعہ میں چالیس افراد کو مسلمانوں پر ضرب لگانے کے لئے مخفی طور پر حملہ کے لئے تیار کیا، لیکن ان کی یہ سازش مسلمانوں کی ہوشیاری سے نقش برآب ہوگئی اور مسلمان ان سب کو گرفتار کرکے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رہا کردیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے تاکہ قریش کے نمائندہ کے ساتھ صلح کے معاہدہ کو ترتیب دیں، اور علی علیہ السلام لکھنے میں مصروف تھے، تو جوانان مکہ میں سے 30 افراد اسلحہ کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوئے، اور معجزانہ طور پر ان کی یہ سازش بے کار ہوگئی اور وہ سب کے سب گرفتار ہوگئے اور حضرت نے انہیں آزاد کردیا۔

عمرۃ القضاء

''عمرۃ القضاء'' وہی عمرہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ سے ایک سال بعد یعنی ہجرت کے ساتویں سال کے ماہ ذی القعدہ میں اسے (ٹھیک ایک سال بعد جب مشرکین نے آپ کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا) اپنے اصحاب کے ساتھ انجام دیا

[1] سورہ فتح آیت 22
[2] سورہ فتح آیت 22
[3] سورہ فتح آیت 24

اوراس کا یہ نام اس وجہ سے ہے، چونکہ یہ حقیقت میں گزشتہ سال کی قضاء شمار ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: قرارداد حدیبیہ کی شقوں میں سے ایک شق کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ مسلمان آئندہ سال مراسم عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت کو آزادانہ طور پر انجام دیں، لیکن تین دن سے زیادہ مکہ میں توقف نہ کریں اور اس مدت میں قریش کے سردار اور مشرکین کے جانے پہچانے افراد شہر سے باہر چلے جائیں گے تاکہ ایک تو احتمالی ٹکراؤ سے بچ جائیں اور کنبہ پروری اور تعصب کی وجہ سے جو لوگ مسلمانوں کی عبادت توحیدی کے منظر کو دیکھنے کا یارا اور قدرت نہیں رکھتے، وہ بھی اسے نہ دیکھیں)

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ لے کر چل پڑے اور ''ظہران'' کے قریب پہنچ گئے اس موقع پر پیغمبر نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام ''محمد بن مسلمہ'' تھا، عمدہ سواری کے گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ اپنے آگے بھیج دیا، جب مشرکین نے اس پروگرام کو دیکھا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے یہ گمان کرلیا کہ حضرت ان سے جنگ کرنا اور اپنی دس سالہ صلح کی قرارداد کو توڑنا چاہتے ہیں، لوگوں نے یہ خبر اہل مکہ تک پہنچادی لیکن جب پیغمبر اکرم ﷺ مکہ کے قریب پہنچے تو آپ نے حکم دیا کہ تمام تیر اور نیزے اور دوسرے سارے ہتھیار اس سرزمین میں جس کا نام ''یاجج'' ہے منتقل کردیں، اور آپ خود اور آپ کے صحابہ صرف نیام میں رکھی ہوئی تلواروں کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے۔ اہل مکہ نے جب یہ عمل دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ وعدہ پورا ہوگیا، (گویا پیغمبر ﷺ کا یہ اقدام مشرکین کے لئے ایک تنبیہ تھا، کہ اگر وہ نقض عہد کرنا چاہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کریں، تو ان کے مقابلہ کی قدرت رکھتے ہیں)

رؤسائے مکہ، مکہ سے باہر چلے گئے، تاکہ ان مناظر کو جو ان کے لئے دل خراش تھے نہ دیکھیں لیکن باقی اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی راستوں میں، چھتوں کے اوپر، اور خانہ خدا کے اطراف میں جمع ہوگئے تھے، تاکہ مسلمانوں اور ان کے مراسم عمرہ کو دیکھیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ خاص رُعب اور دبدبہ کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے اور قربانی کے بہت سے اونٹ آپ کے ساتھ تھے، اور آپ نے انتہائی محبت اور ادب کے ساتھ مکہ والوں سے سلوک کیا، اور یہ حکم دیا کہ مسلمان طواف کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلیں، اور احرام کو ذرا سا جسم سے ہٹالیں تاکہ ان کے قوی اور طاقتور اور موٹے تازے شانے آشکار ہوں، اور یہ منظر مکہ کے لوگوں کی روح اور فکر میں، مسلمانوں کی قدرت وطاقت کی زندہ دلیل کے طور پر اثر انداز ہو۔

مجموعی طور سے ''عمرۃ القضاء'' عبادت بھی تھا اور قدرت کی نمائش بھی، یہ کہنا چاہئے کہ ''فتح مکہ'' جو بعد والے سال میں حاصل ہوئی، اس کا بیج انہیں دنوں میں بویا گیا، اور اسلام کے مقابلہ میں اہل مکہ کے سرتسلیم خم کرنے کے سلسلے میں مکمل طور پر زمین ہموار کردی۔ یہ وضع وکیفیت قریش کے سرداروں کے لئے اس قدر ناگوار تھی کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی کو پیغمبر کی خدمت میں بھیجا کہ قرارداد کے مطابق جتنا جلدی ہوسکے مکہ کو چھوڑ دیجئے۔ قابل توجہ بات یہ ہے، کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مکہ کی عورتوں میں سے ایک بیوہ عورت کو، جو قریش کے بعض سرداروں کی رشتہ دار تھی، اپنی زوجیت میں لے لیا، تاکہ عربوں کی رسم کے مطابق، اپنے تعلق اور رشتے کو ان سے مستحکم کرکے ان کی عداوت اور مخالفت میں کمی کریں۔

جس وقت پیغمبر ﷺ نے مکہ سے باہر نکل جانے کی تجویز سنی تو آپ نے فرمایا: میں اس ازدواج کے مراسم کے لئے کھانا کھلانا چاہتا ہوں اور تمہاری بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں، یہ دعوت رسمی طور پر رد کردی گئی۔

فتح خیبر

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے ان ایک ہزار چار سو افراد کو جنھوں نے حدیبیہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، (جو اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مناسب فرصت کے لئے گن گن کر دن گزار رہے تھے) کہ اس مرکز فساد کو ختم کریں۔

روایات کے مطابق جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''حدیبیہ'' سے پلٹ رہے تھے تو حکم خدا سے آپ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو ''فتح خیبر'' کی بشارت دی، اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے، اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہوگا تخلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

لیکن جونہی ان ڈرپوک دنیا پرستوں نے قرائن سے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جنگ میں جو انہیں درپیش ہے یقینی طور پر کامیاب ہوں گے اور سپاہ اسلام کو بہت سامال غنیمت ہاتھ آئے گا، تو وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میدان خیبر میں شرکت کی اجازت چاہی اور شاید اس عذر کو بھی ساتھ لیا کہ ہم گزشتہ غلطی کی تلافی کرنے، اپنی ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے، گناہ سے توبہ کرنے اور اسلام وقرآن کی مخلصانہ خدمت کرنے کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ ہم میدان جہاد میں آپ کے ساتھ شرکت کریں، وہ اس بات سے غافل تھے کہ وحی الٰہی پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور ان کے راز کو فاش کر چکی تھیں، جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔

''جس وقت تم کچھ غنیمت حاصل کرنے کے لئے چلو گے تو اس وقت پیچھے رہ جانے والے کہیں گے: ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں اور اس جہاد میں شرکت کرنے کا شرف بخشیں''۔[1]

بہرحال قرآن اس منفعت اور فرصت طلب گروہ کے جواب میں کہتا ہے: ''وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں''۔ [2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ''ان سے کہہ دو: تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آنا''، تمہیں اس میدان میں شرکت کرنے کا حق نہیں ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں ''یہ تو وہ بات ہے جو خدا نے پہلے سے ہی کہہ دی ہے''۔[3] اور ہمیں تمہارے مستقبل (کے بارے میں) باخبر کر دیا ہے۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ ''غنائم خیبر''، ''اہل حدیبیہ'' کے لئے مخصوص ہیں اور اس چیز میں کوئی بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کرے، لیکن یہ بے شرم اور پرادعا پیچھے رہ جانے والے پھر بھی میدان سے نہیں ہٹتے اور تمہیں حسد کے ساتھ متہم کرتے ہیں، اور عنقریب وہ یہ کہیں گے: کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو۔[4]

اور اس طرح وہ ضمنی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب بھی کرتے تھے یہی لوگ ''جنگ خیبر'' میں انہیں شرکت سے منع

---

[1] سورہ فتح آیت 15

[2] سورہ فتح آیت 15

[3] سورہ فتح آیت 15

[4] سورہ فتح آیت 15

کرنے کی اصل حسد کو شمار کرتے ہیں۔

دعائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''غطفان'' کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رک گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت ''خیبر'' کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ نے اپنے صحابہ کو رکنے کا حکم دیا، اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دعا پڑھی:

''خداوندا اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انھوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انھوں نے اٹھا رکھا ہے میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے اس کا طلب گار ہوں، اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس شر سے پناہ مانگتا ہوں''۔ اس کے بعد فرمایا: ''بسم اللہ'' آگے بڑھو: اور اس طرح سے رات کے وقت ''خیبر'' کے پاس جا پہنچے اور صبح کے وقت جب ا''ہل خیبر'' اس ماجرا سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکر اسلام کے محاصرہ میں دیکھا، اس کے بعد پیغمبر نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا، اور مشہور یہودی کمانڈر ''مرحب'' اس میں رہتا تھا، پہنچ گئے۔

انہیں دنوں میں ایک سخت قسم کا درد سر، جو کبھی کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عارض ہوا کرتا تھا، آپ کو عارض ہو گیا، اس طرح سے کہ ایک دو دن آپ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکر، نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے دوسری دفعہ ''حضرت عمر'' نے علم اٹھایا، اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

فاتح خیبر علی علیہ السلام

یہ خبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: ''خدا کی قسم کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے، اور خدا اور پیغمبر اس کو دوست رکھتے ہیں، اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کرے گا''۔ ہر طرف سے گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد علی علیہ السلام ہیں لیکن علی علیہ السلام ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں لشکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت علی علیہ السلام اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوئے، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ کے پاس اترے در حالیکہ آپ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ، آپ قریب گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دہن مبارک کا لعاب علی علیہ السلام کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو گئیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم ان کے ہاتھ میں دیا۔

علی علیہ السلام لشکر اسلام کو ساتھ لے کر خیبر کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اوپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''میں علی بن ابی طالب'' ہوں، اس یہودی نے پکار کر کہا: اے یہود یو اب تمہاری شکست کا وقت آن پہنچا ہے، اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر مرحب یہودی، علی علیہ السلام سے مقابلہ کے لئے نکلا، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک

ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہوگئی، علی علیہ السلام قلعہ کے دروازے کے قریب آئے، اور ایک قوی اور پُر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑا اور ایک طرف پھینک دیا، اور اس زور سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہوگئے اور اسے فتح کرلیا، یہودیوں نے اطاعت قبول کرلی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اس اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول کرلیا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کردیئے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

آخر کار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تواریخ کی نقل کے مطابق غنائم خیبر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کئے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لئے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے جنگ خیبر میں شریک نہ ہوسکے ان کے لئے بھی ایک حصہ قرار دیا، البتہ ایسا آدمی صرف ایک ہی تھا، اور وہ ''جابر بن عبداللہ'' تھا۔

فتح مکہ

فتح مکہ نے؛ تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا ہے اور تقریباً بیس سال کے بعد دشمن کی مقاومتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا، حقیقت میں فتح مکہ سے جزیرۃ العرب سے شرک وبت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی، اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف حرکت کے لئے آمادہ ہوا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد وپیمان اور صلح کے بعد کفار نے عہد شکنی کی اور اس صلح نامہ کو نظر انداز کردیا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض حلیفوں کے ساتھ زیادتی کی، آپؐ کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حلیفوں کی مدد کرنے کا ارادہ کرلیا، اور دوسری طرف مکہ میں بت پرستی شرک اور نفاق کا جو مرکز قائم تھا اس کے ختم ہونے کے تمام حالات فراہم ہوگئے تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے ہر حالت میں انجام دینا ضروری تھا، اس لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے مکہ کی طرف جانے کے لئے آمادہ ہوگئے، فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی۔

پہلا مرحلہ مقدماتی تھا، یعنی ضروری قوا اور توانائیوں کو فراہم کرنا، زمانہ کے موافق حالات کا انتخاب اور دشمن کی جسمانی و روحانی قوت وتوانائی کی مقدار وکیفیت کی حیثیت کے بارے میں کافی اطلاعات حاصل کرنا تھا۔

دوسرا مرحلہ، فتح کے مرحلہ کو بہت ہی ماہرانہ اور ضائعات وتلفات یعنی نقصان کے بغیر انجام دینا تھا۔

اور آخری مرحلہ، جو اصلی مرحلہ تھا، وہ اس کے آثار ونتائج کا مرحلہ تھا۔

یہ مرحلہ انتہائی دقت، باریک بینی اور لطافت کے ساتھ انجام پایا، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ ومدینہ کی شاہراہ کو اس طرح سے قرق کرلیا تھا کہ اس عظیم آمادگی کی خبر کسی طرح سے بھی اہل مکہ کو نہ پہنچ سکی۔ اس لئے انہوں نے کسی قسم کی تیاری نہ کی، وہ مکمل طور پر غفلت میں پڑے رہے اور اسی وجہ سے اس مقدس سرزمین میں اس عظیم حملہ اور بہت بڑی فتح میں تقریباً کوئی خون نہیں بہا۔

یہاں تک کہ وہ خط بھی، جو ایک ضعیف الایمان مسلمان ''حاطب بن ابی بلتعہ'' نے قریش کو لکھا تھا اور قبیلہ ''مزینہ'' کی ایک عورت ''کفوذ'' یا ''سارہ'' نامی کے ہاتھ مکہ کی طرف روانہ کیا تھا، اعجاز آمیز طریقہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آشکار ہوگیا، علی علیہ السلام کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑی تیزی سے اس کے پیچھے روانہ ہوئے، انہوں نے اس عورت کو مکہ ومدینہ کی ایک درمیانی منزل

میں جالیا اور اس سے وہ خط لے کر خود اسے بھی مدینہ واپس لے آئے۔

مکہ کی طرف روانگی

بہر حال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کر کے ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان کی دس تاریخ کو مکہ کی طرف چل پڑے، اور دس دن کے بعد مکہ پہنچ گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے کے وسط میں اپنے چچا عباس کو دیکھا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے آپؐ کی طرف آ رہے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اپنا سامان مدینہ بھیج دیجئے اور خود ہمارے ساتھ چلیں، اور آپ آخری مہاجر ہیں۔

آخر کار مسلمان مکہ کی طرف پہنچ گئے اور شہر کے باہر، اطراف کے بیابانوں میں اس مقام پر جسے ''مرالظہران'' کہا جاتا تھا اور جو مکہ سے چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پڑاؤ ڈال دیا۔ اور رات کے وقت کھانا پکانے کے لئے (یا شاید اپنی وسیع پیمانہ پر موجودگی کو ثابت کرنے کے لئے) وہاں آگ روشن کر دی، اہل مکہ کا ایک گروہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔

ابھی تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لشکر اسلام کے اس طرف آنے کی خبریں قریش سے پنہاں تھیں۔

اس رات اہل مکہ کا سرغنہ ابوسفیان اور مشرکین کے بعض دوسرے سرغنہ خبریں معلوم کرنے کے لئے مکہ سے باہر نکلے، اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس نے سوچا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قہر آلود طریقہ پر مکہ میں وارد ہوئے تو قریش میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا، انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لئے بغیر اور آپؐ کی سواری پر سوار ہو کر کہا میں جاتا ہوں، شاید کوئی مل جائے تو اس سے کہوں کہ اہل مکہ کو اس ماجرے سے آگاہ کر دے تاکہ وہ آ کر امان حاصل کر لیں۔

عباس وہاں روانہ ہو کر بہت قریب پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس موقع پر انہوں نے ''ابوسفیان'' کی آواز سنی جو اپنے ایک دوست ''بدیل'' سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے کبھی بھی اس سے زیادہ آگ نہیں دیکھی، ''بدیل'' نے کہا میرا خیال ہے کہ یہ آگ قبیلہ ''خزاعہ'' نے جلائی ہوئی ہے، ابوسفیان نے کہا قبیلہ خزاعہ اس سے کہیں زیادہ ذلیل وخوار ہیں کہ وہ اتنی آگ روشن کریں، اس موقع پر عباس نے ابوسفیان کو پکارا، ابوسفیان نے بھی عباس کو پہچان لیا اور کہا سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟

عباس نے جواب دیا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو دس ہزار مجاہدین اسلام کے ساتھ تمہاری طرف آ رہے ہیں، ابوسفیان سخت پریشان ہوا اور کہا آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔

عباس نے کہا: میرے ساتھ آؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امان لے لو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔

اس طرح سے عباس نے ''ابوسفیان'' کو اپنے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری پر ہی سوار کر لیا اور تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آئے۔ وہ جس گروہ اور جس آگ کے قریب سے گزرتے وہ یہی کہتے کہ یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری پر سوار ہیں، کوئی غیر آدمی نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آئے، جہاں عمر ابن خطاب تھے، جب عمر بن خطاب کی نگاہ ابوسفیان پر پڑی تو کہا خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تجھ (ابوسفیان) پر مسلط کیا ہے، اب تیرے لئے کوئی امان نہیں ہے اور فوراً ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر آپؐ سے ابوسفیان کی گردن اڑانے کی اجازت مانگی۔

لیکن اتنے میں عباس بھی پہنچ گئے اور کہا: کہ اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اسے پناہ دے دی ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں بھی سر دست اسے امان دیتا ہوں، کل آپؐ اسے میرے پاس لے آئیں اگلے دن جب عباس اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت

میں لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: ''اے ابوسفیان وائے ہو تجھ پر، کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تو خدائے یگانہ پر ایمان لے آئے''۔

اس نے عرض کیا: ہاں اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر بتوں سے کچھ ہوسکتا تو میں یہ دن نہ دیکھتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہ موقع نہیں آیا کہ تو جان لے کہ میں اللہ کا رسول ہوں''۔

اس نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ابھی اس بارے میں میرے دل میں کچھ شک وشبہ موجود ہے لیکن آخرکار ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں میں سے دو آدمی مسلمان ہوگئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباس سے فرمایا: ''ابوسفیان کو اس درہ میں جو مکہ کی گزرگاہ ہے، لے جاؤ تا کہ خدا کا لشکر وہاں سے گزرے اور یہ دیکھ لے''۔

عباس نے عرض کیا: ''ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہے، اسکو کوئی امتیازی حیثیت دے دیجئے''

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ امان میں ہے، جو شخص اپنے گھر کے اندر ہے اور دروازہ بند کرلے وہ بھی امان میں ہے''۔

بہرحال جب ابوسفیان نے اس لشکر عظیم کو دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ مقابلہ کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اس نے عباس کی طرف رخ کر کے کہا: آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت بڑی ہوگئی ہے، عباس نے کہا: وائے ہو تجھ پر یہ سلطنت نہیں نبوت ہے۔

اس کے بعد عباس نے اس سے کہا کہ اب تو تیزی کے ساتھ مکہ والوں کے پاس جا کر انہیں لشکر اسلام کا مقابلہ کرنے سے ڈرا۔

ابوسفیان؛ لوگوں کو تسلیم ہونے کی دعوت کرتا ہے

ابوسفیان نے مسجد الحرام میں جا کر پکار کر کہا: ''اے جمعیت قریش محمد ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے، تم میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس کے بعد اس نے کہا: جو شخص میرے گھر میں داخل ہوجائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں چلا جائے وہ بھی امان میں ہے اور جو شخص اپنے گھر میں رہتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کرے وہ بھی امان میں ہے''۔

اس کے بعد اس نے چیخ کر کہا: اے جمعیت قریش اسلام قبول کرلو تا کہ سالم رہو اور بچ جاؤ، اس کی بیوی ''ہندہ'' نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور چیخ کر کہا: اس بڈھے احمق کو قتل کردو۔

ابوسفیان نے کہا: میری داڑھی چھوڑ دے۔ خدا کی قسم اگر تو اسلام نہ لائی تو تو بھی قتل ہوجائے گی، جا کر گھر میں بیٹھ جا۔

علی علیہ السلام کے قدم دوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے اور ''ذی طوی'' کے مقام تک پہنچ گئے، وہی بلند مقام جہاں سے مکہ کے مکانات صاف نظر آتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ دن یاد آگیا جب آپ مجبور ہو کر مخفی طور پر مکہ سے باہر نکلے تھے، لیکن آج دیکھ رہے ہیں کہ اس عظمت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، تو آپ نے اپنی پیشانی مبارک اونٹ کے کجاوے کے اوپر رکھ دی او

رسجدۂ شکر بجالائے، اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''حجون'' میں (مکہ کے بلند مقامات میں سے وہ جگہ جہاں خدیجہ سلام اللہ علیہا کی قبر ہے) اترے، غسل کر کے اسلحہ اور لباس جنگ پہن کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، سورہ فتح کی قرائت کرتے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آواز تکبیر بلند کی، لشکر اسلام نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا تو اس سے سارے دشت وکوہ گونج اٹھے۔ اس کے بعد آپ اپنے اونٹ سے نیچے اترے اور بتوں کو توڑنے کے لئے خانہ کعبہ کے قریب آئے، آپ یکے بعد دیگرے بتوں کو سرنگوں کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴿٨١﴾

''حق آ گیا اور باطل ہٹ گیا، اور باطل ہے ہی ہٹنے والا''۔

کچھ بڑے بڑے بت کعبہ کے اوپر نصب تھے، جن تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا، آپؐ نے امیر المومنین علی علیہ السلام کو حکم دیا وہ میرے دوش پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ جائیں اور بتوں کو زمین پر گرا کر توڑ ڈالیں، علی علیہ السلام نے آپ کے حکم کی اطاعت کی۔

اس کے بعد آپ نے خانہ کعبہ کی کلید لے کر دروازہ کھولا اور انبیاء کی ان تصویروں کو جو خانہ کعبہ کے اندر درودیوار پر بنی ہوئی تھیں، محو کر دیا۔ اس سریع اور شاندار کامیابی کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں پر موجود اہل مکہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

''اب بتلاؤ تم کیا کہتے ہو؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا''؟ انہوں نے عرض کیا: ہم آپ سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی توقع نہیں رکھتے آپؐ ہمارے بزرگوار بھائی اور ہمارے بزرگوار بھائی کے فرزند ہیں، آج آپ برسر اقتدار آ گئے ہیں، ہیں بخش دیجئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور مکہ کے لوگ بھی بلند آواز کے ساتھ رونے لگے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے بارے میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کی تھی کہ آج تمہارے اوپر کسی قسم کی کوئی سرزنش اور ملامت نہیں ہے، خدا تمہیں بخش دے گا، وہ الرحم الراحمین ہے''۔ [1]

اور اس طرح سے آپ نے ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا: ''تم سب آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو''۔

آج کا دن روز رحمت ہے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ لشکری کسی سے نہ الجھیں اور بالکل کوئی خون نہ بہایا جائے۔ ایک روایت کے مطابق صرف چھ افراد کو مستثنیٰ کیا گیا جو بہت ہی بدزبان اور خطرناک لوگ تھے۔

یہاں تک کہ جب آپؐ نے یہ سنا کہ لشکر اسلام کے علمدار سعد بن عبادہ نے انتقام کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ: ''آج انتقام کا دن ہے'' تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا: ''جلدی سے جا کر اس سے علم لے کر یہ نعرہ لگاؤ کہ آج عفو و بخشش اور رحمت کا دن ہے''۔

اور اس طرح مکہ کسی خونریزی کے بغیر فتح ہو گیا، عفو و رحمت اسلام کی اس کشش نے، جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی، دلوں پر ایسا اثر کیا کہ لوگ گروہ در گروہ آکر مسلمان ہو گئے، اس عظیم فتح کی صدا تمام جزائر عربستان میں جا پہنچی، اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی ہر جہت سے دھاک بیٹھ گئی۔

---

[1] سورہ یوسف آیت 92

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا:

''خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا اور یگانہ ہے، اس نے آخر کار اپنے وعدہ کو پورا کردیا، اور اپنے بندہ کی مدد کی، اور اس نے خود اکیلے ہی تمام گروہوں کو شکست دے دی، ان لوگوں کا ہر مال، ہر امتیاز، اور ہر وہ خون جس کا تعلق ماضی اور زمانہ جاہلیت سے ہے، سب کے سب میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں''۔ (یعنی زمانہ جاہلیت میں ہوئے خون خرابہ کو بھول جاو، غارت شدہ اموال کی بات نہ کرو اور زمانہ جاہلیت کے تمام امتیازات کو ختم کر ڈالو، خلاصہ گذشتہ فائلوں کو بند کر دیا جائے۔)

یہ ایک بہت ہی اہم اور عجیب قسم کی پیش نہاد تھی جس میں عمومی معافی کے فرمان سے حجاز کے لوگوں کو ان کے تاریک اور پُر ماجرا ماضی سے کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں اسلام کے سائے میں ایک نئی زندگی بخشی جو ماضی سے مربوط کشمکشوں اور جنجالوں سے مکمل طور پر خالی تھی۔

اس کام نے اسلام کی پیش رفت کے سلسلہ میں بہت زیادہ مدد کی اور یہ ہمارے آج اور آنے والے کل کے لئے ایک دستو رالعمل ہے۔

عورتوں کی بیعت کے شرائط

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہ صفا پر قیام فرمایا اور مردوں سے بیعت لی، بعدہ مکہ کی عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں بیعت کرنے کے لئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو وحی الٰہی نازل ہوئی اور ان کی بیعت کی تفصیل بیان کی، روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''اے پیغمبر جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور ان شرائط پر تجھ سے بیعت کرلیں کہ وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا سے آلودہ نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بہتان نہیں باندھیں گی اور کسی حکم میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے بخشش طلب کرو، بیشک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔''[1]

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بیعت لی۔

بیعت کی کیفیت کے بارے میں بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی کا ایک برتن لانے کا حکم دیا اور اپنا ہاتھ پانی کے اس برتن میں رکھ دیا، عورتیں اپنے ہاتھ برتن کے دوسری طرف رکھ دیتی تھیں، جب کہ بعض نے کہا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لباس کے اوپر سے بیعت لیتے تھے۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی بیعت کا ماجرا

فتح مکہ کے واقعہ میں جن عورتوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی ان میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ''ہندہ'' تھی، یعنی وہ عورت جس کی طرف سے تاریخ اسلام بہت سے دردناک واقعات محفوظ رکھے ہوئے ہے، ان میں سے ایک میدان احد میں حمزہ سید الشہدا علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ ہے کہ جس کی کیفیت بہت ہی غم انگیز ہے۔

اگرچہ آخر کار وہ مجبور ہوگئی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور ظاہراً مسلمان ہوجائے لیکن اسکی

[1] سورہ ممتحنہ آیت 12

بیعت کا ماجرا بتاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اپنے سابقہ عقائد کی اسی طرح وفادار تھی، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بنی امیہ کا خاندان اور ہندہ کی اولاد نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا کہ جن کی سابقہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بہرحال مفسرین نے اس طرح لکھا ہے کہ ہندہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئی جب آپ کوہ صفا پر تشریف فرما تھے اور عورتوں کی ایک جماعت ہندہ کے ساتھ تھی، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں تم عورتوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دوگی، تو ہندہ نے اعتراض کیا اور کہا: ''آپ ہم سے ایسا عہد لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا''، (کیونکہ اس دن مردوں سے صرف ایمان اور جہاد پر بیعت لی گئی تھی)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بات کی پرواہ کئے بغیر اپنی گفتگو کو جاری فرمایا: ''کہ تم چوری بھی نہیں کروگی''

ہندہ نے کہا: ابوسفیان کنجوس اور بخیل آدمی ہے میں نے اس کے مال میں سے کچھ چیزیں لی ہیں، میں نہیں جانتی کہ وہ انہیں مجھ پر حلال کرے گا یا نہیں ابوسفیان موجود تھا، اس نے کہا: جو کچھ تو نے گذشتہ زمانہ میں میرے مال میں سے لے لیا ہے وہ سب میں نے حلال کیا، (لیکن آئندہ کے لئے پابندی کرنا۔)

اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنسے اور ہندہ کو پہچان کر فرمایا: ''کیا تو ہندہ ہے''؟ اس نے کہا: ''جی ہاں، یارسول اللہ پچھلے امور کو بخش دیجئے خدا آپ کو بخشے''۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا: ''اور تم زنا سے آلودہ نہیں ہوگی''

ہندہ نے تعجب کرتے ہوئے کہا: ''کیا آزاد عورت اس قسم کا عمل بھی انجام دیتی ہے؟''

حاضرین میں سے بعض لوگ جو زمانہ جاہلیت میں اس کی حالت سے واقف تھے اس کی اس بات پر ہنس پڑے کیونکہ ہندہ کا سابقہ زمانہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی''۔

ہندہ نے کہا: ''ہم نے تو انہیں بچپن میں پالا پوسا تھا، مگر جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں قتل کر دیا، اب آپ اور وہ خود بہتر جانتے ہیں''۔ (اس کی مراد اس کا بیٹا ''حنظلہ'' تھا جو بدر کے دن علی علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اس بات پر تبسم فرمایا، اور جب آپ اس بات پر پہنچے اور فرمایا: ''تم بہتان اور تہمت کو روا نہیں رکھوگی''۔

تو ہندہ نے کہا: ''بہتان قبیح ہے اور آپ ہمیں صلاح و درستی، نیکی اور مکارم اخلاق کے سوا اور کسی چیز کی دعوت نہیں دیتے''۔

جب آپ نے یہ فرمایا: ''تم تمام اچھے کاموں میں میرے حکم کی اطاعت کروگی''۔

تو ہندہ نے کہا: ''ہم یہاں اس لئے نہیں بیٹھے ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی نافرمانی کا ارادہ ہو''۔

حالانکہ مسلمہ طور پر معاملہ اس طرح نہیں تھا، لیکن تعلیمات اسلامی کے مطابق پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ ان کے بیانات کو قبول کرلیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سرزمین حجاز میں اسلام کافی نفوذ کر چکا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس زمانے کے

بڑے بڑے حکمرانوں کے نام کئی خطوط روانہ کیے۔ان میں بعض خطوط میں ان چیزوں کا سہارا لیا گیا ہے،جس میں آسمانی ادیان کی قدر مشترک کا تذکرہ ہے۔

مقوقس[1] کے نام خط

مقوقس مصر کا حاکم تھا پیغمبر اسلامﷺ نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکام کو خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی،حاطب بن ابی بلتعہ کو حاکم مصر مقوقس کی طرف یہ خط دے کر روانہ کیا۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم

من: محمد بن عبدالله

الی: المقوقس عظیم القبط

سلام علی من اتبع الهدی،اما بعد:"فانی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم،یو تك الله اجرك مرتین، فان تولیت فانما علیكم اثم القبط... یا اهل الكتب تعالوا الی كلمة سواء بیننا و بینكم "ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شیئاً ولا تتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله،فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون"۔

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

از۔۔۔محمد بن عبداللہ

بطرف۔۔۔قبطیوں کے مقوقس بزرگ۔

حق کے پیروکاروں پر سلام ہو۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔اسلام لے آؤ تاکہ سالم رہو۔خدا تجھے دوگنا اجر دے گا۔(ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کر کے ایمان لائیں گے)اور اگر تو نے قانون اسلام سے روگردانی کی تو قبطیوں کے گناہ تیرے ذمہ ہوں گے"اے اہل کتاب ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں حق سے روگردانی نہ کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تم مسلمان ہیں"۔

پیغمبرﷺ کا سفیر مصر کی طرف روانہ ہوا،اسے اطلاع ملی کہ حاکم مصر اسکندریہ میں ہے لہٰذا وہ اس وقت کے ذرائع آمد ورفت کے ذریعے اسکندریہ پہنچا اور مقوقس کے محل میں گیا،حضرت کا خط اسے دیا،مقوقس نے خط کھول کر پڑھا کچھ دیر تک سوچتا رہا،پھر کہنے لگا:"اگر واقعاً محمدﷺ خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اس کے مخالفین اسے اس کی پیدائش کی جگہ سے باہر نکالنے میں کیوں کامیاب ہوئے اور وہ مجبور ہوا کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے؟ان پر نفرین اور بددعا کیوں نہیں کی تاکہ وہ نابود ہو جاتے؟"

پیغمبرﷺ کے قاصد نے جواباً کہا:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول تھے اور آپ بھی ان کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں،بنی اسرائیل نے جب ان کے قتل کی

---

[1] "مقوقس"(بہ ضم میم و بہ فتحہ ہر دو "قاف")"ہرقل"بادشاہ روم کی طرف سے مصر کا والی تھا۔

سازش کی تو آپ نے ان پر نفرین اور بد دعا کیوں نہیں کی تا کہ خدا انہیں ہلاک کر دیتا؟''
یہ منطق سن کر مقوقس تحسین کرنے لگا اور کہنے لگا:

"احسنت انت حکیم من عند حکیم"

''آفرین ہے، تم سمجھدار ہو اور ایک صاحب حکمت کی طرف سے آئے ہو''
حاطب نے پھر گفتگو شروع کی اور کہا: ''آپ سے پہلے ایک شخص (یعنی فرعون) اس ملک پر حکومت کرتا تھا، وہ مدتوں لوگوں میں اپنی خدائی کا سودا بیچتا رہا، بالآخر اللہ نے اسے نابود کر دیا تا کہ اس کی زندگی آپ کے لئے باعث عبرت ہو لیکن آپ کوشش کریں کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بن جائے''۔

''پیغمبر ﷺ نے ہمیں ایک پاکیزہ دین کی طرف دعوت دی ہے، قریش نے ان سے بہت سخت جنگ کی اور ان کے مقابل صف آراء ہوئے، یہودی بھی کینہ پروری سے ان کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے اور اسلام سے زیادہ نزدیک عیسائی ہیں۔''

''مجھے اپنی جان کی قسم جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی بشارت دی تھی اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے مبشر تھے، آپ لوگوں نے توریت کے ماننے والوں کو انجیل کی دعوت دی تھی، جو قوم پیغمبر حق کی دعوت کو سنے اسے چاہئے کہ اس کی پیروی کرے، میں نے محمد کی دعوت آپ کی سرزمین تک پہنچا دی ہے، مناسب یہی ہے کہ آپ اور مصری قوم یہ دعوت قبول کر لے''۔

حاطب کچھ عرصہ اسکندریہ ہی میں ٹھہرا تا کہ رسول اللہ ﷺ کے خط کا جواب حاصل کرے، چند روز گزر گئے، ایک دن مقوقس نے حاطب کو اپنے محل میں بلایا اور خواہش کی کہ اسے اسلام کے بارے میں کچھ مزید بتایا جائے۔
حاطب نے کہا: ''محمد ﷺ ہمیں خدائے یکتا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ لوگ روز و شب میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور نماز پڑھیں، پیمان پورے کریں، خون اور مردار کھانے سے اجتناب کریں''۔
علاوہ ازیں حاطب نے پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کی بعض خصوصیات بھی بیان کیں۔
مقوقس کہنے لگا: ''یہ تو بڑی اچھی نشانیاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خاتم النبیین سرزمین شام سے ظہور کریں گے جو انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے، اب مجھ پر واضح ہوا کہ وہ سرزمین حجاز سے مبعوث ہوئے ہیں''۔
اس کے بعد اس نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ وہ عربی زبان میں اس مضمون کا خط تحریر کرے:
بخدمت: محمد بن عبداللہ۔
منجانب: قبطیوں کے بزرگ مقوقس۔
''آپ پر سلام ہو، میں نے آپ کا خط پڑھا، آپ کے مقصد سے باخبر ہوا اور آپ کی دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا، میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک پیغمبر ﷺ ظہور کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ خطۂ شام سے مبعوث ہوگا، میں آپ کے قاصد کا احترام کرتا ہوں''۔
پھر خط میں ان ہدیوں اور تحفوں کی طرف اشارہ کیا جو اس نے آپ کی خدمت میں بھیجے، خط اس نے ان الفاظ پر تمام کیا۔
''آپ پر سلام ہو''
تاریخ میں ہے کہ مقوقس نے کوئی گیارہ قسم کے ہدیے پیغمبر ﷺ کے لئے بھیجے، تاریخ اسلام میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، ان میں سے ایک طبیب تھا تا کہ وہ بیمار ہونے والے مسلمانوں کا علاج کرے، نبی اکرم ﷺ نے دیگر ہدیئے قبول فرمایائے

لیکن طبیب کو قبول نہ کیا اور فرمایا: ''ہم ایسے لوگ ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہیں کھاتے اور سیر ہونے سے پہلے کھانے سے ہاتھ روک لیتے ہیں، یہی چیز ہماری صحت و سلامتی کے لئے کافی ہے''۔

شاید صحت کے اس عظیم اصول کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ اس طبیب کی وہاں موجودگی کو درست نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ ایک متعصب عیسائی تھا لہٰذا آپ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کا معاملہ اس کے سپرد کر دیں۔

مقوقس نے جو سفیر پیغمبر ﷺ کا احترام کیا، آپ کے لئے ہدیے بھیجے اور خط میں نام محمد اپنے نام سے مقدم رکھا یہ سب اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اس نے آپ کی دعوت کو باطن میں قبول کرلیا تھا یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس بناء پر کہ اس کی حیثیت اور وقعت کو نقصان نہ پہنچے ظاہری طور پر اس نے اسلام کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہ کیا۔

قیصر روم کے نام خط

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من: محمد بن عبداللہ

الی: ھرقل عظیم الرّوم

سلام علی من اتبع الھدیٰ

اما بعد: فانی ادعوك بدعایۃ الاسلام۔

اسلم تسلم، یؤتك اللہ اجرك مرتین، فان تولیت فانما علیکم اثم القبط۔۔۔ یا اھل الکتب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ''ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك بہ شیئاً ولا تتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ، فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون''۔

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

منجانب: محمد بن عبداللہ۔

بطرف: ہرقل بادشاہ روم۔

''اس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تاکہ سالم رہو۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا۔ (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کر کے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانون اسلام سے روگردانی کی تو اریسوں کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا۔ اے اہل کتاب ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں حق سے روگردانی نہ کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تم مسلمان ہیں''۔

قیصر کے پاس نبی اکرم ﷺ کا پیغام پہنچانے کے لئے ''دحیہ کلبی'' مامور ہوا سفیر پیغمبر ﷺ عازم روم ہوا۔

قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے اسے معلوم ہوا کہ قیصر بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے قسطنطنیہ چھوڑ چکا ہے، لہٰذا اس نے بصریٰ کے گورنر حادث بن ابی شمر سے رابطہ پیدا کیا اور اسے اپنا مقصد سفر بتایا ظاہراً پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دحیہ وہ خط حاکم بصریٰ کو دے دے تاکہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے سفیر پیغمبر ﷺ نے گورنر سے رابطہ کیا تو

اس نے عدی بن حاتم کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ دحیہ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف جائے اور خط قیصر تک پہنچا دے مقام حمص میں سفیر کی قیصر سے ملاقات ہوئی لیکن ملاقات سے قبل شاہی دربار کے کارکنوں نے کہا:

''تمہیں قیصر کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا''

دحیہ ایک سمجھدار آدمی تھا کہنے لگا:

''میں ان غیر مناسب بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے اتنا سفر کر کے آیا ہوں۔ میں اس مراسلے کے بھیجنے والے کی طرف سے آیا ہوں تا کہ قیصر کو یہ پیغام دوں کہ بشر پرستی کو ختم ہونا چاہئے اور خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہونی چاہیے، اس عقیدے کے باوجود کیسے ممکن ہے کہ میں غیر خدا کے لئے سجدہ کروں''۔

پیغمبرؐ کے قاصد کی قوی منطق سے وہ بہت حیران ہوئے، درباریوں میں سے ایک نے کہا:

''تمہیں چاہئے کہ خط بادشاہ کی مخصوص میز پر رکھ کر چلے جاؤ، اس میز پر رکھے ہوئے خط کو قیصر کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا سکتا''۔

دحیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا، خط میز پر رکھا اور خود واپس چلا گیا، قیصر نے خط کھولا، خط نے جو ''بسم اللہ'' سے شروع ہوتا تھا اسے متوجہ کیا اور کہنے لگا۔

''حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کے سوا آج تک میں نے ایسا خط نہیں دیکھا''

اس نے اپنے مترجم کو بلایا تا کہ وہ خط پڑھے اور اس کا ترجمہ کرے، بادشاہ روم کو خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے خط لکھنے والا وہی نبی ہو جس کا وعدہ انجیل اور توریت میں کیا گیا ہے، وہ اس جستجو میں لگ گیا کہ آپ کی زندگی کی خصوصیات معلوم کرے، اس نے حکم دیا کہ شام کے پورے علاقے میں چھان بین کی جائے، شاید محمد کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص مل جائے جو ان کے حالات سے واقف ہو، اتفاق سے ابوسفیان اور قریش کا ایک گروہ تجارت کے لئے شام آیا ہوا تھا، شام اس وقت سلطنت روم کا مشرقی حصہ تھا، قیصر کے آدمیوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بیت المقدس لے گئے، قیصر نے ان سے سوال کیا:

کیا تم میں سے کوئی محمد کا نزدیکی رشتہ دار ہے؟

ابوسفیان نے کہا: میں اور محمد ایک ہی خاندان سے ہیں اور ہم چوتھی پشت میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

پھر قیصر نے اس سے کچھ سوالات کئے دونوں میں یوں گفتگو ہوئی:

قیصر: اس کے بزرگوں میں سے کوئی حکمران ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا نبوت کے دعویٰ سے پہلے وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتا تھا؟

ابوسفیان: ہاں محمد راست گو اور سچا انسان ہے۔

قیصر: کونسا طبقہ اس کا مخالف ہے اور کونسا موافق؟

ابوسفیان: اشراف اس کے مخالف ہیں، عام اور متوسط درجے کے لوگ اسے چاہتے ہیں۔

قیصر: اس کے پیروکاروں میں سے کوئی اس کے دین سے پھرا بھی ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا اس کے پیروکار روز بروز بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: ہاں۔

اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان اوراس کے ساتھیوں سے کہا:

''اگر یہ باتیں سچی ہیں تو پھر یقیناً وہ پیغمبر موعود ہیں، مجھے معلوم تھا کہ ایسے پیغمبر کا ظہور ہوگا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ قریش میں سے ہوگا، میں تیار ہوں کہ اس کے لئے خضوع کروں اور احترام کے طور پر اس کے پاؤں دھوؤں، میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس کا دین اور حکومت سرزمین روم پر غالب آئے گی''۔

پھر قیصر نے دحیہ کو بلایا اور اس سے احترام سے پیش آیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کا جواب لکھا اور آپ کے لئے دحیہ کے ذریعے ہدیہ بھیجا اور آپ کے نام اپنے خط میں آپ سے اپنی عقیدت اور تعلق کا اظہار کیا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط لے کر قیصر روم کے پاس پہونچا تو اس نے خصوصیت کے ساتھ آپ کے قاصد کے سامنے اظہار ایمان کیا یہاں تک کہ وہ رومیوں کو اس دین توحید واسلام کی دعوت دینا چاہتا تھا، اس نے سوچا کہ پہلے ان کی آزمائش کی جائے، جب اس کی فوج نے محسوس کیا کہ وہ عیسائیت کو ترک کردینا چاہتا ہے تو اس نے اس کے قصر کا محاصرہ کرلیا، قیصر نے ان سے فوراً کہا کہ میں تو تمہیں آزمانا چاہتا تھا اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔

جنگ ذات السلاسل

ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ بارہ ہزار سوار سرزمین ''یابس'' میں جمع ہیں، اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کو قتل نہ کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت کو منتشر نہ کردیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت کو بعض صحابہ کی سرکردگی میں ان کی جانب روانہ کیا لیکن وہ کافی گفتگو کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے واپس آئے۔

آخرکار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو مہاجرین وانصار کے ایک گروہ کثیر کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا، وہ بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے اور رات بھر میں سارا سفر طے کرکے صبح دم دشمن کو اپنے محاصرہ میں لے لیا، پہلے تو ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا، جب انہوں نے قبول نہ کیا تو ابھی فضا تاریک ہی تھی کہ ان پر حملہ کردیا اور انہیں درہم برہم کرکے رکھ دیا، ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کرلیا اور بکثرت مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا۔

سورہ ''والعادیات'' نازل ہوئی حالانکہ ابھی سربازان اسلام مدینہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئے تھے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن نماز صبح کے لئے آئے تو اس سورہ کی نماز میں تلاوت کی، نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا، یہ تو ایسا سورہ ہے جسے ہم نے آج تک سنا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں علی علیہ السلام دشمنوں پر فتح یاب ہوئے ہیں اور جبرائیل نے گزشتہ رات یہ سورہ لاکر مجھے بشارت دی ہے۔ کچھ دن کے بعد علی علیہ السلام غنائم اور قیدیوں کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے۔[1]

جنگ حنین[2]

اس جنگ کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب ''ہوازن'' جو بہت بڑا قبیلہ تھا اسے فتح مکہ کی خبر ہوئی تو اس کے سردار مالک بن عوف

[1] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سورہ کے واضح مصادیق میں سے ایک ہے، یہ اس کا شان نزول نہیں ہے۔

[2] ذیل آیات 25 تا 27 سورہ توبہ

نے افراد قبیلہ کو جمع کیا اوران سے کہا کہ ممکن ہے فتح مکہ کے بعد محمد ان سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کہنے لگے کہ مصلحت اس میں ہے کہ اس سے قبل کہ وہ ہم سے جنگ کرے ہمیں قدم آگے بڑھانا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع پہونچی تو آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سرزمین ہوازن کی طرف چلنے کو تیار ہو جائیں۔

1 ہجری رمضان المبارک کے آخری دن تھے یا شوال کا مہینہ تھا کہ قبیلہ ہوازن کے افراد سردار ''مالک بن عوف'' کے پاس جمع ہوئے اور اپنا مال، اولاد اور عورتیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تا کہ مسلمانوں سے جنگ کرتے وقت کسی کے دماغ میں بھاگنے کا خیال نہ آئے، اسی طرح سے وہ سرزمین ''اوطاس'' میں وارد ہوئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے لشکر کا بڑا علم باندھ کر علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دیا اور وہ تمام افراد جو فتح مکہ کے موقع پر اسلامی فوج کے کسی دستے کے کمانڈر تھے آنحضرت ﷺ کے حکم سے اسی پرچم کے نیچے حنین کے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ''صفوان بن امیہ'' کے پاس ایک بڑی مقدار میں زرہیں ہیں آپ نے کسی کو اس کے پاس بھیجا اور اس سے سو زرہیں عاریتاً طلب کی، صفوان نے پوچھا واقعاً عاریتاً یا غصب کے طور پر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عاریتاً ہیں اور ہم ان کے ضامن ہیں کہ صحیح وسالم واپس کریں گے۔

صفوان نے زرہیں عاریتاً پیغمبر اکرم ﷺ کو دے دیں اور خود بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ چلا۔

فوج میں کچھ ایسے افراد تھے جنہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا، ان کے علاوہ دس ہزار وہ مجاہدین اسلام تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ فتح مکہ کے لئے آئے تھے، یہ تعداد مجموعاً بارہ ہزار بنتی ہے، یہ سب میدان جنگ کی طرف چل پڑے۔

دشمن کے لشکر کا مورچہ

''مالک بن عوف'' ایک مرد جری اور ہمت وحوصلے والا انسان تھا، اس نے اپنے قبیلے کو حکم دیا کہ اپنی تلواروں کے نیام توڑ ڈالیں اور پہاڑ کی غاروں میں، دروں کے اطراف میں اور درختوں کے درمیان لشکر اسلام کے راستے میں کمین گاہیں بنائیں اور جب اول صبح کی تاریکی میں مسلمان وہاں پہنچیں تو اچانک اور ایک ہی باران پر حملہ کردیں اور اسے فنا کردیں۔

اس نے مزید کہا: محمد کا ابھی تک جنگجو لوگوں سے سامنا نہیں ہوا کہ وہ شکست کا مزہ چکھتا۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز صبح پڑھ چکے تو آپؐ نے حکم دیا کہ سرزمین حنین کی طرف چل پڑیں، اس موقع پر اچانک لشکر ''ہوازن'' نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی بوچھار کردی، وہ دستہ جو مقدمہ لشکر میں تھا (اور جس میں مکہ کے نئے نئے مسلمان بھی تھے) بھاگ کھڑا ہوا، اس کے سبب باقی ماندہ لشکر بھی پریشان ہوکر بھاگ کھڑا ہوا۔

خداوند متعال نے اس موقع پر دشمن کے ساتھ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور وقتی طور پر ان کی نصرت سے ہاتھ اٹھالیا کیونکہ مسلمان اپنی کثرت تعداد پر مغرور تھے، لہٰذا ان میں شکست کے آثار آشکار ہوئے، لیکن حضرت علی علیہ السلام جو لشکر اسلام کے علمبردار تھے وہ مٹھی بھر افراد سمیت دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور اسی طرح جنگ جاری رکھے رہے۔

اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ قلب لشکر میں تھے، رسول اللہ کے چچا عباس بنی ہاشم کے چند افراد کے ساتھ آپؐ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے، یہ کل افراد نو سے زیادہ نہ تھے دسویں ام ایمن کے فرزند ایمن تھے، مقدمہ لشکر کے سپاہی فرار کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرے تو آنحضرت ﷺ نے عباس کو جن کی آواز بلند اور رزوردار تھی کو حکم دیا کہ اس ٹیلے پر جو

قریب ہے چڑھ جائیں اور مسلمانوں کو پکاریں:

"یا معشر المهاجرین والانصار یا اصحاب سورة البقرة یا اهل بیعت الشجرة الی این تفرون هذا رسول الله۔"

اے مہاجرین وانصار اے سورہ بقرہ کے ساتھیو اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو کہاں بھاگے جارہے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو یہاں ہیں۔مسلمانوں نے جب عباس کی آواز سنی تو پلٹ آئے اور کہنے لگے: لبیک لبیک

خصوصاً لوٹ آنے والوں میں انصار نے پیش قدمی کی اور فوج دشمن پر ہر طرف سے سخت حملہ کیا اور نصرت الٰہی سے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ قبیلہ ہوازن وحشت زدہ ہوکر ہر طرف بکھر گیا، مسلمان ان کا تعاقب کررہے تھے، لشکر دشمن میں سے تقریباً ایک سوافراد مارے گئے، ان کے اموال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور کچھ ان میں سے قیدی بنا لئے گئے۔

لکھا ہے کہ اس تاریخی واقعہ کے آخر میں قبیلہ ہوازن کے نمائندے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے او راسلام قبول کرلیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بہت محبت والفت فرمائی، یہاں تک کہ ان کے سربراہ مالک بن عوف نے بھی اسلام قبول کرلیا، آپؐ نے اس کا مال اور قیدی اسے واپس کردیئے اور اس کے قبیلہ کے مسلمانوں کی سرداری بھی اس کے سپرد کردی۔

درحقیقت ابتداء میں مسلمانوں کی شکست کا اہم عامل غرور وتکبر جو کثرت فوج کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گیا تھا، اسکے علاوہ دو ہزار نئے مسلمانوں کا وجود تھا جن میں سے بعض فطری طور پر منافق تھے، کچھ ان میں مال غنیمت کے حصول کے لئے شامل ہو گئے تھے اور بعض بغیر کسی مقصد کے ان میں شامل ہو گئے تھے۔

نہائی کامیابی کا سبب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور بعض اصحاب کا قیام تھا، اور پہلے والوں کا عہد و پیمان اور خدا پر ایمان اور اس کی مدد پر خاص توجہ باعث بنی کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں کامیابی ملی۔

بھاگنے والے کون تھے؟

اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ میدان حنین میں سے اکثریت ابتداء میں بھاگ گئی تھی، جو باقی رہ گئے تھے ان کی تعداد ایک روایت کے مطابق دس تھی اور بعض نے تو ان کی تعداد چار بیان کی ہے بعض نے زیادہ سے زیادہ سوافراد لکھے ہیں۔

بعض مشہور روایات کے مطابق چونکہ پہلے خلفاء بھی بھاگ جانے والوں میں سے تھے لہٰذا بعض اہل سنت مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس فرار کو ایک فطری چیز کے طور پر پیش کیا جائے۔المنار کے مؤلف لکھتے ہیں: ''جب دشمن کی طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی سخت بوچھار ہوئی تو جو لوگ مکہ سے مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے، اور جن میں منافقین اور ضعیف الایمان بھی تھے اور جو مال غنیمت کے لئے آ گئے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور انہوں نے میدان میں پشت دکھائی تو باقی لشکر بھی فطری طور پر مضطرب او ر پریشان ہو گیا وہ بھی معمول کے مطابق نہ کہ خوف و ہراس سے، بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر ایک گروہ فرار ہو جائے تو باقی بھی بے سوچے سمجھے متزلزل ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان کا فرار ہونا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد ترک کرنے اور انہیں دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ جانے کے طور پر نہیں تھا کہ وہ خدا کے غضب کے مستحق ہوں، ہم اس بات کی تشریح نہیں کرتے اور اس کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں''۔

جنگ تبوک

''تبوک''[1] کا مقام ان تمام مقامات سے دور تھا جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جنگوں میں پیش قدمی کی۔ ''تبوک'' اصل میں ایک محکم اور بلند قلعہ کا نام تھا۔ جو حجاز اور شام کی سرحد پر واقع تھا اسی وجہ سے اس علاقے کو سرزمین تبوک کہتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے تیز رفتار نفوذ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہرت اطراف کے تمام ممالک میں گونجنے لگی باوجودیکہ وہ اس وقت حجاز کی اہمیت کے قائل نہیں تھے لیکن طلوع اسلام اور لشکر اسلام کی طاقت کہ جس نے حجاز کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا، نے انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں ڈال دیا۔

مشرقی روم کی سرحد حجاز سے ملتی تھی اس حکومت کو خیال ہوا کہ کہیں اسلام کی تیز رفتار ترقی کی وہ پہلی قربانی نہ بن جائے لہٰذا اس نے چالیس ہزار کی زبردست مسلح فوج جو اس وقت کی روم جیسی طاقتور حکومت کے شایان شان تھی اکھٹی کی اور اسے حجاز کی سرحد پر لاکھڑا کیا یہ خبر مسافروں کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روم اور دیگر ہمسایوں کو درس عبرت دینے کے لئے توقف کئے بغیر تیاری کا حکم صادر فرمایا آپ کے منادیوں نے مدینہ اور دوسرے علاقوں تک آپ کا پیغام پہنچایا تھوڑے ہی عرصہ میں تیس ہزار افراد رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے ان میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ تھے۔

موسم بہت گرم تھا، غلے کے گودام خالی تھے اس سال کی فصل ابھی اٹھائی نہیں گئی تھی ان حالات میں سفر کرنا مسلمانوں کے لئے بہت ہی مشکل تھا لیکن چونکہ خدا اور رسول کا فرمان تھا لہٰذا ہر حالت میں سفر کرنا تھا اور مدینہ اور تبوک کے درمیان پُرخطر طویل صحرا کو عبور کرنا تھا۔

لشکری مشکلات

اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا راستہ بھی طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزے اڑتے تھے اور جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں اس لئے یہ ''جیش العسرۃ'' (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا۔

تاریخ اسلام نشاندہی کرتی ہے کہ مسلمان کبھی بھی جنگ تبوک کے موقع کی طرح مشکل صورت حال، دباؤ اور زحمت میں مبتلا نہیں ہوئے تھے کیونکہ ایک تو سفر سخت گرمی کے عالم میں تھا دوسرا خشک سالی نے لوگوں کو تنگ اور ملول کر رکھا تھا اور تیسرا اس وقت درختوں سے پھل اتارنے کے دن تھے اور اسی پر لوگوں کی سال بھر کی آمدنی کا انحصار تھا۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ مدینہ اور تبوک کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا اور مشرقی روم کی سلطنت کا انہیں سامنا تھا جو اس وقت کی سپر پاور تھی۔

مزید برآں سواریاں اور رسد مسلمانوں کے پاس اتنا کم تھا کہ بعض اوقات دو افراد مجبور ہوتے تھے کہ ایک ہی سواری پر باری باری سفر کریں بعض پیدل چلنے والوں کے پاس جوتا تک نہیں تھا اور وہ مجبور تھے کہ وہ بیابان کی جلانے والی ریت پر پا برہنہ چلیں آب وغذا کی کمی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خرمہ کا ایک دانہ چند آدمی یکے بعد دیگرے منہ میں رکھ کر چوستے تھے یہاں تک کہ اس کی صرف گٹھلی رہ جاتی پانی کا ایک گھونٹ کبھی چند آدمیوں کو مل کر پینا پڑتا۔

---

[1] واقعہ جنگ تبوک سورہ توبہ آیت 117 کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

یہ واقعہ نو ہجری یعنی فتح مکہ سے تقریباً ایک سال بعد رونما ہوا۔ مقابلہ چونکہ اس وقت کی ایک عالمی سو پر طاقت سے تھا نہ کہ عرب کے کسی چھوٹے بڑے گروہ سے لہٰذا بعض مسلمان اس جنگ میں شرکت سے خوف زدہ تھے اس صورت حال میں منافقین کے زہریلے پروپیگنڈے اور وسوسوں کے لئے ماحول بالکل سازگار تھا اور وہ بھی مومنین کے دلوں اور جذبات کو کمزور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے۔

پھل اتارنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا جن لوگوں کی زندگی تھوڑی سی کھیتی باڑی اور کچھ جانور پالنے پر بسر ہوتی تھی یہ ان کی قسمت کے اہم دن شمار ہوتے تھے کیونکہ ان کی سال بھر کی گزر بسر انہیں چیزوں سے وابستہ تھیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مسافت کی دوری اور موسم کی گرمی بھی روکنے والے عوامل کی مزید مدد کرتی تھی اس موقع پر آسمانی وحی لوگوں کی مدد کے لئے آ پہنچی اور قرآنی آیات یکے بعد دیگرے نازل ہوئیں اور ان منفی عوامل کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

تشویق، سرزنش، اور دھمکی کی زبان

قرآن جس قدر ہوسکتی ہے اتنی سختی اور شدت سے جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی تشویق کی زبان سے کبھی سرزنش کے لہجے میں اور کبھی دھمکی کی زبان میں ان سے بات کرتا ہے، اور انہیں آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن راستہ اختیار کرتا ہے۔ پہلے کہتا ہے: ''کہ خدا کی راہ میں، میدان جہاد کی طرف حرکت کرو تو تم سستی کا مظاہرہ کرتے ہو اور بوجھل پن دکھاتے ہو''۔ [1]

اس کے بعد ملامت آمیز لہجے میں قرآن کہتا ہے: ''آخرت کی وسیع اور دائمی زندگی کی بجائے اس دنیاوی پست اور ناپائیدار زندگی پر راضی ہو گئے ہو حالانکہ دنیاوی زندگی کے فوائد اور مال ومتاع آخرت کی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور بہت ہی کم ہیں''۔ [2]

ایک عقلمند انسان ایسے گھاٹے کے سودے پر کیسے تیار ہوسکتا ہے اور کیونکہ وہ ایک نہایت گراں بہا متاع اور سرمایہ چھوڑ کر ایک ناچیز اور بے وقعت متاع کی طرف جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ملامت کے بجائے ایک حقیقی تہدید کا انداز اختیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اگر تم میدان جنگ کی طرف حرکت نہیں کرو گے تو خدا دردناک عذاب کے ذریعے تمہیں سزا دے گا''۔ [3]

''اور اگر تم گمان کرتے ہو کہ تمہارے کنارہ کش ہونے اور میدان جہاد سے پشت پھیرنے سے اسلام کی پیش رفت رک جائے گی اور آئینہ الٰہی کی چمک ماند پڑ جائے گی تو تم سخت اشتباہ میں ہو، کیونکہ خدا تمہارے بجائے ایسے صاحبان ایمان کو لے آئے گا جو عزم مصمم رکھتے ہوں گے اور فرمان خدا کے مطیع ہوں گے''۔ [4]

وہ لوگ کہ جو ہر لحاظ سے تم سے مختلف ہیں نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ ان کا ایمان، ارادہ، دلیری اور فرماں برداری بھی تم سے مختلف ہے لہٰذا ''اس طرح تم خدا اور اس کے پاکیزہ دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے''۔ [5]

---

[1] سورہ توبہ آیت 38

[2] سورہ توبہ آیت 38

[3] سورہ توبہ آیت 39

[4] سورہ توبہ آیت 39

[5] سورہ توبہ آیت 39

تنہا وہ جنگ جس میں حضرت علی علیہ السلام نے شرکت نہ کی

اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا راستہ بھی طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزے اڑتے تھے اور جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں اس لئے یہ ''جیش العسر ۃ'' (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا اس نے تمام سختیوں کو جھیلا اور ماہ شعبان کی ابتداء میں ہجرت کے نویں سال سرزمین ''تبوک'' میں پہنچا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ پر مدینہ میں چھوڑ آئے تھے یہ واحد غزوہ ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام شریک نہیں ہوئے۔

رسول اللہ کا یہ اقدام بہت ہی مناسب اور ضروری تھا کیونکہ بہت احتمال تھا کہ بعض پیچھے رہنے والے مشرکین یا منافقین جو حیلوں بہانوں سے میدان تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے، رسول اللہ اور ان کی فوج کی طویل غیبت سے فائدہ اٹھائیں اور مدینہ پر حملہ کردیں، عورتوں اور بچوں کو قتل کردیں اور مدینہ کو تاراج کردیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کا مدینہ میں رہ جانا ان کی سازشوں کے مقابلے میں ایک طاقتور رکاوٹ تھی۔

بہرحال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک میں پہنچے تو وہاں آپ کو رومی فوج کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا عظیم سپاہ اسلام چونکہ کئی جنگوں میں اپنی عجیب وغریب جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرچکی تھی، جب ان کے آنے کی کچھ خبر رومیوں کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اسی کو بہتر سمجھا کہ اپنے ملک کے اندر چلے جائیں اور اس طرح سے ظاہر کریں کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر روم کی سرحدوں پر جمع ہونے کی خبر ایک بے بنیاد افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی کیونکہ وہ ایک ایسی خطرناک جنگ شروع کرنے سے ڈرتے تھے جس کا جواز بھی ان کے پاس کوئی نہ تھا لیکن لشکر اسلام کے اس طرح سے تیز رفتاری سے میدان تبوک میں پہنچنے نے دشمنان اسلام کو کئی درس سکھائے، مثلاً:

1۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجاہدین اسلام کا جذبہ جہاد اس قدر قوی ہے کہ وہ اس زمانے کی نہایت طاقتور فوج سے بھی نہیں ڈرتے۔

2۔ بہت سے قبائل اور اطراف تبوک کے امراء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ سے تعرض اور جنگ نہ کرنے کے عہد و پیمان پر دستخط کیے اس طرح مسلمان ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہوگئے۔

3۔ اسلام کی لہریں سلطنت روم کی سرحدوں کے اندر تک چلی گئیں اور اس وقت کے ایک اہم واقعہ کے طور پر اس کی آواز ہر جگہ گونجی اور رومیوں کے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔

4۔ یہ راستہ طے کرنے اور زحمتوں کو برداشت کرنے سے آئندہ شام کا علاقہ فتح کرنے کے لئے راہ ہموار ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ آخرکار یہ راستہ طے کرنا ہی ہے۔

یہ عظیم فوائد ایسے تھے کہ جن کے لئے لشکر کشی کی زحمت برداشت کی جاسکتی تھی۔

بہرحال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت کے مطابق اپنی فوج سے مشورہ کیا کہ کیا پیش قدمی جاری رکھی جائے یا واپس پلٹ جایا جائے؟

اکثریت کی رائے یہ تھی، کہ پلٹ جانا بہتر ہے اور یہی اسلامی اصولوں کی روح سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ

اس وقت طاقت فرسا سفر اور راستے کی مشقت وزحمت کے باعث اسلامی فوج کے سپاہی تھکے ہوئے تھے اور ان کی جسمانی قوت مزاحمت کمزور پڑ چکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو صحیح قرار دیا اور لشکر اسلام مدینہ کی طرف لوٹ آیا۔

ایک عظیم درس

''ابوحثیمہ''[1] اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے تھا، منافقین میں سے نہ تھا لیکن سستی کی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ میدان تبوک میں نہ گیا۔

اس واقعہ کو دس دن گذر گئے، ہوا گرم اور جلانے والی تھی، ایک دن اپنی بیویوں کے پاس آیا انھوں نے ایک سائبان تان رکھا تھا، ٹھنڈا پانی مہیا کر رکھا تھا اور بہترین کھانا تیار کر رکھا تھا، وہ اچانک غم وفکر میں ڈوب گیا اور اپنے پیشوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد اسے ستانے لگی، اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جنھوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا اور خدا ان کے گذشتہ اور آئندہ کا ذمہ دار ہے، بیابان کی جلا ڈالنے والی ہواؤں میں کندھے پر ہتھیار اٹھائے اس دشوار گذار سفر کی مشکلات اٹھا رہے ہیں اور ابوحثیمہ کو دیکھو کہ ٹھنڈے سائے میں تیار کھانے اور خوبصورت بیویوں کے پاس بیٹھا ہے، کیا یہ انصاف ہے؟

اس کے بعد اس نے اپنی بیویوں کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم تم میں سے کسی کے ساتھ میں بات نہ کروں گا اور سائبان کے نیچے نہیں بیٹھوں گا جب تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ جاملوں۔

یہ بات کہہ کر اس نے زاد راہ لیا، اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور چل کھڑا ہوا، اس کی بیویوں نے بہت چاہا کہ اس سے بات کریں لیکن اس نے ایک لفظ نہ کہا اور اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ تبوک کے قریب جا پہنچا۔

مسلمان ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ کوئی سوار ہے جو سڑک سے گذر رہا ہے، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے سوار تم ابوحثیمہ ہو تو بہتر ہے۔

جب وہ قریب پہنچا اور لوگوں نے اسے پہچان لیا تو کہنے لگے: جی ہاں؛ ابوحثیمہ ہے۔

اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھایا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔

اس طرح وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا دل باطل کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس کی روحانی آمادگی کی بناء پر خدا نے اسے حق کی طرف متوجہ کیا اور ثبات قدم بھی عطا کیا۔

جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے تین لوگ

مسلمانوں میں سے تین افراد کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ سفر نہ کیا وہ منافقین میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ ایسا انھوں نے سستی اور کاہلی کی بنا پر کیا تھا، تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہو گئے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان تبوک سے مدینہ لوٹے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت کی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے وہ ایک عجیب

---

[1] یہ شخص انہیں افراد میں سے تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سورہ توبہ آیت 117 نازل ہوئی۔

معاشرتی دباؤ کا شکار ہوگئے یہاں تک کہ ان کے چھوٹے بچے اور عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور اجازت چاہی کہ ان سے الگ ہوجائیں، آپؐ نے انہیں علیحدگی کی اجازت تو نہ دی لیکن حکم دیا کہ ان کے قریب نہ جائیں، مدینہ کی فضا اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، وہ مجبور ہوگئے کہ اتنی بڑی ذلت اور رسوائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے شہر چھوڑ دیں اور اطراف مدینہ کے پہاڑوں کی چوٹی پر جاکر پناہ لیں۔

جن باتوں نے ان کے جذبات پر شدید ضرب لگائی ان میں سے ایک یہ تھی کہ کعب بن مالک کہتا ہے: میں ایک دن بازار مدینہ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ ایک شامی عیسائی مجھے تلاش کرتا ہوا آیا، جب اس نے مجھے پہچان لیا تو بادشاہ غسان کی طرف سے ایک خط میرے ہاتھ میں دیا، اس میں لکھا تھا کہ اگر تیرے ساتھی نے تجھے دھتکار دیا ہے تو ہماری طرف چلے آؤ، میری حالت منقلب اور غیر ہوگئی، اور میں نے کہا وائے ہو مجھ پر میرا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ دشمن میرے بارے میں لالچ کرنے لگے ہیں، خلاصہ یہ کہ ان کے اعزاء واقارب ان کے پاس کھانا لے آتے مگر ان سے ایک لفظ بھی نہ کہتے، کچھ مدت اسی صورت میں گزر گئی اور وہ مسلسل انتظار میں تھے کہ اس کی توبہ قبول ہو اور کوئی آیت نازل ہو جو ان کی توبہ کی دلیل بنے، مگر کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران ان میں سے ایک کے ذہن میں یہ بات آئی اور اس نے دوسروں سے کہا اب جبکہ لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا ہے، کیا ہی بہتر ہے کہ ہم بھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیں (یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہ گار ہیں لیکن مناسب ہے کہ دوسرے گنہ گار سے خوش اور راضی نہ ہوں)۔

انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتا تھا، اس طرح پچاس دن انھوں نے توبہ وزاری کی اور آخر کار ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ [۱]

مسجد ضرار [۲]

کچھ منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا، ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم قبیلہ "بنی سالم" کے درمیان "مسجد قبا" کے قریب ایک مسجد بنالیں تاکہ ناتواں بیمار اور بوڑھے جو کوئی کام نہیں کر سکتے اس میں نماز پڑھ لیا کریں۔ اسی طرح جن راتوں میں بارش ہوتی ہے ان میں جو لوگ آپؐ کی مسجد میں نہیں آسکتے اپنے اسلامی فریضہ کو اس میں انجام دے لیا کریں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک کا عزم کر چکے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی۔

انھوں نے مزید کہا: کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ خود آکر اس میں نماز پڑھیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تو میں سفر کا ارادہ کر چکا ہوں البتہ واپسی پر خدا نے چاہا تو اس مسجد میں آکر نماز پڑھوں گا۔

جب آپؐ جنگ تبوک سے لوٹے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہماری درخواست ہے کہ آپؐ ہماری مسجد میں آکر اس میں نماز پڑھائیں اور خدا سے دعا کریں کہ ہمیں برکت دے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے تھے اس وقت وحی خدا کا

---

[۱] سورہ توبہ: آیت 118۔ اس سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

[۲] مسجد ضرار کے سلسلے میں سورہ توبہ 107 تا 110 میں بیان ہوا ہے

حامل فرشتہ نازل ہوا اور خدا کی طرف سے پیغام لایا اور ان کے کرتوت سے پردہ اٹھایا۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مذکورہ مسجد کو جلا دیا جائے اور اسکے باقی حصے کو مسمار کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوڑا کرکٹ ڈالا جایا کرے۔

ان لوگوں کے ظاہراً کام کو دیکھا جائے تو ہمیں شروع میں تو اس حکم پر حیرت ہوئی کہ کیا بیماروں اور بوڑھوں کی سہولت کے لئے اور اضطراری مواقع کے لئے مسجد بنانا برا کام ہے جبکہ یہ ایک دینی اور انسانی خدمت معلوم ہوتی ہے کیا ایسے کام کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا ہے؟ لیکن اگر ہم اس معاملہ کی حقیقت پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ حکم کس قدر برمحل اور جچا تلا تھا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ''ابو عامر'' نامی ایک شخص نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور راہبوں کے مسلک سے منسلک ہو گیا تھا۔ اس کا شمار عابدوں میں ہوتا تھا، قبیلہ خزرج میں اس کا گہرا اثر ورسوخ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمان آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو ابو عامر جو خود بھی پیغمبر ﷺ کے ظہور کی خبر دینے والوں میں سے تھا، اس نے دیکھا کہ اس کے اردگرد سے لوگ چھٹ گئے ہیں اس پر وہ اسلام کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، وہ مدینہ سے نکلا اور کفار مکہ کے پاس پہنچا، اس نے ان سے پیغمبر اکرم ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے مدد چاہی اور قبائل عرب کو بھی تعاون کی دعوت دی، وہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ احد کی منصوبہ بندی میں شریک رہا تھا، اور راہنمائی کرنے والوں میں سے تھا، اس نے حکم دیا کہ لشکر کی دو صفوں کے درمیان گڑھے کھود دیئے جائیں۔ اتفاقاً پیغمبر اسلام ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے، آپؐ کی پیشانی پر زخم آئے اور دندان مبارک ٹوٹ گئے۔

جنگ احد ختم ہوئی، مسلمانوں کو اس میدان میں آنے والی مشکلات کے باوجود اسلام کی آواز بلند تر ہوئی اور ہر طرف صدائے اسلام گونجنے لگی، تو وہ مدینہ سے بھاگ گیا اور بادشاہ روم ہرقل کے پاس پہنچا تا کہ اس سے مدد چاہے اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر مہیا کرے۔

اس نکتے کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اس کی ان کارستانیوں کی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ نے اسے ''فاسق'' کا لقب دے رکھا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ موت نے اسے مہلت نہ دی کہ وہ اپنی آرزو ہرقل سے کہتا لیکن بعض دوسری کتب میں ہے کہ وہ ہرقل سے جا کر ملا اور اس کے وعدوں سے مطمئن اور خوش ہوا۔

بہر حال اس نے مرنے سے پہلے مدینہ کے منافقین کو ایک خط لکھا اور انہیں خوشخبری دی کہ روم کے ایک لشکر کے ساتھ وہ ان کی مدد کو آئے گا۔ اس نے انہیں خصوصی تاکید کی کہ مدینہ میں وہ اس کے لئے ایک مرکز بنائیں تا کہ اس کی آئندہ کی کارگذاریوں کے لئے وہ کام دے سکے لیکن ایسا مرکز چونکہ مدینہ میں اسلام دشمنوں کی طرف سے اپنے نام پر قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا منافقین نے مناسب یہ سمجھا کہ مسجد کے نام پر بیماروں اور معذوروں کی مدد کی صورت میں اپنے پروگرام کو عملی شکل دیں۔

آخر کار مسجد تعمیر ہوگئی یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے ''مجمع بن حارثہ'' (یا مجمع بن جاریہ) نامی ایک قرآن فہم نوجوان کو مسجد کی امامت کے لئے بھی چن لیا گیا لیکن وحی الٰہی نے ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا۔

یہ جو پیغمبر اکرم ﷺ نے جنگ تبوک کی طرف جانے سے قبل ان کے خلاف سخت کارروائی کا حکم نہیں دیا اس کی وجہ شاید ایک تو ان کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور دوسرا یہ کہ تبوک کے سفر میں اس طرف سے کوئی اور ذہنی پریشانی نہ ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی

تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھی بلکہ بعض مسلمانوں (مالک بن دخشم، معنی بن عدی اور عامر بن سکر یا عاصم بن عدی) کو حکم دیا کہ مسجد کو جلا دیں اور پھر اس کی دیواروں کو مسمار کروا دیا۔ اور آخرکار اسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ قرار دے دیا۔

مسجد قباء

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم اس حیات بخش حکم کی مزید تاکید کے لئے خداوند متعال فرماتا ہے کہ اس مسجد میں ہرگز قیام نہ کرو اور اس میں نماز نہ پڑھو۔[1]

''بلکہ اس مسجد کے بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس مسجد میں عبادت قائم کرو جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے''۔[2]

نہ یہ کہ یہ مسجد جس کی بنیاد روز اول ہی سے کفر، نفاق، بے دینی اور تفرقہ پر رکھی گئی ہے۔

''مفسرین نے کہا ہے کہ جس مسجد کے بارے میں مندرجہ بالا جملے میں کہا گیا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں نماز پڑھیں اس سے مراد ''مسجد قبا'' ہے کہ جس کے قریب منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی''۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ''کہ علاوہ اس کے کہ اس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، مردوں کا ایک گروہ اس میں مشغول عبادت ہے جو پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ رکھے اور خدا پاکباز لوگوں کو دوست رکھتا ہے''۔[3]

سب سے پہلی نماز جمعہ

پہلا جمعہ جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑھا وہ اس وقت پڑھا گیا جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپؐ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس دن پیر کا دن بارہ ربیع الاول اور ظہر کا وقت تھا۔ حضرت چار دن تک ''قبا'' میں رہے اور مسجد قبا کی بنیاد رکھی، پھر جمعہ کے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے (قباء اور مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے اور موجودہ وقت میں قبا مدینہ کا ایک داخلی محلہ ہے)

اور نماز جمعہ کے وقت آپ محلہ ''بنی سالم'' میں پہنچے وہاں نماز جمعہ ادا فرمائی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا کیا۔ جمعہ کی نماز میں آپؐ نے خطبہ بھی پڑھا۔ جو مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خطبہ تھا۔

واقعہ غدیر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری سال تھا ''حجۃ الوداع'' کے مراسم جس قدر باوقار و پرشکوہ ہو سکتے تھے اس قدر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے۔ سب کے دل روحانیت سے سرشار تھے ابھی ان کی روح اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس عظیم نعمت سے فیض یاب ہوئے اور اس سعادت کے حاصل ہونے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔

نہ صرف مدینہ کے لوگ اس سفر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان

---

[1] سورہ توبہ آیت 108

[2] سورہ توبہ آیت 108

[3] سورہ توبہ آیت 108

بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز وافتخار حاصل کرنے کے لئے آپؐ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ ''جحفہ'' کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے ''غدیر خم'' کے بیابان نظر آنے لگے۔

دراصل یہاں پر ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شمالی راستہ مدینہ کی طرف دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پر آخری مقصد اور اس عظیم سفر کا اہم ترین کام انجام پذیر ہوتا تھا تاکہ مسلمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ان کا آخری حکم جان کر ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال۔ آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں نے بلند آواز سے ان لوگوں کو جو قافلے کے آگے چل رہے تھے واپس لوٹنے کے لئے پکارا اور اتنی دیر کے لئے ٹھہر گئے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن نے ''اللہ اکبر'' کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن فضاء اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی سر کے اوپر لے لیں، ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہی تھیں۔

اس صحرا میں کوئی سائبان نظر نہ آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند بے برگ وبار بیابانی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لئے ہوئے تھے اور انہوں نے ان برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک سائبان سا بنا رکھا تھا لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرمی کو اس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی۔ بہرحال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔

خطبہ غدیر

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انھوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوندتعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور تھے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے دیکھ نہیں پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پہلے پروردگار عالم کی حمد وثنا بجالائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوند متعال کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو، تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے لوگوں نے بلند آواز میں کہا:

''ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی وکوشش کی، خدا آپؐ کو جزائے خیر دے''۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: خداوند گواہ رہنا۔

آپؐ نے مزید فرمایا: اے لوگو کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دیکھو میں تمہارے درمیان دو گراں مایہ اور گراں قدر چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ دو گراں مایہ چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور ان سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپؐ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہوگئی اور آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"ایها الناس من اولی الناس بالمومنین من انفسهم"

یعنی اے لوگو بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود ان سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا میرا مولا اور رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا اور رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

"فمن کنت مولاه فهذا علی مولاه"۔

"یعنی جس جس کا میں مولا ہوں علی علیہ السلام بھی اس اس کے مولا اور رہبر ہے"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:۔

"اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ واحب من احبہ و ابغض من ابغضہ و انصر من نصرہ واخذل من خذلہ، وادر الحق معہ حیث دار۔"

یعنی بار الہا جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر۔ جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا:

"تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اور اس وقت موجود نہیں ہیں"۔

روز اکمال دین

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہو گیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا۔

ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بایں الفاظ بشارت دی:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی"۔ [1]

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا"۔

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اکبر اللہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمۃ ورضی الرب برسالتی والولایۃ لعلی من بعدی"۔

"ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لئے علی علیہ السلام کی ولایت کے لئے خوش ہوا۔"

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی ولایت کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس اعزاز و منصب پر حضرت علی علیہ السلام کو اپنی طرف سے مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا:

"بخ بخ لك یا بن ابی طالب اصبحت وامسیت مولائی و مولا کل مومن و مومنۃ:"

"مبارک ہو مبارک ہو اے فرزند ابی طالب کہ آپؑ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر

---

[1] سورہ مائدہ آیت 3

ہو گئے''۔

اس وقت ابن عباس نے کہا: بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا''۔[1]

فدک

فدک اطراف مدینہ میں تقریباً ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک ایک آباد قصبہ تھا۔ جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے یکے بعد دیگر افواج اسلامی نے فتح کر لئے اور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے بارگاہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی آدھی زمینیں اور باغات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیئے اور آدھے اپنے پاس رکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ کی زمینوں کی کاشتکاری بھی اپنے ذمہ لی۔ اپنی کاشتکاری کی زحمت کی اجرت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصول کرتے تھے، سورہ حشر کی آیات کے پیش نظر اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ زمینیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت خاص تھیں۔ ان کی آمدنی کو آپؐ اپنے مصرف میں لاتے تھے یا ان مدات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف اس سورہ کی آیت نمبر 7 میں اشارہ ہوا ہے۔

لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرما دیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر درالمنثور میں ابن عباس سے مروی ہے کہ جس وقت آیت (**فات ذا القربی حقه**)[2] نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا: کتاب کنز العمال جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے، میں صلہ رحم کے عنوان کے ماتحت ابوسعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا:

"**یا فاطمة لك فدك**"

''اے فاطمہ علیہا السلام فدک تیری ملکیت ہے''۔

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستان فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اسی طرح بہت سے دیگر مؤرخین نے بھی، لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لئے مضر سمجھتے تھے، انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یاور و انصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشیں کر دیں۔ حدیث مجہول (نحن معاشر الانبیاء ولا نورث) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر متصرف تھیں اور کوئی شخص ''ذوالید'' (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا، جناب سیدہ سلام اللہ علیہا سے گواہ طلب کیے گئے۔ بی بی نے گواہ پیش کیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں فدک عطا فرمایا ہے لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بعد میں آنے والے خلفاء میں سے جو کوئی اہلبیت سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فدک انہیں لوٹا دیتا لیکن زیادہ دیر نہ گزرتی کہ دوسرا خلیفہ اسے چھین لیتا اور دوبارہ اس پر قبضہ کر لیتا۔ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس بارہا یہ اقدام کرتے رہے۔

---

[1] اس سلسلے میں مزید آگہی کے لئے کتاب الغدیر، علامہ امینی، احقاق الحق، قاضی نور اللہ شوشتری، المراجعات شرف الدین اور دلائل الصدق محمد حسین مظفر پر رجوع کریں۔

[2] سورہ روم آیت 38

واقعہ فدک اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع حوادث جو صدر اسلام میں اور بعد کے ادوار میں پیش آئے، زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف حوادث نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے نامور محدث مسلم بن حجاج نیشاپوری نے اپنی مشہور و معروف کتاب "صحیح مسلم" میں جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کا خلیفہ اول سے فدک کے مطالبہ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے، اور جناب عائشہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو جب خلیفہ اول نے فدک نہیں دیا تو بی بی ان سے ناراض ہوگئی اور آخر عمر ان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔[1]

"نحن معاشر الانبیاء لانورث"

اہل سنت کی مختلف کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ایک حدیث موجود ہے جو اس طرح کے مضمون پر مشتمل ہے:

"نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقة"

"ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگ اپنی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم سے رہ جائے اسے راہ خدا میں صدقے کے طور پر خرچ کر دیا جائے"۔

اور بعض کتابوں میں "لانورث" کا جملہ نہیں ہے بلکہ "ماترکناہ صدقة" کی صورت میں نقل کیا گیا ہے۔

اس روایت کی سند عام طور پر ابوبکر تک جا کر ختم ہوجاتی ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی زمام امور اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اور جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض بیویوں نے ان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اس حدیث کا سہارا لے کر انہیں میراث سے محروم کر دیا۔

اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح (جلد 3 کتاب الجھاد والسیر ص1379) میں، بخاری نے جزء ہشتم کتاب الفرائض کے صفحہ 185 پر اور اسی طرح بعض دیگر افراد نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے بخاری میں بی بی عائشہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے: فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور جناب عباس بن عبدالمطلب (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد) ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انھوں نے اپنی فدک کی اراضی اور خیبر سے ملنے والی میراث کا مطالبہ کیا تو ابوبکر نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "ہم میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑتے، جو کچھ ہم سے رہ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے"۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے جب یہ سنا تو ناراض ہو کر وہاں سے واپس آگئیں اور مرتے دم تک ان سے بات نہیں کی۔

البتہ یہ حدیث مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے لیکن اس تفسیر میں ہم چند ایک نکات بیان کریں گے:

1۔ یہ حدیث، قرآنی متن کے مخالف ہے اور اس اصول اور کلیہ قاعدہ کی رو سے ناقابل اعتبار ہے کہ جو بھی حدیث کتاب اللہ کے مطابق نہ ہو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور ایسی حدیث کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دیگر معصومین علیہم السلام کا قول سمجھ کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب جہاد ج3 ص1380 حدیث52

ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جناب داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور آیت کا ظاہر مطلق ہے کہ جس میں اموال بھی شامل ہیں۔ جناب یحیی علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ"

''خداوندا مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے''۔[1]

حضرت ''زکریا علیہ السلام'' کے بارے میں تو بہت سے مفسرین نے مالی وراثت پر زور دیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ''وراثت'' کی آیات کا ظاہر بھی عمومی ہے کہ جو بلا استثناء سب کے لئے ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے مشہور عالم علامہ قرطبی نے مجبور ہو کر اس حدیث کو غالب اور اکثر فعل کی حیثیت سے قبول کیا ہے نہ کہ عمومی کلیہ کے طور پر اور اس کے لئے یہ مثال دی ہے کہ عرب ایک جملہ کہتے ہیں:

"انا معشر العرب اقری الناس للضیف"۔

ہم عرب لوگ دوسرے تمام افراد سے بڑھ کر مہمان نواز ہیں (حالانکہ یہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے)۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اس حدیث کی اہمیت کی نفی کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں اس قسم کا عذر قبول کر لئے تو پھر دوسرے کے لئے بھی یہ قطعی نہیں رہ جاتی۔

2۔مندرجہ بالا روایت ان کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہو کہ ابوبکر نے جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو فدک واپس لوٹانے کا پختہ ارادہ کر کیا تھا لیکن دوسرے لوگ اس میں حائل ہو گئے تھے چنانچہ سیرت حلبی میں ہے:

فاطمہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکر کے پاس اس وقت آئیں جب وہ منبر پر تھے۔انھوں نے کہا:

''اے ابوبکر کیا یہ چیز قرآن میں ہے کہ تمہاری بیٹی تمہاری وراث بنے لیکن میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں''؟

یہ سن کر ابوبکر رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر وہ منبر سے نیچے اترے اور فدک کی واپسی کا پروانہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو لکھ دیا۔اسی اثناء میں عمر آ گئے۔پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ تحریر لکھ دی ہے تا کہ فاطمہ کو ان کے باپ سے ملنے والی وراثت واپس لوٹا دوں عمر نے کہا: اگر آپ یہ کام کریں گے تو پھر دشمنوں کے ساتھ جنگی اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟

جبکہ عربوں نے آپ کے خلاف قیام کیا ہوا ہے۔یہ کہا اور تحریر لے کر اسے پارہ پارہ کر دیا۔[2]

یہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو صریحی طور پر ممانعت کی ہو اور ابوبکر اس کی مخالفت کی جرأت کریں؟ اور پھر عمر نے جنگی اخراجات کا تو سہارا لیا لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پیش نہیں کی۔

مندرجہ بالا روایت پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ممانعت کا سوال نہیں تھا۔بلکہ سیاسی مسائل آڑے تھے اور ایسے موقع پر معتزلی عالم ابن ابی الحدید کی گفتگو یاد آ جاتی ہے۔وہ کہتے ہیں:

میں نے اپنے استاد ''علی بن فارقی'' سے پوچھا کہ کیا فاطمہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دعویٰ میں سچی تھیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں پھر

---

[1] سورہ مریم آیت 6

[2] سیرہ حلبی ج 3 ص 361

میں نے پوچھاتو ابوبکرانہیں سچااور برحق بھی سمجھتے تھے۔

اس موقع پر میرے استاد نے معنی خیز تبسم کے ساتھ نہایت ہی لطیف اور پیارا جواب دیا حالانکہ انکی مذاق کی عادت نہیں تھی، انھوں نے کہا: اگر وہ آج انہیں صرف ان کے دعویٰ کی بناء پر ہی فدک دے دیتے تو پھر نہ تو ان کے لئے کسی عذر کی گنجائش باقی رہتی اور نہ ہی ان سے موافقت کا امکان''۔[1]

3۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے جسے شیعہ اور سنی سب نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، حدیث یہ ہے: "العلماء ورثة الانبیاء"۔''علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں''۔

نیز یہ قول بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے:

"ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درهماً"۔

''انبیاء اپنی میراث میں نہ تو دینار چھوڑتے ہیں اور نہ ہی درہم''۔

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو یہ بات باور کرائیں کہ انبیاء کے لئے سرمایہ افتخار ان کا علم ہے اور اہم ترین چیز جو وہ یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں ان کا ہدایت وراہنمائی کا پروگرام ہے اور جو لوگ علم ودانش سے زیادہ بہرہ مند ہوں گے وہی انبیاء کے اصلی وارث ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ ان کی مال پر نگاہ ہو اور اسے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔اس کے بعد اس حدیث کے نقل بہ معنی کر دیا گیا اور اس کی غلط تعبیریں کی گئیں اور شاید ''ماترکناہ صدقۃ'' والے جملے کا بعض روایات میں اس پر اضافہ کر دیا گیا۔

مباہلہ

خداوند عالم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو اسے ''مباہلہ'' کی دعوت دو اور کہو کہ وہ اپنے بچوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بچوں کو عورتوں اور نفس کو بلالو پھر دعا کرو تا کہ خدا جھوٹوں کو رسوا کر دے۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے جب کہ مباہلہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں، اور ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کریں اور پھر منتشر ہو جائیں کیونکہ یہ عمل تو نتیجہ خیز نہیں ہے۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ دعا اور نفرین عملی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو جھوٹا ہو فوراً عذاب میں گرفتار ہو جائے۔

آیات میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق واستدلال کے غیر مؤثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لئے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خاجی اثر پیش نظر تھا۔

مباہلہ کا مسئلہ عرب میں کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور اس راستہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدقت وایمان کو اچھی سرح سمجھا جاسکتا تھا، کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دی کہ آؤ اکھٹے درگاہ خدا میں چلیں، اس سے درخواست کریں اور دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کر دے اور پھر یہ بھی کہے کہ تم عنقریب اس کا نتیجہ خود دیکھ لو گے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد۔16 ص284

یہ مسلم ہے کہ ایسے میدان کا رخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے والے کی دعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھ دار انسان نتیجے کے متعلق اطمینان کئے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دعوت مباہلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپؐ کی دعوت کی صداقت اور ایمان کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ ''مباہلہ'' کی دعوت دی گئی تو نجران کے عیسائیوں کے نمائندے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ سے مہلت چاہی تا کہ اس بارے میں سوچ بچار کرلیں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرلیں۔ مشورہ کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت کی چغلی کھاتی ہے۔

بہر حال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے مابین یہ طے پایا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شور وغل، مجمع اور داد وفریاد کے ساتھ ''مباہلہ'' کے لئے آئیں تو ڈرا نہ جائے اور مباہلہ کرلیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں تو پھر حقیقت کچھ بھی نہیں، جب بھی شور وغل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر وہ بہت محدود افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر وعدہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس صورت میں اس سے ''مباہلہ'' کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدان مباہلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بیٹے حسین علیہ السلام کو گود میں لئے حسن علیہ السلام کا ہاتھ پکڑے اور علی علیہ السلام اور فاطمہ علیہا السلام کو ہمراہ لئے آپہنچے ہیں اور انہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں، تم آمین کہنا۔

عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انتہائی پریشان ہوئے اور مباہلہ سے رک گئے اور صلح ومصالحت کے لئے تیار ہو گئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہو گئے۔

عظمت اہل بیت علیہم السلام کی ایک زندہ سند

شیعہ اور سنی مفسرین اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آیہ مباہلہ اہل بیت رسول علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف ان کے بیٹے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام، ان کی بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام تھے۔ اس بناء پر آیت میں ''ابنائنا'' سے مراد صرف امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام ہیں۔ ''نسائنا'' سے مراد جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں اور ''انفسنا'' سے مراد صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے بعض مفسرین نے جو بہت ہی تعداد میں ہیں۔ اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً مولف ''المنار'' نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے:

''یہ تمام روایات شیعہ طریقوں سے مروی ہیں، ان کا مقصد معین ہے، انہوں نے ان احادیث کی نشر واشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے۔ جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے''۔

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا ان کی کتابوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر اہل سنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی

احادیث اور کتب بھی درجہ اعتبار سے گر جائیں گی۔

اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اہل سنت کے طریقوں سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے۔

قاضی نوراللہ شوستری اپنی کتاب نفیس ''احقاق الحق'' [1] میں لکھتے ہیں: ''مفسرین اس مسئلے میں متفق ہیں کہ ''ابنائنا'' سے اس آیت میں امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام مراد ہیں، ''نسائنا'' سے ''حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا'' اور ''انفسنا'' میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے''۔

اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسول علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ [2]

1۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، مؤلف صحیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اور ان کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابل اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم، ج7 ص120 طبع مصر زیر اہتمام محمد علی صبیح۔

2۔ احمد بن حنبل نے اپنی ''مسند'' میں لکھا ہے ملاحظہ ہو، ج2 ص185 طبع مصر۔

3۔ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے۔ دیکھئے ج3 ص192 طبع میمنیہ مصر۔

4۔ حاکم نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے، دیکھئے ج3 ص15 مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

5۔ حافظ ابونعیم اصفہانی، کتاب ''دلائل النبوۃ'' ص297 مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

6۔ واحدی نیشاپوری، کتاب ''اسباب النزول'' ص74 طبع ہند۔

7۔ فخر رازی، نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے، دیکھئے ج8 ص85 طبع بہیہ، مصر۔

8۔ ابن اثیر، ''جامع الاصول'' جلد9 ص470 طبع سنۃ المحمدیہ، مصر۔

9۔ ابن جوزی ''تذکرۃ الخواص'' صفحہ 17 طبع نجف۔

10۔ قاضی بیضاوی، نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، ملاحظہ کریں ج2 ص22 طبع مصطفی محمد، مصر۔

11۔ آلوسی نے تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے۔ دیکھئے۔ ج3 ص167 طبع منیریہ مصر۔

12۔ معروف مفسر طنطاوی نے اپنی تفسیر ''الجواھر'' میں لکھا ہے۔ ج2 ص120 مطبوعہ مصطفی البابی ال۔ حلبی، مصر۔

13۔ زمخشری نے تفسیر ''کشاف'' میں لکھا ہے، دیکھئے۔ ج1 ص193، مطبوعہ مصطفی محمد، مصر۔

14۔ حافظ احمد ابن حجر عسقلانی، ''الاصابۃ''۔ ج2 ص503، مطبوعہ مصطفی محمد، مصر۔۔۔

15۔ ابن صباغ، ''فصول المہمۃ''۔ ص108 مطبوعہ نجف۔

16۔ علامہ قرطبی، ''الجامع الاحکام القرآن''۔ ج3 ص104 مطبوعہ مصر 1936۔

''غایۃ المرام'' میں صحیح مسلم کے حوالے سے لکھا: ''ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا:''

تم ابوتراب (علی علیہ السلام) کو سب وشتم کیوں نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگا۔

جب سے علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آتی ہیں، میں نے اس کام سے صرف نظر کر لیا

---

[1] ان کے نام اور ان کی کتاب کی خصوصیات صفحہ۔ 46 سے لیکر صفحہ 76 تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں۔

[2] جلد سوم طبع جدید صفحہ 46

ہے۔ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام، حسین علیہ السلام، اور علی علیہ السلام کو دعوت دی۔اس کے بعد فرمایا"اللھم ھو لاء اھلی"(یعنی خدایا یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں)۔

تفسیر ''کشاف'' کے مؤلف اہل سنت کے بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں۔''یہ آیت اہل کساء کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے قوی ترین دلیل ہے''۔

شیعہ مفسرین، محدثین اور مؤرخین بھی سب کے سب اس آیت کے ''اھل بیت'' کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ ''نورالثقلین'' میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔ان میں سے ایک کتاب ''عیون اخبار الرضا'' ہے۔اس میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے، جو مامون نے اپنے دربار میں منعقد کی تھی۔

اس میں ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے فرمایا:

''خدا نے اپنے پاک بندوں کو آیت مباہلہ میں مشخص کر دیا ہے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے:

"فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل"

اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر، علی، فاطمہ، حسن، اور حسین علیہم السلام کو اپنے ساتھ مباہلہ کے لئے لے گئے اور یہ ایسی خصوصیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیت علیہم السلام پر سبقت حاصل نہیں کر سکا اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا اور یہ ایسا شرف ہے جسے ان سے پہلے کوئی حاصل نہیں کر سکا''۔

تفسیر ''برہان''، ''بحارالانوار'' اور تفسیر ''عیاشی'' میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت ''اہل بیت'' علیہم السلام کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

زینب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی [1]

زمانہ بعثت سے پہلے اور اس کے بعد جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی تو حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے ''زید'' نامی ایک غلام خریدا، جسے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔

آپؐ نے اسے آزاد کر دیا۔ چونکہ اس کے قبیلے نے اسے اپنے سے جدا کر دیا تھا، لہٰذا رسول رحمت نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، جسے اصطلاح میں ''متبنّیٰ'' کہتے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد زید مخلص مسلمان ہو گیا اور اسلام کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے اور اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔آخر میں جنگ موتہ میں ایک مرتبہ لشکر اسلام کے کمانڈر بھی مقرر ہوئے اور اسی جنگ میں شربت شہادت نوش کیا۔

جب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کا عقد کرنا چاہا تو اپنی پھوپھی زاد، بہن زینب بنت حجش بنت امیہ بنت عبدالمطلب سے اس کے لئے خواستگاری کی۔زینب نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لئے اسے انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔لہٰذا وہ خوش ہو گئی اور رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ آپؐ کی یہ خواستگاری تو زید کے لئے تھی تو سخت پریشان ہوئیں اور انکار کر دیا۔اس کے بھائی عبداللہ نے بھی اس چیز کی سخت مخالفت کی۔

یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور زینب اور عبداللہ جیسے افراد کو تنبیہ کی کہ جس وقت خدا اور اس کا

---

[1] اکثر مفسرین و مؤرخین اسلامی کے بقول سورہ احزاب کی آیات 36 تا 38 اس سلسلے میں نازل ہوئی ہیں

رسول کسی کام کو ضروری سمجھیں تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے۔

جب انھوں نے یہ بات سنی تو سر تسلیم خم کر دیا۔ (البتہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ شادی کوئی عام شادی نہیں تھی بلکہ یہ زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لئے ایک تمہید تھی کیونکہ زمانہ جاہلیت میں کسی باوقار اور مشہور خاندان کی عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ غلام کتنا ہی اعلی قدر و قیمت کا مالک کیوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ شادی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی اور طرفین کے درمیان اخلاقی نااتفاقیوں کی بدولت طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ اگرچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصرار تھا کہ یہ طلاق واقع نہ ہو لیکن ہو کر رہی۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی میں اس ناکامی کی تلافی کے طور پر زینب کو حکم خدا کے تحت اپنے حبالہ عقد میں لے لیا اور یہ بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

لیکن دوسری باتیں لوگوں کے درمیان چل نکلیں جنہیں قرآن نے مربوط آیات کے ذریعے ختم کر دیا۔ اسکے بعد زید اور اس کی بیوی زینب کی اس مشہور داستان کو بیان کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حساس مسائل میں سے ایک ہے اور ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسئلہ سے مربوط ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اس وقت کو یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دے رکھی تھی اور ہم نے ابھی، اے رسول اسے نعمت دی تھی اور تم کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو''۔ [1]

نعمت خدا سے مراد وہی ہدایت اور ایمان کی نعمت ہے جو زید بن حارثہ کو نصیب ہوئی تھی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت یہ تھی کہ آپؐ نے اسے آزاد کیا تھا اور اپنے بیٹے کی طرح اسے عزت بخشی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینب کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ نوبت جدائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ اگر آیت میں لفظ ''تقول'' کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فعل مضارع ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار بلکہ ہمیشہ اسے نصیحت کرتے اور روکتے تھے۔

کیا زینب کا یہ نزاع زید کی سماجی حیثیت کی بناء پر تھا جو زینب کی معاشرتی حیثیت سے مختلف تھی؟ کیونکہ زینب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ سے تعلق تھا اور زید آزاد شدہ تھا۔ یا زید کی اخلاقی سختیوں کی وجہ سے تھا؟ یا ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی بلکہ دونوں میں روحانی اور اخلاقی موافقت اور ہم آہنگی نہیں تھی؟ کیونکہ ممکن ہے دو افراد اچھے تو ہوں لیکن فکر و نظر اور سلیقہ کے لحاظ سے ان میں اختلاف ہو جس کی بناء پر اپنی ازدواجی زندگی کو آئندہ کے لئے جاری نہ رکھ سکتے ہوں؟

پیغمبر کی نظر میں تھا کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی نہیں ہو پائی اور نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے تو وہ اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کی اس ناکامی کی تلافی اپنے ساتھ نکاح کی صورت میں کر دیں گے، اس کے ساتھ آپؐ کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ لوگ دو وجوہ کی بناء پر آپؐ پر اعتراض کریں گے اور مخالفین ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیں گے۔

اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''تم اپنے دل میں ایک چیز کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا آشکار کرتا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہارا پروردگار زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو''۔ [2]

---

[1] سورہ احزاب آیت 37

[2] سورہ احزاب آیت 37

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منہ بولا بیٹا تھا، اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق منہ بولے بیٹے کے بھی وہی احکام ہوتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔

دوسری یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیونکر اس بات پر تیار ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد کریں جبکہ آپ کی شادی بہت بلند و بالا ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ ارادہ حکم خداوندی سے کیا ہوا تھا اور بعد والے حصے میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے۔

اس بناء پر یہ مسئلہ ایک تو اخلاقی اور انسانی مسئلہ تھا اور دوسرے یہ زمانہ جاہلیت کی غلط رسموں کو توڑنے کا ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ تھا (یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلّقہ سے آزاد کردہ غلام کی مطلّقہ سے عقد)۔

مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان مسائل میں نہ تو لوگوں سے ڈرنا چاہیئے تھا اور نہ ہی فضا کے مکدر ہونے اور زہریلے پروپیگنڈے سے خوف و وحشت کا شکار ہو جاتے، خاص کر جب یہ احتمال ہو کہ ایک جنجال کھڑا ہو جائے گا اور آپ اور آپ کے مقدس مشن کی ترقی اور اسلام کی پیش رفت کے لئے رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی اور یہ بات ضعیف الایمان افراد کو متزلزل کر دے گی اور ان کے دل میں شک وشبہات پیدا ہو جائیں گے۔

اس لئے قرآن میں اس سلسلہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

''جس وقت زید نے اپنی حاجت کو پورا کر لیا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تو ہم اسے تمہاری زوجیت میں لے آئے تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے مطلّقہ ہونے کے بعد مومنین کو ان سے شادی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو''۔[1]

یہ کام ایسا تھا جسے انجام پا جانا چاہئے تھا

''اور خدا کا فرمان انجام پا کر رہتا ہے''۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ہر قسم کے شک وشبہ کو دور کرنے کے لئے پوری صراحت کے ساتھ اس شادی کا اصل مقصد بیان کرتا ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لئے تھی یعنی منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یہ خود ایک کلی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مختلف عورتوں سے شادی کرنا کوئی عام سی بات نہیں تھی بلکہ اس میں کئی مقاصد کا ذکر کرنا مقصود تھا جو آپ کے مکتب کے مستقبل کے انجام سے تعلق رکھتا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زینب کے ساتھ شادی کی داستان قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کا ہدف منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کے ذریعے دور جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنا تھا، اس کے باوجود دشمنان اسلام نے اسے غلط رنگ دے کر ایک عشقیہ داستان میں تبدیل کر دیا اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کو آلودہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے اور اس بارے میں مشکوک اور جعلی احادیث کا سہارا لیا ہے ان داستانوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زید کی احوال پرسی کے لئے اس کے گھر گئے اور جونہی آپ نے دروازہ کھولا تو آپ کی نظر زینب کے حسن وجمال پر جا پڑی تو آپ نے فرمایا:

---

[1] سورہ احزاب آیت 37

[2] سورہ احزاب آیت 37

"سبحان الله خالق النور تبارك الله احسن الخالقين"

''منزہ ہے وہ خدا جو نور کا خالق ہے اور جاوید و بابرکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے''۔

ان لوگوں نے اس جملے کو زینب کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے لگاؤ کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ عصمت و نبوت کے مسئلہ سے قطع نظر بھی اس قسم کے افسانوں کی تکذیب کے لئے واضح شواہد ہمارے پاس موجود ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت زینب، رسول پاک کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور خاندانی ماحول میں تقریباً آپ کے سامنے پلی بڑھی تھیں اور آپ ہی نے زید کے لئے ان کی خواستگاری کی تھی اگر زینب حد سے زیادہ حسین تھیں اور بالفرض اس کے حسن و جمال نے پیغمبر اکرم ﷺ کی توجہ کو اپنی طرف جذب کرلیا تھا تو نہ تو اس کا حسن و جمال ڈھکا چھپا تھا اور نہ ہی اس ماجرے سے پہلے ان کے ساتھ آنحضرت کا عقد کرنا کوئی مشکل امر تھا بلکہ اگر دیکھا جائے تو زینب کو زید کے ساتھ شادی کرنے سے دلچپی نہ تھی، بلکہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا تھا اور وہ اس بات کو کاملاً ترجیح دیتی تھیں کہ زید کی بجائے رسول اللہ کی بیوی بنیں، کیونکہ جب آنحضرت ﷺ زید کے لئے زینب سے رشتہ دینے آئے تو وہ نہایت خوش ہوگئیں، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے اپنے لئے خواستگاری کی غرض سے تشریف لائے ہیں، لیکن بعد میں وحی الٰہی کے نزول اور خدا و پیغمبر ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے زید کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوگئیں تو ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو ہم کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہیں آپ زینب کے حالات سے بے خبر تھے؟ یا آپ ان سے شادی کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اقدام نہیں کر سکتے تھے؟

دوسرا یہ کہ جب زید نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا تو آپ نے بار بار اسے نصیحت کی اور طلاق دینے کے لئے روکا اور یہ چیز بجائے خود ان افسانوں کی نفی کا ایک اور شاہد ہے۔

پھر یہ کہ خود قرآن صراحت کے ساتھ اس شادی کا مقصد بیان کرتا ہے تا کہ کسی قسم کی دوسری باتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ قرآنی آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے کہ زید کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ لوگوں سے ڈرتے تھے، جبکہ انہیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہئے۔

خوف خدا کا مسئلہ واضح کرتا ہے کہ یہ شادی ایک فرض کی بجا آوری کے طور رانجام پائی تھی کہ خدا کی ذات کے لئے شخصی معاملات کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے تا کہ ایک خدائی مقدس ہدف پورا ہو جائے، اگر چہ اس سلسلے میں کوردل دشمنوں کی زبان کے زخم اور منافقین کی افسانہ طرازی کا پیغمبر کی ذات پر الزام ہی کیوں نہ آتا ہو پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم خدا کی اطاعت اور غلط رسم کو توڑنے کی پاداش میں یہ ایک بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔

لیکن سچے رہبروں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں، جن میں انہیں ایثار اور فداکاری کا ثبوت دینا پڑتا ہے، اور وہ اس قسم کے لوگوں کے اتہامات اور الزامات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں تا کہ اس طرح سے وہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ جائیں

البتہ اگر پیغمبر گرامی قدر نے زینب کو بالکل ہی نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی پہچانا ہوتا اور زینب نے بھی آپ کے ساتھ ازدواج کے بارے میں رغبت کا اظہار نہ کیا ہوتا اور زید بھی انہیں طلاق دینے پر تیار نہ ہوتے (نبوت و عصمت کے مسئلہ سے ہٹ کر) پھر تو اس قسم کی گفتگو اور توہمات کی گنجائش ہوتی، لیکن پیغمبر ﷺ کی تو وہ دیکھی دکھائی تھیں لہٰذا ان تمام امکانات کی نفی کے ساتھ ان افسانوں کا جعلی اور من گھڑت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا کوئی لمحہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ گو زینب سے کوئی خاص لگاؤ اور رغبت ہو، بلکہ دوسری

بیویوں کی نسبت ان سے کوئی رغبت رکھتے تھے اوران افسانوں کی نفی پر یہ ایک اور دلیل ہے۔

ثعلبہ

''ثعلبہ بن حاطب انصاری'' ایک غریب آدمی تھا، روزانہ مسجد میں آیا کرتا تھا اس کا اصرار تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا فرمائیں کہ خدا اس کو مالا مال کردے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا:

''مال کی تھوڑی مقدار جس کا تو شکر ادا کر سکے مال کی کثرت سے بہتر ہے جس کا تو شکر ادا نہ کر سکے''۔

کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے اور سادہ زندگی بسر کرے۔

لیکن ثعلبہ مطالبہ کرتا رہا اور آخر کار اس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میں آپ ؐ کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ ؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر خدا نے مجھے دولت عطا فرمائی تو میں اس کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ چنانچہ آپ ؐ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔

ایک روایت کے مطابق زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ اس کا ایک چچا زاد بھائی جو بہت مالدار تھا، وفات پا گیا اور اسے بہت سی دولت ملی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے ایک بھیڑ خریدی جس سے اتنی نسل بڑھی کہ جس کی دیکھ بھال مدینہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہیں مدینہ کے آس پاس کی آبادیوں میں لے گیا اور مادی زندگی میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ نماز با جماعت تو کیا نماز جمعہ میں بھی نہ آتا تھا ایک مدت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکواۃ وصول کرنے والے عامل کو اس کے پاس زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا لیکن اس کم ظرف کنجوس نے نہ صرف خدائی حق کی ادائیگی میں پس وپیش کیا بلکہ شرع مقدس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حکم جزیہ کی طرح ہے یعنی ہم اس لئے مسلمان ہوئے تھے کہ جزیہ دینے سے بچ جائیں۔ اب زکوٰۃ دینے کی شکل میں ہم میں اور غیر مسلموں میں کون سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے نہ جزیہ کا مطلب سمجھا تھا اور نہ زکوٰۃ کا اور اگر اس نے سمجھا تھا تو دنیا پرستی جو اسے حقیقت کے بیان اور اظہار حق کی اجازت نہیں دیتی تھی، غرض جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا:

''یاویح ثعلبه یاویح ثعلبه''۔

''وائے ہو ثعلبہ پر ہلاکت ہو ثعلبہ پر''۔[1]

تمت بالخیر

[1] مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ سورہ توبہ کی آیت 75 تا 78 اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔